الرّفيقُ الفصِيح
لمشكوٰة المَصَابِيح
جلد ۱۵
افادات
حضرت علّامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ
شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد
مرتب
محمد فاروق غفرلہٗ
ڈیزائننگ و کمپوزنگ:
مجیب الرحمن قاسمی 7895786325

S.R.Waraq-14

الرفیق الفصیح
لمشکوٰۃ المصابیح

جلد ۱۵

افادات

حضرت علامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ

شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد

مرتب

محمد فاروق غفرلہٗ

خادم جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ (یوپی) ۲۴۵۲۰۶

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

تفصیلات

نام کتاب......الرفیق الفصیح لمشکوٰۃ المصابیح ج:۱۵

افادات............حضرت علامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ

مرتب............محمد فاروق غفرلہٗ خادم جامعہ محمودیہ میرٹھ

کمپوزنگ............مجیب الرحمن قاسمی لکھیم پوری شعبہ کمپیوٹر جامعہ ہذا

سن اشاعت............سنہ ۱۴۳۵ھ مطابق سنہ ۲۰۱۴ء

صفحات............۶۱۶

قیمت

ناشر

مَکتَبہ مَحمُودِیَہ

جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ (یو پی) ۲۴۵۲۰۶

S.R.Waraq-14

فہرست

الرفیق الفصیح

لمشکوٰۃ المصابیح

جلد: پانزدہم

اجمالی فہرست

تفصیلی فہرست

الرفیق الفصیح لمشکوٰۃ المصابیح ۱۵

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	﴿الفصل الثانی﴾	
۳۲	حدیث نمبر﴿۲۶۵۰﴾ اپنے ہاتھ کی کمائی پاکیزہ ترین کمائی ہے............	۶۶
۳۳	حدیث نمبر﴿۲۶۵۱﴾ حرام مال عنداللہ مقبول نہیں	۶۷
۳۴	گناہوں کا کفارہ کیسے ہوگا؟	۶۸
۳۵	حدیث نمبر﴿۲۶۵۲﴾ حرام خوری کا اثر	۶۹
۳۶	حرام خوری سے کیوں جنت میں محروم ہوگا؟............	۶۹
۳۷	حدیث نمبر﴿۲۶۵۳﴾ تقویٰ اور پرہیزگاری............	۷۰
۳۸	حدیث نمبر﴿۲۶۵۴﴾ نیکی اور معصیت کی شناخت............	۷۱
۳۹	آنحضرت ﷺ کی برکت	۷۳
۴۰	حدیث نمبر﴿۲۶۵۵﴾ تقویٰ اور ورع کا حصول	۷۳
۴۱	حدیث نمبر﴿۲۶۵۶﴾ شراب اور لعنت	۷۴
۴۲	حدیث نمبر﴿۲۶۵۷﴾ شراب نوشی کا حکم	۷۵
۴۳	حدیث نمبر﴿۲۶۵۸﴾ سینگی کی اجرت	۷۶
۴۴	حدیث نمبر﴿۲۶۵۹﴾ گانے بجانے کی اجرت	۷۷
۴۵	حدیث نمبر﴿۲۶۶۰﴾ گانے والی باندی خریدنا............	۷۸
	﴿الفصل الثالث﴾	۸۰
۴۶	حدیث نمبر﴿۲۶۶۱﴾ کسب حلال فرض ہے	۸۰
۴۷	حدیث نمبر﴿۲۶۶۲﴾ کتابت قرآن کریم کی اجرت	۸۱
۴۸	حدیث نمبر﴿۲۶۶۳﴾ کونسا کسب افضل ہے؟	۸۲
۴۹	حدیث نمبر﴿۲۶۶۴﴾ دودھ فروخت کرنا............	۸۳
۵۰	حدیث نمبر﴿۲۶۶۵﴾ بلاوجہ ذریعہ معاش کی تبدیلی نہ کی جائے	۸۵
۵۱	حدیث نمبر﴿۲۶۶۶﴾ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی احتیاط اور کمالِ تقویٰ ..	۸۷

Jild-15

نمبرشمار	مضامین	صفحہ نمبر
	﴿الفصل الثانی﴾	
۲۷۸	حدیث نمبر﴿۲۸۱۶﴾بنجر زمین کا حکم	۳۷۲
۲۷۹	حدیث نمبر﴿۲۸۱۷﴾کسی کا مال طیب نفس کے ساتھ ہی حلال ہے	۳۷۳
۲۸۰	حدیث نمبر﴿۲۸۱۸﴾ایضاً	۳۷۴
۲۸۱	نکاح شغار اور اس کا حکم	۳۷۴
۲۸۲	حدیث شریف کی وضاحت اور مذاہب ائمہ	۳۷۵
۲۸۳	حدیث نمبر﴿۲۸۱۹﴾ادنیٰ شی بھی غصب ہے	۳۷۶
۲۸۴	حدیث نمبر﴿۲۸۲۰﴾غصب شدہ مال جس کے پاس ہو لے لے	۳۷۷
۲۸۵	حدیث نمبر﴿۲۸۲۱﴾لی ہوئی شی کو واپس کرنا ہوگا	۳۷۷
۲۸۶	حدیث نمبر﴿۲۸۲۲﴾اگر حیوان سے نقصان پہنچا ہو؟.....................	۳۷۸
۲۸۷	مسئلۃ الباب میں مذاہب ائمہ	۳۷۹
۲۸۸	حدیث نمبر﴿۲۸۲۳﴾غیر اختیاری نقصان پر ضمان نہیں	۳۷۹
۲۸۹	حدیث نمبر﴿۲۸۲۴﴾ضرورتِ شدیدہ کے وقت دوسرے کے جانور سے دودھ پینا	۳۸۰
۲۹۰	حدیث نمبر﴿۲۸۲۵﴾باغ سے پھل کھانے کا حکم........................	۳۸۲
۲۹۱	حدیث نمبر﴿۲۸۲۶﴾عاریۃ کا حکم...................................	۳۸۲
۲۹۲	مذاہب ائمہ	۳۸۳
۲۹۳	توجیہ الحدیث علی مسلک الحنفیۃ	۳۸۴
۲۹۴	حدیث نمبر﴿۲۸۲۷﴾کفیل ضامن ہے..................................	۳۸۴
۲۹۵	حدیث نمبر﴿۲۸۲۸﴾درخت سے گرے ہوئے پھلوں کا حکم	۳۸۵
	﴿الفصل الثالث﴾	
۲۹۶	حدیث نمبر﴿۲۸۲۹﴾زمین غصب کرنے پر وعید	۳۸۷

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	﴿الفصل الثالث﴾	
۳۱۵	حدیث نمبر﴿۲۸۴۱﴾حق شفعہ کس میں ہے؟............................	۴۰۶
	باب المساقات والمزارعت	
۳۱۶	(باغبانی اور کاشتکاری کا بیان)	۴۰۹
	﴿الفصل الاوّل﴾	
۳۱۷	حدیث نمبر﴿۲۸۴۲﴾ارض خیبر پر عقد ہونا برائے مزارعت..............	۴۱۰
۳۱۸	مزارعت کی تفصیل..	۴۱۱
۳۱۹	اہم اشکال اور اس کا جواب	۴۱۵
۳۲۰	حدیث نمبر﴿۲۸۴۳﴾مخابرہ درست نہیں	۴۱۶
۳۲۱	حدیث نمبر﴿۲۸۴۴﴾اجرت یا لگان پر زمین دینا..........................	۴۱۶
۳۲۲	حدیث نمبر﴿۲۸۴۵﴾مزارعت کی ایک ممنوع صورت	۴۱۷
۳۲۳	حدیث نمبر﴿۲۸۴۶﴾زمین کو عاریت پر دینا زیادہ بہتر ہے	۴۱۸
۳۲۴	حدیث نمبر﴿۲۸۴۷﴾زمین عاریت پر دینا	۴۱۹
۳۲۵	حدیث نمبر﴿۲۸۴۸﴾اگر زراعت جہاد سے مانع ہو تو؟	۴۲۰
	﴿الفصل الثانی﴾	
۳۲۶	حدیث نمبر﴿۲۸۴۹﴾غصب کردہ زمین پر کاشت کرنا..........................	۴۲۱
	﴿الفصل الثالث﴾	
۳۲۷	حدیث نمبر﴿۲۸۵۰﴾عقد مزارعت مباح ہے.............................	۴۲۳
	باب الاجارۃ	
۳۲۸	(اجارہ کا بیان)	۴۲۷
	﴿الفصل الاوّل﴾	
۳۲۹	حدیث نمبر﴿۲۸۵۱﴾اجارہ جائز ہے	۴۲۹

Jild-15

Jild-15

نمبرشمار	مضامین	صفحہ نمبر
	باب الوصایا	
۴۵۸	(وصیتوں کا بیان)	۵۹۹
	﴿الفصل الاول﴾	
۴۵۹	حدیث نمبر﴿۲۹۳۸﴾ وصیت تحریر کرنا	۶۰۱
۴۶۰	وصیت لکھنے کا حکم	۶۰۱
۴۶۱	حدیث نمبر﴿۲۹۳۹﴾ ایک تہائی تک وصیت کرسکتا ہے....................................	۶۰۳
	﴿الفصل الثانی﴾	
۴۶۲	حدیث نمبر﴿۲۹۴۰﴾ ایضاً....................................	۶۰۶
۴۶۳	وصیت سے متعلق بعض ضروری مسائل....................................	۶۰۷
۴۶۴	حدیث نمبر﴿۲۹۴۱﴾ وارث کے لئے وصیت نہیں	۶۰۸
۴۶۵	ایضاً	۶۱۰
۴۶۶	حدیث نمبر﴿۲۹۴۲﴾ ورثاء کو بذریعہ وصیت نقصان پہنچانا درست نہیں	۶۱۱
	﴿الفصل الثالث﴾	
۴۶۷	حدیث نمبر﴿۲۹۴۳﴾ وصیت اور تقویٰ....................................	۶۱۳
۴۶۸	حدیث نمبر﴿۲۹۴۴﴾ ایصال ثواب کا حکم....................................	۶۱۳
۴۶۹	حدیث نمبر﴿۲۹۴۵﴾ ورثاء کا حق نہ دیئے جانے پر وعید	۶۱۵
۴۷۰	عرض ضروری....................................	۶۱۶
	تمت وبالفضل عمت	

کتاب البیوع

خرید وفروخت کا بیان

رقم الحدیث: ۲۶۳۹؍ تا ۲۶۶۸؍

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کتاب البیوع

خرید وفروخت کا بیان

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی عملی زندگی کے دو محور ہیں:

اوّل:......''حقوق اللہ'' جن کو عبادات کہتے ہیں۔اور

دوم:......''حقوق العباد'' جن کو معاملات اور معاشرت کہا جاتا ہے۔

یہی دو اصطلاحیں ہیں جو انسانی نظام حیات کے تمام اصول وقواعد اور قوانین کی بنیاد ہیں۔

عبادات کی طرح معاشرت اور معاملات شریعت کے نہایت اہم ابواب ہیں، بلکہ ان میں ہدایات ربانی اور خواہشات نفسانی اور احکام شریعت اور دینوی مصلحت کی کشمکش عبادات وغیرہ دوسرے تمام ابواب سے زیادہ ہوتی ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ کی بندگی وفرمانبرداری اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی شریعت کی تابعداری کا جیسا امتحان ان میدانوں میں ہوتا ہے دوسرے کسی میدان میں نہیں ہوتا، اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے بنی آدم کو فرشتوں پر نوعی فضیلت حاصل ہوئی، ورنہ ظاہر ہے کہ ایمان ویقین اور ہمہ وقتی ذکر وعبادت اور روح کی لطافت وطہارت میں انسان فرشتوں کی برابری کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

لیکن چونکہ ''حقوق اللہ'' کو عمومیت حاصل ہے کہ اس کا تعلق انسان کے ہر فرد سے ہے، اس لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے ان کو بیان کیا، اس کے بعد ''حقوق العباد'' یعنی معاملات کا بیان شروع کیا ہے اور چونکہ لوگ آپس کے تنازعات کی آگ کو بجھانے میں اور نظام المعاش کے چلانے اور بقاء میں خرید وفروخت کی طرف زیادہ محتاج ہیں، اس لئے اس کی اہمیت کی وجہ سے ''بیع'' کو معاملات کا سب سے اہم جزء سمجھ کر دیگر معاملات سے اس کو مقدم کیا گیا۔(معارف الحدیث: ۶/۱۸، مظاہر حق: ۳/۲۷)

پھر چونکہ شہوت بطن مقدم ہوتی ہے شہوت فرج پر، نیز شہوت فرج کی ضرورت پیش آتی ہے بلوغ کے بعد اور شہوت بطن کی ضرورت دنیا میں آنے کے بعد سے ہی پیش آجاتی ہے، اس لئے نکاح پر اس کو مقدم کیا۔

بیع کے لغوی و شرعی معنی

لفظ "بیع" کے معنی ہیں: بیچنا۔ یعنی فروخت کرنا اور لفظ "شراء" کے معنی ہیں خریدنا لیکن یہ دونوں الفاظ اضداد کی قبیل سے ہیں، یعنی ایک دوسرے کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، کیونکہ ثمن اور مثمن دونوں میں "مبیع" بننے کی صلاحیت ہے، اس لئے "بیع" کا ترجمہ اصطلاحی طور پر "خرید و فروخت" سے کیا جاتا ہے اور لغوی اعتبار سے مطلب اس کا صرف "مبادلة المال بالمال" [مال کا مبادلہ مال سے۔] ہے۔

جبکہ شریعت کی اصطلاح میں "مبادلة المال بالمال علی سبیل التراضی" [مال کا مبادلہ مال سے باہمی رضامندی کے طریقہ پر۔] کو بیع کہا جاتا ہے، لیکن تراضی شرعی معتبر ہے، لہٰذا اگر متعاقدین کسی غیر شرعی عقد پر راضی ہوں تو اس کا اعتبار نہیں۔

بیع کے ارکان و شرائط اور حکم

بیع کا رکن "ایجاب اور قبول" ہے، شرط "اہلیت متعاقد" ہے، محل "مال" ہے اور حکم "بیع کے تام ہونے کے بعد مشتری کیلئے ملک کا ثابت ہونا ہے۔" (عمدة القاری: ۱۵۹/۱۱، مرقاة: ۳۱/۶)

بیع کی مشروعیت

"بیع" کی حلت قرآن کریم کی آیت "وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (البقرہ: ۲۷۵) [حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔] سے صراحةً ثابت ہے، دیگر آیات میں بھی یہ مذکور ہے، مثلاً: "وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" (النباء: ۱۱) [اور دن روزی حاصل کرنے کا وقت ہم نے قرار دیا۔] چنانچہ دن کو معاش کے لئے مقرر کرنے کا ذکر بطور احسان کے کیا جا رہا ہے اور معاش کا

ذریعہ بننا بیع وشراء پر موقوف ہے وغیرہ ذلک۔ اور حدیث شریف سے بھی ثابت ہے، چنانچہ حضور اکرم ﷺ جب مبعوث ہوئے تو لوگ بیع وشراء کا عمل کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کو اسی حالت پر برقرار رکھا اور بیع وشراء کے جواز پر تمام علمائے امت کا اجماع بھی ہے۔

پھر عقلی لحاظ سے بھی جواز وحلت ضروری ہے، کیونکہ انسان مدنی الطبع ہے، اگر ''بیع'' جائز نہ ہو اور سبب تملیک نہ ہو تو مکلفین کی بقاء یا تو اس طریقے سے ہوگی کہ ہر ایک اپنی تمام حاجات خود سرانجام دیگا۔ خوراک، لباس، اور دیگر تمام اشیاء ضرورت از خود پیدا کرے گا۔ مثلاً: کھیتی باڑی کرنا، پھر اس کی دیکھ بھال کرنا اور فصل کے بعد اس کو صاف کر کے غلہ حاصل کرنا، آٹا بنانا اور روٹی تیار کرنا وغیرہ، اسی طرح لباس وغیرہ کی تیاری تک خود ہر مرحلے سے گذرے گا اور ظاہر ہے کہ یہ تمام امور اس طرح ممکن نہیں اور یا دوسرے کا مال خریدے بغیر زبردستی لیا جائے یا بذریعہ سوال لے گا اور یا پھر فاقہ کرے گا، یہاں تک موت واقع ہو اور ظاہر ہے کہ یہ تمام صورتیں فاسد ہیں۔ لہٰذا ''بیع'' کا جائز وحلال ہونا بقاء ''مکلفین'' کے لئے ضروری ہے۔ (مرقاۃ: ۳۱/۶، عمدۃ القاری: ۱۵۹/۱۱)

بیع کی بنیادی چیزیں اور اقسام

''بیع'' میں بنیادی طور پر تین چیزیں ہوتی ہیں:

(۱)......عقد بیع یعنی نفس معاملہ کہ ایک شخص کوئی چیز فروخت کرتا ہے دوسرا اسے خریدتا ہے۔

(۲)......مبیع جس چیز کو فروخت کیا جاتا ہے۔

(۳)......ثمن یعنی ''قیمت''

ان تینوں کے اعتبار سے فقہی اصطلاح میں ''بیع'' کی مختلف اقسام ہیں، چنانچہ نفس معاملہ اور اس کے حکم (کہ بیع صحیح ہوئی یا نہیں ہوئی) کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں ہیں:

(۱)......نافذ۔ (۲)......موقوف۔ (۳)......فاسد۔ (۴)......باطل۔

''مبیع'' یعنی فروخت کی جانے والی چیز کے اعتبار سے بھی ''بیع'' کی چار قسمیں ہیں:

(۱)......مقایضہ۔ (۲)......صرف۔ (۳)......سلم۔ (۴)......بیع مطلق۔

اور "ثمن"، یعنی قیمت کے اعتبار سے بھی "بیع" کی چار قسمیں ہیں:

(۱)......مرابحہ۔ (۲)......تولیہ۔ (۳)......وضعیہ۔ (۴)......مساومہ۔

بیع مرابحہ: وہ بیع ہے جو ثمن اول سے زائد کے ساتھ ہو۔

بیع تولیہ: وہ بیع ہے جو ثمن اول کے ساتھ ہو۔

بیع وضعیہ: اس کو کہتے ہیں کہ بائع نے جس قیمت پر مبیع کو خریدا ہے اس سے کم پر فروخت کرے۔اور

بیع مساومہ: اس کو کہتے ہیں جس میں بائع کی خرید یعنی ثمن اول کا کوئی لحاظ نہ ہو، بلکہ دونوں رضامندی سے جو قیمت چاہیں متعین کریں۔

یہ تمام اقسام جائز ہیں اور شرائط جواز ان میں موجود ہے۔(البحر الرائق:۶/۱۰۷،باب المرابحۃ والتولیۃ)

لفظ بیع کبھی مصدر مبنی للمفعول کے طور پر مستعمل ہوتا ہے، اس لئے اس کی جمع لائی جاتی ہے اور کبھی معنی مصدری ہی مراد ہوتے ہیں اور جمع سے اس کی انواع کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔(مرقاۃ:۶/۳۱، البحر الرائق:۵/۲۶۱،کتاب البیوع)نفحات التنقیح:۳/۳۹۶۔

دین میں معاملات کی درستگی کی اہمیت

ہمارا دین یعنی دین اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ عبادات، معاملات، معاشرات، اخلاقیات کے مجموعہ کا نام ہے، بغیر معاملات کی درستگی کے آدمی دیندار یا صوفی وزاہد نہیں ہوسکتا، چنانچہ "تعلیم المتعلم"، میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عرض کیا: "الا تصنف کتابا فی الزھد" [کہ آپ زہد وتصوف میں کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے؟] تو انہوں نے جواب دیا: "قد صنفت کتابا فی البیوع" [کہ میں مسائل بیوع پر کتاب لکھ چکا ہوں۔] بظاہر جواب سوال کے مطابق نہیں تھا، اسی لئے سائل نے دوبارہ سوال کیا، انہوں نے پھر وہی جواب ارشاد فرمایا، تین بار ایسا ہی ہوا، ہر بار وہ یہی فرماتے رہے کہ میں بیوع میں کتاب لکھ چکا ہوں، گویا امام صاحب نے اس طرف اشارہ فرمایا: کہ بغیر بیوع اور معاملات کی درستگی کے آدمی صوفی اور زاہد نہیں بن سکتا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے

اس قصہ کی تائید امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے صنیع سے بھی ہوتی ہے، اس لئے کہ انہوں نے کتاب البیوع کے شروع میں سب سے پہلے جو باب باندھا ہے وہ یہ ہے "باب ماجاء فی ترک الشبهات" اور پھر اس میں یہ مشہور حدیث مرفوع ذکر فرمائی ہے۔ "الحلال بین والحرام بین وبین ذلک امور مشتبهات لایدری کثیر من الناس امن الحلال هی ام من الحرام فمن ترکها استبراء لدینه وعرضه فقد سلم الحدیث قال ابو عیسی هذا حدیث صحیح۔ قلت هو متفق علیه اخرجه البخاری ومسلم" (الدر المنضود: ۵/۳۲۷)

اسلاف کرام نے تجارت کو بہت زیادہ پسند فرمایا اور اس کو اختیار بھی فرمایا ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کبارِ صحابہ مہاجرین رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، وہ بڑے تاجر تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجارت میں برکت کی دعا فرمائی، کپڑے کے بڑے تاجر تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کبار محدثین میں ہوئے ہیں، وہ بھی بڑے تاجر تھے، جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز نہ ہوئے تھے بڑے تاجر تھے، کپڑے کی تجارت تھی۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ تجارت میں برکت ہے، وہ اسی وقت تک ہے جب کہ صدق اور امانت کے ساتھ اور شرعی اصول پر مبنی ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان تھا: "جاہل لوگ ہمارے بازاروں میں تجارت نہ کریں۔" چنانچہ وقتاً فوقتاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار میں تشریف لاتے اور بعض جاہل تاجروں کو درے سے سزا بھی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے بازاروں میں صرف وہی لوگ خرید و فروخت کریں جن کو تجارت کے شرعی احکام کا علم ہو۔ (احیاء العلوم اردو: ۱۷۰، قسط: ۳)

کسب معاش

اہل علم کا قول ہے کہ "کسب الحلال اصل الورع واساس التقوی" (التعلیق: ۳/۲۹۴)
[حلال روزی حاصل کرنا پرہیزگاری کی اصل اور تقویٰ کی بنیاد ہے۔

انسانی زندگی میں خالق ارض وسماوات نے اوقات کی تقسیم کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:
"وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً" [اور بنایا ہم نے دن کو معاش کے لئے۔] وقال تعالیٰ: "وَجَعَلْنَا لَكُمْ

فِیْهَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَا تَشْكُرُوْنَ" (پ:۸) [اور اس میں تمہارے لئے روزی کے اسباب پیدا کئے (پھر بھی) تم لوگ شکر کم ہی ادا کرتے ہو۔]

قرآن کریم کی آیات میں رزق و معاش کو فضل رب فرمایا ہے: قَالَ تَعَالٰی: "فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللہِ" (سورۃ الجمعۃ) [زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔]

اللہ تعالیٰ نے اسبابِ معاش زمین کے مختلف حصوں میں پھیلائے ہوئے ہیں، لہٰذا جس کو جس جگہ سے اپنی معاش حاصل ہونے والی ہے، اس کے لئے مباح قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ زمین میں پھیل جاؤ اور فضل اللہ کو حاصل کرو، تلاش کرو۔ سمندری سفر کرنا ہے یا کہ خشکی کا سفر، قرآن کریم میں اجازت واباحت فرمائی ہے: "وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ الخ" (پ:۲۹) [اور کچھ دوسرے ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے کے لئے زمین میں سفر کر رہے ہوں گے۔] کسب حلال اور طلب حلال کے لئے بہت سے اسباب اور وسائل پیدا فرمائے اور پھر بندوں کو ان تمام اقسام کی جانب مائل فرمایا ہے۔

کسب معاش اور کسب حلال

قرآن اور احادیث میں کسبِ معاش اور کسبِ حلال کی تاکید ہے، ایک حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرَائِضِ" (مشکوۃ) [حلال روزی طلب کرنا فرائض کے بعد اہم ترین فریضہ ہے۔]

اس ارشاد نبوی ﷺ میں کسب معاش اور کسب حلال کی اہمیت کا بیان ہے کہ اس کو فرض قرار دیا گیا ہے، اور جب اس کو فرض کا درجہ دیا گیا ہے تو یقیناً وہ طاعت اور عبادت کے زمرے میں بھی آئے گا۔

بہرحال اہل علم نے کسب معاش کو تین اقسام پر تقسیم فرمایا ہے:

(۱)......مباح۔ (۲)......فرض۔ (۳)......مستحب۔

قرآن اور حدیث نے ان امور کو بہت تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ کسب محض نہیں، بلکہ

’’کسبِ حلال‘‘ مطلوب ہے، اور حلال وہ ہے جس کو قرآن اور حدیث نے حلال قرار دیا ہے، اور قرآن وسنت کے اصولوں پر جو حاصل ہوگا وہی قانونِ الٰہی میں حلال ہوسکتا ہے، اور جو اس کے خلاف ہے وہ حلال نہیں ہوگا۔

کسب اور اکتساب کے معنی حاصل کرنا، کمائی، محنت اور جد و جہد کرنا ہے، نیز دست و بازو کی محنت سے حاصل کردہ اسبابِ معاش۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

شریعتِ اسلامیہ کے احکام ومسائل اور قانونِ زندگی دو رہنما اصولوں پر مبنی ہیں:

(۱)……جن کا تعلق عبادات سے ہے۔

(۲)……اور جن کا تعلق معاملات سے ہے۔

نیز اسی کو اس طرح بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ (۱) حقوق اللہ۔ اور (۲) حق العبد، حقوق العباد۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل نہ حقوق اللہ کی وقعت تھی اور نہ حقوق العباد کا کوئی تصور تھا، اس لئے کہ تقریباً تمام دنیا جہالت سے قریب تر تھی، جس کو عہد جاہلیت سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے عبادات کی حقیقت سے بھی باخبر فرمایا۔ اور عبادات کے احکام ومسائل کی بھی تعلیم ارشاد فرمائی، اور اسی طرح حقوق العباد سے بھی متعارف کرایا، اور اس کے احکام ومسائل بھی تفصیل کے ساتھ ارشاد فرمائے اور جملہ اقسام معاملات کے اصول وضوابط بیان فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی بہت زیادہ تاکید فرمائی۔

حقوق العباد اور معاملات میں ایک اہم ترین شعبہ تجارت اور کسبِ معاش کا ہے، کسبِ معاش کے بعض اسباب اور ذرائع ہیں ان سب کو واضح عبارات کے ساتھ امت کے سامنے پیش فرمایا۔ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی انہیں اصولوں پر تربیت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی انہیں اصولوں پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام امت اسلامیہ اسی کو اختیار کرے۔ وباللہ التوفیق۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب الکسب وطلب الحلال

کمائی اور حلال رزق کا بیان

﴿الفصل الاول﴾

کما کر کھانا سنت انبیاء علیہم السلام ہے

{۲۶۳۹} **وَعَنِ** الۡمِقۡدَادِ بۡنِ مَعۡدِیۡ کَرِبَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيۡرًا مِنۡ اَنۡ يَّأۡكُلَ مِنۡ عَمَلِ يَدَيۡهِ وَاِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَيۡهِ السَّلَامُ كَانَ يَأۡكُلُ مِنۡ عَمَلِ يَدَيۡهِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۷۸، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ، حدیث نمبر: ۲۰۲۵۔

ترجمہ: حضرت مقداد بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبھی کسی نے اپنے ہاتھ کی محنت کی روزی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا۔ اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ

کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے دست بازو کی کمائی سے کھاتے تھے۔

تشریح: کما کر کھانا سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ چنانچہ روایت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے گذر اوقات کرتے، وہ ہاتھ سے زرہ بنا کر فروخت کرتے۔ پس مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کا طریقہ اپنائیں۔ روایات میں وارد ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے زمانہ بادشاہت میں رات کو بھیس بدل کر حالات معلوم کرتے اور لوگوں سے دریافت کرتے کہ داؤد کیسا حکمراں ہے؟ اس کی عادات کیسی ہیں؟ تمہارے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے؟ ایک دن اسی طرح گشت کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو آدمی کی صورت میں بھیجا۔ آپ نے اس سے یہی باتیں دریافت کیں۔ اس نے کہا: داؤد بہت خوب آدمی ہے۔ مگر بیت المال سے اپنا وظیفہ لیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اور زیادہ مناسب تھا، حضرت داؤد علیہ السلام جب واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اے میرے پروردگار مجھے بیت المال سے بے نیاز کردے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو شرفِ قبولیت سے سرفراز فرما کر زرہ بنانے کا طریقہ سکھا دیا۔ اور لوہے کو ان کے لئے موم کی طرح کر دیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر جدھر چاہتے موڑ لیتے۔ وہ زرہ بناتے اور اسے چار ہزار درہم میں فروخت کرتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہر روز ایک زرہ بناتے تھے اور اس کو چھ ہزار درہم میں فروخت کرتے۔ ان میں سے دو ہزار درہم اپنے اہل وعیال کے خرچ کے لئے رکھ لیتے اور باقی چار ہزار درہم فقراء بنی اسرائیل پر خرچ کر دیتے۔

فائدہ: اس روایت میں کسب حلال کی ترغیب دی گئی ہے۔ کسب حلال عظیم الشان فوائد پر مشتمل ہے۔ کسب حلال کا فائدہ جہاں کمانے والے کی ذات کو پہنچتا ہے، وہاں دوسرے لوگ بھی اس کے فوائد سے محروم نہیں رہتے۔ اس حلال ذریعہ رزق میں مشغولیت کی وجہ سے لہو ولعب اور بہت سی بری محافل سے انسان بچ جاتا ہے۔ اور ہاتھ سے کمانے کی بناء پر اس میں کسر نفسی اور عاجزی پیدا ہو کر نفس کا غرور اور سرکشی دم توڑ جاتی ہے۔ ہاتھ کی کمائی کی برکت سے وہ ذلت سوال سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور کسی کی احتیاج بھی نہیں رہتی۔

انسانوں کے لئے معاشیات

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اسبابِ معاش پیدا فرما کر اس کو مکلف فرمایا ہے کہ وہ حسب قدرت محنت ومشقت برداشت کرتے ہوئے ان اسباب کو اختیار کرے اور اس کے لئے خاص طور پر ترغیب کے ساتھ متوجہ فرمایا ہے۔ قَالَ تَعَالیٰ: "وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ" (الاعراف:۱۰) [اور کھلی بات ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں رہنے کی جگہ دی، اور اس میں تمہارے لئے روزی کے اسباب پیدا کئے (پھر بھی) تم لوگ شکر کم ہی ادا کرتے ہو۔]" وَقَالَ تَعَالیٰ: "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا" (البقرہ:۲۹) [وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔]

حلال مال کھانے کی فضیلت اور حرام مال سے بچنے کا اثر

{۲۶۴۰} **وَعَنْ** اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا وَاِنَّ اللهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ فَقَالَ: يَا اَيُّهَا الرُّسُلُ! كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا، وَقَالَ تَعَالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْ مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَا كُمْ، ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱/۳۲۶، کتاب الزکوۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔ حدیث نمبر: ۱۰۰۵۔

حل لغات: اشعث: بالوں کا پراگندہ ہونا۔ اغبر: گرد آلودہ ہونا، کہ سفر کی یہ دو خاص حالتیں ہیں۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ پاک اور (منزہ) ہیں (ہر عیب سے) پاکیزہ (اور حلال) کے علاوہ قبول نہیں فرماتے اور بالیقین اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اہل ایمان کو اس چیز کا جس کا رسولوں کو حکم فرمایا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ آیت) "یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ الخ" یعنی اے رسولو! کھاؤ حلال اور پاکیزہ رزق میں سے اور نیک عمل کرو اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو کھاؤ ان پاکیزہ اور حلال چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: کہ ایک شخص ہے جو طویل سفر کرتا ہے (اس کے) بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں، آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے (کہتا ہے) اے میرے رب! اے میرے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام اور اس کا پینا حرام اور اس کا لباس حرام، اور حرام سے ہی غذا دیا گیا تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو۔

تشریح: الطیب: یہ ضد ہے "خبیث" کی اور جب اللہ تعالیٰ اس وصف کو بیان فرماتے ہیں تو اس سے مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ "نقائص" سے پاک ہو، اور مقدس ہو آفات سے، اور جب بندہ کے ساتھ اس وصف کو ذکر کیا جائے تو اس سے مقصود اخلاقِ رذیلہ سے (بندہ) پاک اور صاف ہو اور خصائل محمودہ کے ساتھ آراستہ ہو، اور مال کے حق میں طیب ہونا کہ وہ حلال ہو اور عمدہ ترین صاف وستھرا ہو ہر قسم کی کراہت سے، لہٰذا کسب معاش میں اس حقیقت شرعیہ کا مکمل خیال رکھے، اور مالِ حرام کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

چنانچہ اس کی ایک مثال دی گئی ہے: کہ ایک شخص حج یا اور عبادات کے لئے طویل سفر اختیار کرتا ہے وہ ان مقامات مقدسہ تک پہنچنے میں پوری مشقت اور جدوجہد کرتا ہے، جہاں مانگی جانے والی دعا باب قبولیت تک پہنچتی ہے، اور وہ وہاں پہنچ کر اس حال میں دست سوال اٹھاتا ہے کہ سفر کی مشقت وطوالت کی وجہ سے اس کے بال پراگندہ ہیں، پورا جسم گردوغبار سے آلودہ اور تضرع والحاح کی پوری کیفیت اس پر طاری ہے، غرضیکہ قبولیت دعا کے تمام آثار موجود ہیں، مگر اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی، اس لئے کہ جاننے والا جانتا ہے کہ وہ حرام مال سے پرہیز نہیں کرتا۔ یہ ہے اثر حرام مال کا۔ چنانچہ محاورہ مشہور ہے: کہ دعا کے دو بازو ہیں: (۱) رزق حلال۔ (۲) صدق مقال۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب خود پاک ہے اور حلال رزق کو اس کی جناب پاک میں اس وجہ سے ایک نسبت حاصل ہے کہ حلال رزق بھی حرمت کی نجاستوں سے پاک ہوتا ہے، تو تقاضائے عبودیت یہی ہے کہ بندہ حلال ہی رزق کھائے تا کہ پاک وحلال رزق کی وجہ سے اس بندہ کو بارگاہ خداوندی میں تقرب کی دولت حاصل ہو۔

زمانۂ بد کے آنے کی پیش گوئی

{۲۶۴۱} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ۔ (رواه البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۷۶، کتاب البیوع، باب من لم یبال من حیث کسب المال، حدیث نمبر: ۲۰۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ (اس میں) انسان پرواہ نہیں کریگا جو مال لے رہا ہے کیا وہ حلال ہے یا حرام۔

تشریح: قربِ قیامت کے وقت علم اور عمل نہ ہوگا، مال کی محبت غالب ہوگی، اور مال کا محتاج تر رہے گا، حلال اور حرام کا امتیاز نہ رہے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پیش گوئی آج کے زمانہ پر پوری طرح منطبق ہے، آج کتنے ایسے لوگ ہیں جو حلال وحرام مال کے درمیان تمیز کرتے ہیں، ہر شخص مال وزر بٹورنے کی ہوس میں مبتلا ہے، مال حلال ہے یا حرام اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، بس ہاتھ لگنا چاہئے کسی نے خوب کہا ہے:

ہر چہ آمد بدہان شاں خورند
وآنچہ آمد بزبان شاں گفتند

[ان کے منہ میں جو آجائے کھالیتے ہیں۔ اوران کی زبان پر جو آجائے بول دیتے ہیں۔]

مشتبہ چیزوں سے بچنا

{۲۶۴۲} **وَعَنِ** النُّعْمَانِ ابْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِيْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَرْتَعَ فِيْهِ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اِلَّا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱۳/۱، کتاب الایمان، باب فضل من استبراءلدینہ، حدیث نمبر: ۵۲، مسلم شریف: ۲۸/۲، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات، حدیث نمبر: ۱۵۹۹۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حلال ظاہر ہے اور حرام (بھی) ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں، جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص مشتبہ امور سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو پاک (اور محفوظ) کرلیا، اور جو شخص مشتبہ امور میں مبتلا ہوگیا تو وہ حرام میں مبتلا ہوگیا، اس چرواہے کی طرح جو کہ چراگاہ کے قریب چراتا ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ چراگاہ میں چرائے، خبردار! ہر بادشاہ کی چراگاہ ہے، خبردار! یقیناً اللہ تعالیٰ کی (خاص) چراگاہ (یعنی حد جو اس نے مقرر کی ہے) اس کی حرام (کردہ چیزیں) ہیں، خبردار! یقینا جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہے تو تمام جسم درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو اس کا تمام جسم بگڑ جائے گا، یاد رکھو! وہ دل ہے۔

تشریح: علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث بڑی عظمت والی ہے اور بڑے وسیع خزانے کی حامل ہے اور ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کا مدار ہے، حتی کہ ایک جماعت نے اس کو ثلث الاسلام کہا ہے اور کہتے ہیں کہ جن حدیثوں پر شرائع واحکام کا

مدار ہے وہ تین ہیں:

ایک تو: "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" [بلا شبہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔]

دوسری: "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ" [انسان کے اسلام کا حسن اس کا لایعنی چیزوں کو چھوڑ دینا ہے۔]

اور تیسری: یہی حدیث ہے: "اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ" [حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام بھی کھلا ہوا ہے۔]

جبکہ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اسلام کا مدار چار حدیثوں پر ہے، تین تو یہی مذکور احادیث ہیں اور ایک حدیث "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ" [تم میں کوئی مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ جو اپنے لئے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرے۔]

اس حدیث شریف کی عظمت کی یہ توجیہ بتائی گئی ہے کہ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے، پینے، لباس اور نکاح وغیرہ اعمال کی درستگی پر تنبیہ فرمائی ہے اور معرفت حلال کی طرف رہنمائی کرکے یہ بتلا دیا کہ طریقہ معاش میں شبہات کو چھوڑ کر حلال طریقہ اختیار کرنا چاہئے، کیونکہ یہی طریقہ انسان کی آبرو اور دین کی حفاظت کا سبب ہے اور اس حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شبہات میں پڑنے سے ڈرایا اور پھر اس کی وضاحت محسوس کے ساتھ تشبیہ دے کر بیان فرمائی، پھر سب سے اہم چیز یعنی دل کی نگرانی کا ذکر فرمایا۔

علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صرف اسی ایک حدیث شریف سے دین کے تمام احکام کا استنباط ہوسکتا ہے۔

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ حدیث مذکور حلال وحرام کی تفصیل پر مشتمل ہونے کے ساتھ اس بات پر بھی مشتمل ہے کہ تمام اعمال کا تعلق دل سے ہے، جس کی وجہ سے تمام اعمال اسی حدیث شریف کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (عمدۃ القاری: ۱/۲۹۷)

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ فی نفسہٖ تو تمام احکام باری تعالیٰ کی طرف سے واضح ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس میں

اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو اور اس پر کوئی دلیل اور بیان نہ ہو، لیکن بیان دو قسم کا ہے:

ایک بیان جلی ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں اور ایک بیان خفی ہے جس کو خاص علماء کے بغیر دوسرے لوگ نہیں جانتے، اس خفاء اور پوشیدگی کی وجہ سے جو امور لوگوں پر مشتبہ ہو گئے ہیں ان میں توقف کرنا چاہیئے، اور شک سے بچنا چاہیئے تا کہ بصیرت کے بغیر اس مشکوک چیز پر اقدام نہ ہو، کیونکہ بیان اور وضاحت سے پہلے اگر اقدام کرے گا تو حرام میں واقع ہونے کا خطرہ رہے گا، جیسا کہ ممنوعہ چراگاہ کی منڈیر پر چرانے سے ممنوعہ علاقے میں واقع ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ (معالم السنن: ۶/ ۵)

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ یہ امور اضافی طور پر مشتبہ "اشتباہ میں ڈالنے والے" ہیں، یعنی بنسبت ان لوگوں کے جو بیان خفی کو نہیں سمجھتے، البتہ تمام لوگوں کے اعتبار سے مشتبہ نہیں، چنانچہ سیاق حدیث "لا یعرفھا کثیر من الناس" [اکثر لوگ اس کو نہیں پہچانتے۔] سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ جانتے ہیں اور جب بعض لوگ جانتے ہوں گے تو فی نفسہ ان کو مشتبہ نہیں کہا جائے گا۔

اور ان "مشتبہات" سے بچنے کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک بیان اور وضاحت نہ ہو جائے اس وقت تک بصیرت کے بغیر ان چیزوں پر اقدام نہ ہو، البتہ وضاحت کے بعد کوئی مضائقہ نہیں۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ "مشتبہات" سے مراد امور اجتہادیہ ہیں، جن میں ادلّہ حلت وحرمت متعارض ہوں، اب جب مجتہد نے اجتہاد کے ذریعہ سے دلیل شرعی کی روشنی میں اس چیز کو حلال یا حرام کے ساتھ ملحق کیا تو اس اجتہاد میں چونکہ خطاء اور غلطی کا امکان ہے اور یہ کوئی نص اور اجماع نہیں، اس لئے تقویٰ کی رو سے اس چیز سے بچنا چاہیئے نہ کہ فتویٰ کے لحاظ سے۔

علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشتبہات سے مراد امور مکروہہ ہیں اور حدیث کا مقصود مکروہات سے بچنے پر برانگیختہ کرنا ہے، کیونکہ بہت سارے لوگ یہ گمان کرتے ہوئے کہ یہ حرام نہیں مکروہات کے ارتکاب کی پرواہ نہیں کرتے تو حدیث میں ان کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ان کا یہ عمل محرمات کے ارتکاب کی طرف مفضی ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ مشتبہات سے مراد وہ مباح امور ہیں جن سے بچنا تقویٰ کے

اعتبار سے بہتر ہے۔ حضور اقدس ﷺ اور حضرات خلفاء کرام اور اکثر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مباح امور سے بھی بچتے تھے، چنانچہ انہوں نے نہ اچھے کھانوں کا، نہ نرم لباس کا اور نہ اچھے مکانات میں رہنے کا التزام کیا، بلکہ ان حضرات نے عیش پرستی کے تمام اضداد کو اختیار کیا تھا، جیسا کہ ان کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱/۳۰۲، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ الدینہ)

دراصل حدیث کا اجمالی مقصد مشتبہ چیزوں سے بچنا اور پرہیز کرنا ہے تاکہ حرام میں واقع ہونے سے محفوظ ہو جائیں اور یہ مطلب تمام توجیہات سے واضح ہے، ورنہ اس معنی سے قطع نظر کر کے اگر ہر توجیہ کو الگ لیا جائے تو آخری دو توجیہ ضعیف ہیں، اس لئے کہ ظاہر ہے مباح اور مکروہ مشتبہات کے قبیل سے نہیں ہیں۔ پھر اشتباہ سے بچنے کی مختلف صورتیں ہیں، کیونکہ یا تو اشتباہ عام آدمی کو ہوا ہے یا مجتہد کو، اگر عام آدمی کو اشتباہ ہوا ہے اس حکم کو نہ جاننے کی وجہ سے اور مجتہد سے سوال نہ کرنے کی وجہ سے اس صورت میں بچنا واجب ہے اور اگر اشتباہ اختلاف علماء اور اہل فتویٰ کی وجہ سے ہوا اور کسی ایک صورت کو دوسری پر علم وتقویٰ کے لحاظ سے ترجیح نہ دی جا سکتی ہو تو اس صورت میں بچنا مستحب ہے۔

اور اگر اشتباہ مجتہد کو اجتہاد نہ کرنے کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کا حکم بھی عام آدمی کی طرح ہے، یعنی بچنا واجب ہے، اور اگر اجتہاد کے بعد اشتباہ ہوا ہے تعارض ادلہ کی وجہ سے کہ ان میں سے کسی دلیل کو دوسری دلیل پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تو اس صورت میں بھی بچنا واجب ہے، اس لئے کہ حلت وحرمت کے احتمال کے برابر ہونے کی صورت میں محرم کو مبیح پر ترجیح ہوتی ہے۔

اور اگر تعارض ادلہ کے ساتھ اباحت کی ترجیح حرمت پر ثابت ہو جائے تو اس وقت احتمال خطاء کی بنا پر بچنا استحباب کے درجے میں ہوگا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۱/۶۲۳)

فمن اتقی الشبھات استبرأ لدینہ وعرضہ: [جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا۔] یعنی مشتبہ چیزوں سے بچنے والے کو نہ تو دین میں کسی خرابی کا خوف رہے گا اور نہ کوئی اس پر طعن وتشنیع کرے گا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کی منڈیر پر جانور چراتا ہے۔

حرام میں واقع ہونے کی دو توجیہ کی گئی ہیں:

(۱)……ایک تو یہ کہ جب آدمی کی عادت مشتبہ چیزوں سے نہ بچنے کی ہو تو اس عادت کی وجہ سے گناہوں سے اجتناب کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور دینی امور میں لاپرواہی کی وجہ سے حرام جاننے کے باوجود حرام میں واقع ہو جاتا ہے۔

یا یہ کہ مشتبہ امور میں کثرت وقوع کی وجہ سے اس کے دل میں ظلمت اور تاریکی آ جاتی ہے اور علم وتقویٰ کی نورانیت ختم ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ حرام میں واقع ہو جاتا ہے اور اس کو اس فعل کی حرمت کا شعور تک نہیں ہوتا۔

(۲)……دوسری توجیہ یہ ہے کہ جب آدمی پر کوئی حکم کسی مسئلہ میں مشتبہ ہو جائے اور وہ پوچھنے اور تحقیق کے بغیر اس کا ارتکاب کرے تو ہو سکتا ہے کہ نفس الامر میں وہ فعل حرام ہو، اس بنیاد پر "وقوع فی الشبہۃ" کو "وقوع فی الحرام" فرمایا گیا۔ (عمدۃ القاری: ۱/۳۰۱)

اس ارشاد گرامی میں حرام چیزوں کو ممنوعہ چراگاہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کوئی حاکم کسی خاص چراگاہ کو دوسروں کے لئے ممنوع قرار دے دیتا ہے اور دوسرے لوگ اپنے جانوروں کو اس ممنوعہ چراگاہ سے دور رکھتے ہیں، اسی طرح جو چیزیں شریعت نے حرام قرار دی ہیں وہ لوگوں کے لئے ممنوع ہیں، ان کے ارتکاب سے اجتناب واجب ہے اور مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہونے کو ممنوعہ چراگاہ کی منڈیر پر عام جانور چرانے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح چرواہے کے لئے ضروری ہے کہ ممنوعہ چراگاہ سے بچنے کے لئے جانور دور چرائے، کیونکہ اگر ممنوعہ چراگاہ کی منڈیر پر چرائے گا تو جانوروں کا ممنوعہ چراگاہ میں گھسنے کا ہر وقت احتمال رہے گا اور گھسنے کی صورت میں اسے مجرم قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح انسان کو چاہئے کہ وہ مشتبہ چیزوں سے دور رہے تاکہ محرمات میں مبتلا نہ ہو جائے، اس تشبیہ کی وضاحت میں آنحضرت ﷺ فرما رہے ہیں کہ ہر بادشاہ کا ایک ایسا ممنوعہ علاقہ ہوتا ہے جس میں جانور چرانا جرم سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ رب العزت کا ممنوعہ علاقہ حرام چیزیں ہیں کہ جن میں مبتلا ہونا لوگوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا ہے، لہٰذا جو کوئی اس ممنوعہ علاقہ میں داخل ہوگا، یعنی حرام چیزوں کا ارتکاب کرے گا اسے مستوجب عذاب قرار دیا جائے گا، تمثیل مذکور میں خاص طور سے چراگاہ کا ذکر اس وجہ سے آیا ہے کہ زمانہ

جاہلیت میں عرب کے بادشاہ اپنے لئے خاص علاقے مخصوص کرتے تھے تو حضور اقدس ﷺ نے ایسی چیز کو مثال میں ذکر کیا جو ان کے نزدیک مشہور تھی۔ (عمدۃ القاری: ۱/۳۰۲)

محدث العصر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ محمود بالمذموم کے قبیل سے ہے، یعنی بادشاہ کا کسی علاقہ کو اپنے لئے خاص کرنا اور اس علاقہ کی گھاس کو جانوروں کے چرنے سے روک کر ممنوعہ چراگاہ قرار دینا درست نہیں تو اس مذموم کے ساتھ محمود کو تشبیہ دی گئی اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث سے استنباط کیا جائے اور بادشاہ کے لئے اس کو جائز قرار دیا جائے، کیونکہ تشبیہات سے اخذ مسائل اور استنباط احکام صحیح نہیں، اسی وجہ سے ہمارے نزدیک بادشاہ اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر کسی علاقہ کو خاص نہیں کرسکتا، البتہ امام مصالح المؤمنین کے پیش نظر اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی علاقہ کو خاص کردے اور ممنوعہ علاقہ قرار دے، جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تہام "ربضة" کو خیل الجہاد کے لئے مختص کیا تھا۔ (فیض الباری: ۱/۱۵۴)

واضح رہے کہ حدیث شریف میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بدن کی بھلائی بہترین حلال غذا پر موقوف ہے، کیونکہ حلال غذا سے دل کو صفائی حاصل ہوتی ہے اور دل کی صفائی ہی سے تمام بدن اچھی حالت میں رہتا ہے، بایں طور کہ برائی کی طرف کوئی عضو مائل نہیں ہوتا اور ایک ایک عضو سے اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں۔

(فیض الباری: ۱/۱۵۴، کتاب الایمان، باب فضل من استبر الخ، نفحات التنقیح: ۳/۳۹۹)

دو حدیثوں میں تعارض اور ان کا جواب

یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے کہ "ابوداؤد" کے "کتاب الاطعمة" کے اخیر میں "باب مالم یذکر تحریمہ" کے اندر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس طرح ہے: "كان اهل الجاهلية ياكلون اشياء ويتركون ايشاء تقذرا فبعث الله نبيه صلى الله عليه وسلم وانزل كتابه واحل حلاله وحرم حرامه فما احل فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سكت عنه فهو عفو" [اہل جاہلیت کچھ چیزوں کو کھاتے تھے اور کچھ چیزوں کو نفرت کرتے ہوئے چھوڑ دیتے تھے، پس اللہ تعالیٰ نے

اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتاب نازل فرمائی، اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام فرمایا، پس جن چیزوں کو حلال فرمایا وہ حلال ہیں، اور جن چیزوں کو حرام فرمایا وہ حرام ہیں، اور جن سے سکوت فرمایا وہ معاف ہیں۔]

اس حدیث شریف میں حلال وحرام کے درمیانی چیزوں کو عفو قرار دیا گیا ہے، اور حدیث الباب میں ان کو مشتبہ اور واجب الاحتراز فرمایا گیا ہے، اس اشکال اور اور اس کے جوابات کی طرف اشارہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ کوکب میں اس طرح فرمایا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان کئی طرح جمع کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ

(۱)......حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما من باب الفقہ والفتویٰ ہے اور نعمان بن بشیر کی یہ حدیث من باب الورع والتقویٰ ہے۔

(۲)......اور اس سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں جو حکم مذکور ہے یعنی عفو وہ مسکوت عنہ کا ہے، اور نعمان بن بشیر کی حدیث میں جو حکم مذکور ہے وہ امر مشتبہ کا ہے، پس یہاں چار مراتب ہوئے: (۱) حلال، (۲) حرام، (۳) مسکوت عنہ یعنی وہ شی جس کے بارے میں نہ دلیل حلت موجود ہو نہ دلیل حرمت، (۴) مشتبہ یعنی جس امر میں دلائل متعارض ہوں حلت وحرمت کے بارے میں۔ اور اس کا حکم وجوب ترک ہے ترجیحاً للحرمۃ اور قسم ثالث کا حکم یہ ہے کہ وہ معفو عنہ ہے اباحت اصلیہ کا اعتبار کرتے ہوئے۔ اور ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث متفق علیہ ہے بلکہ صحاح ستہ کی حدیث ہے، اور حدیث ابن عباس سنن کی روایت ہے۔ (الدر المنضود: ۵/۳۳۰)

کتے کی قیمت، زانیہ اور حجام کی اجرت حرام ہے

{۲۶۴۳} وَعَنْ رَافِعِ ابْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَنُ الْكَلْبِ خَبِيْثٌ وَمَهْرُ الْبَغِيِّ خَبِيْثٌ وَكَسَبُ الْحَجَّامِ خَبِيْثٌ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۲/۱۹، کتاب المساقاۃ، باب تحریم ثمن الکلب وحلوان الکاھن، حدیث نمبر:۱۵۶۸۔

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کتا کی قیمت ناپاک مال ہے اور زانیہ کی اجرت حرام مال ہے اور سینگی لگانے والے کی اجرت ناپسندیدہ ہے۔

تشریح: خبیث: طیب کی ضد ہے، خبیث ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو خساست اور دنائت کی وجہ سے ناپسند کیا جائے، اس کا اطلاق حرام اور مکروہ دونوں پر ہوتا ہے۔

حضرات ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کتے کا پالنا شکار کرنے کے لئے اور جانور و زراعت کی حفاظت کے لئے جائز ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح مذکور ہے: "مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ اَوْ مَا شِيَةٍ اَوْ زَرْعٍ نُقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ" (مسلم شریف:۲/۲۱) [جس شخص نے کتا پالا شکاری کتے اور مویشی اور کھیتی کے کتے کے علاوہ تو اس کے اجر میں سے ہر روز ایک قیراط کم ہو جائے گا۔]

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: "سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: "من اقتنی کلبا الا کلب صید او ماشیة فانه ینقص من اجره کل یوم قیراطان، [جس نے شکار یا مویشی کے کتے کے علاوہ کتا پالا تو اس کے اجر میں ہر روز دو قیراط کم ہو جائیں گے۔] قال سالم و کان ابو ھریرۃ یقول او کلب حرث" (بخاری شریف:۲/۸۲۴، کتاب الذبائح والصید، باب من اقتنی کلبا، مسلم شریف:۲/۲۱، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الامر بقتل الکلاب وبیان نسخه)

ان روایتوں سے کتے کا پالنا شکار اور مویشی و زراعت کی حفاظت کے لئے صراحۃً جائز معلوم ہوتا ہے، البتہ ان تینوں امور کے علاوہ دیگر امور کے لئے مثلاً گھر کی حفاظت کے لئے کتے کا پالنا جائز نہیں؟

علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گھر کی حفاظت کے لئے کتے کا پلنا جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں صرف مذکورہ تین قسموں کا استثناء آیا ہے اور شوافع کے نزدیک گھر کی حفاظت کے لئے کتے کا پالنا جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی ایسی ہی ضرورت پڑتی ہے جس طرح باقی تین صورتوں میں

ضرورت ہے، لہٰذا اس صورت کو باقی تین صورتوں پر قیاس کیا جائے گا۔

لیکن پہلا قول راجح ہے، کیونکہ اگر مذکورہ تین قسموں پر دیگر اقسام کو بھی قیاس کیا جائے تو پھر اس چیز کو مباح کہنا پڑے گا، جو حدیث کی رو سے حرام ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کتا گھر کی حفاظت کے لئے ایسا کارآمد نہیں جیسا باقی تین صورتوں میں ہے، کیونکہ چور ایسا حیلہ کرسکتا ہے کہ اس کو کچھ کھلا کر نکال دے اور پھر سامان چوری کرے۔ (المغنی لابن قدامہ: ۴/۱۷۳)

بیع الکلب کا حکم

حدیث مذکور سے حضرات ائمہ ثلاثہ، حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ، عبدالرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰ وغیرہم حضرات نے "بیع الکلب" کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے کہ بیع الکلب مطلقاً ناجائز ہے، چاہے کلب معلم ہو یا غیر معلم، اسی طرح قابل انتفاع ہو یا انتفاع کے قابل نہ ہو، البتہ مالکیہ کے نزدیک ایک روایت میں وہ کتا جس کا رکھنا اور پالنا جائز ہو تو اس کی بیع بھی جائز ہے اور جس کتے کا پالنا جائز نہیں تو اس کی بیع بھی جائز نہیں، حضرات حنفیہ، عطاء بن ابی رباحؒ، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر حضرات کے نزدیک ہر وہ کتا جو قابل انتفاع ہے اس کی بیع جائز ہے، البتہ "کلب عقور" جو قابل انتفاع نہیں ہے اس کی بیع ناجائز ہے۔ (عمدۃ القاری: ۲۰۳/۱۱، باب موکل الربا)

"بیع الکلب" کے جواز پر حنفیہ نے متعدد روایات سے استدلال کیا ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے: "**ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن ثمن الکلب والسنور الا کلب صید**" (طحاوی فی شرح المعانی الآثار: ۲/۲۵۰، باب ثمن الکلب) [حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شکاری کتے کے علاوہ کتے اور بلی کی قیمت سے منع فرمایا۔]

اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں ہے: "**عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نہی عن ثمن الکلب الا کلب المعلم**" (مسند احمد: ۳/۳۱۷) [حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم کتے کے علاوہ کتے کی قیمت سے منع فرمایا۔]

حضرت **ابوہریرہ** رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے: **"نھی عن ثمن الکلب الا کلب الصید"** (ترمذی شریف: ۱/ ۲۴۱، باب بلاترجمة بعدباب کراھیة ثمن الکلب والسنور) [شکاری کتے کے علاوہ کتے کی قیمت سے منع فرمایا۔]

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے: **"رخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ثمن کلب الصید"** (خوارزمی: ۱۰/ ۲) [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکاری کتے کی قیمت کی رخصت فرمائی۔]

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی نقل کیا ہے کہ انہوں نے شکاری کتے کے قتل کے سلسلے میں ایک آدمی پر چالیس درہم کا جرمانہ مقرر کیا اور جانوروں اور مویشیوں کے محافظ کتے کے قتل کے بارے میں ایک مینڈھے کا فیصلہ فرمایا۔

(شرح معانی الآثار: ۲۵۱/ ۲، باب ثمن الکلب)

دوسری بات یہ ہے کہ شکاری کتے اور مویشی اور زراعت کی حفاظت کرنے والے کتے کا پالنا صحیح احادیث سے ثابت ہے، جس کے انکار کی مجال نہیں تو جب اس کا قابل انتفاع ہونا اور مالیت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے تو پھر اس کے ثمن کی حرمت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسب عادت تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

حدیث مذکور کا جواب

حدیث مذکور کا جواب حنفیہ کی طرف سے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الحجۃ" میں یہ دیا ہے کہ یہ حدیث ابتداء اسلام پر محمول ہے، جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "قتل کلاب" کا حکم فرمایا تھا اور جب "قتل کلاب" کا حکم منسوخ ہوا تو "تحریم بیع" کا حکم بھی منسوخ ہوا، چنانچہ حدیث میں آیا ہے **"ان من السحت ثمن الکلب واجر الحجام ثم رخص فی اجر الحجام"** تو جس طرح اجرت حجام کی ممانعت منسوخ ہوگئی ہے، اسی طرح ثمن کلب کی ممانعت بھی منسوخ ہے اور کتوں کے سلسلے میں احکام تشدید سے تخفیف کی طرف آئے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ابتداء میں حکم سخت تھا تاکہ لوگوں کے دلوں سے آثار جاہلیت مکمل

طور پر ختم ہو جائیں اور جب یہ مقصد پورا ہو گیا تو حکم میں نرمی اور رخصت آئی، چنانچہ وہی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن سے احادیث نہی مروی ہیں ان کا عمل رخصت پر ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا والا حکم منسوخ ہے اور متعدد روایات تحریم میں استثناء بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا دفع تعارض بین الاحادیث کے لئے یہی کہا جائے گا کہ احادیث نہی کلب غیر منتفع بہ سے متعلق ہیں اور احادیث جواز جن میں کلب صید وغیرہ کا استثناء ہے وہ کلب منتفع بہ سے متعلق ہیں، تاکہ دونوں قسم کی احادیث پر عمل ہو۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ نہیں تحریم پر محمول نہیں، بلکہ اصل مقصود کتے بیچنے کے پیشے سے نفرت دلانا ہے، اور اس کی دنائت کا اظہار ہے، چنانچہ بعض روایات میں "کسب الحجام" اور بعض روایات میں "ثمن السنور" کا ذکر ہے، جبکہ متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک وہ حرام نہیں، لہٰذا "بیع الکلب" کے بارے میں جن روایات میں نہی وارد ہے اور یا "ثمن کلب" کو "خبیث" کہا گیا ہے وہ سب نہی تنزیہی یا غیر "منتفع بہ کلب" پر محمول ہوں گی، جیسا کہ "کسب الحجام" اور "ثمن السنور" بالاتفاق نہی تنزیہی پر محمول ہیں۔ (تکملہ فتح الملہم: ١/٥٣١)

ومہر البغی: "بُغِيٌّ" قَوِيٌّ کے وزن پر زانیہ کے معنی میں ہے، جمع اس کی ہے "بغایا" اور "بغی" غین کے سکون کے ساتھ اسی طرح "بغا" زنا کے معنی میں مستعمل ہیں، جیسا کہ ارشاد گرامی ہے: "وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ" (سورۃ النور: ٣٣) [اور اپنی باندیوں کو دنیا کا ساز وسامان حاصل کرنے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرو۔]

"مہر البغی" سے مراد وہ مال ہے جو زنا کار عورت کو اس کی بدکاری کی اجرت کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ مال متفقہ طور پر حرام ہے، کیونکہ یہ زنا کے عوض میں لیا جاتا ہے اور جو حرام کا وسیلہ ہوتا ہے وہ بھی حرام ہوتا ہے، لیکن یہ عوض چونکہ بمقابلہ بضع کے ہے، اس لئے مجازاً اس کو مہر کہا گیا ہے۔ (عمدۃ القاری: ١٢/٥٨، نووی شرح المسلم: ٢/١٩، نفحات التنقیح: ٣/٤٠٤)

کسب الحجام کا حکم

تیسرا مسئلہ کسب حجام کے بارے میں آیا ہے، یہ جائز ہے یا ناجائز؟ تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے

نزدیک یہ جائز نہیں ہے، لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حدیث مذکور ہے کہ کسب حجام کو خبیث کہا گیا۔ جمہور کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے بخاری ومسلم میں: "انه علیه السلام احتجم واعطی الحجام اجرة" [آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور حجام کو اجرت عطا فرمائی۔] تو اگر حرام ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اجرت نہ دیتے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جس حدیث سے استدلال کیا اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں خبیث سے مراد دنائت کے ہیں کہ ایک مسلمان کی شان یہ نہیں کہ خون چوس کر ایک رذیل پیشہ کر کے رزق حاصل کرے، یا تو نہی کی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے منسوخ ہوگئی۔(درس مشکوۃ:۲۵۹/۲)

ثمن کلب

{۲۶۴۴} **وَعَنْ** اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغِیِّ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۲۹۸/۱، کتاب البیوع، اب ثمن الکلب، حدیث نمبر: ۲۱۸۵، مسلم شریف: ۱۹/۲، کتاب المساقاة، باب تحریم ثمن الکلب وحلوان الکاهن، حدیث نمبر: ۱۵۶۱۔

ترجمه: حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلا شبہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور زانیہ کی کمائی (اجرت) سے منع فرمایا ہے اور کاہن کی اجرت (مٹھائی اور تحفہ) سے (بھی) منع فرمایا۔

تشریح: وحلوان الکاهن: کے معنی اجرۃ الکاہن، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "حلوت الکاهن حلوانا" جبکہ اس کو اجرت دی جائے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "حلوان" حلاوت سے ماخوذ ہے، شیرینی اور مٹھائی کے معنی میں ہے، کاہن کی اجرت کو مٹھائی کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ کاہن وہ مال بڑی سہولت سے بغیر محنت ومشقت کے حاصل کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کو فرحت محسوس ہوتی ہے، جیسا کہ مٹھائی کھانے سے

طبیعت کو سرور اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ (فتح الباری: ۴۲۷/۴)

''کاہن'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو غیب کی خبریں بتاتا ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کاھن'' اور ''عراف'' کے درمیان یہ فرق بتایا ہے کہ ''کاھن'' اس کو کہتے ہیں جو مستقبل کی خبریں بتاتا ہو، اور ''عراف'' اس کو کہتے ہیں جو پوشیدہ باتیں بتاتا ہو، جیسا کوئی گم شدہ یا چوری کی ہوئی چیز کے بارے میں بتادے۔ ''کاہن'' کے پاس جانا اور اس کو اجرت دینا اور اس کی خبروں پر اعتماد کرنا بالاتفاق حرام ہے، اس طرح نجومی وغیرہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔

(شرح النووی: ۱۹/۲ نفحات التنقیح: ۴۰۴/۳)

خون کی خرید وفروخت

{۲۶۴۵} **وَعَنْ** اَبِیْ جُحَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الدَّمِ وَثَمَنِ الْكَلْبِ وَكَسْبِ الْبَغْیِ وَلَعَنَ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهٗ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَالْمُصَوِّرَ۔ (رواه البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۹۸/۱، کتاب البیوع، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر: ۲۱۸۶۔

ترجمہ: حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کی قیمت (اور اس کی خرید وفروخت) اور کتے کی قیمت اور زانیہ کی اجرت سے منع فرمایا اور سود کھانے والے اور کھلانے والے اور گودنے والی عورت اور گدوانے والی عورت اور تصویر بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کی قیمت (یعنی اس کی خرید وفروخت) سے منع فرمایا ہے، لہٰذا اس نہی کی وجہ سے اس کی ثمن ناجائز اور حرام ہوگی، کیونکہ خون نجس شی ہے اور شی نجس شرعاً مالِ (متقوم) کے حکم میں نہیں ہے، جس پر خرید وفروخت کے احکام جاری ہوسکیں، ایسی آمدنی کو حلال اور پاک نہیں کہا جائے گا۔

ثمن دم کو سینگی کی اجرت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ وہ عمل کی اجرت ہے اور علاج کی ایک

صورت ہے جس میں خونِ فاسد کو نکالا جاتا ہے، اس لئے دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ فافہم

فائدہ: اگر اضطراری صورتِ حال ہے تو اجازت ہوگی عطیہ کرنے یا خرید کرنے کی۔

نیز اس میں اکل ربوا یعنی سود کی آمدنی کا حرام ہونا اور اس پر لعنت کا ہونا مذکور ہے۔

اور "الواشمة" یہ "الوشمه" سے ماخوذ ہے، سوئی وغیرہ کے ذریعہ بدن (کھال) میں گدائی کرنا، اور اس میں نورہ، کحل وغیرہ بھرنا، جس سے کہ رنگ ابھر جائے، عرب میں عورتیں اکثر ایسا کرتی تھیں، وہ عورت جو گدائی کرائے اور جو عورت گدائی کرے، یہ عمل ناجائز ہے اور باعث لعنت ہے۔

تصویر سازی کا حکم

تصویر سے مراد کسی جاندار کی تصویر ہے جس کا بنانا اور بنوانا جائز نہیں ہے، لہٰذا تصویر سازی کے ذریعہ کسب معاش بھی جائز نہیں ہے، احادیث میں تصویر سازی پر شدید وعید بھی آئی ہے، چنانچہ بروایت عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اشد الناس عذابا عند الله المصورون" (متفق علیہ) [عنداللہ سب سے زیادہ سخت عذاب والے تصویر بنانے والے ہیں۔]

البتہ غیر جاندار کی تصویر بنانا اور اس کو ذریعہ معاش بھی بنانا بلا کراہت مباح اور جائز ہے، جیسا کہ بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (ایک واقعہ) مروی ہے کہ ایک شخص تصویر سازی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھا، جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس پر وعید سنائی تو وہ شخص بہت فکرمند ہوا اور اس کے چہرہ کا رنگ پیلا پڑ گیا تو پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو (یہ تشریح کرتے ہوئے) فرمایا: "وکل شیء لیس فیہ روح" (مشکوٰۃ شریف: ۳۸۶) [کہ غیر ذی روح کی تصویر بنانے اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں۔]

حرام اشیاء کی خرید و فروخت

{۲۶۴۶} وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَامَ الْفَتْحِ وَهُوَ بِمَكَّةَ اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ

بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْأَصْنَامِ فَقِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَرَأَيْتَ شُحُوْمَ الْمَيْتَةِ فَإِنَّهُ تُطْلٰى بِهَا السُّفُنُ وَيُدَّهَنُ بِهَا الْجُلُوْدُ وَيُسْتَصْبَحُ بِهَا النَّاسُ فَقَالَ: لَا هُوَ حَرَامٌ ثُمَّ قَالَ عِنْدَ ذٰلِكَ قَاتَلَ اللهُ الْيَهُوْدَ إِنَّ اللهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُوْمَهَا أَجْمَلُوْهُ ثُمَّ بَاعُوْهُ فَأَكَلُوْا ثَمَنَهُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۹۸/۱، کتاب البیوع، باب بیع المیتة والاصنام، حدیث نمبر: ۲۱۸۴، مسلم شریف: ۲۳/۲، کتاب المساقاۃ، باب تحریم بیع الخمر والمیتة، حدیث نمبر: ۱۵۸۱۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے فتح مکہ والے سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اس وقت) مکہ میں قیام فرما تھے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے شراب کی خرید وفروخت اور خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کردیا ہے، کسی نے سوال کیا یارسول اللہ! مردار کی چربی کے متعلق (کیا حکم ہے؟) کیونکہ اس سے کشتیاں پالش کی جاتی ہیں اور چمڑے اس سے چکنے کئے جاتے ہیں اور لوگ اس سے چراغ روشن کرتے ہیں؟ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مت استعمال کروتم، وہ تو حرام ہے، پھر اسی کے ساتھ فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے، اللہ تعالیٰ نے جب ان پر مردار کی چربیوں کو حرام فرمایا تو انہوں نے اس کو پگھلایا اور پھر اس کی خرید وفروخت کی اور اس کی قیمت کو کھایا۔

تشریح: علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے ساتھ ادب کا معاملہ فرمایا، اس وجہ سے ذکر خداوندی کے ساتھ اپنا ذکر ایک ہی صیغہ میں نہیں فرمایا، ورنہ قیاس کا تقاضا یہی تھا کہ بجائے "حرم" کے "حرما" فرماتے۔ جیسا کہ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خطیب نے دونوں کا ذکر ایک ہی ضمیر میں کیا اور کہا: "ومن یعصهما فقد غوی" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بئس الخطیب انت، قل: ومن یعص اللہ ورسول"
(مسلم شریف: ۵۹۴/۲، کتاب الجمعة)

لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس توجیہ کو رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ضمیر تثنیہ میں بھی دونوں کا ذکر ثابت ہے، چنانچہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"فنادی منادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اللہ و رسولہ ینھیانکم عن لحوم الخمر"

(بخاری شریف: ۲/۶۰۴، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر، مسلم شریف: ۲/۱۵۰، کتاب الصید) [رسول اللہ ﷺ کے منادی نے اعلان فرمایا: کہ بالیقین اللہ اور اس کے رسول ﷺ دونوں تم کو شراب کے گوشتوں سے منع فرماتے ہیں۔]

حافظین فرماتے ہیں کہ ایسے مقامات میں صیغہ مفرد کا استعمال کرنا جائز ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ایک ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: "واللہ ورسولہ احق ان یرضون" جبکہ قیاس چاہتا ہے "یرضوھما" ہونا چاہئے۔ دیکھئے پوری تفصیل کے لئے عمدۃ القاری: ۱۲/۵۵، باب البیع المیتۃ الخ)

چنانچہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث مذکور میں رسول اللہ ﷺ کے ذکر سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر بطور تمہید کے ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حضور اقدس ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خلیفہ ہیں، لہذا آنحضرت ﷺ کا ان چیزوں کو حرام قرار دینا ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حرام قرار دینا۔ (شرح الطیبی: ۶/۱۶)

خلاصہ یہ ہے کہ کبھی شان تادب غالب ہوتی ہے تو آنحضرت ﷺ کلام میں تقطیع پسند فرماتے ہیں دونوں کا ذکر ایک ساتھ نہیں فرماتے اور کبھی شان "توحد الامر" غالب ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ اپنی طرف سے کچھ نہیں، بلکہ بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، جس کی وجہ سے دونوں کا ذکر بھی ایک ساتھ فرماتے ہیں، لہذا درحقیقت کسی بھی طریقہ سے دوسرے طریقے کی ممانعت مقصود نہیں، بلکہ یہ مختلف احوال پر محمول ہے۔

والمیتۃ: "میتہ" سے مراد وہ جانور ہے جو شرعی طریقے سے ذبح کئے بغیر خود بخود مر جائے، ایسے جانور کا گوشت کھانا اور بیچنا بالاجماع حرام ہے، علاوہ اس "میتہ" کے جس کا استثناء حدیث سے ثابت ہے، یعنی "سمک اور جراد" مچھلی اور ٹڈی۔ البتہ گوشت کے علاوہ بال، ہڈی، ناخن سینگ وغیرہ کے بارے میں اختلاف ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک وہ مرنے سے نجس نہیں ہوتے، لہذا ان سے انتفاع بھی جائز ہے اور ان کا بیچنا بھی جائز ہے، جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کے

نزدیک میتہ کے تمام اجزاء حرام ہیں۔

یطلی بھا السفن: میتہ "مردار" کی چربی سے انتفاع حاصل کرنے کے تین طریقے بتائے ہیں:

(۱)......بحری آب وہوا سے حفاظت کی خاطر چربی کشتیوں پر ملی جاتی تھیں۔

(۲)...... چمڑے کو مضبوط کرنے کے لئے چربی سے چکنا کیا جاتا ہے۔

(۳)......لوگ چربیوں سے گھروں میں چراغ جلاتے تھے۔

اور مقصود یہ ہے کہ مردار کی چربی سے ان تین طریقوں سے انتفاع حاصل کیا جاتا ہے، تو کیا چربی کا بیچنا بھی جائز ہے؟

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "**لا ھو حرام**"

اکثر شافعیہ کے نزدیک چونکہ چربی کا استعمال کرنا جائز ہے مذکورہ مقاصد کے لئے، یا اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے البتہ بیچنا جائز نہیں، اس لئے ان حضرات کے ہاں حدیث میں "ھو" ضمیر "بیع" کی طرف راجع ہے، انتفاع کی طرف راجع نہیں ہے۔

جبکہ جمہور کے نزدیک نہ تو مردار کی چربی کا بیچنا جائز ہے اور نہ اس کا کسی فائدہ کے لئے استعمال جائز ہے، اس واسطے "ھو" ضمیر انتفاع کی طرف راجع ہوگی، یعنی مذکورہ طریقوں سے انتفاع حاصل کرنا جائز نہیں، حرام ہے۔ (شرح مسلم للامام نووی: ۲۳/ ۲، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ)

چنانچہ اس کی تائید ابن ماجہ شریف کی روایت سے ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہے: "**لا ھن حرام**" (ابن ماجہ: ۷۳۲/ ۲، کتاب التجارات)

باقی نجس تیل، زیتون اور گھی جو کسی خارجی نجاست کی وجہ سے نجس ہو گئے ہوں ان کے استعمال کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل اور احمد بن صالح علیہم الرحمۃ وغیرہم کے نزدیک ان سے انتفاع حاصل کرنا بھی حرام ہے اور وہ بھی "شحم میتہ" کے حکم میں ہیں۔

جبکہ جمہور امت کے نزدیک کھانے کے علاوہ کسی اور استعمال میں ان کا لانا جائز ہے، بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نجس زیتون کا بیچنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ وقت بیع نجاست کا اظہار کیا جائے۔

مردار کی چربی اور نجس زیتون کے درمیان فرق یہ بتایا گیا ہے کہ مردار کی چربی کے استعمال کی حرمت نص سے ثابت ہے، جبکہ نجس زیتون کے استعمال کی حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں۔

نجس زیتون کو مردار کی چربی پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ شریعت مطہرہ نے نفرت بڑھانے کی غرض سے شراب، خنزیر اور مردار چیزوں کے بارے میں حکم مبالغہ کے ساتھ صادر فرمایا ہے، چنانچہ ان چیزوں کو نجس العین قرار دیا، جبکہ دیگر نجس اشیاء کا یہ حکم نہیں، لہٰذا دیگر اشیاء نجسہ کو ان پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہوگا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۵۶۱/۱، نفحات التنقیح: ۴۰۶/۳)

یہود کی حیلہ سازی

{۲۶۴۷} **وَعَنْ** عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمُ فَجَمَلُوْهَا فَبَاعُوْهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۹۶/۱، مسلم شریف: ۲۳/۲، کتاب المساقاۃ، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ، حدیث نمبر: ۱۵۸۲۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یقیناً حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کو بددعا دیتے ہوئے) فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے ان پر چربیاں حرام کی گئیں تو انہوں نے اس کو پگھلایا اور پھر اس (کے تیل) کی خرید و فروخت کی۔

تشریح: گذشتہ حدیث کے تحت تفصیل معلوم ہو چکی۔

قاتل اللہ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کردے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ جو حرام شی کی تحریف وغلط تاویل کر کے حلال بنائے وہ اس وعید میں داخل ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

بلی کی خرید و فروخت

{۲۶۴۸} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَہٰی عَنْ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۲۰، کتاب المساقاۃ، باب تحریم ثمن الکلب وحلوان الکاھن، حدیث نمبر: ۱۵۶۹۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یقینا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور بلی کی قیمت (یعنی اس کی خرید وفروخت) سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: سنور بلی کو کہتے ہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور بعض تابعین کا مذہب یہ ہے کہ بلی کی بیع جائز نہیں اور اس کا ثمن بھی حلال نہیں، جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ایسی بلی جس کا کچھ نفع ہو اس کی بیع جائز ہے اور اس کا ثمن حلال ہے، اس حدیث کی جمہور نے دو تاویلیں کی ہیں۔

(۱)......نہی تنزیہ پر محمول ہے تاکہ اس قسم کی معمولی چیزوں کے ہبہ اور اعارہ کی لوگوں کو عادت ہو۔

(۲)......یہ نہی سنور وحشی پر محمول ہے، سنور وحشی کے تسلیم پر بائع قادر نہیں ہوتا اور اس کا کوئی نفع بھی نہیں ہوگا، کیونکہ وحشی بلی کو اگر باندھیں گے تو بلی رکھنے کا مقصد فوت ہو جائے گا اور اگر کھولیں گے تو ہاتھ سے نکل جائے گی۔

یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کی بیع کلب کے جواز میں تائید کرتی ہے، کیونکہ جس طرح بیع کلب سے احادیث میں نہی ہے، اسی طرح بیع سنور سے بھی نہی ہے، اور بیع سنور کی نہی میں شوافع بھی تاویل کرتے ہیں کہ یہ نہی تنزیہی ہے یا یہ نہی سنور غیر نافع کے لئے ہے، یہی تاویلات احناف بیع کلب کی نہی میں کرتے ہیں۔ (اشرف التوضیح: ۲/۳۸۱)

سینگی لگانے کی اباحت

{۲۶۴۹} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ حَجَمَ اَبُوْطَیْبَۃَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ لَہٗ بِصَاعٍ مِنْ تَمْرٍ وَاَمَرَ اَہْلَہٗ اَنْ یُّخَفِّفُوْا عَنْہُ مِنْ خَرَاجِہٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۸۳، کتاب البیوع، باب ذکر الحجام، حدیث نمبر: ۲۰۵۵،

مسلم شریف: ۲/ ۲۲، کتاب المساقاۃ، باب حل اجرۃ الحجامۃ، حدیث نمبر: ۱۵۷۷۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوطیبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینگی لگائی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (کو) ایک صاع کھجور دیئے، جانے کا حکم فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مالکوں کو حکم فرمایا: کہ وہ ان سے ان (پر مقرر) خراج میں (قدرے) تخفیف کر دیں۔

تشریح: صاع: عرب کا ایک پیمانہ، جس کی مقدار (تقریباً) ساڑھے تین سیر ہے۔

خراج: غلام باندی کے مالک اپنے مملوک کو کسی بھی پیشہ کرنے کی اجازت دیکر ہر دن کے لئے ایک مقدار ان پر مقرر کرتے کہ وہ اپنی آمد میں سے یہ مقدار مالک کو ادا کر دے اور باقی ماندہ اس کی ملکیت رہے گی، غلام اس کو قبول کرتے ہوئے کہتا: "رضیت به" (تعلیق: ۲۹۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا: کہ ابوطیبہ رضی اللہ عنہ پر یومیہ خراج کی مقدار زائد ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مالک سے سفارش فرما کر اس میں تخفیف کرائی تھی۔

فائدہ: (۱)......اس میں رحمت وشفقتِ نبوی کا حال معلوم ہوا ہے۔

(۲)......اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ یہ پیشہ فی نفسہ مباح ہے، اور از روئے طب وعلاج افضل الادویہ یعنی عمدہ ترین علاج ہے، خون میں شدت اور فساد ہونے پر اس فاسد خون کا اخراج ہوتا ہے ایک آلہ (سینگی) کے ذریعے۔

(۳)...... بوقت ضرورت سفارش کرنا درست ہے، بلکہ اجر وثواب بھی اس پر مرتب ہوگا، البتہ سفارش، حکم نہ ہو۔

اشکال مع جواب

اس حدیث شریف کے اندر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجامۃ کرائی، اور حجام کو ایک صاع اجرت کے طور پر دینے کا حکم فرمایا، حالانکہ اس سے پہلے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اندر ہے کہ "کسب الحجام خبیث" لہٰذا دونوں کے اندر تعارض ہے۔ اس تعارض کے جوابات یہ ہیں:

(١)……بعض لوگوں نے کہا: کہ حدیث رافع منسوخ ہے۔

(٢)……حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبید (غلام) کے لئے اجرت لینا جائز ہے، اور احرار (آزاد) کے لئے جائز نہیں۔

(٣)……بعض نے فرمایا: کہ لینا جائز نہیں، لیکن دینا جائز ہے۔

(٤)……حضرت ابوجحیفہ کی حدیث کے اندر گذرا نہی عن ثمن الدم اگر دم سے حجامۃ مراد ہے تو پھر مسئلہ گذر گیا اور اگر اس سے خون مراد ہو تو چونکہ وہ نجس ہے اس لئے منع فرمایا۔

(٥)……اب اس صورت کے اندر بعض لوگوں نے کسب الحجام خبیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس حجام سے وہ مراد ہے جو حجامۃ کے بعد خون کو فروخت کر دیتا ہو۔ (تقریر حضرت شیخ زکریا قدس سرہٗ)

اپنے ہاتھ کی کمائی پاکیزہ ترین کمائی ہے

{۲۶۵۰} **وَعَنْ** عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ وَاِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ۔ (رواه الترمذی والنسائی وابن ماجة) وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوُدَ وَالدَّارِمِيِّ اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهٖ وَاِنَّ وَلَدَهٗ مِنْ كَسْبِهٖ۔

حواله: ترمذی شریف: ۱/۲۵۲، ابواب الاحکام، باب ما جاء ان الوالد یأخذ من مال ولده، حدیث نمبر:۱۳۵۸، نسائی شریف: ۲/۱۸۵، کتاب البیوع، باب الحث علی الکسب، حدیث نمبر:۴۴۵۴، ابن ماجہ شریف:۱۶۵، ابوب التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، حدیث نمبر:۲۲۹۰، ابو داؤد شریف: ۲/۴۹۷، کتاب البیوع، باب الرجل یاعلی من مال ولده، حدیث نمبر:۳۵۲۸، دارمی: ۲/۳۲۱، کتاب البیوع، باب فی الکسب وعمل الرجل بیده، حدیث نمبر:۲۵۳۷۔

ترجمه: ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ جو تم نے اپنی محنت سے حاصل شدہ کھایا ہے وہ بہت ہی پاکیزہ (اور بہتر) مال ہے، اور یقینا تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی (ہوئی چیزوں میں) سے ہے۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) اور ابوداؤد اور دارمی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ انسان جو کچھ کھاتا ہے اس میں سب سے بہتر وہ چیز ہے جو اس کی کمائی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف میں دو امر کا بیان ہے:

(۱)......انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے دست بازو سے اور اپنی محنت سے کسب حلال کو اختیار کرے اور اس کو کھائے اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کرے۔

(۲)……اور اگر والدین کو ضرورت ہو اور اب وہ کسب معاش پر قادر نہ ہوں تو عند الضرورت اولاد کی آمدنی پر گذر کرنا بھی درست ہے، اور (گویا کہ) والدین کے حق میں ان ہی کی کمائی ہے۔ اور یہ اس لئے فرمایا ہے کہ والدین اس حالت میں پہنچ کر یہ احساس نہ کریں کہ ہم اولاد کے محتاج ہو گئے، فقہاء نے فرمایا ہے: عند الضرورت والدین کے ضروری مصارف اولاد پر لازم ہوں گے۔ (التعلیق: ۲۹۰/۳)

مال حرام عند اللہ مقبول نہیں

{۲۶۵۱} **وَعَنْ** عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقَ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهٗ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكُهٗ خَلْفَ ظَهْرِهٖ إِلَّا كَانَ زَادَهٗ إِلَى النَّارِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُوْا السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُوْ السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ إِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيْثَ۔ (رواه احمد) وَكَذَا فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

حواله: مسند احمد: ۱/۳۸۷، حدیث نمبر: ۳۶۷۲۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بندہ حرام مال کمائے اور پھر اس میں سے صدقہ کرے تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جاتا، اور اس میں سے خرچ کرے تو اس کے لئے اس میں برکت نہیں دی جاتی، اور اس مالِ حرام کو اپنے مرنے کے بعد چھوڑ جائے تو وہ اس کا توشہ ہوگا دوزخ کی آگ کی طرف (لے جانے کے لئے)، بلا شبہ اللہ تعالیٰ برائی، برائی کے ذریعہ معاف نہیں کرتے لیکن برائی کو خیر (یعنی مالِ حلال) کے ذریعہ صاف کرتے ہیں، یقیناً گندگی نہیں دور کرتی ہے گندگی کو۔

تشریح: فیتصدق: (مرفوعاً) یکسب پر عطف ہوگا اور لا ینفق (معروف) ہے اور اس کا عطف فیتصدق پر ہوگا۔ (تعلیق: ۲۹۰)

جو مال حرام ہوگا وہ اس لائق نہ ہوگا کہ اس کا صدقہ کیا جائے اور وہ عند اللہ مقبول ہو، یعنی اس میں

مقبول عند اللہ ہونے کی صلاحیت و استعداد ہی نہیں ہے اور جب وہ مقبول نہ ہوگا تو اس پر ثواب بھی مرتب نہ ہوگا، اور اس کے علاوہ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ خود ہی اپنے کسب کردہ مالِ حرام میں سے خود پر خرچ کرے گا تو اس میں کوئی خیر و برکت اس کے لئے نہ ہوگی۔

برکت وہ خیر کثیر ہے جو منجانب اللہ عطیۂ خصوصی ہوا کرتا ہے، اور مالِ حرام عند اللہ بہت مبغوض ہے تو اس پر رحمت الٰہی بصورتِ برکت کیسے متوجہ ہوگی؟ ہرگز نہیں! یہی وجہ ہے کہ مالِ حرام، ناجائز اور خلافِ شریعت کاموں میں صرف ہوتا ہے، جو حقیقی منافع دے کر نہیں جائے گا۔ اور مالِ حرام کا مرنے کے بعد ترکہ جو ہوگا وہ ایسا توشہ ہوگا جو اس کو دوزخ کی آگ تک پہنچا دے گا، یعنی آخرت کے اعتبار سے بھی وہ مال سبب ہوگا دوزخ کے لئے۔

خلف ظهره: سے اشارہ موت کی جانب یعنی پس مرگ! **زاد:** بمعنی توشہ سفر میں ضرورت پوری کرنے والی شی۔

ان اللہ الخ: یہ کلام مستانفہ ہے اور عند اللہ مقبول نہ ہونے کی علت کا بیان ہے۔

گناہوں کا کفارہ کیسے ہوگا؟

اس لئے فرمایا برائی، برائی کو دھونے اور صاف کرنے والی نہیں ہو سکتی، بلکہ حسنہ کے ذریعہ سیئات کو مٹایا اور صاف کیا جاتا ہے۔ جب وہ مالِ حرام بری شی ہے، ناپاک اور گندی ہے تو ایسا مال اور ایسی بری شی بندہ کے برے اعمال اور گناہوں کے لئے کفارہ کیسے ہوگا؟" **قال: کما قال اللہ تعالیٰ:** "ان الحسنات یذھبن السیئات" [یقیناً نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔]

خلاصہ اور حاصل کلام یہ ہے کہ خبیث اور گندی شی، خباثت اور گندگی کو صاف نہیں کر سکتی اور برے اعمال کا کفارہ نہیں ہو سکتی، ایسے مال میں نہ کوئی خیر ہے اور نہ برکت اور نہ عند اللہ مقبول، اللہ تعالیٰ طیب ہے اور طیب ہی کو قبول فرماتے ہیں۔ اس لئے مالِ حرام خواہ مقدار میں کتنا بھی ہو اس کا صدقہ کرنا عند اللہ مقبول نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر مالِ حرام کو صدقہ کیا گیا اور اس پر ثواب کی امید کی گئی تو یہ عمل

موجب کفر ہے، اور اگر فقیر کو معلوم ہو گیا کہ یہ حرام مال اس کو دیا گیا ہے اور اس فقیر نے اس کو دعا دی، تو یہ بھی کفر ہے۔

فائدہ: ما قبل میں جو جملے حدیث پاک میں مذکور ہیں وہ دراصل آخری جملہ ''ان الخبیث الخ'' کے لئے تمہید اور مقدمہ ہے۔ (تعلیق: ۲۹۱، مظاہر حق قدیم: ۱۰)

حرام خوری کا اثر

{۲۶۵۲} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ. (رواہ احمد والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

حوالہ: مسند احمد: ۳/۳۲۱، دارمی: ۲/۴۰۹، کتاب الرقائق، باب فی اکل السحت، حدیث نمبر: ۲۷۷۶، بیہقی: ۵/۵۶، باب فی المطاعم والمشارب فصل فی طیب المطعم الخ، حدیث نمبر: ۵۷۶۱۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں وہ گوشت داخل نہیں ہوگا جو حرام مال سے پرورش پایا ہو، اور ہر وہ گوشت جو مالِ حرام سے پرورش پایا ہو تو اس (جسم) کے لئے آگ زیادہ لائق ہے۔

تشریح: **السحت:** حرام، نجس، اصل معنی لغۃً سوخت کردن، اور مالِ حرام برکت کو سوخت کر دیتا ہے، جو انسانی بدن مالِ حرام سے پرورش پایا ہو، بڑھا اور ترقی کیا ہو اور حدیث پاک میں ''**لحم**'' کی جانب اسناد فرمائی ہے کہ وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، نفس انسانی کی جانب یہ اسناد نہیں فرمائی۔

حرام خوری سے کیوں جنت میں محروم ہوگا؟

یہ اس وجہ سے کہ وہ گوشت نجس اور خبیث ہے، جو علت ہے عدم دخول کی۔ ''**ان الخبیث للخبیث**'' اور جنت پاکیزہ مقام ہے، اس میں شی طیب ہی داخل ہو سکتی ہے، اگر اس کی مغفرت نہ ہوئی تو

اولاً دوزخ میں جائے گا، جیسا کہ حدیث میں اس جانب اشارہ ہے، بعدہٗ جنت میں داخل ہوگا، اس لئے ہر صاحب ایمان جنت میں ضرور داخل ہوگا، توبہ یا مغفرت کے بعد یا سزا بھگتنے کے بعد، اور جن صورتوں میں مغفرت اور بخشش کی تفصیل ہے اس کے مطابق مثلاً صاحب حق کو راضی کر دیا گیا یا سفارش شامل حال ہوگئی، اور ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جنت کے درجاتِ عالیہ میں داخل نہ ہو نیز اس میں زجر اور توبیخ ہے اور وعید بھی ہے اور اگر (خدانخواستہ) اس کا اعتقاد حرام نہ ہونے کا تھا وہ از روئے اعتقاد و نظریات اس کو حلال جانتا تھا، تو پھر حرام کو حلال تصور کرنا کفر ہے، مالِ حرام کی مختلف انواع اور صورتیں ہیں، اس لئے ہر ایک کی نوعیت علیحدہ ہے اور اسی اعتبار سے اس کا حکم بھی ہے۔

تقویٰ اور پرہیزگاری

{۲۶۵۳} **وَعَنِ** الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَانِيْنَةٌ وَاِنَّ الْكِذْبَ رِيْبَةٌ۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی وروی الدارمی الفصل الاول)

حوالہ: مسند احمد: ۱/۱۷۷، ترمذی شریف: ۲/۷۸، ابواب صفۃ القیامۃ، قبیل ابواب صفۃ الجنۃ، حدیث نمبر: ۲۵۱۸، نسائی شریف: ۲/۲۸۵، کتاب الاشربۃ، باب الحث علی ترک الشبہات، حدیث نمبر: ۵۷۱۴، دارمی: ۲/۲۴۵، کتاب البیوع، باب دع ما یریبک الی ما لا یریبک، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ،

حل لغات: دع: صیغہ امر، ودع (ف) الشی، چھوڑنا۔ ریبۃ: شک تہمت، جمع: ریب اراب، باب افعال شک میں ڈالنا۔

ترجمہ: حضرت حسن بن علی ﷛ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے (اس حدیث شریف کو) یاد کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شئ تجھ کو شک میں ڈالتی ہے اس کو چھوڑ (اور متوجہ ہو اور اختیار کر) اس شی کو جو تجھ کو شک میں نہ ڈالے، چونکہ سچائی باعث اطمینان قلبی ہے

اور یقینا جھوٹ (اور باطل) باعث شک (اور تردد) ہے۔ (مسند احمد، ترمذی، نسائی) اور دارمی نے جز اول کو نقل کیا ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف میں یہ حکم ہے کہ جس شی (قول، فعل، مال کسی بھی شی) میں شک اور شبہ قلب میں پیدا ہو جائے اور تردد ہو جائے کہ وہ درست اور حلال ہے یا نہیں، تو ایسی صورت میں اس شی کو چھوڑ دیا جائے اور اس جانب کو اختیار کرلے جس میں کوئی تردد اور شک وشبہ نہ ہو۔

یریبک: اس میں علامت مضارع پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے، اور ضمہ بھی دونوں ہو سکتے ہیں، البتہ اکثر روایات بالفتح ہے، راب اور اراب دونوں لغات ہیں، البتہ ان میں درست اور معروف "رابنی الشی" ہے، مجھ کو شک وشبہ میں ڈال دیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مشتبہ اور شبہات سے بہر صورت پرہیز کیا جائے، نیز اس شی کو اختیار کیا جائے جس میں قلب کو شک اور شبہ نہ ہو، یہ علامت ہے اس کے حق ہونے کی، کیونکہ صدق اور سچائی (اور امید حق) قلب کو مطمئن کرتا ہے اور اس کے برخلاف کذب اور امید ناحق قلب میں تردد پیدا کرتا ہے جو علامت ہے اس کے باطل ہونے کی اسی لئے ایک حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے: "اپنے قلب سے پوچھ لیجئے" بہر حال اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ قلب میں نور تقوی ہو، تقویٰ سے قلب بھرا ہوا ہو۔

نیکی اور معصیت کی شناخت

{۲۶۵۴} **وَعَنْ** وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: یَا وَابِصَةُ! جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ قُلْتُ: نَعَمْ! قَالَ: فَجَمَعَ اَصَابِعَهٗ فَضَرَبَ بِهَا صَدْرَهٗ وَقَالَ: اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ ثَلَاثًا اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَیْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَیْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ۔ (رواہ احمد والدارمی)

حوالہ: مسند احمد: ۴/۲۲۸، دارمی: ۲/۳۲۰، کتاب البیوع، باب دع ما یریبک الخ، حدیث نمبر: ۲۵۳۳۔

حل لغات: البر: نیکی،حسنہ،اوراس کی ضد ہے ”اثم“ گناہ،معصیت،النفس: ذاتِ انسان، حاک (ماضی) خلجان، تردد،کھٹک۔ افتناء فتویٰ دینا،حکم بیان کرنا۔

ترجمہ: حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: اے وابصہ! آیا ہےتو (میرے پاس) تاکہ سوال کرے، نیکی اور گناہ (کی حقیقت اور علامت) سے متعلق، میں نے عرض کیا: جی ہاں! حضرت وابصہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں جمع فرمائیں، اور پھر ان کو میرے سینے پر مارااور فرمایا: فتویٰ طلب کر اپنے نفس سے، اور فتویٰ طلب کر اپنے قلب سے (اور یہ بات) تین مرتبہ فرمائی، نیکی وہ ہے کہ جس سے نفس مطمئن ہوجائے اور قلب کو اس پر اطمینان ہو، اور گناہ وہ ہے جس سے نفس میں کھٹک پیدا ہو اور سینہ میں تردد ہو (قلب منشرح نہ ہو) اگرچہ لوگ فتویٰ دیں۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد سے ایک اصول بیان فرمایا ہے، عمل حسنہ اور غیر حسنہ (گناہ) کے درمیان امتیاز کرنے اور حقیقت حال کو معلوم کرنے کے لئے (زریں) اصول یہ ہے کہ اگر کسی امر میں واضح حکم نہ ہونے کی وجہ سے تردد اور شک ہے تو اپنے قلب کی جانب رجوع کرلے، اگر قلب میں کوئی تردد نہ ہو اور قلب مطمئن ہے تو وہ حسنہ اور نیکی (بر) ہے، اور قلب میں کھٹک اور تردد ہے اور قلب مطمئن نہ ہو تو وہ اثم ہے، اور مفتی حضرات کا فتویٰ ظاہر پر ہوتا ہے، ان کے روبرو جو صورتِ حال (قولاً یا فعلاً) آئے گی وہ اس پر فتویٰ دیا کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اپنے قلب متقی سے فتویٰ لیا جائے، اور تقویٰ پر عمل کرنا فتویٰ پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔

گذشتہ حدیث کی تشریح میں گذر چکا کہ دل اور ضمیر کی صحیح راہنمائی کا جوہر ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا، بلکہ اس جوہر کا تعلق ان صالح لوگوں سے ہے جن کی دلی خواہشات نفسانی کدورت سے پاک وصاف اور تقویٰ و پرہیزگاری و خداترسی کے جوہر سے معمور رہتے ہیں، کیونکہ ان کے طبائع صرف خیر و بھلائی کی طرف مائل اور برائی سے بیزار رہتے ہیں، جبکہ برے لوگ نفسانی خواہشات میں گرفتار رہتے ہیں، اور نیکی اور بھلائی سے بے اعتنائی اختیار کئے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انہیں ضمیر کی صحیح رہنمائی نہیں حاصل ہوسکتی۔

نیز یہ حکم اس وقت ہے جب کسی چیز کے بارے میں واضح شرعی فیصلہ سامنے نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کی برکت

آنحضرت ﷺ نے دستِ مبارک ان صحابی رضی اللہ عنہ کی سینہ پر رکھا، بظاہر تو آنحضرت ﷺ نے اشارہ کے لئے رکھا ہے کہ قلب کی جگہ یہ ہے اور معنوی طور پر بالضرور ان کا قلب مبارک ہاتھوں کی روحانی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے قلب میں بڑی قوت پیدا ہوئی ہوگی، جس سے قلب میں قوت ادراک میں ترقی بھی حاصل ہوئی ہوگی، اور سوال سے قبل آنحضرت ﷺ کا معلوم کرنا کہ یہ سوال کریں گے یہ از راہِ مکاشفہ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا۔

تقویٰ اور ورع کا حصول

{۲۶۵۵} **وَعَنْ** عَطِيَّةَ السَّعْدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَاْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَاْسٌ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۷۲، ابواب صفة القیامة، باب علامة التقویٰ ورع مالا باس بہ حذرا، حدیث نمبر: ۲۴۵۲۔ ابن ماجہ شریف: ۳۱۱، ابواب الزھد، باب الورع والتقویٰ، حدیث نمبر: ۴۲۱۵۔

حل لغات: یدع: یترک (ترک کردے) لا بأس: یعنی از روئے ظاہر عند الفتویٰ اس میں کوئی شرعاً قباحت نہ ہو، مباح ہو، حذرا: منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی وجہ سے، بمعنی خوفا اور یکون فعل مضارع یبلغ کا ظرف ہوگا اور مضاف محذوف ہے، یعنی درجتہ متقی لغۃً اسم فاعل ہے، جو ماخوذ ہے وقاہ سے، مصدر الوقایۃ بمعنی بہت زیادہ احتیاط کرنا، محتاط ہونا، اور متقی کے شرعی معنی ''الذی یقی نفسه تعاطی ما یستحق به العقوبة من فعل او ترک'' یعنی وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ایسے فعل سے بچائے، جس کے کرنے پر عذاب کا مستحق ہو اور جس فعل کے ترک کرنے پر عذاب ہوتا ہے۔ (مرقاۃ: ۲/۲۹۶)

ترجمہ: حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک متقی لوگوں کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک چھوڑ دے ایسی چیزوں کو جس میں کوئی برائی (اور قباحت) نہیں (یعنی وہ چیز درجہ اباحت میں ہے) اس چیز سے بچاؤ کے لئے جس میں برائی (اور خرابی) ہے۔

تشریح: تقویٰ کے بہت سے درجات ہیں، ابتدائی درجہ کفر اور شرک سے نکلنا، توبہ کرنا، اور اس کے بعد اس کے درجات میں ترقیات ہوتی ہیں، اہل تقویٰ بہت زیادہ محتاط رہتے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب نہ ہو، اور ان کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ اعلیٰ درجہ تک پہنچنے کے لئے بہت سے مباح امور کو بھی ترک کرنا ہوتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک متقی و پرہیزگار نہیں ہوتا جب تک وہ اس خوف کی وجہ سے مباح چیزیں بھی نہیں چھوڑ دیتا کہ مبادا یہ مباح چیز کسی حرام یا مکروہ یا مشتبہ چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائے۔

شراب اور لعنت

{٢٦٥٦} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْخَمْرِ عَشْرَةً عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَاٰكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُشْتَرِيَ لَهَا وَالْمُشْتَرٰى لَهٗ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

حوالہ: ترمذی شریف: ١/٢٤٢، ابواب البیوع، باب ماجاء فی بیع الخمر والنھی عن ذلک، ابن ماجہ شریف: ٢٤٢، ابواب الاشربة، باب لعنة الخمر علی عشرة اوجه۔

حل لغات: لعنت: بددعا ہے رحمت الٰہی سے دور ہونے کی۔ عاصر: اسم فاعل از عصر: انگور (وغیرہ) سے شراب بنانے کے کے لئے شیرہ نکالنے والا، معتصر: جو شخص شیرہ نکلوائے، یہ اپنے لئے ہو یا کسی دوسرے کے لئے، شارب: اسم فاعل، پینے والا۔ حامل: اسم فاعل، اٹھانے والا، خواہ اپنے لئے یا

دوسرے کے لئے اگر چہ وہ غلام یا ملازم و خادم ہو، وکیل کی حیثیت سے یا کسی بھی صورت سے۔ **محمولة:** اسم مفعول، کسی کے لئے اٹھا کر لے جائے۔ **بائع:** اسم فاعل، شراب فروخت کرنے والا، مالک ہونے کی حیثیت سے یا ملازم وغیرہ ہونے کی وجہ سے، شراب فروخت کرنے پر اس کی حاصل شدہ قیمت کو کھانے والا، اسی لئے کہ معلوم ہے کہ اس سے وہ شراب بنائے گا تو اس کو انگور فروخت کرنے والا بھی اس میں شامل ہے اور شراب جس کے لئے خرید کی گئی ہے۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی شراب کے سلسلہ میں دس لوگوں پر، اس کو نچوڑنے والا اور اس کو نچڑوانے والا اور اس کا پینے والا اور اس کو لانے والا اور جس کی طرف لایا جائے اور اس کو پلانے والا اور اس کی بیع کرنے والا اور اس کی قیمت کھانے والا اور اس کو خریدنے والا اور جس کے لئے خرید کی جائے۔

تشریح: شراب کے معاملہ میں جو شخص بھی جس صورت سے اس سے وابستہ ہوگا وہ لعنت کا مستحق ہوگا، اکثر و بیشتر یہ دس صورتیں ہوا کرتی ہیں، اس لئے ان کو نامزد کر دیا گیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی، مثلاً شراب بنانے یا فروخت کرنے کے لئے جگہ کرایہ پر دی گئی تو اس کرایہ کی آمدنی کو کھانا بھی حرام ہے اور اس فہرست میں شامل و لاحق ہوگا۔

شراب نوشی کا حکم

{۲۶۵۷} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ۔ (رواه ابوداؤد وابن ماجة)

حواله: ابوداؤد شریف: ۲/۵۱۷، کتاب الاشربة، باب العصیر للخمر، ابن ماجه شریف: ۲۴۲، ابواب الاشربة، باب لعنة الخمر علی عشرة اوجه۔

ترجمه: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے، شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور اس کو پلانے والے (خادم وغیرہ) پر اور اس کو فروخت کرنے اور اس کو خریدنے والے پر اور اس کو نچوڑنے والے پر اور اس کو نچڑوانے والے پر اور اس کو لانے والے پر اور جس کے لئے لائی جاتی ہو اس پر۔

تشریح: شراب ام الخبائث ہے، جس کی وجہ سے بکثرت گناہ کا صدور ہوتا ہے، انسان کو بڑی نعمت دی گئی ہے "عقل"۔ شراب نوشی سے عقل مستور ہو کر ایسی صورتِ حال بنا دیتی ہے کہ (گویا) وہ انسان نہیں ہے بلکہ بدتر حیوان ہے۔

الخمر: یعنی صاحب شراب۔ بہر حال نفس شراب بھی ہوسکتی ہے کہ اس کی بدتر ہونے کی وجہ سے بذاتِ خود بھی ملعون ہے اور شراب والا بھی ہوسکتا ہے۔ نیز شراب نجس شی بھی ہے۔ 'قال اللہ تعالی: "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ" [شراب، جوا، بتوں کے تھان، اور جوے کے تیر یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں۔]

سینگی کی اجرت

{۲۶۵۸} **وَعَنْ** مُحَیِّصَةَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّہٗ اسْتَأْذَنَ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اُجْرَۃِ الْحَجَّامِ فَنَہَاہُ فَلَمْ یَزَلْ یَسْتَاذِنُہٗ حَتّٰی قَالَ اَعْلِفْہُ نَاضِحَکَ وَاَطْعِمْہُ رَقِیْقَکَ۔ (رواہ مالك والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

حوالہ: موطا امام مالک: ۳۸۳، کتاب الاستئذان، باب ماجاء فی الحجامعۃ واجرۃ الحجام، ترمذی شریف: ۲۴۰/۱، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کسب الحجام، حدیث نمبر: ۱۲۷۷، ابوداؤد شریف: ۴۸۶/۲، کتاب البیوع، باب کسب الحجام، حدیث نمبر: ۳۴۲۲، ابن ماجہ شریف: ۱۵۷، ابواب التجارۃ، باب کسب الحجام، حدیث نمبر: ۲۱۶۶،

ترجمہ: حضرت محیصہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی سینگی لگانے کی اجرت لینے (اور اس کو استعمال کرنے) کی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمادیا، پس وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر اجازت طلب کرتے رہے، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: اس کو اپنی اونٹنی کو کھلا دے اور کھلا دے اپنے غلام کو۔

تشریح: اعلفه: امر بمعنی (امر اباحت و اجازت) یعنی اس سے گھانس، دانہ وغیرہ خرید کر اپنی اونٹنی وغیرہ کو کھلا دے۔

ناضح: اونٹ، جس کے ذریعہ پانی دیا جائے، گذشتہ روایات کے تحت تفصیل معلوم ہو چکی کہ سینگی کا پیشہ اور اس کے ذریعہ علاج کرنا حلال ہے، حرام نہیں لیکن وہ عمل نزاہت کے خلاف ہے، کیونکہ سینگی والا آلہ منہ میں لے کر سانس کے ذریعہ خون نکالا جاتا ہے، اور اس میں ایک احتمال ہے کہ خون کا اثر سانس کے ساتھ اندر پہنچ جائے اس لئے وہ نزاہت اور نظافت کے خلاف ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافِ ورع اور کمال طہارت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اشراف کے لئے اس آمدنی کو پسند نہ فرمایا، اس لئے ان کو اجازت نہ دی، ایک سے زیادہ مرتبہ (تین مرتبہ) سوال کرنا ہوسکتا ہے کہ ضرورت کی وجہ سے اجازت طلب کرتے ہوں۔ بہرحال پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی کہ اپنے جانور کے لئے گھانس وغیرہ پر یا غلام پر اس کو خرچ کرنے کی اجازت دی۔ اگر یہ آمدنی حرام ہوتی تب تو جانور اور غلام کے لئے بھی درست نہ ہوتی۔ بہرحال یہ اجازت کراہیت کے ساتھ ہے۔ گویا کہ اس میں نہی نہی تنزیہی ہے۔

گانے بجانے کی اجرت

{۲۶۵۹} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَ کَسَبِ الزَّمَّارَةِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

حوالہ: شرح السنہ: ۱۸/۵، کتاب البیوع، باب تحریم ثمن الکلب الخ، حدیث نمبر: ۲۰۳۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور گانے والی عورت کی اجرت سے منع فرمایا۔

تشریح: الزمارۃ: زنا کار باندی، گانے والی باندی، حسین عورت، بالعموم زنا کار اور گانے والی عورت حسین ہوتی ہے، آواز میں حسن ہوتا ہے، اس لئے یہ دونوں احتمال ہیں۔ "یقال غناء زمیر" یعنی

حسنَ اور زَمَرَ بمعنی گانا، زمر الرجل: یہ اس وقت کہا جاتا ہے جس وقت بجانے کے لئے ضرب لگاتا ہو، اور اس شخص کو "زَمَّارٌ" کہتے ہیں اور عورت کو "زَامِرَةٌ" اور اکثر زنا کار عورت فاحشہ (رنڈی) کا پیشہ کرنے والی گانا بجانا بھی کرتی ہے، ابتداءً گانا بجانا ہوتا ہے اور انتہاء زنا پر ہوتی ہے، اور ایک لغت بیان کی گئی ہے کہ وہ اصل زَمَزَۃٌ ہے، جس کے معنی آنکھ اور ہونٹ کے ذریعہ اشارہ کرنا۔ اور اکثر ایسی پیشہ اور فاحشہ عورت اولاً اشارہ بازی کرتی ہے، رجال کو اپنی طرف مائل اور متوجہ کرتی ہے۔

گانے والی باندی خریدنا

{۲۶۶۰} **وَعَنْ** اَبِیْ اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَبِیْعُوْا الْقَیْنَاتِ وَلَا تَشْتَرُوْهُنَّ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ وَثَمَنُهُنَّ حَرَامٌ وَفِیْ مِثْلِ هٰذَا اُنْزِلَتْ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ) وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَعَلِیُّ بْنُ یَزِیْدَ الرَّاوِیُّ یُضَعَّفُ فِی الْحَدِیْثِ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ جَابِرٍ نَهٰی عَنْ اَکْلِ الْهِرِّ فِیْ بَابِ مَا یَحِلُّ اَکْلُهٗ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالیٰ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۲۴۱/۱، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة بیع المغنیات، حدیث نمبر: ۱۲۸۳، مسند احمد: ۲۶۴/۵، ابن ماجه شریف: ۱۵۷، ابواب التجارة، باب مالا یحل بیعه، حدیث نمبر: ۲۱۶۸،

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مت خریدو گانے والی باندیوں کو اور ان کو نہ فروخت کرو اور نہ سکھلاؤ ان کو، اور ان کی قیمت حرام ہے، اور اسی طرح کے امور اور اشیاء سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ انسانوں میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کھیل کی بات خریدتے ہیں۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے، اور اس کے ایک راوی علی بن یزید روایت حدیث کے سلسلے میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔

تشریح: بعض علماء نے حدیث کے ظاہری الفاظ "و ثمنھن حرام" کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ گانے والی لونڈیوں کو بیچنا جائز نہیں ہے، جبکہ بقیہ تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کو بیچنا جائز ہے، یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے، جس کی بناء پر اس کو کسی مسلک کی دلیل قرار دینا مناسب نہیں، لیکن اس کے باوجود "ثمنھن حرام" کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ اس حدیث کا مطلب صرف ان کے گانے کی اجرت کی حرمت کو بیان کرنا ہے، یعنی ان کے گانے سے حاصل ہونے والی اجرت و آمدنی مال حرام ہے، اس لئے کہ وہ ایک حرام ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے، نہ اس لئے کہ حرام ہے کہ ان لونڈیوں کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

004 Kitabul Buyoo

﴿الفصل الثالث﴾

کسب حلال فرض ہے

{۲۶۶۱} **وَعَنْ** عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حوالہ: بیھقی فی شعب الایمان: ۴۲۰/۶، باب فی حقوق الاولاد الخ، حدیث نمبر: ۸۷۴۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: حلال کمائی طلب کرنا فریضۂ (نماز وغیرہ) کے بعد فرض ہے۔

تشریح: معاش انسان کے لئے بنیادی ضرورت ہے، اور ہر انسان اس کو اختیار بھی کرتا ہے، شریعت نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ کسب حلال کرے، نیز شریعت نے اس کو فرض قرار دیا ہے، اور جب شریعت نے اس کو فرض کہا ہے تو یہ طاعت اور عبادت کے درجے میں بھی آ گیا ہے، لہٰذا حکم الٰہی اور اطاعت کرتے ہوئے اس کو اختیار کرنے پر آخرت میں اجر وثواب بھی مرتب ہوگا، اسی وجہ سے بہت سے کسبِ معاش کے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں، نیز قرآن کریم میں بھی صیغۂ امر کسب اور طلب حلال کا تذکرہ آیا ہے۔

بعد الفریضۃ: اس کا مطلب کیا ہے؟

(۱)......یعنی جن شرعی فرائض کا علم ہے، شریعت نے ان فرائض کو بیان کیا ہے، مثلاً نماز، روزہ وغیرہ ان کے بعد کسب حلال کا حکم ہے۔

(۲)......شرعاً بندہ پر جو فرائض عائد ہیں ان میں سے ایک کسب حلال بھی ان فرائض شرعی کے ساتھ وابستہ ہے، اور کسب حلال کو ایک اہم ترین درجہ یہ بھی حاصل ہے کہ یہ اصل ورع ہے اور اساسِ

تقویٰ بھی ہے۔(تعلیق: ۲۹۴/۳)

وضاحت: کسبِ معاش حلال کی فرضیت میں ضروری تفصیل یہ ہے کہ جس قدر انسانی حیات کے لئے لازم ہے اس قدر کسب فرض ہے اور جس قدر انفاق درجہ اباحت میں ہے اس قدر مباح اور جائز ہے اور جن افراد کا نفقہ کسی شخص پر فرض ہے ان کے لئے بھی حقوق کی ادائیگی کی غرض سے کسب لازم اور فرض ہے یا مباح ہے اور جب کہ بعض افراد کے نفقات دوسرے کے ذمہ ہوتے ہیں، مثلاً زوجہ کا نفقہ شوہر پر اور اولاد کا نفقہ تو زوجہ (عورت) پر کسب فرض نہیں ہے اور نابالغ بچوں پر بھی یہ کسب فرض نہیں ہے۔

خلاصہ کلام: بہرصورت بندہ (انسان) پر لازم ہے کہ معاش میں وہ خود کفیل ہو، اور اپنے دست و بازو کی کمائی (کسب) کے ساتھ کفالت کرے، دوسرے انسانوں کا محتاج اور دست نگر نہ ہو، اگر کسب معاش نہیں کرتا، تو پھر بہت سی ناجائز صورتیں بھی کرگذرتا ہے، دست سوال دراز کرنے لگتا ہے جو شرعاً و عرفاً بالکل ناپسندیدہ ہے۔

کتابت قرآن کریم کی اجرت

{۲۶۶۲} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا اَنَّهٗ سُئِلَ عَنْ اُجْرَةِ كِتَابَةِ الْمُصْحَفِ فَقَالَ لَا بَأْسَ اِنَّمَا هُمْ مُصَوِّرُوْنَ وَاِنَّهُمْ اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ مِنْ عَمَلِ اَيْدِيْهِمْ۔ (رواہ رزین)

حوالہ: رزین: لم یوجد۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان سے قرآن کریم کی کتابت کی اجرت سے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے جواباً فرمایا: کوئی مضائقہ نہیں ہے وہ تو محض مصور (یعنی نقش بنانے والے) ہیں اور وہ تو اپنے ہاتھوں کے عمل کی اجرت کھاتے ہیں۔

تشریح: کسب معاش میں ایک اصل یہ ہے کہ انسان "عمل بیدہ" کو اختیار کرے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس صفت خاص

کو بھی بیان فرمایا ہے۔ قال تعالیٰ: "کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدَیْهِ" (حدیث) اور اسی وجہ سے کہ یہی اصل ہے، ایک حدیث شریف میں اس کو "کسب اطیب" بھی فرمایا ہے، یعنی عمدہ ترین کسب معاش اور قرآنِ کریم کی کتابت بھی "عمل بیدہ" میں شامل ہے، لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ یقینی طور پر کسب حلال اور معاشِ طیب ہے اور اگر کسی کو اشکال وشبہ پیش آنے لگے کہ یہ آیاتِ الٰہی کی خرید وفروخت کی صورت ہوگی؟ اس شبہ اور اشکال کو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دور کرتے ہوئے فرمایا: کہ وہ حروف کی صورت کو نقش کرتا ہے، جو بندہ ہی کا عمل ہے اور وہ عمل کتابت ہے جس کی اجرت لی گئی نہ کہ مکتوب اور قرآن یا کلامِ الٰہی کی۔ (تقریر طیبی، تعلیق)

فائدہ: ایسا ہوتا ہے کہ سائل کو سوال کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہو کہ اس کی نظر نفس قرآن اور کلامِ الٰہی یعنی "المکتوب و المقروءہ" پر ہو، بلاشبہ اس کی بڑی شان وعظمت ہے، جس کی وجہ سے اس کو کسب معاش میں شمار کرنا درست نہ ہو، اس لئے استفتاء کیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس جواب وافتاء سے حقیقت الامر کو واضح کردیا ہے۔

کونسا کسب افضل ہے؟

{۲۶۶۳} **وَعَنْ** رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ؟ قَالَ: عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِهٖ وَکُلُّ بَیْعٍ مَبْرُوْرٍ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۱۴۱/۴،

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم کونسی کمائی زیادہ بہتر (اور پاکیزہ) ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر مبرور بیع۔

تشریح: اس کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کسب معاش کو افضل فرمایا ہے:

(۱)......"عمل بیدہ" اور

(۲)......وہ تجارت جو عند اللہ مقبول ہو، اور مقبول تجارت عند اللہ وہ ہے جو شرعی قوانین کے ساتھ ہو اور بندوں کے حق خیر وصلاح کے ساتھ معاملات ہوں اور ایسی تجارت پر اجر وثواب بھی ہوتا ہے اور ایسے تاجر کی فضیلت بھی آئی ہے۔

عمل الرجل بیدہ: میں تمام صنائع اور حرفات داخل ہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی شرعی قباحت اور منکر نہ ہو۔ اور اگر یہ بات کہی جائے تو حدیث پاک کی روشنی میں درست معلوم ہوتی ہے کہ کسب معاش کی دراصل دو ہی صورتیں ہیں، ایک تجارت اور ایک "عمل بیدہ" جس میں زراعت اور ہر قسم کی دستکاری وغیرہ شامل ہیں۔

دودھ فروخت کرنا

{۲۶۶۴} **وَعَنْ** اَبِیْ بَکْرِ بْنِ اَبِیْ مَرْیَمَ قَالَ: کَانَتْ لِمِقْدَامِ ابْنِ مَعْدِیْ کَرِبَ جَارِیَۃٌ تَبِیْعُ اللَّبَنَ وَیَقْبِضُ الْمِقْدَامُ ثَمَنَہٗ فَقِیْلَ لَہٗ: سُبْحَانَ اللہِ اَتَبِیْعُ اللَّبَنَ وَتَقْبِضُ الثَّمَنَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ! وَمَا بَاْسٌ بِذٰلِكَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: لَیَاْتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَنْفَعُ فِیْہِ اِلَّا الدِّیْنَارُ وَالدِّرْھَمُ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۱۳۳/۴،

ترجمہ: حضرت ابوبکر بن ابی مریم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ کی ایک باندی دودھ فروخت کرتی تھی اور حضرت مقدام رضی اللہ عنہ دودھ کی قیمت لیتے تھے، پس کسی شخص نے ان سے (از روئے تعجب) کہا: سبحان اللہ! آپ دودھ فروخت کرتے ہیں، اور قیمت وصول کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے، میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اس وقت میں لوگوں کو (کوئی شی) نفع نہیں دے گی، مگر دینار و درہم۔

تشریح: قرن اول اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں دودھ کی تجارت اور اس کی فروختگی کا رواج نہ تھا،

بلکہ اگر زائد از ضرورت ہوتا تو وہ صدقہ اور ہدیہ کی صورت میں خرچ ہوا کرتا تھا، غالباً حضرت مقدام رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہوں گے عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو باندی کے ذریعہ جانور کے دودھ کی فروختگی کراتے ہوں، جس پر اس عہد کے عرف کی وجہ سے تعجب ہوا، اور از راہِ تعجب لوگوں نے یہ بات کہی، اور حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نعم، وما به بأس" اور اس جوابِ باصواب سے اس امر کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ از روئے اصول شرع اپنی ملکیت والی اشیاء کو فروخت کرنا قطعی درست ہے، جس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، اور حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق کسبِ حلال کی ہر صورت کو اختیار کیا جائے گا، اگر ایسا نہ کریں گے تو پھر حرام راستوں پر چل پڑیں گے۔

منقول ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں فرمایا کرتے تھے کہ تجارت و محنت کے ذریعہ اتنا مال ضرور کمالیا کرو، جس سے آبرومندانہ زندگی کا تحفظ ہو سکے اور یاد رکھو ایک ایسا بھی دور آنے والا ہے کہ جب تم میں سے کوئی محتاج و تنگدست ہوگا تو سب سے پہلے اپنے دین و ایمان ہی کو کھا جائے گا۔ (مظاہر حق: ۴۴۹/۳)

اسلاف کا مقولہ ہے: **اتجروا واکتسبوا فانکم فی زمان اذا احتاج احدکم کان اول ما یأکل دینہ**" [تجارت کرو اور کمائی حاصل کرو، اس لئے کہ تم ایسے زمانہ میں ہو کہ تم میں جب کوئی شخص محتاج ہو جاتا ہے تو سب سے اوّل اپنے دین کو کھاتا ہے۔ یعنی روزی حاصل کرنے کے لئے اپنے دین کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اور حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: "**یا بنی استغن بالکسب الحلال عن الفقر فانہ ما افتقر احد الا اصابہ ثلاث خصال رقۃ فی دینہ و ضعف فی عقلہ و ذھاب مروۃ و اعظم من ھذہ الثلاث الاستخفاف الناس بہ**" (تعلیق: ۲۹۴/۳) [اے بیٹا! کسبِ حلال کے ذریعہ فقر و فاقہ سے استغناء حاصل کرو، اس لئے کہ جب کوئی شخص فقیر و محتاج ہو جاتا ہے تو تین چیزیں اس کو پیش آتی ہیں: (۱)……دین میں دقت۔ (۲)……عقل میں ضعف۔ (۳)……مروت کا ختم ہو جانا۔ اور تینوں چیزوں سے بڑھ کر لوگوں کا اس کے ساتھ استخفاف اور ہلکا جاننا ہے۔]

خلاصۂ کلام: اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دینار اور درہم، مال و دولت جو عطا فرمائی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اور بندوں کو یہ اس لئے عنایت ہوتی ہے کہ بندے باعزت طریقہ پر اس سے نفع

حاصل کریں اور شریعت کے اصول کے مطابق اور شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے اس کو استعمال کریں، تجارت کریں، بلاشبہ اس میں خیر و برکت اور صلاح کے اسباب پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد حضرت مقدام رضی اللہ عنہ نے آنے والے زمانہ میں مال و زر کی طرف لوگوں کے شدید میلان کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی بیان فرمائی کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جس میں لوگوں کی تمام تر توجہ اور کوششوں کا مرکز صرف مال و زر بن جائے گا اور اسباب معیشت کی قلت و گرانی ہر قسم کی پریشانیوں اور نقصانات میں مبتلا کر دے گی۔

بلا وجہ ذریعہ معاش کی تبدیلی نہ کی جائے

{۲۶۶۵} **وَعَنْ** نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ أُجَهِّزُ إِلَى الشَّامِ وَإِلَى مِصْرَ فَجَهَّزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَأَتَيْتُ إِلَى أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ لَهَا: يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ! كُنْتُ أُجَهِّزُ إِلَى الشَّامِ فَجَهَّزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَتْ: لَا تَفْعَلْ مَا لَكَ وَلِمَتْجَرِكَ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِذَا سَبَّبَ اللهُ لِأَحَدِكُمْ رِزْقًا مِنْ وَّجْهٍ فَلَا يَدَعْهُ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ لَهٗ أَوْ يَتَنَكَّرَ لَهٗ۔

(رواہ احمد وابن ماجۃ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۵۵، ابواب التجارات، باب اذا قسم للرجل رزق وجه فليلزمه، حدیث نمبر: ۲۱۴۸، مسند احمد: ۲۲۷/۴،

ترجمہ: حضرت نافع سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں سامانِ (تجارت) ملک شام اور ملک مصر بھیجتا تھا، پس میں نے (قصد کیا) عراق کی طرف روانہ کرنے کا، میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوا اور میں نے ان سے عرض کیا: یا ام المومنین! میں سامانِ تجارت شام روانہ کرتا ہوں، پس میں نے قصد کیا ہے عراق روانہ کرنے کا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم (یہ) نہ کرو۔ تم اپنی جس تجارت گاہ (مال روانہ کرتے ہو تو اس میں) کیا وجہ آپ کے لئے پیش آئی؟ (اس قدیم جگہ کو بلا وجہ ترک نہ کرو) کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

آنحضرت ﷺ فرمار ہے تھے: جب اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی شخص کے لئے رزق کے حصول کے لئے کوئی سبب بنادیا ہو تو اس کو ترک نہ کرو، یہاں تک کہ اس میں کوئی تبدیلی ہو جائے یا نقصان ہونے لگے اس کو۔

تشریح: اجھز: از تجھیز بروزن تفعیل، اور اس سے مراد یہ ہے کہ بذریعہ اپنے وکلاء اور کارندوں کے مالِ تجارت ملک شام برائے تجارت بھیجتا ہوں۔

فجھزت: سو پھر میں نے قصد کیا کہ ملک عراق روانہ کروں، مقصد بیان یہ ہے کہ تجارتی منڈی تبدیل کردوں۔

مالک؟: برائے استفہام اور برائے انکار ہے، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ آئندہ جملے سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مقصد اس پر انکار کرنا اور منع کرنا ہے اور اس کے بعد اس کی وجہ بھی بیان فرمائی۔

متجرک: ظرفِ مکان، یعنی آپ کی تجارتی جگہ، ملک شام کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب تک کوئی ضروری وجہ نہ ہو۔

فانی الخ: فابرائے سبب ہے، یعنی میں تم کو تبدیل نہ کرنے کا جو مشورہ دے رہی ہوں وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے جس میں آنحضرت ﷺ نے ایک اصول بیان فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کے لئے کوئی کسب معاش کا ذریعہ عطا کیا ہو اس کو اس وقت تک نہ ترک کیا جائے کہ جب تک (کوئی ایسی وجہ نہ ہو کہ اس میں) تغیر نہ ہو جائے، فائدہ نہ ہوا اور نقصان ہونے لگے، لہٰذا اب تبدیلی کے لئے ضروری وجہ اور سبب ہو گیا۔

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ جو اسبابِ معاش مباح اور جائز اختیار کئے ہوئے ہیں اور بحمد اللہ اس سے ضروریات بھی حاصل ہو رہی ہیں تو بلا کسی ضروری وجہ کے سابقہ صورت کو تبدیل نہ کیا جائے کہ دراصل وہ منجانب اللہ عطا شدہ ہے اور اس میں برکت ہے، اور اب جو تبدیلی کی تجویز پیش نظر ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں انسانی نفسانی اور وسوسۂ شیطانی اور غلط مشوروں کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہو، اور محض ترقی کے احتمالی تصور سے بھی ایسا نہ کرنا چاہئے تاوقتیکہ نقصان ہونے لگا ہو، نفع بخش نہیں رہا ہو۔ (تعلیق: ۳/۲۹۵)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی احتیاط اور کمال تقویٰ

{۲۶۶۶} **وَعَنْ** عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ كَانَ لِاَبِیْ بَكْرٍ غُلَامٌ يُخَرِّجُ لَهُ الْخِرَاجَ فَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ يَاكُلُ مِنْ خِرَاجِهٖ فَجَاءَ يَوْمًا بِشَيْءٍ فَاَكَلَ مِنْهُ اَبُوْبَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الْغُلَامُ تَدْرِیْ مَا هٰذَا فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ: وَمَا هُوَ قَالَ كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِاِنْسَانٍ فِی الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا اُحْسِنُ الْكِهَانَةَ اِلَّا اَنِّیْ خَدَعْتُهٗ فَلَقِيَنِیْ فَاَعْطَانِیْ بِذٰلِكَ فَهٰذَا الَّذِیْ اَكَلْتَ مِنْهُ قَالَتْ فَاَدْخَلَ اَبُوْبَكْرٍ يَدَهٗ فَقَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِیْ بَطْنِهٖ۔ (رواه البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۴۳، کتاب المناقب، باب مناقب الانصار، حدیث نمبر: ۳۶۴۰۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خراج دیا کرتا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی خراج کی آمد سے کھایا کرتے تھے، ایک دن کوئی شی لے کر آیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ کھالیا، کھانے کے بعد غلام نے عرض کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہاں سے آیا ہے؟ اس غلام نے عرض کیا: کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک شخص کے لئے کہانت کی حالانکہ میں کہانت (والا عمل) بہتر طریقہ پر نہیں جانتا تھا مگر میں نے اس کو دھوکہ دیا (اور اس کا کام ہوگیا) سو اس شخص نے (اب) مجھ سے ملاقات کی اور یہ اسی نے مجھ کو دی ہے، پس جو شی آپ نے کھائی ہے وہ یہی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ (حلق میں) داخل کیا اور جس قدر ان کے پیٹ میں تھا اس کو نکال دیا۔

تشریح: الخراج: وہ مقرر شدہ رقم جو غلام پر تجویز کردہ ہو کہ وہ اپنی آمدنی میں یہ مقدار مالک کو ادا کریگا۔

یخرّج: راء پر تشدید، یعنی مقرر شدہ روزانہ ادا کیا کرتا، مضاف محذوف ہے، یعنی اپنی آمدنی میں سے۔

تکھنت: بتکلف میں نے عمل کہانت کیا، جب کہ میں اس سے واقف بھی نہ تھا۔

الا: سے اس کو بیان بھی کر دیا کہ میں نے تو دھوکا (ہی) دیا تھا۔

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ کہانت اور اس کے ذریعہ مال حاصل کرنا بھی حرام ہے، اور اس کے ساتھ خداع (دھوکا دینا) بھی حرام ہے، اس طرح اس میں دو حرام کا اجتماع ہونے کی وجہ سے اس کی حرمت میں اور شدت پیدا ہوگئی ہے، بہر حال اصل حرمت اور اجرت کہانت ہی ہے، جس کو حلوان الکاہن بھی کہتے ہیں۔ (طیبی، تعلیق)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ عمل نہایت تقویٰ اور پرہیز گاری کو اختیار کرنا ہے اور کمالِ تقویٰ اور کمالِ ورع یہی ہے کہ پیٹ میں کوئی ایسی شی نہ پہنچے جس میں کسی بھی قسم کی شرعی قباحت ہو اور مالِ مشتبہ ہو، اسلاف اس کا بہت خیال رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ایسی ہمت عنایت فرمادیں۔ آمین!

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی حرام چیز کھالی ہو اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حرام چیز تھی تو اس پر لازم ہے کہ فوراً قے کر کے اس چیز کو پیٹ سے نکال دے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے منہاج العابدین میں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل تقویٰ و پرہیز گاری کی قسم سے ہے، نیز انہوں نے لکھا ہے کہ تم کسی سے کوئی چیز اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک اس کے بارہ میں پوری تحقیق نہ کرلو۔ پھر تحقیق کے بعد یقین بھی حاصل کرلو کہ اس چیز میں کسی بھی درجہ کا کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ (مظاہر حق: ۳/۴۵۰)

مال حرام کھانے پر وعید

{۲۶۶۷} **وَعَنْ** اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حوالہ: بیہقی فی شعب الایمان: ۵/۵۶، باب فی المطاعم و المشارب، فصل فی طیب المطعم

الخ، حدیث نمبر: ۵۷۶۰، بالفاظ متغیر۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو جسم مالِ حرام سے پرورش پایا ہو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

تشریح: جس بدن کی پرورش مالِ حرام سے ہوئی تھی وہ معنوی اعتبار سے نجس ہے، اس لئے وہ فی الحال عذاب کا مستحق ہے اور اس نجاست سے پاک وصاف ہونا اس کے لئے ضروری ہے، لہٰذا قصداً اور ظاہراً مال حرام نہ کھائے، مکمل پرہیز کیا جائے اور اگر عدم علم یا غفلت سے دنیا میں ایسا کیا تھا تو موت سے پہلے اس کی تلافی کرے۔

حرام مال سے نماز مقبول نہ ہوگی

{۲۶۶۸} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ مَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِعَشْرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ تَعَالٰى لَهٗ صَلَاةً مَا دَامَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ وَقَالَ صُمَّتَا اِنْ لَّمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُهٗ۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان) وَقَالَ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

حوالہ: مسند احمد: ۹۸/۲، بیہقی فی شعب الایمان: ۱۴۲/۵، باب فی الملابس والاوانی، حدیث نمبر: ۶۱۱۴،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے ایک کپڑا دس درہم میں خرید کیا اور اس میں ایک درہم حرام کا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں فرمائیں گے جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر ہے، اس کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں داخل کیں اور فرمایا: یہ دونوں کان بہرے ہوجائیں، اگر میں نے اس ارشاد کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمارہے تھے۔ (مسند احمد، بیہقی) بیہقی نے فرمایا: اس کی اسناد ضعیف ہے۔

تشریح: مادام: یعنی جب تک اس وقت تک۔

ثم دخل الخ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے از روئے تاکید یہ بیان دیا ہے کہ میں نے اس کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود سنا ہے اور مجھ کو خوب یاد ہے اور محفوظ ہے جس میں مجھ کو شک اور شبہ نہیں ہے، میں نے اس کلام کو اسی طرح بیان کیا جس طرح میں نے اس کو سنا تھا۔

عند اللہ مالِ حرام بہت مبغوض اور ناپسندیدہ شی ہے، اہل ایمان اس سے نہایت اہتمام کے ساتھ پرہیز کریں، اگر چہ وہ بہت قلیل مقدار ہو، اور اکثر حصہ مالِ حلال ہو، اور عدم قبولیت یعنی عند اللہ وہ مقبول نہ ہوگی، جس پر اجر وثواب حاصل ہوگا، البتہ اس کے ذمہ سے وہ نماز ادا ہوگئی ہے، حکم دنیوی کے اعتبار سے، لہٰذا اس پر قضاء واجب نہ ہوگی کہ جس طرح غصب کردہ زمین ومکان میں نماز پڑھی جائے تو وہ عند اللہ مقبول نہیں لیکن نماز ادا ہوگئی ہے۔ (تعلیق)

امام احمد کے نزدیک ثوب حرام کے اندر نماز جائز نہیں ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا، جمہور کے نزدیک جائز ہے اور حدیث کے متعلق علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے نیز اثابۃ کی نفی ہے۔ (مرقاۃ: ۳/۳۰۰)

005 Babul Musahlati

باب المساهلة فی المعاملة

معاملات میں نرمی اور سہولت اختیار کرنے کا بیان

رقم الحدیث: ۲۶۶۹ تا ۲۶۷۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب المساھلۃ فی المعاملۃ

معاملات میں نرمی اور سہولت اختیار کرنے کا بیان

الفصل الاول

معاملات میں نرمی کرنے والے کیلئے دعائے رحمت

{۲۶۶۹} وَعَنۡ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰہُ رَجُلًا سَمۡحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشۡتَرٰی وَاِذَا اقۡتَضٰی۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۷۸، کتاب البیوع، باب المسھولۃ والمسماحۃ فی الشری، حدیث نمبر: ۲۰۲۹۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو بیچنے میں اور خرید نے میں اور تقاضہ کرنے میں نرمی کرنے والا ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوئی کہ آدمی کو خرید وفروخت کرنے اور روپئے وغیرہ کے مطالبہ میں نرمی اور سہولت سے کام لینا چاہئے۔ایسے شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت نازل ہوتی ہے اور بد اخلاقی اور بدکرداری سے پرہیز کرنا چاہئے۔مطالبہ میں سختی سے کام لینا ایک مذموم حرکت ہے۔

نرم خوئی فضیلت

{۲٦٧٠} **وَعَنْ** حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَجُلًا كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهٗ فَقِيْلَ لَهٗ: هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ قَالَ قَالَ مَا اَعْلَمُ قِيْلَ لَهٗ اُنْظُرْ قَالَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ اَنِّيْ كُنْتُ اُبَايِعُ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا وَاُجَازِيْهِمْ فَاُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَاَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَاَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ نَحْوَهٗ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ وَاَبِيْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيِّ فَقَالَ اللهُ اَنَا اَحَقُّ بِذَا مِنْكَ تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِيْ۔

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۴۹۰، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۳۴۳۴، مسلم شریف: ۲/۱۷، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر والتجاوز، حدیث نمبر: ۱۵٦۰۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بالیقین تم لوگوں سے قبل ایک شخص تھا، اس کے پاس فرشتہ آیا، تاکہ اس کی روح قبض کرے، پس اس شخص سے سوال کیا گیا تو نے کوئی نیک عمل (بھی) کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نہیں جانتا، اس سے پھر سوال کیا گیا، اچھی طرح سوچ لے، اس نے جواب دیا: مجھے کچھ یاد نہیں ہے، البتہ میں دنیا میں لوگوں سے خرید وفروخت کرتا تھا اور ان کے ساتھ (حسن وخوبی کا برتاؤ کرتا) درگذر سے کام لیتا تھا، مالدار کو مہلت اور تنگدست سے درگذر کیا کرتا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کر دیا۔(متفق علیہ) اور مسلم شریف

کی ایک روایت میں اس کی مانند مروی ہے بروایت حضرت عقبہ بن عامر اور ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہما، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اس (آسانی اور درگذر کرنے) کا زیادہ حق رکھتا ہوں تیرے مقابلہ میں (اے فرشتو! تم) میرے بندہ سے درگذر کرو۔

تشریح: اتاہ الملک: اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ خود حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی اس کی روح قبض کرنے آئے تھے، یا پھر یہ کہ ان فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ آیا ہوگا جو حضرت عزرائیل علیہ السلام کے مددگار و ماتحت ہیں، اغلب یہ ہے کہ خود حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی آئے ہونگے، کیونکہ قبض روح کے سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ارواح قبض کرنے کا کام حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی انجام دیتے ہیں۔

فقیل له: اس سوال کے بارے میں بھی دونوں احتمال ہیں، یا تو اس سے یہ سوال اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا، یا فرشتوں نے یہ بات پوچھی۔ نیز وقت سوال کے سلسلہ میں زیادہ واضح بات تو یہ ہے کہ اس شخص سے یہ سوال روح قبض کرنے سے پہلے کیا گیا تھا، جیسا کہ حدیث کے ابتدائی الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سوال روح قبض ہونے کے بعد قبر میں کیا گیا ہوگا، جیسا کہ شیخ مظہر کا قول ہے۔ اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ دراصل یہ سوال قیامت میں کیا جائے گا۔ بہرحال اس حدیث شریف سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مطالبات کی وصولی میں مستطیع کو مہلت دینا اور نادار شخص کو معاف کر دینا بڑے ثواب کی چیز ہے۔

خرید و فروخت میں زیادہ قسمیں کھانا

{۲۶۷۱} **وَعَنْ** اَبِیْ قَتَادَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِیَّاکُمْ وَ کَثْرَةَ الْحَلْفِ فِی الْبَیْعِ فَاِنَّهٗ یُنَفِّقُ ثُمَّ یَمْحَقُ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۳۲/۲، کتاب المساقاة، باب النهی عن الحلف فی البیع، حدیث نمبر: ۱۶۰۷،

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بچو تم زیادہ قسم کھانے سے بیع میں، کیونکہ زیادہ قسمیں کھانا کاروبار کو رواج دیتا ہے، مگر پھر برکت ختم (اور زائل) ہو جاتی ہے۔

تشریح: تجارتی معاملات میں زیادہ قسمیں کھانے کی وجہ سے وقتی طور پر کاروبار میں وسعت ہوتی ہے، بایں طور کہ لوگ قسم پر اعتبار کر کے زیادہ خریداری کی طرف مائل ہوتے ہیں، لیکن انجام کار زیادہ قسمیں کاروبار میں خیر و برکت کو ختم کر دیتی ہیں، کیونکہ جس آدمی کو زیادہ قسمیں کھانے کی عادت ہوگی اس سے جھوٹی قسموں کا بھی صدور ہونے لگے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک تو باطنی طور پر اس کی تجارت سے خیر و برکت کی روح نکل جائے گی، دوسرے اس کا اعتبار آہستہ آہستہ اٹھنے لگے گا، اور لوگ اس سے لین دین کرنے میں تامل کرنے لگیں گے اور چھوڑ دیں گے۔

ایضاً

{۲۶۷۲} وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْحَلْفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَکَةِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۸۰، کتاب البیوع، باب یمحق اللہ الربوا ویربی، حدیث نمبر: ۲۰۸۷، مسلم شریف: ۲/۳۲، کتاب المساقاۃ، باب النهی عن الحلف فی البیع، حدیث نمبر: ۱۶۰۶۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے، وہ فرما رہے تھے: (جھوٹی یا کثرت کے ساتھ) قسم کھانا سامان کے چلنے کا (فروخت کرنے کا تو) باعث ہے اور برکت کو مٹا دینے (اور زائل کر دینے) کا سبب ہے۔

تشریح: الحلف: حا کے فتح اور لام کے کسرہ کے ساتھ اور سکون لام بھی جائز ہے۔ "قالہ

السندی علی النسائی قلت ویجوز فیه کسر الحاء مع سکون اللام"

اگر قسم جھوٹی ہے تب تو کراہۃ تحریمی ہے اور اگر سچی ہے تب بھی مکروہ ہے بکراہۃ تنزیہ۔ یعنی تاجر کا جھوٹی قسم کھانا (اس لئے کہ مسند احمد کی روایت میں "الیمین الکاذبۃ" ہے) یہ تاجر کے سامان کو تو چالو کرنے والی ہے، لیکن برکت کو کم کرنے والی ہے، یا مٹانے والی ہے۔

منفقه: میم اور فاء کے فتحہ کے ساتھ درمیان میں نون ساکن ہے، یہ ماخوذ ہے نفاق بفتح النون سے، وھو الرواج ضد الکساد۔ اور لفظ ممحقة بروزن منفقة، اور اس میں ایک روایت ضم میم اور سکر حاء کی بھی ہے، یہ ماخوذ ہے محق سے، بمعنی النقص والابطال، مطلب ظاہر ہے کہ جھوٹی قسموں سے سامان تو نکل جاتا ہے، فروخت ہو جاتا ہے، لیکن اس تجارت میں برکت نہیں ہوتی۔ (الدر المنضود: ۵/۳۳۳)

ایضاً

{۲۶۷۳} وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ثَلَاثَۃٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ قَالَ اَبُوْذَرٍّ: خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ ھُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلِفِ الْکَاذِبِ۔ (رواہ مسلم)

حواله: مسلم شریف: ۱/۷۱، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار، حدیث نمبر: ۱۰۶۔

ترجمه: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین (قسم کے) لوگوں سے روز قیامت اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف (رحمت کی) نظر فرمائیں گے اور نہ ان کو (گناہ کی گندگی سے) صاف کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: خیر و بھلائی سے محروم اور گھاٹے میں رہنے والے وہ کون شخص ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک پائچے لٹکانے والا، دوسرا احسان جتلانے والا اور تیسرا جھوٹی قسم کھا کر اپنی تجارت بڑھانے والا۔

تشریح: المسبل: اس سے مراد وہ شخص ہے جو از راہ تکبر ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتا یا لٹکاتا

ہے، چنانچہ اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جو ٹخنوں سے نیچا کرتا پہنے، البتہ اگر کسی کا پاجامہ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے کسی مجبوری کی وجہ سے یا غیر اختیاری طور پر لٹک جائے، لیکن تکبر کی وجہ سے نہ ہو تو وہ اس وعید میں داخل نہ ہوگا۔

والمنان: اس کے تین معنی ہیں:

(١)......احسان جتلانے والا۔

(٢)......کیل وزن کے اندر کمی کرنے والا۔

(٣)......قاطع رحم۔

احسان جتانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کر کے یا ہمدردی کا کوئی معاملہ کر کے احسان جتائے۔ چنانچہ احسان جتلانے والا ثواب سے محروم رہتا ہے۔

والمنفق الخ: اس سے مراد وہ تاجر ہے جو زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے یا اپنا مال تجارت بڑھانے کے لئے جھوٹی قسمیں کھائے۔

تنبیہ: آج ان تینوں چیزوں میں ابتلاء عام ہو رہا ہے، اس لئے ان تینوں چیزوں سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

امانت دار اور سچائی پسند تاجر

{۲۶۷۴} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی والدارقطنی) وَرَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ التِّرْمِذِیُّ: ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۲۹، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، حدیث نمبر: ۱۲۰۹، دارمی: ۲/۳۲۲، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، حدیث نمبر: ۲۵۳۹، دار قطنی: ۲/۶، کتاب البیوع، حدیث نمبر: ۲۷۸۹، ابن ماجہ: ۱۵۵، ابواب التجارۃ، باب البحث علی المکاسب، حدیث نمبر: ۲۱۳۹۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امانت دار سچا تاجر (بروز قیامت) انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی، دارمی، دارقطنی) اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بروایت ابن عمر نقل کی ہے، ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: جس تاجر میں دو خوبیاں ہوں:

(۱)......سچائی۔ (۲)......امانت داری۔

تو گویا اس کی زندگی تمام صفات کمالیہ سے مزین ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا یا تو میدان حشر میں نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ اور جس طرح وہاں کی ہولناکیوں کے وقت یہ تینوں طبقے رحمت الٰہی کے سایہ میں ہونگے اسی طرح وہ شخص بھی رحمت خداوندی کی خاص پناہ میں ہوگا۔ یا اسے جنت میں ان کی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا۔ چنانچہ اسے انبیاء علیہم السلام کی رفاقت تو ان کی اطاعت وفرمانبرداری

کی وجہ سے حاصل ہوگی۔ صدیقین کے ساتھ ان کی صفت خاص یعنی صدق کی موافقت کی وجہ سے ہوگا۔ اور شہیدوں کی رفاقت کی سعادت اسے اس لئے نصیب ہوگی کہ شہید اس شخص کے وصف صدق وامانت کی شہادت دیں گے۔

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ ہر تاجر کو یہ دو خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے، تا کہ کائنات کی عظیم المرتبت ہستیوں کے ساتھ اس کا حشر ہو۔ (تحفۃ الالمعی)

تجارت کے ساتھ صدقہ وخیرات

{۲۶۷۵} **وَعَنْ** قَيْسِ بْنِ اَبِيْ غَرْزَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ كُنَّا نُسَمّٰى فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّمَاسِرَةَ فَمَرَّ بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمَّانَا بِاِسْمٍ هُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ! اِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ فَشُوْبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ۔ (رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجة)

حواله: ابوداؤد شریف: ۲/۴۷۲، کتاب البیوع، باب فی التجارة یخالطها الحلف، حدیث نمبر: ۳۳۲۶، ترمذی شریف: ۱/۲۲۹، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، حدیث نمبر: ۱۲۰۸، نسائی شریف: ۲/۱۲۶، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف والکذب لمن لم یعتقد، حدیث نمبر: ۳۸۲۸، ابن ماجه شریف: ۱۵۵، ابواب التجارات، باب التوقی للتجارة، حدیث نمبر: ۲۱۴۵،

ترجمه: حضرت قیس بن ابی غزرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں (تجار) سماسرہ کے نام سے موسوم تھے، ایک مرتبہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گذرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا نام اس سے (بھی) بہت عمدہ تجویز فرمایا، ارشاد فرمایا: اے جماعت تجار! یقینا خرید وفروخت میں لغو (اور فضول گوئی) ہوجاتی ہے اور قسم (بھی) لہٰذا تم لوگ اس کو صدقہ کے ذریعہ صاف کرو۔

تشریح: قیس بن ابی غزرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم شروع عہد نبوی میں سماسرہ کہلاتے

تھے، یعنی تاجروں کو سماسرہ کہا جاتا تھا، جوکہ سمسار بمعنی الدلال کی جمع ہے، ایک روز حضور اقدس ﷺ بازار میں تاجروں کے پاس کو گذرے، وہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز آنحضرت ﷺ نے ہمیں بڑے اچھے نام سے یاد فرمایا، فرمایا: یامعشر التجار! اے تاجروں کی جماعت! دیکھو لین دین اور بیع وشراء میں لغویات اور جھوٹی سچی قسم زبان پر آجاتی ہے، تو تم اپنے اس عمل کو صدقہ کے ساتھ ملالیا کرو، یعنی روزانہ حسب گنجائش ووسعت کچھ صدقہ کرتے رہا کرو، تاکہ ان لغویات کی تلافی ہوجائے۔

تاجر کا نام سمسار سے کیوں اچھا ہے؟ اس لئے کہ تجارت الفاظ عربیہ میں سے ہے، قرآن کریم میں مذکور ہے، بخلاف سمسار کے کہ وہ عجمی لفظ ہے۔ (الدر المنضود: ۵/۳۲۷)

تجار سماسرہ سے احسن کس وجہ سے ہے؟ اس کے اندر چند قول ہیں:

(۱)……سماسرہ دلال کو کہتے ہیں اور دلال سے تمام لوگ نفرت کرتے ہیں۔

(۲)……تجارت کا ذکر قرآن پاک میں ہے اور سماسرہ کا لفظ قرآن میں نہیں ہے۔

(۳)……تجار عربی خالص ہے۔ (تقریر حضرت شیخ زکریا قدس سرہٗ)

تاجروں کا حشر

{۲۶۷۶} **وَعَنْ** عُبَيْدِ بْنِ رُفَاعَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: التُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَبَرَّ وَصَدَقَ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی) وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ الْبَرَاءِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

حواله: ترمذی شریف: ۲۳۵/۱، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، حدیث نمبر: ۱۲۱۰، ابن ماجه شریف: ۱۵۵، ابواب التجارة، باب الترقی فی التجارة، حدیث نمبر: ۲۱۴۶، دارمی: ۳۲۲/۲، کتاب البیوع، باب فی التجار، حدیث نمبر: ۲۵۳۸، بیهقی فی شعب الایمان: ۲۱۹/۴، باب فی حفظ اللسان، حدیث نمبر: ۴۸۴۸۔

ترجمہ: حضرت عبید بن رفاعہ رحمۃ اللہ علیہ بروایت والد خود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تاجر لوگ بروز قیامت جمع کئے جائیں گے فاجر (اور فاسق لوگوں) کے ساتھ، مگر جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتا اور سچائی اختیار کرتا تھا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی بروایت براءؓ) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تجار حضرات عموماً فسق وفجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، خیانت کرتے ہیں، وعدہ خلافی کرتے ہیں، کم تولتے ہیں، بعض دفعہ قیمت پوری ادا نہیں کرتے۔ عیب دار چیز کا عیب ظاہر نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے ایسے تاجر لوگوں کا حشر فاسق وفاجر لوگوں کے ساتھ ہوگا اس لئے تجار حضرات کو ان برائیوں سے اپنے آپ کو بہت زیادہ بچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

006 Babul Khiyar

باب الخیار

خیار کا بیان

رقم الحدیث: ۲۶۷۷ / تا ۲۶۸۲ /

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الخیار

خیار کا بیان

لفظ ''خیار'' اختیار کا اسم مصدر ہے، جس کے معنی ہیں: ''دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا، چنانچہ کسی تجارتی معاملہ کو فسخ کرنے یا اس کو باقی رکھنے کا جو اختیار خریدار اور تاجر کو حاصل ہوتا ہے وہ اصطلاحِ فقہ میں ''خیار'' کہلاتا ہے۔ (مرقاۃ:۶/۵۵)

تجارتی معاملات میں اس اختیار کی کئی قسمیں ہیں، جو تفصیل سے کتب فقہ میں مذکور ہیں، تاہم اس موقع پر ان قسموں کے نام اور تعریفات کا ذکر کردینا ضروری ہے۔

(۱)...... ''خیار قبول'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص بیع کے لئے ایجاب کردے تو دوسرے فریق کو مجلس کے اندر اس کو قبول یا عدم قبول کا اختیار ہے، مجلس ختم ہونے تک یہ اختیار رہے گا اور مجلس ختم ہونے پر ایجاب ختم ہوجائے گا اور خیار قبول باقی نہ رہے گا۔

(۲)...... ''خیار شرط'' تجارتی معاملہ طے ہوجانے کے بعد تاجر یا خریدار یا دونوں کو اس معاملہ کے ختم کردینے یا باقی رکھنے کا حق دیا جانا ''خیار شرط'' کہلاتا ہے، یہ اختیار تین دن تک رہتا ہے، اس کے بعد بیع تام ہوجاتی ہے، اختیار باقی نہیں رہتا۔

(۳)...... ''خیار عیب'' بیع ہوجانے کے بعد خریدی ہوئی چیز میں کوئی عیب معلوم ہوجائے تو اس کے بعد اس چیز کو رکھ لینے یا واپس کردینے کا جو اختیار خریدار کو حاصل ہوتا ہے، اسے ''خیار عیب'' کہتے ہیں، البتہ اگر بائع نے اس چیز کو فروخت کرتے وقت مشتری سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں کسی عیب کا

ذمہ دار نہیں ہوں خواہ خریدو یا نہ خریدو اور پھر بھی خریدار رضامند ہو گیا تو پھر واپس نہیں کر سکتا، چاہے اس میں کوئی عیب بھی نکلے، اس صورت میں خیارعیب حاصل نہیں ہوگا۔

(۴)……''خیارِ رؤیت''بغیر دیکھی ہوئی چیز کو خریدنے کے بعد اس چیز کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا جو اختیار مشتری کو حاصل ہوتا ہے اسے ''خیارِ رؤیت'' کہتے ہیں۔

(۵)……''خیارِ تعیین''، چند چیزوں میں بعض کو رکھ لینے اور بعض کو واپس کرنے کا جو اختیار حاصل ہوتا ہے، اسے خیارِ تعیین کہتے ہیں۔

ان اقسام کے علاوہ اس باب میں ایک قسم ہے جسے ''خیارِ مجلس'' کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب و قبول مکمل ہو جانے کے بعد مجلس کے ختم ہونے تک دونوں فریقوں کو بیع ختم کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے، لیکن خیار کی اس قسم میں اختلاف ہے، چنانچہ امام شافعی، امام احمد اور ان کے متبعین رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک یہ خیار بھی ثابت ہے، جب کہ حنفیہ اور مالکیہ خیارِ مجلس کے قائل نہیں، بلکہ ایجاب وقبول ہو جانے کے بعد معاملہ تکمیل پا گیا، مجلس کے اندر اگر ایک فریق ''بیع'' فسخ کرنا چاہے تو دوسرے فریق پر اس فسخ کو قبول کرنا لازم نہیں، البتہ دوسرے فریق کی رعایت کرتے ہوئے اپنی خوشی سے معاملے کو ختم کر دیا جائے تو یہ مستحسن بات ہے۔(نفحات التنقیح: ۳/۴۰۷)

الفصل الاوّل

مسئلہ خیارِ مجلس

{۲۶۷۷} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُتَبَایِعَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِنْہُمَا بِالْخِیَارِ عَلٰی صَاحِبِہٖ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا اِلَّا بَیْعَ الْخِیَارِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ) وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِّمُسْلِمٍ اِذَا تَبَایَعَ الْمُتَبَایِعَانِ فَکُلُّ وَاحِدٍ مِّنْہُمَا بِالْخِیَارِ مِنْ بَیْعِہٖ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا اَوْ یَکُوْنُ بَیْعُہُمَا عَنْ خِیَارٍ فَاِذَا کَانَ بَیْعُہُمَا عَنْ خِیَارٍ فَقَدْ وَجَبَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلتِّرْمِذِیِّ اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا اَوْ یَخْتَارَا وَفِی الْمُتَّفَقِ عَلَیْہِ اَوْ یَقُوْلُ اَحَدُہُمَا لِصَاحِبِہٖ اِخْتَرْ بَدَلَ اَوْ یَخْتَارَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/ ۲۸۳، کتاب البیوع، باب البیعان مالم یتفرقا، حدیث نمبر: ۲۰۶۴، مسلم شریف: ۲/ ۶، البیوع، باب ثبوت خیار المجلس، حدیث نمبر: ۱۵۳۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر دو خرید وفروخت کرنے والے شخص اپنے ساتھی (فریق) پر اختیار رکھتے ہیں اپنی بیع میں، (یعنی ہر شخص بااختیار ہے) جس وقت تک وہ دونوں جدا نہ ہوں، مگر بیع خیار میں، اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے: بائع اور مشتری جب باہم بیع کریں تو دونوں کو جس وقت تک دونوں علیٰحدہ علیٰحدہ نہ ہوں اختیار رہے۔ یا جب کہ بیع خیار کے ساتھ مشروط ہو، پس جب بیع خیار کے ساتھ مشروط ہو تو اختیار لازم ہے، اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ بائع اور مشتری کو اختیار رہے جب کہ وہ دونوں جدا نہ ہوں الّا یہ کہ وہ دونوں خیار کی شرط لگا دیں۔ اور بخاری ومسلم کی ایک روایت میں ہے: یا ان دونوں میں سے ہر شخص اپنے ساتھی سے (یوں) کہے: کہ خیار کی شرط لگاؤ، اس روایت میں ''اختر'' کا لفظ ہے یختارا کی جگہ۔

خیار مجلس کے سلسلے میں ائمہ کا اختلاف

تشریح: امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما نے اس حدیث شریف سے خیار مجلس کے ثبوت پر استدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے، ان کے نزدیک بیع صرف ایجاب اور قبول سے لازم نہیں ہوتی، بلکہ ایجاب وقبول کے بعد مجلس کی بقاء تک عاقدین میں سے ہر ایک کو بیع فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے، یہاں تک کہ مجلس بیع ختم ہو جائے اور تفرق بالابدان ہو جائے، البتہ تفرق بالابدان ہونے کے بعد بیع لازم ہو جاتی ہے، جبکہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک ''بیع'' ایجاب اور قبول سے لازم ہو جاتی ہے، اور مجلس بیع کی وجہ سے کسی کو بھی اختیار نہیں ہوتا، البتہ خیار شرط، خیار رؤیت، اور خیار عیب کی وجہ سے اختیار کا باقی رہنا جدا امر ہے اس کا خیار مجلس سے کوئی تعلق نہیں۔(احکام القرآن للجصاص:۲/۱۷۵)

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ اور مالکیہ کا استدلال ایک تو قرآن کریم کی اس آیت سے ہے: "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (مائدہ:۱) کیونکہ ہر عقد کی حقیقت ایجاب اور قبول ہے، لہٰذا جب بیع میں یہ دونوں رکن متحقق ہو گئے تو عقد تام ہو گیا، اور آیت سے اس کا ایفاء واجب ہوا، اگر خیار مجلس ثابت ہو جائے تو عقد کے تام ہونے کے باوجود ایفاء نہیں ہوگا معلوم ہوا کہ خیار مجلس ایفاء عقد کے منافی ہے جو کہ آیت سے ثابت ہے۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" (النساء:۲۹)[اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے)۔] ظاہر ہے کہ ایجاب اور قبول کرنے سے تراضی متحقق ہوگئی اور ''مبیع'' پر مشتری کی ''ثمن'' پر بائع کی ملکیت ثابت ہوگئی، لہٰذا کسی کو بھی دوسرے کی اجازت کے بغیر ''بیع'' فسخ کرنے کا

اختیار نہیں ہوگا۔ "خیارِ مجلس" کی وجہ سے اگر عاقدین کو ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر فسخ کرنے کا اختیار دیا جائے تو اس آیت کے منافی ہوگا۔(التعلیق: ۲۹۸/۳)

اس کے علاوہ احادیث مبارکہ سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

چنانچہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے استدلال کیا ہے: "من ابتاع طعاما فلا یبعه حتی یستوفیه" [جو شخص غلہ خریدے اس کو فروخت نہ کرے، یہاں تک کہ اس پر قبضہ کرلے۔] اس حدیث شریف میں بیع طعام سے ممانعت فرمائی ہے اور اس ممانعت کی غایت ہے "قبض مبیع"، تو مطلب یہ ہوا کہ "قبض مبیع" جب ہو جائے تو مشتری اس کا مالک بن جاتا ہے اور اس میں ہر قسم کے تصرف کا حقدار ہوتا ہے، اگر خیارِ مجلس ثابت ہوتا تو بیع بعد القبض جائز نہ ہوتی بلکہ مجلس کے اختتام پر موقوف ہوتی۔(شرح معانی الآثار: ۲/۲۲۴)

اسی طرح علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث شریف سے استدلال کیا ہے، جس میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اونٹ خرید کر تفرق بالابدان سے پہلے علی الفور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو ہبہ کر دیا۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر خیارِ مجلس ثابت ہوتا تو وہ اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خیار کے ختم ہونے سے پہلے ہبہ نہ کرتے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ایسی چیز ہبہ میں دیں جس میں کسی اور کا اختیار باقی ہو۔(اعلاء السنن: ۱۴/۱۹)

شافعیہ اور حنابلہ کے استدلال کا جواب

حنفیہ اور مالکیہ کی طرف سے امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کے استدلال کے متعدد جوابات دئے گئے ہیں، ایک تو یہ کہ تفرق اور جدائی کی دو قسمیں ہیں: تفرق بالابدان اور تفرق بالکلام والاقوال" حدیث باب میں تفرق سے مراد ثانی ہے اول نہیں تو گویا حدیث سے خیار قبول ثابت ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ عاقدین میں سے کسی نے ایجاب کیا، مثلاً: "بِعتُ" کہا، اب دوسرے عاقد کو قبول کرنے اور "اِشْتَرَیْتُ" کہنے کے بعد رد کرنے کا اختیار نہیں، کیونکہ "تفرق بالاقوال" ہو گیا، یعنی دونوں اپنی بات کر

کے اور ایجاب و قبول کر کے فارغ ہو گئے، اب رضامندی کے بغیر فسخ ممکن نہیں۔

''تفرق'' کی یہی تفسیر ابراہیم نخعی، سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الحجۃ اور موطا میں بھی اسی کی تصریح فرمائی ہے۔ (موطا امام محمد: ۳۴۱)

قرآن حکیم سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ تفرق کے معنی جیسے تفرق بالابدان کے آتے ہیں، اسی طرح تفرق بالاقوال کے معنی میں بھی وہ مستعمل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ" (البینۃ: ۴) [اور جو اہل کتاب تھے، انہوں نے جدا راستہ اسی کے بعد اختیار کیا، جب ان کے پاس روشن دلیل آ چکی تھی۔] ظاہر ہے کہ تفریق سے مراد تفرق بالاقوال ہے تفرق بالابدان نہیں۔ (فتح الباری: ۳۲۷/۴)

اسی طرح قرآن حکیم میں ارشاد ہے: "وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ" (النساء: ۱۳۰) [اور اگر دونوں جدا ہی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی (قدرت اور رحمت) کی وسعت سے دونوں کو (ایک دوسرے کی حاجت سے) بے نیاز کر دیگا، اللہ تعالیٰ بڑی وسعتوں والا اور بڑی حکمت والا ہے۔] چنانچہ اس آیت میں ''جدا ہونے'' کا مطلب مجلس سے جدا ہونا نہیں بلکہ خاوند بیوی کے درمیان طلاق کے ذریعہ جدائی مراد ہے کہ خاوند یہ کہے کہ میں نے تم کو اتنے پیسوں پر طلاق دی اور بیوی یہ کہے کہ میں نے قبول کیا۔ (فیض الباری: ۲۱۰/۳)

دوسری یہ کہ تفرق سے مراد ''تفرق بالابدان'' ہے، لیکن اپنے معنی پر محمول نہیں، بلکہ عقد سے فراغت اور ''تفرق بالاقوال'' سے کنایہ ہے، کیونکہ عاقدین جب عقد سے فارغ ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، تو گویا ''تفرق بالابدان'' عنوان ہے اور ''تفرق بالاقوال'' معنون ہے، اور مراد عنوان سے معنون ہی ہے، کیونکہ کنایہ کی صورت میں لفظ سے معنی موضوع لہ مراد نہیں ہوتے۔

یہ توجیہ حضرت علامہ محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اولیٰ ہے اور اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ خیار سے مراد خیار مجلس نہیں بلکہ خیار قبول ہے۔ (فیض الباری: ۲۱۰/۳)

حنفیہ کے ان جوابات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث میں ''متبایعان'' کا لفظ آیا ہے، جس سے خیار قبول کی طرف اشارہ ہے۔

کیونکہ عاقدین کو قبول الایجاب والقبول "متبایعان" کہنا مجاز باعتبار مایؤل ہوگا اور بعد الایجاب والقبول چاہے مجلس برقرار ہو مجاز باعتبار ما کان ہوگا اور بیع کے دوران یعنی جس وقت بیع میں مشغول ہیں ایک کی طرف سے ایجاب ہوا ہے دوسرے کی طرف سے قبول نہیں ہوا، اس حالت میں عاقدین کو "متبایعان" کہنا حقیقت ہے، جیسا کہ متضاربان اور متقاتلان وہی ہیں، جو بالفعل مشغول بالضرب والقتال ہوں، لہٰذا "متبایعان" کے معنی بھی "متشاغلان بالبیع" کے ہوں گے۔

اور ظاہر ہے کہ معنی حقیقی خیار قبول ہی کی صورت میں مراد لئے جا سکتے ہیں، کیونکہ اس وقت بائع اور مشتری عقد میں مشغول ہوتے ہیں، جبکہ خیار مجلس کی صورت میں بائع اور مشتری کو متبایعان کہنا مجاز باعتبار ما کان ہے کیونکہ دونوں عقد سے فارغ ہو چکے ہیں، اور ایجاب و قبول ہو چکا ہے، لہٰذا مجازی معنی کا مراد لینا خلاف الاصل ہے اور حقیقی مراد لینا ہی بہتر ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: **"وفیه اشارة الیه فانهما متبایعان حالة البیع حقیقة و ما بعده او قبله مجازا"** (عمدۃ القاری: ١٩٦/١١)

حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تفرق سے تفرق بالابدان مراد ہے اور خیار سے بھی خیار مجلس وجوباً یا الزاماً ثابت کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف آپس میں حسن معاشرت کے طور پر اور احتیاطاً اختلاف سے بچنے کے لئے خیار مجلس کو استحباباً اور استحساناً مانا جائے گا۔ (التعلیق: ٣٠٠/٣)

الا بیع الخیار: اس استثناء کے بارے میں کئی توجیہات کی گئی ہیں:

(١)...... یہ استثناء **"مالم یتفرقا"** کے مفہوم سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تفرق کے بعد خیار باقی نہیں رہتا اور عقد بیع لازم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر خیار شرط رکھ لیں تو یہ خیار تفرق کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اپنی مدت تک، یہ مطلب دونوں مذہبوں پر منطبق ہو سکتا ہے۔

(٢)...... یہ استثناء اصل حکم سے یعنی **"المتبایعان بالخیار"** ہے اور مستثنیٰ میں مضاف محذوف ہے دراصل عبارت ہے: **"الا بیع اسقاط الخیار"** اور مطلب یہ ہے کہ متبایعین میں سے ہر ایک کو خیار مجلس ہوگا، مگر اس بیع میں جس میں اسقاط خیار کی شرط لگائی گئی ہو، یعنی عقد ہی میں یہ بات طے ہو جائے کہ خیار مجلس نہیں ہوگا تو اس کے طے ہونے کی وجہ سے خیار مجلس مستثنیٰ ہو جائے گا۔

006 Babul Khiyar

(۳)...... "الا بیع الخیار" کا مطلب یہ ہے کہ عاقدین میں سے کوئی ایک دوسرے سے کہہ دے "اختر" اور مطلب یہ ہے کہ بعد میں اختیار نہیں ہوگا، ابھی سوچ لو، دوسرا کہے: "اخترت" یعنی میں نے سوچ لیا، دونوں کے اس طرح کہنے کی وجہ سے بیع فسخ کرنے کا خیار ختم ہوگیا، اگرچہ مجلس ابھی تک ختم نہ ہوئی، تو "الا بیع الخیار" کے معنی ہوئے "الا بیعا جری فیہ التخایر" یہ دونوں توجیہات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر منطبق ہوتی ہیں۔

(مرقاۃ:۵۵/۶، فتح الباری:۳۳۳/۴، نفحات التنقیح:۴۰۸/۳)

جھوٹ اور فریب دہی سے برکت نہیں

{۲۶۷۸} **وَعَنْ** حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذِبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۷۹/۱، کتاب البیوع، باب مایمحق الکذب والکتمان، حدیث نمبر: ۲۰۳۵، مسلم شریف: ۶/۲، البیوع، باب ثبوت خیار المجلس، حدیث نمبر: ۱۵۳۲۔

ترجمہ: حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بائع اور مشتری دونوں اختیار کے ساتھ ہوتے ہیں جب تک دونوں علاحدہ علاحدہ نہ ہوں، سو اگر دونوں نے سچائی اختیار کی اور صاف صاف کہہ دیا تو دونوں کے لئے ان کے عقد بیع میں برکت دی جائے گی اور اگر (عیب وغیرہ) کو چھپایا اور جھوٹ بولے تو ان کو بیع کی برکت دور کر دی جائے گی۔

تشریح: ما قبل میں گذر چکی۔

دین میں فریب نہیں

{۲۶۷۹} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَجُلٌ

لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اُخْدَعُ فِي الْبُيُوْعِ فَقَالَ اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَقُوْلُهٗ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۲۴، الاستقراض، باب ما ینھی عن اضاعۃ المال، حدیث نمبر: ۲۳۴۴، مسلم شریف: ۲/۷، البیوع، باب من یخدع فی البیع، حدیث نمبر: ۱۵۳۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کیا: کہ میں بیع میں دھوکہ کھا جاتا ہوں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یقیناً عقد بیع کرو تو کہہ دیا کرو نہ غبن ہے اور نہ دھوکا اس عقد بیع میں یعنی اس طرح کی چیز نہ ہونی چاہئے ورنہ تم اس کے ذمہ دار ہو، چنانچہ وہ شخص (بوقت عقد ہی) کہہ دیا کرتا تھا۔

تشریح: حدیث شریف میں "رجل" سے مراد حضرتِ حبان بن منقذ بن عمرو الانصاری المازنی رضی اللہ عنہ ہیں، جیسا کہ روایات میں اس کی تصریح آئی ہے۔ (طیبی: ۴/۴۰)

بیہقی اور ابن ماجہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام منقذ بن عمر ہے اور یہ حبان کے والد ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ (تلخیص الحبیر: ۳/۲۱)

اور چونکہ ان کے سر میں زخم آیا تھا، جس کی وجہ سے زبان بھی ثقیل ہوگئی تھی اور عقل بھی ناقص ہوگئی تھی، اس وجہ سے خرید وفروخت میں دھوکہ کھاتے تھے اور صحیح تمیز نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ زبان کے ثقل کی وجہ سے "لاخلابة" نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ "لا خیابة" کہتے تھے۔ (فتح الباری: ۴/۳۳۸)

"الخلابة" بکسر الخاء وخفة اللام بمعنی الخدیعة۔ دھوکہ کے معنی میں مستعمل ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "خلبت المرأة الرجل خلابة اذا خدعته" (جامع الاصول: ۱/۴۹۴)

حدیث شریف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دھوکہ اور غبن کی وجہ سے نہ تو بیع فاسد ہوتی ہے اور نہ خیار ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اگر بیع فاسد ہوتی یا خیار ثابت ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تنبیہ فرماتے اور اس شرط کے بتانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

البتہ حنابلہ اور بعض مالکیہ نے اس حدیث شریف سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی

آدمی بصیرت والا نہیں، اس کو خرید وفروخت کے معاملات میں تجربہ نہیں، نہ تو اشیاء کے بھاؤ کا پتہ ہے اور نہ صحیح بیع کرنے پر قادر ہے تو اس صورت میں اس کے لئے خیار ثابت ہے تاکہ دھوکہ سے محفوظ رہے، پھر بعض حضرات نے مطلقاً دھوکہ کی وجہ سے اس کے لئے خیار ثابت کیا ہے، اور بعض نے اس دھوکہ کی تعیین فرمائی ہے کہ اگر ثلث قیمت کی حد تک دھوکہ ہے پھر تو خیار ہوگا ورنہ نہیں، مثلاً ایک چیز کی قیمت آٹھ روپئے ہے اور وہ بارہ روپئے کی خرید لے تو خیار ہوگا اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غبن فاحش ہو تو خیار ہے ورنہ نہیں۔ (المغنی لابن قدامۃ: ۴/۱۷)

جبکہ حنفیہ، شافعیہ اور اکثر مالکیہ کے نزدیک دھوکہ کی وجہ سے خیار ثابت نہیں ہوتا، چاہے جس قسم کا دھوکہ ہو۔

اس لئے کہ جب عقد ثمن مخصوص پر ہوا ہے، دونوں کی تراضی کے ساتھ اور دونوں عاقل بھی ہیں تو تجارت عن تراض ثابت ہوگئی اور عقد تام ہوا، لہٰذا کسی کو بھی خیار نہیں ہوگا۔

حدیث مذکور کی ان حضرات نے دو توجیہیں کی ہیں:

(۱)……حدیث مذکور کا حکم حضرت حبان بن منقد رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص ہے اور دلیل خصوصیت ایک تو مستدرک حاکم کی روایت ہے، جس میں حضرت حبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیرنی فی بیعتی'' (المستدرک علی الصحیحین: ۲/۲۲) [بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو میری بیع میں اختیار مرحمت فرمایا۔]

دوسرے یہ کہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت ذکر کی ہے کہ حضرت حبان رضی اللہ عنہ ایک طویل عرصہ تک زندہ رہے، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا، اس وقت حضرت حبان رضی اللہ عنہ کی عمر ایک سوتیس (۱۳۰) سال کی تھی، حضرت حبان رضی اللہ عنہ جب کسی سے معاملہ کرتے تھے اور دھوکہ اور غبن کی صورت میں واپس کرتے تھے تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی تصدیق فرماتے تھے اور سب میں یہ مشہور تھا کہ حضرت حبان رضی اللہ عنہ کو خرید وفروخت میں تین دن تک خیار ہے، خیار کی تعلیل کسی نے بھی غبن اور دھوکہ سے نہیں کی بلکہ ان کی خصوصیت پر محمول کیا۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۵/۲۷۳)

(۲)...... حدیث مذکور میں جو خیار حضرت حبان رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت ہے وہ خیار شرط ہے "خیار مغبون" نہیں ہے، اس کی تائید ابن ماجہ کی روایت سے ہوتی ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "**اذا انت بایعت فقل لا خلابة ثم انت فی کل سلعة ابتعتها بالخیار ثلاث لیال**" (سنن ابن ماجہ:۷۸۹، رقم الحدیث:۲۳۵۵)

اگر خیار سے "خیار مغبون" مراد ہوتا تو تین دن کے ساتھ مقید نہ ہوتا، کیونکہ اس میں کوئی تین دن کی قید نہیں اور جو حضرات خیار مغبون کے قائل ہیں وہ بھی اس قید کے قائل نہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ "خیار شرط" ہے نہ کہ "خیار مغبون"۔

البتہ متاخرین حنفیہ کا فتویٰ اس بات پر ہے کہ اگر بائع نے قصداً دھوکہ دیا اور مشتری کو غبن فاحش ہوا تو اس صورت میں مشتری کو رد کرنے کا اختیار ہے، مثلاً بائع مشتری سے کہے کہ اس کی قیمت اتنی ہے، مشتری نے خریدا اور پھر معلوم ہوا کہ قیمت اس سے بہت کم ہے، تو رد کرنے کا اختیار ہے، لیکن اگر بائع نے کچھ نہیں کہا بلکہ اس کو خود دھوکہ ہوا ہے تو پھر "خیار" نہیں۔ (الاشباہ والنظائر:۱/۱۰۱)

خیار شرط کی مدت میں اختلاف

خیار شرط کی مدت میں تین مذاہب مشہور ہیں:

(۱)...... خیار شرط صرف تین دن تک ہے، اس سے زیادہ نہیں، یہ مذہب امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ (ہدایہ:۲/۲۰)

(۲)...... خیار شرط کے لئے کوئی متعین مدت نہیں بلکہ عاقدین کی صواب دید پر محمول ہے، جس مدت پر وہ راضی ہوں وہی مدت ہے، یہ مذہب امام احمد، طرفین صاحبین حسن بن صالح وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ (المغنی لابن قدامۃ:۴/۱۸)

(۳)...... خیار شرط کے لئے کوئی متعین مدت نہیں، بلکہ مبیعات کے مختلف ہونے سے "مدتِ خیار" بھی مختلف ہوتی ہے، چنانچہ اگر "مبیع" گھر یا زمین ہو تو مدت خیار چھتیس دن ہوگی، اگر غلام ہو تو دس دن اور عام سامان ہو تو پانچ دن اور اگر کوئی جانور ہو تو دو دن، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

کی رائے ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال اس سے ہے کہ چونکہ خیارِ شرط مشروع ہی غور و فکر کے لئے ہوا ہے، مبیع کے بارے میں غور فکر کیا جائے اور ظاہر ہے کہ مبیعات غور و فکر کے لحاظ سے متفاوت ہیں، سب کی حیثیت ایک جیسی نہیں، لہٰذا اس مدت کا مدار بھی مبیع پر ہوگا۔ (المغنی لابن قدامۃ: ۴/۱۸)

مذہب ثانی کے لئے استدلال اس سے ہے کہ "خیارِ شرط" ایسا حق ہے جو شرط لگانے سے ثابت ہوتا ہے، تو شرط لگانے والوں کی صواب دید کے مطابق اس کی مدت اور وقت کی تعیین ہوگی اور پھر خیار شرط کی مدت کا تعلق عقد کے ساتھ ہے تو جس طرح دیگر امور عقد میں متعاقدین کی رضامندی کا اعتبار ہوتا ہے اسی طرح "مدت خیار" میں بھی ان کی رضامندی کا اعتبار ہوگا۔ (المغنی لابن قدامۃ: ۴/۱۹)

جبکہ حنفیہ اور شافعیہ کا مذہب قوی ہے اور ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں تین دن کی تصریح موجود ہے۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک آدمی نے اونٹ خریدا اور اپنے لئے چار دن تک خیار کی شرط لگائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو باطل قرار دے کر فرمایا: "الخیار ثلاثۃ ایام" (تلخیص الحبیر: ۳/۲۱)

اسی طرح دارقطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "الخیار ثلاثۃ ایام" (سنن دارقطنی: ۳/۵۶) [حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ خیار تین دن کا ہے۔]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت جس میں حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ہے، خود اس بات میں صریح ہے کہ خیار تین دن تک ہوگا، مزید نہیں۔ اگر اس سے زیادہ جائز ہوتا تو حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ کی کمزوری اور ضعف عقل کے باوجود اس سے محروم نہ ہوتے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی ثابت ہے کہ انہوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کہ تمہاری خرید و فروخت کے سلسلے میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہوسکتی، جو گنجائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ کے لئے رکھی ہے اور وہ ہے تین دن کا خیار۔ (دارقطنی: ۳/۵۷)

قیاس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ تین دن سے زائد خیار نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ "خیار شرط" عقد کے مقتضیٰ کے خلاف ہے، عقد کا تقاضا ہے بیع کا تام ہونا اور لازم ہونا اور خیار کا تقاضا ہے موقوف ہونا، البتہ اس کی مشروعیت احادیث سے ثابت ہے، اور جو خلاف قیاس نص سے ثابت ہو جائے وہ مورد نص کے ساتھ خاص ہوتا ہے، لہٰذا خیار شرط بھی مورد نص کے ساتھ خاص ہوگا، جو کہ تین دن ہے، کیونکہ احادیث میں تین دن سے زیادہ کہیں بھی خیار ثابت نہیں اور اسی میں احتیاط بھی ہے، چنانچہ ہدایہ میں یہی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مستدل ذکر کیا ہے۔ (ہدایہ:۳/۳۹، نفحات التنقیح:۳/۴۱۲)

الفصل الثانی

تجارتی معاملات میں فریقین کی رضامندی

{۲۶۸۰} **وَعَنْ** عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ صَفْقَةَ خِيَارٍ وَلَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يُّفَارِقَ صَاحِبَهٗ خَشْيَةَ اَنْ يُّسْتَقِيْلَهٗ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤدوالنسائی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲۳۶/۱، ابواب البیوع، باب ماجاء البیعان بالخیار مالم یتفرقا، حدیث نمبر: ۱۲۴۷، ابوداؤد شریف: ۴۸۹/۲، کتاب البیوع، باب خیار المتبایعین، حدیث نمبر: ۳۴۵۶، نسائی: ۱۸۸/۲، البیوع، باب وجوب الخیار للمتبایعین قبل افتراقھما، حدیث نمبر: ۴۴۸۳۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد و دادا خود حضرت نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: دونوں بائع اور مشتری خیار کے ساتھ ہوتے ہیں، جس وقت تک وہ دونوں متفرق نہ ہوجائیں، مگر یہ کہ عقد بیع خیار کے ساتھ (ہی) ہوا ہو اور کسی ایک کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے علاحدہ ہو اس اندیشہ سے کہ وہ اس سے اقالہ عقد کرلے گا۔

تشریح: شافعیہ اس حدیث کے آخری جملہ کو بطور قرینہ پیش کرتے ہیں کہ حدیث میں تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے، کیونکہ یہاں کہا گیا ہے کہ متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ساتھی سے جدا ہوجائے، صرف اس لئے کہ کہیں وہ بیع کے ختم کرنے کا مطالبہ نہ کرنے لگے، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہاں استقالہ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، جس کا معنی ہے اقالہ طلب کرنا، اقالہ اسی وقت طلب کیا جاسکتا ہے جب کہ پہلے بیع تام ہوچکی ہو، اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ بیع صرف ایجاب وقبول سے تام ہوگئی تھی، اب یہ حدیث آپ کے بھی خلاف ہوگی دوسری بات یہ کہ یہاں مفارقت سے مراد بھی مفارقت

بالقبول یعنی قبول کرلینا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس نیت سے قبول میں جلدی نہیں کرنی چاہئے کہ ایجاب کرنے والا اپنا ایجاب واپس نہ لے سکے، کبھی ایجاب والے سے سبقت لسان ہو جاتی ہے، قبول میں جلدی کرنا اس کو مزید سوچ کا موقع نہ دینا اسلامی اخلاق کے منافی ہے۔

اعلاء السنن میں اس کا ایک الزامی جواب دیا گیا ہے کہ "لا یحل" کے ظاہر کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس طرح کی مفارقت حرام ہو، حالانکہ شافعیہ اس کے قائل نہیں، معلوم ہوا کہ وہ اس کو اپنے ظاہر پر محمول نہیں کرتے، اس میں تاویل کرتے ہیں، اگر وہ تاویل کرسکتے ہیں تو ہم بھی حدیث کی کوئی اور توجیہ کرسکتے ہیں، اس کے بعد اس حدیث کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ مفارقت کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک مجلس سے اٹھ کر چلے جانا اور دوسرے کسی سے ملاقات ہی نہ کرنا، ملاقات سے گریز کرنا، یہاں مفارقت سے مراد مطلقاً غیبوبت عن المجلس ہے، جو ان دونوں معنوں کو شامل ہے اور "ان یستقیله" اپنے ظاہر پر ہے، مطلب حدیث کا یہ ہے کہ بائع کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بیع ہوتے ہی دوسرے عاقد سے جدا ہو جائے اور بعد میں اس سے ملاقات کرنے سے بھی گریز کرتا رہے، تاکہ کہیں وہ اس سودے پر پشیمان ہو کر اقالہ کا مطالبہ نہ کردے، اس طرح کرنا مناسب نہیں کیونکہ دوسرا بھائی سودے سے پشیمان ہو کر اقالہ کرنا چاہے تو اقالہ کرلینا ثواب کی بات ہے اس سے کتراتے نہیں پھرنا چاہئے۔

(اعلاء السنن: ۱۱/ ۴)(اشرف التوضیح: ۳۸۴/ ۲)

خریدار اور بائع کے درمیان رواداری

{۲۶۸۱} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا یَتَفَرَّقَنَّ اِثْنَانِ اِلَّا عَنْ تَرَاضٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۴۹۰، کتاب البیوع، باب خیار المتبایعین، حدیث نمبر: ۳۴۵۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہرگز ہر دو بائع و مشتری متفرق نہ ہوں گے، مگر باہم رضامندی سے (عقد) پر۔

تشریح: یہ حدیث مروت و احسان اور مکارم اخلاق کے باب سے ہے کہ اگر مجلس بدلنے سے

پہلے فریق کی رائے بدل جائے اور وہ سودا اور معاملہ ختم کرنا چاہے تو دوسرے کو فوراً تیار ہو جانا چاہئے۔ اور اس پر راضی ہو جانا چاہئے۔ اس لئے کہ فریقین نے ابھی اپنے عوضوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، اور وقت بھی زیادہ نہیں گذرا، پس معاملہ ختم کرنے میں کسی کا نقصان نہیں ہے، ہاں مجلس ختم ہونے کے بعد یہ تراضی ضروری نہیں۔ (تحفۃ الالمعی)

الفصل الثالث

خیار بیع

{۲۶۸۲} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ ان رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیَّرَ اَعْرَابِیًّا بَعْدَ الْبَیْعِ۔ (رواہ الترمذی) وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۲۳۶، ابواب البیوع، باب ما جاء البیعان بالخیار مالم یتفرقا، حدیث نمبر: ۱۲۴۹۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو اختیار دیا بیع کے بعد۔ (ترمذی) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: یہ حدیث مختصر ہے، پورا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو اونٹ بیچا، وہ اونٹ لے کر چلا گیا، عرصہ بعد واپس آیا، اور کہنے لگا یا رسول اللہ! آپ نے مجھے پہچانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں تم وہی ہو جو مجھ سے اونٹ خرید کر لے گئے تھے، اس نے کہا: ہاں، میں وہی ہوں اور مجھے سودا منظور نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ واپس لے لیا اور رقم لوٹادی، یہ مکارم اخلاق کا اعلیٰ درجہ ہے، اس واقعہ کا نہ خیار مجلس سے کچھ تعلق ہے نہ اختر کہنے سے۔ (تحفۃ الالمعی: ۱۶۹/۴)

007 Babur Riba

باب الربوٰا

سود کا بیان

رقم الحدیث: ۲۶۸۳ر تا ۲۷۰۹ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الربوٰا

سود کا بیان

''سود'' ایک معاشرتی لعنت وعفریت ہے، جس کی اقتصادی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ہی غربت کے لہو سے سرمایہ داری کی آبیاری کی ہے اور غریب کے سسکتے وجود سے سرمایہ داری کی ہوس کو غذا بخشی ہے، چنانچہ اس لعنت میں مبتلا ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں تنبیہ فرمائی ہے:

''فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ'' (البقرہ: ۲۷۹)

[پھر اگر تم اس (سود خواری چھوڑنے کے حکم) پر عمل نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔]

اسلام نے تجارت اور قرض دونوں میں سود کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا ارتکاب گناہِ کبیرہ بتایا ہے، جو مسلمان سود کے حرام ہونے کا قائل نہ ہو اسلامی قانون کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے۔

یہ لعنت بہت پرانی ہے، اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کا طریقہ رائج تھا، چنانچہ قریش مکہ اور یہودِ مدینہ میں اس کا عام رواج تھا اور ان میں صرف شخصی ضرورتوں مثلاً قرض وغیرہ ہی کے لئے نہیں بلکہ تجارتی مقاصد کے لئے بھی سود کا لین دین جاری تھا، اسی طرح سود کی تباہ کاریاں بھی ہمیشہ ہی تسلیم شدہ رہی ہیں۔ اور اس کو اختیار کرنے والے بھی کبھی اس کے مضر اثرات کے منکر نہیں رہے ہیں، البتہ ایک نئی بات یہ ضرور ہوئی ہے کہ جب سے یورپ کے دلّال دنیا کی مسند اقتدار و تجارت پر چھائے ہیں انہون نے مہاجنوں اور یہودیوں کے اس خاص کاروبار کو نئی نئی شکلیں اور نئے نئے نام دیکر اس کا

دائرہ اتنا عام اور وسیع کر دیا ہے کہ وہی سود جو پہلے انسان کی معاشرتی زندگی کا ایک گھن سمجھا جاتا تھا، آج معاشیات، اقتصادیات اور تجارت کے لئے ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، اور سطحی ذہن وفکر رکھنے والوں کو یقین ہوگیا ہے کہ آج کوئی تجارت یا صنعت یا اور کوئی معاشی نظام سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا، اگرچہ آج بھی اہل یورپ ہی میں سے وہ لوگ جو تقلید محض اور عصبیت سے بلند ہو کر وسیع نظر سے معاملات کا جائزہ لیتے ہیں اور جو معاشیات کا وسیع علم ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے عملی پہلوؤں پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں، خود ان کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ سود، معاشیات اور اقتصادی زندگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ایک ایسا کیڑا ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں لگ گیا ہے، اور جب تک اس کیڑے کو نہ نکالا جائے گا دنیا کی معاشیات میں جو اضطراب و ہیجان ہے وہ ختم نہیں ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آج دنیا میں سود کا لین دین جتنا وسیع ہوگیا ہے اور دنیا کے اِس کونہ سے لے کر اُس کونہ تک تمام ہی تجارتوں میں اس کا جال جس طرح بچھا دیا گیا ہے، افراد واشخاص کی کیا حیثیت، اگر کوئی پورا طبقہ و جماعت بلکہ کوئی پورا ملک بھی اس سے نکلنا چاہے تو اس کو اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا کہ یا تو اپنی تجارت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے، یا نقصان برداشت کرتا رہے، یہی وجہ ہے کہ اب تو عام مسلمان تاجر الگ رہے، وہ دیندار و پرہیزگار مسلمان تاجر جن کی اعتقادی وعملی زندگی بڑی پاکیزہ اور مثالی ہے اب انہوں نے بھی یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ سود جو حرام ترین چیز اور بدترین سرمایہ ہے اس سے کس طرح نجات حاصل کریں؟ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دیندار اور پابند شریعت مسلمانوں اور ایک خالص دنیادار مہاجن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

لہٰذا سود کی ہمہ گیری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اس عام مجبوری کا سہارا لے کر اتنی بڑی لعنت سے بالکل بے پرواہ ہو کر بیٹھ جائیں۔ اور ان کے دل میں ذرہ برابر کھٹک بھی پیدا نہ ہو کہ وہ کتنی بڑی حرام چیز میں مبتلا ہیں، آج سود کے بارہ میں جو تاویلیں کی جاتی ہیں یا اس کو جو نئی نئی شکلیں دی جاتی ہیں یاد رکھئے وہ سب اسی درجہ میں حرام ہیں جس درجہ میں خود سود کی حرمت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے تجارتی معاملات کو اس انداز میں استوار کریں جس سے حتی الامکان اس لعنت سے نجات مل سکے، اگر موجودہ معاشی نظام میں اس حد تک تبدیلی ان کے بس میں نہیں ہے کہ جس میں سود

کا دخل نہ ہوتو کم سے کم اپنی زندگی اور نجی معاملات ہی کو درست کریں تاکہ سود کی لعنت سے اگر بالکل نجات نہ ملے تو کم ازکم اس میں کمی ہی ہو جائے اور مسلمان ہونے کا یہ ادنیٰ تقاضہ تو پورا ہو کر وہ حتی الامکان حرام سے بچنے کی فکر میں رہیں۔

بہرکیف اس باب میں اسی موضوع سے متعلق احادیث ذکر ہوں گی جن کے ضمن میں حسب موقع سود کے احکام ومسائل بیان کئے جائیں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ پہلے اس موضوع سے متعلق چند بنیادی باتیں بتادی جائیں۔

ربا کے لغوی معنی: ربا کے معنی لغت کے اعتبار سے زیادتی، بڑھوتری اور بلندی کے آتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "وَمَا اٰتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْ عِنْدَ اللّٰهِ" (الروم:۳۹)

ربا کی اصطلاحی تعریف: اور اصطلاحِ شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں، جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے، چنانچہ ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**الربا فی اللغة الزیادة والمراد فی الأیة کل زیادة لم یقابلها عوض**" اس میں وہ زیادتی بھی داخل ہے جو روپیہ کو ادھار دینے پر حاصل کی جائے، کیونکہ مال کے معاوضہ میں تو رأس المال پورا مل جاتا ہے، جو زیادتی بنام سود ملتی ہے وہ بے معاوضہ اور بیع وشراء کی وہ صورتیں بھی اس میں داخل ہیں جن میں کوئی زیادتی بالمعاوضہ حاصل کی جائے، مگر جاہلیت عرب کے زمانہ میں لفظ ربا صرف پہلی قسم کے لئے بولا جاتا تھا، دوسری اقسام کو وہ ربا میں داخل نہ سمجھتے تھے۔

پہلی قسم کا "ربا" زمانۂ جاہلیت میں شائع تھا اور اس کی حقیقت اس زمانہ میں معروف ومشہور تھی، اس میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں تھی، جب بھی ربا کا لفظ بولا جاتا تو اس سے "ربا" کی پہلی قسم ہی مراد ہوتی تھی۔ ابن جریر، ابن کثیر، رازی، ابوحیان اور آلوسی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ بہت سے مفسرین نے معتبر روایات سے یہ بات نقل کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو "ربا" رائج تھا اس کی صورت یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے کو مقررہ مدت تک قرض دیتا اور واپسی پر رأس المال کے ساتھ کچھ زیادتی کی بھی شرط کر لیتا، اگر مقروض متعینہ مدت تک قرض کی ادائیگی نہ کرسکتا تو سود میں اضافہ کر کے مدت مزید بڑھا دی جاتی، اسی

نوعیت کے بعض معاملات حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی ایمان لانے سے پہلے کئے تھے، اوران کے کچھ سودی بقایاجات بعض مشرکین کے ذمہ رہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ صاف اعلان فرمادیا تھا ''وربا الجاھلیۃ موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبدالمطلب فانہ موضوع'' [زمانۂ جاہلیت کے سودختم کردئے گئے، اورسب سے پہلا سود جس کو میں ختم کرتا ہوں، وہ ہمارا سود عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، پس بے شک وہ ختم کردیا گیا۔] یہاں بھی اسی نوعیت کا ربا مراد ہے۔ غرضیکہ ربا کی پہلی قسم زمانۂ جاہلیت میں شائع تھی، اورلفظ ''ربا'' کا اصلی اورمتعارف بین الناس مفہوم یہی تھا، جب قرآن کریم میں حرمت ربوا کی آیت نازل ہوئی تواس وقت بھی ''ربا'' کا یہی معنی مراد لیا گیا تھا، اصالۃً تحریم اسی قسم کے سود کی ہوئی تھی، ''ربا'' کا یہ مفہوم تمام عرب کے لئے بالکل واضح تھا، اس میں کسی کوکوئی الجھن پیش نہ آئی نہ اس کے مفہوم میں کوئی خفا تھا، اسی لئے جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ربا فی القرض کو فوراً چھوڑ دیا تھا، جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی شراب کو چھوڑ دیا تھا، کتب فقہ وتفسیر وغیرہ میں اس ''ربا'' کو رباحقیقی، ربا القرآن، رباالجاہلیۃ وغیرہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ قرآن نے اصالۃً تو تحریم ''رباالقرض'' ہی کی کی تھی، جو ''ربا'' کا مدلول مطابقی تھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ نے بعض دوسرے معاملات کوبھی ان کے ساتھ ملحق کرکے ان کوبھی ''ربا'' قرار دیا، مثلاً اسی باب میں حدیثیں آرہی ہیں جن میں اشیاءستہ کی بیع تفاضلا یا نسیئتاً سے منع فرمایا، اس نوعیت کے ''ربا'' کے بارہ میں کچھ خفا تھا، اجتہاد کی ضرورت تھی کہ آیا ''رباالمعاملات'' انہی اشیائے ستہ میں منحصر ہے یا دوسرے معاملات میں بھی ہوسکتا ہے، پھراگر ''رباالمعاملات'' ان چھ چیزوں میں منحصر نہیں ہے توان معاملات میں ''ربا'' کی وہ کونسی علت ہے جس کے پائے جانے کی صورت میں دوسرے معاملات کوبھی ربوی قرار دیا جائے گا ان باتوں میں فقہاء کا اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن یہ سب کچھ ''رباالمعاملات'' میں ہوا۔

''رباالقرض'' کے بارہ میں نہ توکسی الجھن اورخفاء کی گنجائش تھی اورنہ ہی اس کے بارہ میں کسی کا کوئی اختلاف ہوا ہے۔

فصل ثالث میں بحوالہ ابن ماجہ ودارمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد آرہا ہے کہ آنحضرت ﷺ

اس دنیا سے تشریف لے گئے اور "ربا" کی وضاحت نہیں فرمائی، اس کے بعد فرمایا: "فدعوا الربوا والریبۃ" یعنی ان صورتوں کو بھی چھوڑ دو جن کو صراحۃً "ربا" کہا گیا ہے اور ان کا سود ہونا واضح ہے اور ان صورتوں کو بھی چھوڑ دو جن میں "ربا" کا شبہ بھی ہو، آج کل کے بعض مغرب سے مرعوب ذہنیت رکھنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کو بنیاد بنا کر موجودہ بنکاری سود کو جائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب سود کی حقیقت اور اس کی تفصیلات واضح ہی نہیں تو سود کو ترک کرکے موجودہ معاشی نظام کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا موجودہ بینکوں کے سود کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں، اس لئے کہ یہ سود "ربا القرض" اور "ربا حقیقی" کے ضمن میں آتا ہے، جو قرآن کریم کی نص قطعی سے ثابت ہے، اس میں اجمال کا کوئی بھی قائل نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں کوئی ابہام کی گنجائش تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت تو کجا اس دور کے عام عربی کو بھی اس میں کوئی الجھن پیش نہیں آ سکتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا "ربا القرض" کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں، بلکہ آپ "ربا المعاملات" کی بات کرنا چاہتے ہیں کہ "اشیاء ستہ" کے بارہ میں تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرمادی، باقی کن اشیاء میں کب سود ہوگا، اس میں اجمال ہے، اجتہاد کی ضرورت ہے۔

پھر اس سود کو بھی مجمل کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سود کی عام دعوت دینا نہیں چاہتے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد تو یہ ہے کہ جن معاملات کے سود ہونے کی تصریح ہے ان کو تو چھوڑنا ہی ہے، اس کے ساتھ ان معاملات کو بھی چھوڑ دو جن میں سود ہونے کا شبہ بھی ہو۔

(ربا القرض کی حرمت کے دلائل کیلئے مزید دیکھئے: رسالہ "کشف الدجیٰ عن وجہ الربا" ملحقہ باعلاء السنن)

سود کی حرمت قرآن کریم کی سات آیات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس سے زائد احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، بلکہ قرآن کریم نے تو اس کو اللہ اور رسول سے جنگ قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ جس قوم یا معاشرہ کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا ہو، وہاں خوشحالی کی کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی، عقلی طور پر بھی علماء کرام نے سود کے معاشی، اخلاقی اور روحانی نوعیت کے نقصانات تفصیل سے بیان فرمادیئے ہیں۔ (اشرف التوضیح: ۲/۳۸۵)

رباٰاور سود میں فرق

عموماً چونکہ ’’ربا‘‘ کا ترجمہ ’’سود‘‘ سے کیا جاتا ہے، اس لئے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ’’ربا‘‘ اور ’’سود‘‘ دونوں عربی اور اردو میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، لیکن درحقیقت ایسا نہیں، بلکہ ’’ربا‘‘ ایک عام اور وسیع مفہوم کا حامل ہے اور مروجہ سود بھی اسی کی ایک قسم اور شاخ ہے، کیونکہ ’’مروجہ سود‘‘ میں زیادتی بلاعوض موجود ہے اور بلاشبہ یہ بھی ’’ربا‘‘ کی تعریف میں داخل ہے، مگر ’’ربا‘‘ اس میں منحصر نہیں اس کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے، اس میں بہت سے وہ معاملات بیع وشراء بھی داخل ہیں جن میں ادھار کا لین دین قطعاً نہیں، چنانچہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے ’’ربا‘‘ کے معنی کی وسعت بیان فرما کر بہت سی ایسی صورتوں کو بھی ’’ربا‘‘ قرار دیا جن میں ادھار کا معاملہ نہیں، جیسا کہ اس بات کا ثبوت روایات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

’’ربا‘‘ کی قسمیں

’’ربا‘‘ کے مذکورہ بالا مفہوم کے مطابق فقہاء نے ’’ربا‘‘ کی جو قسمیں مرتب کی ہیں ان میں سے عام طور پر یہ پانچ قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) ربا قرض۔ (۲) ربا رہن۔ (۳) ربا شراکت۔ (۴) ربا نسیئہ۔ (۵) ربا فضل۔

ربا قرض: کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کا قرض دار سے شرط کے مطابق مقررہ میعاد کے بعد اپنے اصل مال پر کچھ زائد مقدار لینا جیسا کہ مروجہ سود ہے، جس میں قرض اسی شرط پر دیا جاتا ہے کہ اتنا روپیہ اس پر ماہوار سود کے حساب سے زیادہ دینا ہوگا اور اصل روپیہ بدستور باقی رہے گا۔

’’ربا‘‘ کی یہ صورت کلیۃً حرام ہے، جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

ربا رھن: کا مطلب یہ ہے کہ بلا کسی مالی معاوضہ کے وہ نفع جو مرتہن کو راہن سے یا شے مرہون سے حاصل ہو مثلاً راہن اپنی کوئی ملکیت مثلاً زیور یا مکان مرتہن کے پاس بطور ضمانت رکھ کر اس سے کچھ روپیہ قرض لے اور وہ مرتہن اس رہن رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھائے، مثلاً اس مکان میں

رہے، یا کرائے پر چلائے اور یا اس مرہون چیز سے فائدہ اٹھائے، یا شی مرہون سے نفع حاصل نہ کرے بلکہ راہن سے نفع حاصل کرے بایں طور کہ قرض دی ہوئی رقم پر سود حاصل کرے، رہن کی یہ دونوں صورتیں بھی حرام ہیں۔

رباشراکت: کا مطلب یہ ہے کہ کسی مشترک کاروبار میں ایک شریک اپنے دوسرے شریک کا نفع متعین کردے اور جملہ نقصانات اور فوائد کا خود مستحق بن جائے یہ بھی حرام ہے۔

ربا نسئیه: کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں کے باہم لین دین یا دو چیزوں کی باہم خرید وفروخت میں ادھار کرنا۔خواہ اس ادھار میں اصل مال پر زیادتی لی جائے یا نہ لی جائے۔

ربا فضل: کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں باہم کمی بیشی کے ساتھ دست بدست لین دین کیا جائے، یہ آخری دو قسمیں یعنی ربا نسیئہ اور ربا فضل مطلقاً جائز بھی نہیں اور مطلقاً حرام بھی نہیں، بلکہ متحد الجنس اور متحد القدر چیزوں میں ربا نسیئہ بھی حرام ہے اور ربا فضل بھی، جیسا کہ گیہوں کا گیہوں کے ساتھ یا چنے کا چنے کے ساتھ یا چونے کا چونے کے ساتھ یا سونے کا سونے کے ساتھ لین دین کیا جائے تو اس صورت میں فضل بھی حرام ہوگا اور نسیئہ بھی حرام ہے۔

اور اگر اتحاد جنس ہے اتحاد قدر نہیں، جیسے ہروی کپڑا ہروی کپڑے کے بدلے میں بیچنا کہ جنس ایک ہے اور قدر نہیں، یا اتحاد قدر ہے اتحاد جنس نہیں جیسے گندم جو کے بدلہ میں بیچنا تو اس صورت میں فضل تو جائز ہے، نسیئہ جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح ہے: ”**فاذا اختلف هذه الاوصاف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيد**“ (مسلم شریف:۲/۲۵)[جب یہ اوصاف مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو، جبکہ معاملہ ہاتھ در ہاتھ ہو، یعنی نقد ہو۔]

اور اگر نہ اتحاد جنس ہے اور نہ اتحاد قدر تو اس صورت میں فضل بھی جائز ہے اور نسیئہ بھی۔ جیسے گیہوں کا چاندی کے ساتھ لین دین کیا جائے کیونکہ جنس بھی متحد نہیں اور قدر بھی نہیں، کیونکہ گیہوں مکیل ہے اور چاندی موزون ہے۔(ہدایہ:۳/۷۹، نفحات التنقیح:۳/۴۱۵)

الفصل الاوّل

سود لینے دینے والے پر لعنت الٰہی

{۲۶۸۳} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰکِلَ الرِّبَا وَمُؤْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ وَقَالَ ھُمْ سَوَاءٌ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/ ۲۷، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الربا، حدیث نمبر: ۱۵۹۸،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے اور کھلانے والے، سود کے معاملات لکھنے والے اور سود کی گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ اور ارشاد فرمایا: یہ سب (اصل گناہ میں) برابر ہیں۔

تشریح: ربوا القرآن اور ربوا الحدیث: شریعت کی اصطلاح میں ''ربا'' کا اطلاق پانچ قسم کے معانی کے لئے ہوا ہے، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال دو معنوں کے لئے ہوتا ہے۔ ایک ''ربا النسیئہ'' کے لئے اور دوسرے ''ربا الفضل'' کے لئے۔

''ربا النسیئہ'' کی تعریف یہ ہے ''ھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ مال علی المستقرض'' اس کو ''ربا القرآن'' اور ''ربا جلی'' بھی کہتے ہیں۔

اور ''ربا الفضل'' کی تعریف یہ ہے کہ دو ہم جنس چیزوں کے آپس کے تبادلے کے وقت کمی زیادتی کرنا اس کو ''ربا الحدیث'' اور ''ربا خفی'' بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ پہلی قسم کے ''ربا'' کو قرآن کریم نے اور دوسری قسم کے ''ربا'' کو حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔ (تکملۃ فتح الملہم: ۱۰/ ۵۶۶)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی زیر بحث حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جس طرح سود کا معاملہ کرنا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح سود کے معاملہ میں دلالی کرنا، سودی معاملے کا ذریعہ بننا اور سود کا حساب کتاب لکھنا بھی

ناجائز ہے، اسی حدیث کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا جاتا ہے کہ آج کل بینکوں کی ملازمت جائز نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی کسی نہ کسی درجے میں سود کے معاملات میں ملوث ہو جاتا ہے۔

بینک میں ملازمت کا حکم

چونکہ آج کل پیسہ ہر جگہ سے بینک ہی کے واسطے سے آتا ہے، اس لئے کوئی بھی چیز سود سے پاک نہیں۔ لہٰذا پھر تو ہر چیز حرام ہونی چاہئے نہ صرف بینک کی ملازمت؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہر چیز کی حد مقرر کر دی ہے کہ اس حد تک جائز ہے اور اس کے علاوہ ناجائز ہے۔ لہٰذا بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینک کے اندر سودی لین دین ہوتا ہے اور جو شخص بھی بینک میں ملازم ہو، وہ کسی نہ کسی درجے میں سودی لین دین میں تعاون کر رہا ہے اور کسی بھی گناہ کے کام میں تعاون کرنا قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدۃ: ۲) اور گناہ اور ظلم میں (ایک دوسرے کے ساتھ) تعاون نہ کرو۔]

اس وجہ سے بینک کی ملازمت حرام ہے۔ باقی رہا یہ اشکال کہ ہر پیسہ بینک ہی کے واسطے سے ہم تک پہنچتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بینک سے پیسے جائز طریقے سے آتے ہیں تو ان پیسوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر ناجائز اور حرام طریقے سے آتے ہیں تو ان کا استعمال بھی حرام ہے۔

موجودہ بینکوں کے سود کا حکم

چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی سود پر قائم ہے، اس لئے پوری دنیا سود کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ تمام تجارتیں سود کی بنیاد پر ہو رہی ہیں، بڑے بڑے سرمایہ دار اور بڑی بڑی کمپنیاں سودی بنیادوں پر بینک سے قرضہ لیتی ہیں اور اس سے اپنا کاروبار چلاتی ہیں اور سارے بینک سود کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔

چنانچہ عالم اسلام میں اس عام بلویٰ کی وجہ سے بعض عناصر ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ بینکوں کا سود وہ سود نہیں ہے، جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، اور استدلال اس بات سے کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے قرض لیا کرتے تھے۔ مثلاً: کوئی غریب شخص کسی صاحب استطاعت کے پاس جاتا اور اس سے جا کر کہتا کہ مجھے کچھ پیسے قرض دیدو تا کہ میں بیوی بچوں کو کھانا کھلاسکوں۔ صاحب استطاعت جواب میں کہتا کہ میں سود پر قرض دونگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ظلم کی بات تھی کہ ایک آدمی بھوک کو مٹانے کے لئے قرض مانگ رہا ہے اور آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کا اصل فرض تو یہ تھا کہ آپ اپنی طرف سے اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کرتے، نہ یہ کہ اس کو قرض دے کر الٹا اس پر سود کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایسے سود کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا: کہ اگر تم اس کو نہیں چھوڑوگے تو تمہارے خلاف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

یا مثلاً کسی شخص کے گھر میں میت ہوگئی اور اس کے پاس کفن دفن کے لئے پیسے نہیں ہیں، وہ دوسرے شخص کے پاس جاتا اور اس سے قرض مانگتا، تا کہ میت کے کفن دفن کا انتظام کرسکے، اس موقع پر قرض دینے والا یہ مطالبہ کرتا کہ میں اس وقت تک تمہیں قرض نہیں دوں گا جب تک تم اتنا سود ادا نہیں کروگے، ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر سود کا مطالبہ کرنا انسانیت اور مروت کے خلاف بات تھی، اس لئے اس قسم کے سود کو قرآن کریم نے حرام قرار دیدیا، اور اسی عمل کے اختیار کرنے پر اعلان جنگ فرمایا، چنانچہ جتنی شدید وعید سود کے معاملہ کرنے والوں کے بارے میں آئی ہے شاید کسی اور گناہ پر نہیں آئی جیسے کہ ارشاد ہے:

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ" (البقرہ:۲۷۹) [اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور واقعی تم مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمے) باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔] یہی ارشاد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے سودی لین دین نہ چھوڑنے پر اعلان جنگ ہے۔

تجارتی قرضوں پر سود کا حکم

البتہ جہاں تک موجودہ دور کے بینکوں کے سود کا تعلق ہے تو اس میں قرض ان لوگوں کو نہیں ملتا جن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے اور جن کے پاس میت کے کفن دفن کے انتظام کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ ایسے غرباء کو تو بینک قرض دیتا ہی نہیں۔ بلکہ بینک سے قرض لینے والے بڑے بڑے سرمایہ دار اور دولت مند ہوتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بینک سے قرض لے کر اس رقم کو اپنی تجارت میں لگا دیں گے، اور زیادہ نفع کمائیں گے، ایک لاکھ روپیہ بینک سے قرض لے کر اس سے دو لاکھ بنالیں گے۔

دوسری طرف وہ روپیہ جو سرمایہ دار بینک سے بطور قرض لیتا ہے وہ عوام کا روپیہ ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی کمائی سے بچا بچا کر یہ روپیہ بینک میں بطور امانت کے رکھوایا ہے، لہٰذا جو سرمایہ دار بینک سے قرض لے رہا ہے۔ اگر اس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس قرض کے ذریعہ تجارت کر کے جو نفع کماؤ گے، اس نفع میں سے اتنا فیصد بینک کو بطور سود ادا کرو گے تو اس میں کون سا ظلم ہو جائے گا؟ اور اس زمانہ میں جو سود رائج تھا اس میں قرض لینے والے پر ظلم ہوتا تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سود کو حرام قرار دیدیا۔ لہٰذا موجود دور کے بینکوں کا سود حرام نہیں۔

بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرض وہ ہے جس کو انسان اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لئے لیتا ہے۔ ایسے قرض کو ”صرفی قرضہ“ کہتے ہیں۔ دوسرا قرض وہ ہے جس کو انسان تجارت کرنے اور نفع کمانے کے لئے لیتا ہے، ایسے قرض کو ”تجارتی قرض“ یا ”پیداواری“ قرض کہتے ہیں۔ سود کے جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ قرآن کریم نے ”صرفی قرض“ پر لئے جانے والے سود کو حرام کہا ہے۔ ”تجارتی قرض“ پر لیا جانے والا سود اس حرمت میں داخل نہیں۔

سود مفرد اور مرکب کا حکم ایک ہے

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن کریم نے صرف سود مرکب کو حرام قرار دیا ہے، اور قرآن کریم

کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" (اٰل عمران:۱۳۰)

[اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود مت کھاؤ۔]

اس آیت میں ربا کے ساتھ چونکہ اضعافاً مضاعفۃً کی قید لگی ہوئی ہے، اور نہی کا تعلق قید کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا صرف وہ ربا ممنوع ہوگا جس میں سود کی رقم رأس المال سے کم از کم دوگنی ہو جائے۔ مگر یہ استدلال درست نہیں؛ کیونکہ "اضعافاً مضاعفۃً" کی قید باجماع امت احترازی نہیں، بلکہ اتفاقی ہے، اور بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

"لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا" (البقرہ:۴۱)

[اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو۔]

اس آیت میں اگرچہ "ثمن قلیل" کی قید لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی بھی عقل مند انسان اس آیت کا یہ مطلب نہیں لیتا کہ آیات قرآن کو "ثمن قلیل" کے ساتھ فروخت کرنا تو جائز نہیں البتہ "ثمن کثیر" کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے۔

اس قید کے اتفاقی ہونے کے دلائل قرآن وسنت کی روشنی میں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)......قرآن کریم کی آیت ہے: "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" (البقرہ:۲۷۸) [اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی کسی کے ذمے باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو۔] اس آیت میں لفظ "ما" عام ہے، جو "ربا" کی ہر قلیل اور کثیر مقدار کو شامل ہے۔

(۲)......خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس ﷺ نے یہ اعلان فرمادیا کہ "وربا الجاهلية موضوعة واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب فانه موضوع كله" (مسلم شریف:۱/۳۹۷)

[اور جاہلیت کے سود سوخت کر دیے گئے اور پہلا سود جس کو میں سوخت کرتا ہوں، وہ ہمارا سود ہے، عباس بن عبد المطلب کا سود، پس بالیقین وہ تمام کا تمام سوخت کر دیا گیا۔] اس حدیث شریف میں لفظ "كله" ربا کہ ہر مقدار کی حرمت پر صریح ہے۔

(۳)......حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کل قرض جر نفعا فھو ربا" (اعلاء السنن: ۴۹۸/ ۱۴) [ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو وہ سود ہے۔] اس حدیث شریف میں لفظ "نفعًا" اس بات پر دال ہے کہ نفع کی ہر مقدار حرام ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت میں "اَضْعَافاً مُضَاعَفَةً" کی قید احترازی نہیں، بلکہ اتفاقی ہے۔

سود کے جواز پر استدلال

قائلین جواز قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (البقرہ: ۲۷۵)

اس آیت میں لفظ "الربوا" معرف باللام ہے، اور الف لام میں اصل یہ ہے کہ وہ عہد کے لئے ہو، چنانچہ اصول کی کتابوں میں تصریح ہے: "اعلم ان لام التعریف اما للعھد الخارجی او الذھنی واما لاستغراق الجنس واما لتعریف الطبیعة لکن العھد ھو الاصل" (انظر التوضیح: ۱/ ۱۳۳)

لہٰذا لفظ "ربا" سے وہ مخصوص "ربا" مراد ہوگا جو زمانہ جاہلیت میں اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور میں رائج تھا، اور اس زمانہ میں "تجارتی قرض" رائج ہی نہ ہوا تھا۔ قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے؟ لہٰذا حرمت سود کا اطلاق صرف "صرفی قرض" پر ہوگا۔ "تجارتی قرض" پر نہیں ہوگا۔

حکم کا تعلق حقیقت سے ہوتا ہے صورت سے نہیں

درحقیقت قائلین جواز کا استدلال مغالطے پر مبنی ہے، ان کے استدلال کا صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ہیں، ان کے استدلال کا صغریٰ یہ ہے کہ عہد رسالت میں تجارتی سود رائج نہیں تھا اور کبریٰ یہ ہے کہ جو چیز عہد رسالت میں رائج نہ ہو اس پر حرمت کا اطلاق نہیں ہوسکتا، حالانکہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔

پہلے کبریٰ کو سمجھ لیں۔ دیکھئے! اصول یہ ہے کہ قرآن یا حدیث جب کسی چیز پر حلت یا حرمت کا حکم لگاتے ہیں تو وہ حکم اس چیز کی کسی خاص شکل یا صورت پر نہیں لگاتے، بلکہ اس چیز کی حقیقت پر لگاتے ہیں، لہٰذا جہاں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں وہ حکم پایا جائے گا۔

مثلاً شراب، جس زمانے میں حرام ہوئی، اس زمانے میں لوگ اپنے گھروں میں انگور کا شیرہ اپنے ہاتھوں سے نکال کر اس کو سڑا کر شراب بناتے تھے، لہٰذا اب موجودہ دور میں کوئی شخص اگر یہ کہے کہ چونکہ اس زمانے میں لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں میں شراب بناتے تھے اور اس میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا، اس لئے شراب حرام قرار دی گئی تھی، اب چونکہ موجودہ دور میں شاندار مشینوں کے ذریعہ حفظانِ صحت کے تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی صفائی ستھرائی کے ساتھ شراب بنائی جاتی ہے، اس لئے شراب کی حرمت کا اطلاق موجودہ دور کی شراب پر نہیں ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ شریعت نے شراب کی کسی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اس کی حقیقت جہاں پائی جائے گی، اس پر حرمت کا اطلاق ہوگا، چاہے اس کی وہ مخصوص صورت حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں موجود ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں بیئر اور برانڈی وغیرہ موجود نہیں تھیں اس لئے یہ حرام نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں اگرچہ شراب اس نام سے اور اس شکل میں موجود نہیں تھی، مگر اس کی حقیقت یعنی ''ایسا مشروب جو نشہ آور ہو'' موجود تھی، اور آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کو حرام قرار دیا تھا، اب یہ حقیقت ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی، چاہے کسی بھی زمانے میں کسی بھی نام سے پائی جائے۔

''ربا'' کی حقیقت

''ربا'' کی حقیقت کیا ہے؟ جس کی بناء پر شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے؟ اور کیا یہ حقیقت موجودہ دور کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کو دیئے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادتی کا مطالبہ کرنا سود ہے۔ مثلاً آپ نے کسی شخص کو سو روپے بطور قرض

007 Babur Riba

دئے اور اس کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ ایک سال بعد تم سے ایک سوبیس روپئے واپس لوں گا تو یہ سود ہے۔ البتہ اگر طے نہیں کیا بلکہ آپ نے اس کو ویسے ہی سو روپئے قرض دیدئے لیکن قرض لینے والے نے قرض واپس کرتے وقت اپنی خوشی سے ایک سوبیس روپئے واپس کئے تو یہ سود اور حرام نہیں بلکہ قرض کی واپسی کی عمدہ شکل ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کی عادت کریمہ یہی تھی کہ جب آنحضرت ﷺ سے قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آنحضرت ﷺ اس کی دل جوئی کے لئے اس کا قرض کچھ زیادتی کے ساتھ واپس کرتے۔

لیکن چونکہ یہ زیادتی پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی اس لئے وہ سود نہیں ہوتی تھی۔ حدیث کی اصطلاح میں اس کو ''حسن القضاء'' کہا جاتا ہے۔ یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا۔ بلکہ حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرمایا: کہ ''ان خیار کم احسنکم قضاء'' (بخاری شریف: ۱/۳۲۲) یعنی تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ طے کرکے زیادہ ادا کرنا تو سود ہے اور طے کئے بغیر زیادہ ادا کرنا سود نہیں بلکہ ''حسن قضاء'' ہے۔

بہر حال چونکہ ''سود'' کی مندرجہ بالا حقیقت موجودہ بینکوں کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے، اس لئے تجارتی سود حرام ہوگا۔ اس تفصیل سے تجارتی سود کے جواز کے قائلین کی دلیل کا کبری غلط ثابت ہوا۔ جبکہ ان کی دلیل کا صغری یہ تھا کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں تجارتی سود موجود نہیں تھا، یہ بھی درست نہیں کیونکہ عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس ﷺ تشریف لائے اس میں بھی آج کے دور کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں۔ اس لئے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلے کے تمام افراد اپنا ایک ایک درہم اور ایک ایک دینار لاکر ایک جگہ جمع کردیتے، پھر اس رقم کو قافلے والے شام لے جاکر اس سے مال تجارت لاکر فروخت کرتے، چنانچہ آپ نے ''تجارتی قافلوں'' کا نام سنا ہوگا، وہ یہی کام کیا کرتے تھے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ'' (القریش: ۱)

[چونکہ قریش کے لوگ عادی ہیں۔ یعنی وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں (یمن اور شام کے)

سفر کرنے کے عادی ہیں۔]

اس آیت میں گرمیوں اور سردیوں کے جن سفروں کا ذکر ہے، اس سے مراد یہی تجارتی قافلے ہیں جو سردیوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے، اور ان کا کام یہ تھا کہ یہاں مکہ مکرمہ سے سامان لے جا کر وہاں فروخت کر دیتے اور وہاں سے سامان تجارت لا کر مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیتے، ان قافلوں میں بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ قرض کھانے پینے کی ضرورت کے لئے یا کفن دفن کے انتظام کے لئے نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ وہ تجارتی مقصد ہی کے لئے لیا جاتا تھا۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جس تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے مکہ مکرمہ آرہے تھے، جس پر مسلمانوں نے حملہ کرنے کا ارادہ کیا، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ بدر پیش آئی، اس قافلے کے بارے میں اصحاب السیر نے لکھا ہے کہ: ”لم یبق بمکة قرشی ولا قرشیة له مثقال فصاعدا الا بعث به فی تلک العیر الا حویطب بن عبدالعزی“ یعنی حویطب بن عبدالعزی کے علاوہ جس قریشی مرد یا عورت کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اس نے اس تجارتی قافلے میں بھیج دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قبیلے اس طرح مشترک سرمائے سے تجارت کرتے تھے۔

(السیرة النبویة بهامش السیرة الحلبیة: ۱/۳۶۵)

روایات میں آتا ہے کہ بنومغیرہ اور بنوثقیف کے درمیان آپس میں قبائلی سطح پر سود کا لین دین ہوتا تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے سود پر قرض لیتا اور دوسرا قرض دیتا۔ ایک قبیلہ سود کا مطالبہ کرتا اور دوسرا قبیلہ اس سود کو ادا کرتا اور یہ سب تجارتی قرض ہوتے تھے۔ (اعلاء السنن: ۱۴/۳۳۴)

اسی طرح حجۃ الوداع کے واقعے سے بھی اس کی تائید ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تجارتی سود کا رواج تھا، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سود کی حرمت کا اعلان فرمایا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”وربا الجاهلیة موضوعة واول ربا

اضعه ربا عباس بن عبدالمطلب فانه موضوع کله‘‘ (مسلم شریف:۳۹۷/۱) یعنی آج کے دن جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا۔ چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ میں آج کے دن ان کا وہ سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہے اس کو ختم کرتا ہوں، روایات میں آتا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وہ سود دس ہزار مثقال سونا تھا، اور ایک مثقال تقریباً ۴ر ماشے ہوتا ہے اور پھر یہ دس ہزار مثقال کوئی سرمایہ اور رأس المال نہیں تھا، بلکہ یہ وہ سود تھا جو اصل رقم پر واجب ہوا تھا، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار مثقال کا سود لگ گیا ہو وہ صرف کھانے پینے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے نہیں بلکہ تجارت کی غرض سے لیا گیا ہوگا۔

عہد صحابہ میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا طریقہ تجارت

صحیح البخاری میں ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ ان کے پاس بطور امانت بڑی بڑی رقمیں رکھوانے کے لئے آتے تو وہ ان سے کہتے: ’’لا ولکنه سلف‘‘ (بخاری شریف:۴۴۱/۱) یہ امانت نہیں بلکہ قرض ہے۔ لیکن وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ قرض کی صورت میں طرفین کا فائدہ تھا، امانت رکھوانے والوں کا تو یہ فائدہ تھا کہ اگر یہ رقم امانت کے طور پر رکھی ہوتی تو اس صورت میں حفاظت کے باوجود ہلاک ہونے یا چوری ہو جانے کی صورت میں اس کا ضمان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر نہ آتا، کیونکہ امانت کا ضمان نہیں ہوتا، اس کے برخلاف قرض کی رقم اگر ہلاک ہو جائے، یا چوری ہو جائے تو اس کا ضمان قرض لینے والے پر آتا ہے، لہٰذا امانت رکھوانے والوں کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کی رقم محفوظ اور مضمون ہو گئی اور دوسری طرف حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کو اس بات کا اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہیں صرف کریں، یا تجارت میں لگائیں، اس لئے کہ اگر وہ رقم امانت ہوتی تو امانت محضہ کو تجارت میں لگانا جائز نہیں۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ان کے قرضوں کا حساب لگایا، "فحسبت ما علیہ من الدین فوجدتہ الفی الف و مائتی الف" (بخاری شریف: ۴۴۱/۱) یعنی میں نے ان کے ذمے واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ (۲۲۰۰۰۰۰) دینار نکلے۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا قرض صرف قرض نہیں بلکہ "تجارتی قرض" ہی تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تجارتی قرضوں کا رواج تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تجارتی قرضہ

تاریخ طبری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے حالات میں لکھا ہے کہ ہند بنت عتبہ جو حضرت ابوسفیان کی بیوی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور بیت المال سے قرض دیئے جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرض کی اجازت دیدی، انہوں نے اس قرض کی رقم سے "بلاد کلب" میں جا کر تجارت کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرض بھوک مٹانے کے لئے یا میت کی تدفین کے لئے نہیں لیا گیا تھا۔ بلکہ تجارت کے لئے لیا گیا تھا۔ (طبری: ۲۸۷/۳) اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں عہد رسالت اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ثابت ہوا کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عہد رسالت میں تجارتی قرضے نہیں تھے، بلکہ تجارتی قرضوں کا رواج تھا، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "ربا" کی حرمت کے اعلان کے بعد ان قرضوں پر سود کا لین دین موقوف تھا، لہٰذا تجارتی سود کو جائز کہنے والوں نے جس صغریٰ اور کبریٰ سے استدلال کیا ہے وہ دونوں غلط ثابت ہو گئے۔

قائلین جواز کی ایک اور دلیل

"سود" کو جائز قرار دینے والوں کی طرف سے ایک استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی شخصی ضروریات کے لئے کھانے پینے وغیرہ ضرورت کے لئے قرض مانگتا ہے اور قرض دینے والا شخص اس سے "سود" کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ ظلم اور بے مروتی کی بات ہے اور ایک غیر انسانی حرکت ہے، لیکن جو

شخص تجارت کرنے کے لئے قرض مانگتا ہے تاکہ اس قرض کی رقم تجارت میں لگا کر نفع کمائے، اگر اس سے ''سود'' کا مطالبہ کیا جائے تو اس میں ناانصافی کی کوئی بات نہیں۔ اس استدلال کی تائید میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

''وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ'' (البقرہ:۲۷۹)

یعنی اگر تم ''سود'' سے توبہ کرلو تو پھر تمہارا جو راس المال ہے وہ تمہارا حق ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ''سود'' کی حرمت کی علت ''ظلم'' ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ ظلم صرفی سود میں تو پایا جاتا ہے، تجارتی سود میں نہیں پایا جاتا، اس لئے ''تجارتی سود'' حرام نہیں ہونا چاہئے۔

علت اور حکمت میں فرق

یہ استدلال بھی مختلف مغالطوں کا مجموعہ ہے۔ پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اس دلیل میں ''ظلم'' کو ''ربا'' کی حرمت کی علت قرار دیا ہے، حالانکہ ظلم دور کرنا ''ربا'' کی حرمت کی علت نہیں۔ بلکہ اس کی حکمت ہے اور حکم کا دارومدار ''علت'' پر ہوتا ہے، حکمت پر نہیں ہوتا۔ اس کی آسان سی مثال یہ سمجھئے کہ آپ نے دیکھا ہوگا سڑکوں پر سگنل لگے ہوئے ہیں، اس میں تین رنگ کی بتیاں ہوتی ہیں۔ سرخ، پیلی، سبز۔ جس وقت سرخ بتی جل رہی ہو، اس وقت حکم یہ ہے کہ رک جاؤ اور جس وقت سبز بتی جلے اس وقت چل پڑو اور سگنل کا یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ ٹریفک میں نظم وضبط قائم کیا جائے اور حادثات کی روک تھام کی جائے، تاکہ تصادم کا خطرہ کم سے کم کیا جائے۔ اس میں یہ جو کہا گیا کہ ''سرخ بتی پر رک جاؤ'' یہ حکم ہے اور ''سرخ بتی'' اس حکم کی ''علت'' ہے اور اس کے ذریعہ حادثات کی روک تھام اس حکم کی ''حکمت'' ہے۔ اب ایک شخص رات کے بارہ بجے گاڑی چلاتا ہوا سگنل کے پاس پہنچا تو سرخ بتی جل رہی تھی، لیکن چاروں طرف سے کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی، تصادم اور حادثے کا کوئی خطرہ نہیں تھا، اس وقت میں اگرچہ اس حکم کی ''حکمت'' نہیں پائی جارہی تھی، لیکن پھر بھی گاڑی روکنا ضروری ہے، اس لئے کہ روکنے کے حکم کی جو علت ہے یعنی ''سرخ بتی کا جلنا'' وہ پائی جارہی ہے۔ لہٰذا اگر وہ نہیں رکے گا تو قانون کی خلاف ورزی کی بناء پر مجرم شمار ہوگا۔

شراب حرام ہونے کی حکمت

شریعت کے تمام احکام کے حکم کا مدار ''علت'' پر ہوتا ہے۔''حکمت'' پر نہیں ہوتا۔ دنیوی اور شرعی دونوں قسم کے قوانین میں یہی اصول کارفرما ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے شراب کے بارے میں فرمایا:

''اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ'' (المائدہ:۹۱)

[شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض کے بیج ڈالدے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے روک دے، اب بتاؤ کہ کیا تم (ان چیزوں) سے باز آجاؤ گے۔]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوے کی حرمت کی ایک حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کے نتیجے میں آپس میں بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور انسان اس کی وجہ سے اللہ کے ذکر سے غافل ہوجاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شراب اور جوا اسی وقت حرام ہے جب کہ اس کے نتیجے میں عداوت اور بغض پیدا ہو، اگر عداوت اور بغض پیدا نہ ہو تو حرام نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال درست نہیں کیونکہ عداوت اور بغض کا پیدا ہونا شراب اور جوے کی حرمت کی ''حکمت'' ہے ''علت'' نہیں۔

اسی طرح سود کی حرمت کے بارے میں ارشاد ہے:

''لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْن'' (البقرہ:۲۷۹) [نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔]

یہ ارشاد بطور ''علت'' کے بیان نہیں فرمایا بلکہ بطور حکمت کے بیان فرمایا ہے، لہٰذا ''ربا'' کے حرام ہونے کا دارومدار ظلم کے ہونے یا نہ ہونے پر نہیں بلکہ ''ربا'' کی حقیقت پائے جانے پر ہے۔ جہاں ربا کی حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے وہاں ظلم ہو یا نہ ہو۔

احکام شرعیہ میں امیر اور غریب کا فرق نہیں

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ قائلین جواز تجارتی سود کو جائز ثابت کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ''صرفی

قرضوں‘‘ میں اگر کوئی شخص سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو چونکہ طلب کرنے والا غریب ہوتا ہے، اس لئے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے، بخلاف تجارتی قرضوں کے کیونکہ اس میں قرض طلب کرنے والا سرمایہ دار اور امیر ہوتا ہے، اور اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم نہیں۔ یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ ایک جگہ سود لینا ظلم ہے اور دوسری جگہ ظلم نہیں۔ حالانکہ اصل سوال یہ ہے کہ قرض پر زیادہ رقم کا مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز نہیں تو پھر اس میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک قلم فروش قلمیں فروخت کر رہا ہے، ایک قلم کی لاگت بارہ آنے آتی ہے اور چار آنے وہ نفع کے رکھ کر ایک روپئے کا قلم فروخت کرتا ہے اور اس نے غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں رکھا کہ غریب کو کم قیمت پر قلم فروخت کردے اور امیر کو زیادہ قیمت پر، بلکہ سب کو ایک قیمت پر دے رہا ہے، لہٰذا کوئی بھی شخص اسے یہ نہیں کہتا کہ تم غریب آدمی کو ایک روپئے کا قلم فروخت کر کے ظلم کر رہے ہو، اس لئے کہ وہ اپنا حق وصول کر رہا ہے، اس لئے کہ امیر اور غریب دونوں سے نفع کا مطالبہ کرنا اس کا حق ہے، کوئی ظلم نہیں۔

بالکل اسی طرح ایک غریب شخص دوسرے سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسرا شخص اس قرض پر سود کا مطالبہ کرتا ہے تو اب یہ کہنا کہ چونکہ قرض لینے والا غریب ہے اس لئے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے، کیسے درست ہوسکتا ہے۔ جبکہ وہی شخص اپنا منافعہ رکھ کر غریب آدمی کو ایک روپئے کا قلم فروخت کر رہا ہے تو یہ ظلم نہیں اور دوسرا شخص اس غریب سے قرض پر سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو یہ ظلم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کی علت معاملہ کرنے والے کی ’’غربت‘‘ نہیں، بلکہ ظلم کی اصل علت ’’روپیہ‘‘ ہے اور یہ علت غریب کے قرض میں جس طرح پائی جارہی ہے، اسی طرح امیر کے قرض میں بھی موجود ہے اور قلم یا دیگر کسی چیز پر نفع کا مطالبہ کرنا انصاف کے بھی خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے، اس لئے ’’روپیہ‘‘ ایسی چیز نہیں، جس پر منافع کا مطالبہ کیا جائے، لہٰذا قرض لینے والا امیر ہو یا غریب ہو، دونوں صورتوں میں سود لینا حرام ہوگا۔ اور ان ہی خرابیوں کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے مطلقاً سود کے بارے میں فرمایا: ’’ان الربا بضع و سبعون شعبة ادناها کالذی یقع علی امه‘‘ [سود کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، اس کا ادنیٰ درجہ اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر ہے۔]

اس حدیث شریف کا مدعا اور پیغام یہ ہے کہ سود خوری اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بدرجہا زیادہ شدید وخبیث گناہ ہے۔(نفحات التنقیح :۴١٦/٣)

ہم جنس اشیاء کے باہمی تبادلہ وتجارت میں ربا کی صورت

{٢٦٨۴} **وَعَنْ** عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمَرُ بِالتَّمَرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ٢/٢٥، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقدا، حدیث نمبر: ١٥٨٧۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیچو تم سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض اور گیہوں کو گیہوں کے عوض اور جو کو جو کے عوض اور کھجور کو کھجور کے عوض اور نمک کو نمک کے عوض برابر، برابر (ہوں مقدار میں اور مزید تاکید کے لئے فرمایا: سواء بسواء) برابر، برابر کے ساتھ ہاتھ در ہاتھ (یعنی دونوں طرف سے نقد) اور جب کہ یہ اجناس بدل جائیں تو پھر فروخت کرو تم جس طرح چاہو، بشرطیکہ ہاتھ در ہاتھ ہو۔(مسلم شریف)

”ربا المعاملات“ کی کچھ وضاحت

تشریح: اس حدیث شریف میں اور اس کے بعد والی چند حدیثوں میں ربا کی دوسری قسم یعنی ربا المعاملات کا ذکر ہے۔ حدیث شریف میں چھ چیزوں کے متعلق ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ چھ چیزیں یہ ہیں:

(١) سونا۔ (٢) چاندی۔ (٣) تمر۔ (۴) نمک۔ (٥) جو۔ (٦) گندم۔

ان چھ چیزوں کے متعلق جوضابطہ بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ان کی بیع اس طرح ہو کہ دونوں طرف سے ایک ہی جنس ہو، مثلاً سونے کی بیع سونے کے بدلہ میں ہو یا گندم کی بیع گندم کے بدلہ میں تو یہاں دو چیزوں کی رعایت ضروری ہے، ایک یہ کہ دونوں کی مقداروں میں مماثلت ہو، عوضین کی مقداریں برابر ہوں، کسی طرف سے کمی بیشی نہ ہو، اس کو حدیث میں ''مثلاً بمثل'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اگر ایک طرف زیادہ اور دوسری طرف کم ہو تو یہ ''ربا'' ہوگا، اس کو ''ربا الفضل'' کہتے ہیں، دوسری جس چیز کی رعایت ضروری ہے یہ ہے کہ معاملہ دونوں طرف سے نقد ہو اور تعیین مجلس کے اندر ہو جائے، اگر ایک طرف سے ادھار ہوگیا، یعنی ایک فریق نے اپنا عوض مجلس کے اندر متعین کیا تو یہ ''ربا'' ہو جائے گا اس کو ''ربا النسیئہ'' کہتے ہیں، ''یدا بید'' یا ''ھاء و ھاءَ'' کہہ کر تقابض فی المجلس بتلانا مقصود ہے۔

اگر عوضین کا تعلق ایک جنس سے نہ ہو، مثلاً حنطہ کی بیع ہو رہی ہو ملح کے بدلہ میں تو تقابض فی المجلس تو اب بھی ضروری ہے، مماثلت ضروری نہیں، عوضین کی مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے۔

حاصل یہ کہ ان اشیاءِ ستہ میں اگر عوضین متحد الجنس ہوں تو تفاضل اور نسیئہ دونوں ناجائز ہیں اور اگر مختلف الجنس ہوں تو تفاضل جائز اور نسیئہ ناجائز ہے۔

ان اشیاءِ ستہ میں اس طرح سے سود لازم آنا علماء کے درمیان اتفاقی مسئلہ ہے اور حدیث میں بھی تصریح ہے البتہ اس میں اختلاف ہوا ہے کہ معاملات کا سود ان ہی اشیاءِ ستہ میں منحصر ہے یا ان کے علاوہ اور اشیاء میں بھی ہوتا ہے؟ بعض اصحابِ ظواہر کے نزدیک ''ربا المعاملات'' ان چھ چیزوں میں منحصر ہے، لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ان اشیاء میں سود لازم آنا معلول بالعلت ہے، جہاں وہ علت پائی جائے گی وہاں ''ربا المعاملات'' لازم آئے گا، اب قابل غور یہ ہے کہ وہ علت کیا ہے؟ اس میں ان حضرات کا بھی اختلاف ہوا ہے، ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حنفیہ کے نزدیک ان اشیاء میں ربا کی علت قدر اور جنس ہے، امام احمد کا قول مشہور یہی ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علت طعم اور ثمنیت ہے، مجانست ان کے ہاں علت ربا نہیں، بلکہ شرط ربا ہے۔ امام مالک کے نزدیک علت ربا طعم اور ادخار ہے۔

حنفیہ کے مذہب میں قدر سے مراد اس شی کا مکیلی یا موزونی ہونا ہے، مذہب حنفی کی مزید

وضاحت یہ ہے کہ اگر عوضین میں اتحاد جنس بھی ہو اور اتحاد قدر بھی ہو تو تفاضل اور نسیئہ دونوں حرام ہیں، اور اگر اتحاد جنس ہو اتحاد قدر نہ ہو جیسے انڈے کی بیع انڈے کے بدلہ میں کہ جنس تو ایک ہے لیکن یہ قدری نہیں، یا اتحاد قدر ہو اتحاد جنس نہ ہو جیسے چاول کی بیع چنے کے بدلہ میں تو تفاضل جائز ہے اور نسیئہ ناجائز ہے، اور اگر نہ اتحاد جنس ہو نہ اتحاد قدر تو تفاضل بھی جائز ہے اور نسیئہ بھی جیسے، انڈوں کی بیع اخروٹوں کے بدلہ میں۔

حنفیہ کے نزدیک کل چار صورتیں بنیں گے:

(۱)......اتحاد جنس اور اتحاد قدر دونوں ہو تو تفاضل اور نسیئہ دونوں ناجائز ہیں۔

(۲)......اتحاد جنس ہو اتحاد قدر نہ ہو تو تفاضل جائز ہے، نسیئہ ناجائز۔

(۳)......اتحاد قدر ہو اتحاد جنس نہ ہو تو تفاضل جائز، نسیئہ ناجائز۔

(۴)......نہ اتحاد قدر ہو نہ اتحاد جنس، تو تفاضل اور نسیئہ دونوں جائز ہیں۔ (اشرف التوضیح: ۲/۳۸۷)

ایضاً

{۲۶۸۵} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِیْرُ بِالشَّعِیْرِ وَالتَّمَرُ بِالتَّمَرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ یَدًا بِیَدٍ فَمَنْ زَادَ اَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ اَرْبٰی الْاٰخِذُ وَالْمُعْطِیْ فِیْهِ سَوَاءٌ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الصرف وبیع الذھب بالورق نقداً، حدیث نمبر: ۱۵۸۴۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: فروخت کرو تم سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض اور گیہوں کو گیہوں کے عوض اور جو کو جو کے عوض اور کھجور کو کھجور کے عوض اور نمک کو نمک کے عوض (مقدار میں) برابر ہوں، ہاتھ در ہاتھ (یعنی لین دین ہو دونوں جانب سے) پس جس شخص نے زائد دیا یا جس نے زائد طلب کیا تو یقیناً اس نے سود کو اختیار کیا، سود لینے والا اور دینے والا اس میں

برابر ہیں۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

سونا اور چاندی کے باہم لین دین

{۲۶۸۶} **وَعَنْہُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَبِیْعُوْا الذَّھَبَ بِالذَّھَبِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ لَا تُشِفُّوْا بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ وَلَا تَبِیْعُوْا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ وَلَا تَبِیْعُوْا مِنْھَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ) وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَا تَبِیْعُوْا الذَّھَبَ بِالذَّھَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا وَزْنًا بِوَزْنٍ۔

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۹۱، کتاب البیوع، باب بیع الفضۃ بالفضۃ، حدیث نمبر: ۲۱۷۷، مسلم شریف: ۲/۲۴، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الربا، حدیث نمبر: ۱۵۸۴

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہ فروخت کرو تم سونے کو سونے کے عوض، مگر برابر، برابر اور اس کا بعض بعض پر زیادہ نہ کرو، اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ فروخت کرو، مگر وزن (یعنی من حیث المقدار) وزن کے برابر ہو اور زائد نہ کرو بعض پر بعض کو اور نہ بیع کرو ان میں سے کسی کی غائب کی نقد کے عوض۔

اور ایک روایت میں یہ کلمات ہیں:

"لَا تَبِیْعُوْا الذَّھَبَ بِالذَّھَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرَقِ اِلَّا وَزْنًا بِوَزْنٍ"

[نہ سونا سونے کے بدلے بیچو نہ چاندی چاندی کے بدلے۔]

مگر دونوں وزن میں برابر ہوں۔

تشریح: یہ حدیث شریف اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص سونے کے زیور کا سونے کے ساتھ یا چاندی کے زیور کا چاندی کے ساتھ تبادلہ کرے تو اس صورت میں بھی دونوں کا وزن میں برابر سرابر ہونا ضروری ہے۔

ہم جنس اشیاء کا تبادلہ برابر کرنا چاہئے

{۲۶۸۷} وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اَلطَّعَامُ بِالطَّعَامِ مِثْلًا بِمِثْلٍ۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۲۶، کتاب المساقاة والمزارعة، باب بیع الطعام مثلا بمثلا، حدیث نمبر: ۱۵۹۲۔

ترجمہ: حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمارہے تھے: غلہ، غلہ کے عوض برابر فروخت کرو۔

تشریح: اوپر گذر چکی۔

متحد القدر چیزوں کے تبادلہ میں ادھار نا جائز ہے

{۲۶۸۸} وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْوَرِقُ بِالْوَرِقِ رِبًا اِلَّا هَآءَ وَهَآءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا اِلَّا هَآءَ وَهَآءَ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ رِبًا اِلَّا هَآءَ وَهَآءَ وَالتَّمَرُ بِالتَّمَرِ رِبًا اِلَّا هَآءَ وَهَآءَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۹۰، کتاب البیوع، باب بیع الشعیر بالشعیر، حدیث نمبر: ۲۱۷۴، مسلم شریف: ۲/۲۴، کتاب المساقاة والمزارعة، باب الصرف وبیع الذهب بالورق نقدا، حدیث نمبر: ۱۵۸۶۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سونا، سونے کے عوض سود ہے، مگر اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے، اور چاندی چاندی کے عوض سود ہے، مگر اس ہاتھ دے، اور اس ہاتھ لے۔ اور گیہوں گیہوں کے عوض سود ہے، مگر اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے،

اور جو، جو کے عوض سود ہے، مگر اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے، اور کھجور کھجور کے عوض سود ہے، مگر اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے۔

تشریح: اس حدیث شریف میں جو لفظ مکرر یعنی ھاء و ھاء ہے، یہ اسمائے افعال میں سے ہے، جس کے معنی ہیں، خذ اس میں مد اور قصر دونوں جائز ہیں، لیکن مد افضل ہے، سیوطی نے لکھا ہے کہ اس لفظ کی اصل ''ھاک'' ہے، یعنی ''خذ'' کاف (ک) کو حذف کر کے اس کے عوض میں مد اور ہمزہ کو لایا گیا۔ اور فائق میں لکھا ہے کہ لفظ ''ھائ'' اسمائے اصوات میں سے ہے، بمعنی ''خذ'' اور اسی سے ہے باری تعالیٰ کا قول ''ھاؤم اقرؤ کتابیه'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ یہ لفظ محل نصب میں ہے بنا بر حالیت کے، اور الا کا مستثنیٰ منہ مقدر ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بیع الذہب بالفضۃ ربا ہے، تمام حالات میں الا حال الحضور و التقابض فی المجلس۔ پس یہ لفظ ''ھاء و ھائ'' کنایہ ہے تقابض سے۔ (بذل) لہٰذا ترجمہ یہ ہوگا کہ ذہب کی بیع فضہ کے ساتھ ربا ہے، جملہ احوال میں، مگر اس حال میں کہ متعاقدین میں سے ہر ایک دوسرے سے کہہ رہا ہو ''خذ ھذا'' یعنی لے بھائی اور دوسرا بھی کہے لے بھائی، اسی کا نام ہے تقابض فی المجلس۔ اور اگر اس طرح نہیں ہوگا تو پھر ربا النسیئہ پایا جائے گا جو کہ حرام ہے۔ (الدر المنضود: ۵/۳۴۱) باقی تفصیل ما قبل میں گذر چکی۔

ہم جنس ہونے کی صورت میں ناقص اور عمدہ چیز کا تبادلہ

{۲۶۸۹} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلٰی خَیْبَرَ فَجَاءَ هٗ بِتَمْرٍ جَنِیْبٍ فَقَالَ: اَکُلُّ تَمْرِ خَیْبَرَ هٰکَذَا قَالَ: لَا وَاللّٰهِ! یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّا لَنَاْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰذَا بِالصَّاعَیْنِ وَالصَّاعَیْنِ بِالثَّلَاثِ فَقَالَ لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِیْبًا وَقَالَ: فِی الْمِیْزَانِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۹۳، کتاب البیوع، باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منہ، حدیث نمبر: ۲۲۰۱،

مسلم شریف: ۲۶/۲، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب بیع الطعام مثلا بمثل، حدیث نمبر: ۱۵۹۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر ایک شخص کو عامل مقرر فرمایا، وہ عامل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہایت عمدہ کھجوریں لایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! نہیں، البتہ ہم لوگ اس قسم کی کھجوریں ایک صاع کو دو صاع کے عوض اور دو صاع کو تین صاع کے عوض تبادلہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (یہ صورت) نہ کرو، (بلکہ) فروخت کرو (اپنی) ردی قسم کی (یا مخلوط شدہ) کھجوروں کو (اولاً) دراہم کے عوض اور پھر نفیس کھجوروں کو دراہم کے عوض خرید لو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اشیاء ربوا میں جو اشیائ) وزن کی جاتی ہیں ان میں (بھی) یہی حکم فرمایا۔

تشریح: اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ دو ہم جنس اشیاء کا باہمی تبادلہ کیا جائے اور ان میں سے ایک گھٹیا ہو اور دوسری اچھی ہو۔ اور اچھی چیز کم وزن میں دی جائے اور اس کے مقابلہ میں گھٹیا چیز زیادہ وزن میں لی جائے تو بھی ناجائز ہے، اور اس طرح کاروبار کرنا اور آپسی معاملہ کرنا بھی ناجائز ہے۔ چونکہ شریعت میں جنس واحد میں جید اور ردی کا تفاوت لغو اور بے کار ہے۔

اگر کسی شخص کو ایسی ضرورت پیش آجائے اور گھٹیا گیہوں اچھے گیہوں کے بدلے تبادلہ کرنا ضروری ہو جائے تو شریعت میں اس کی ترکیب یہ ہے کہ دو بیعیں کی جائیں کہ اولاً اپنے معمولی اور گھٹیا گیہوں کسی کو نقد بیچ دے، پھر اس رقم سے عمدہ گیہوں خرید لے۔ (تحفۃ الالمعی)

حدیث شریف کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کھجور اور ان چیزوں کے بارہ میں جو کیلی ہیں یہ حکم بیان کیا گیا، اسی طرح ان چیزوں کے بارہ میں بھی جو وزن کے ذریعہ لی جاتی ہیں، جیسے سونا چاندی کا یہی حکم ہے کہ اچھی اور خراب ہونے کی صورت میں بھی دونوں میں برابری ضروری اور تفاضل حرام ہوگا۔

اگر جنس متحد ہو تو کمی بیشی ناجائز ہے

{۲۶۹۰} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ جَاءَ بِلَالٌ اِلَی

النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرٍ بَرْنِيٍّ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَيْنَ هٰذَا؟ قَالَ: كَانَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِيٌّ فَبِعْتُ مِنْهُ صَاعَيْنِ بِصَاعٍ فَقَالَ أَوَّهْ! عَيْنُ الرِّبَا عَيْنُ الرِّبَا لَا تَفْعَلْ وَلٰكِنْ إِذَا أَرَدْتَ أَنْ تَشْتَرِيَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَيْعٍ اٰخَرَ ثُمَّ اشْتَرِبِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۱/۲۹۳، کتاب البیوع، باب اذا اراد بیع تمر بتمر خیر منه، حدیث نمبر: ۲۲۰۱، مسلم شریف: ۲/۲۶، کتاب المساقاة والمزارعة، باب بیع الطعام مثلا بمثل، حدیث نمبر: ۱۵۹۴۔

ترجمه: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں برنی کھجوریں لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: یہ کہاں سے لائے ہو؟ انہوں نے فرمایا: کہ میرے پاس ردی قسم کی کھجوریں تھیں، پس میں نے ان میں کی دو صاع کھجوروں کو ایک صاع کے عوض خرید کرلی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اُف! یہ تو عین ربا ہے، عین ربا ہے، ایسا نہ کرنا۔ بلکہ جب تمہارا خریداری کرنے کا ارادہ ہو تو (اولاً) ان معمولی کھجوروں کو فروخت کردو کسی دوسری جنس کی بیع کے ساتھ اور پھر خرید کرلو اس کے عوض۔

تشریح: اوپر گذر چکی۔

جو چیزیں ہم وزن اور ہم کیل نہ ہوں اس میں کمی بیشی

{۲۶۹۱} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ جَاءَ عَبْدٌ فَبَايَعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَلَمْ يَشْعُرْ أَنَّهُ عَبْدٌ فَجَاءَ سَيِّدُهُ يُرِيْدُهُ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعْنِيْهِ فَاشْتَرَاهُ بِعَبْدَيْنِ أَسْوَدَيْنِ وَلَمْ يُبَايِعْ أَحَدًا بَعْدَهُ حَتّٰى يَسْأَلَهُ أَعَبْدٌ هُوَ أَوْ حُرٌّ؟۔ (رواه مسلم)

حواله: مسلم شریف: ۲/۳۰، کتاب المساقاة والمزارعة، باب جواز بیع الحیوان بالحیوان من جنسه متفاضلاً، حدیث نمبر: ۱۶۰۲۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک غلام حاضر (خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) ہوا اور اس نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرلی ہجرت پر، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نہ تھا کہ وہ غلام ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس غلام کا مالک آیا، جو اس کو لے جانے کا ارادہ کرتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: کہ تم اس کو فروخت کردو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دو حبشی غلاموں کے عوض خرید لیا، اور اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے بیعت نہیں لی حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے سوال فرمالیتے کہ وہ غلام ہے یا آزاد؟

تشریح: اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ ایک غلام کو دو غلاموں کے بدلے میں لینا جائز ہے، نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو چیزیں ''مال ربا'' میں داخل نہیں ان کا لین دین اس طرح کرنا کہ ایک طرف کم ہو اور دوسری طرف زیادہ ہو جائز ہے، چنانچہ شرح السنہ میں لکھا ہے کہ علماء نے اسی بنیاد پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ ایک جانور کو دو جانوروں کے بدلے میں دست بدست لینا جائز ہے، خواہ دونوں طرف سے ایک ہی جنس کے جانور ہوں یا دو جنس کے البتہ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین جائز ہے یا نہیں؟ (التعلیق:۳۰۶/۳)

چنانچہ حنفیہ کے نزدیک بیع الحیوان بالحیوان نسیئۃً جائز نہیں جبکہ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک جائز ہے۔ (التعلیق:۳۰۷/۳)

حنفیہ کا استدلال حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے: **''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الحیوان بالحیوان نسیئۃ''** (ابوداؤد:۲۵۰/۳، رقم الحدیث:۳۳۵۶)

[بالیقین حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیوان کی بیع حیوان کے بدلے ادھار سے منع فرمایا ہے۔]

شافعیہ اور مالکیہ کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے: **''انہ صلی اللہ علیہ وسلم امرہ ان یجہز جیشا فنفدت الابل فامرہ أن یأخذ علی قلائص الصدقۃ فکان یأخذ البعیر بالبعیرین الی ابل الصدقۃ''** (ایضاً، رقم الحدیث:۳۳۵۷)

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں ایک اونٹ کے بدلے میں دو اونٹ لئے گئے اور یہ نسیئہ ہی تھا، لہٰذا جیسے یداً بید تفاضل جائز ہے، نسیئہ بھی جائز ہے۔

ان کے استدلال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تحریم الربو سے قبل کا واقعہ ہے، بعد میں روایات تحریم سے حکم منسوخ ہوا۔ (شرح معانی الآثار: ۲/۲۵۲، مرقاۃ: ۶/۶۷)

اور پھر حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت مبیح اور حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایات محرم ہیں، اور ترجیح محرم کو ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ جہاد کا معاملہ تھا، عام بیع کی بات نہیں تھی، عام بیع کے لئے تو یہی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایات ہیں کہ بیع الحیوان بالحیوان نسیئۃً جائز نہیں ہے۔

واضح رہے کہ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے تین اقوال مروی ہیں، ایک قول یہ کہ مطلقاً جائز ہے، دوسرا یہ کہ مطلقاً ناجائز ہے، تیسرا یہ کہ اگر متحد الجنس ہوں تو ناجائز ہے اور اگر مختلف الجنس ہوں تو جائز ہے۔ (نفحات التنقیح: ۳/۴۲۹)

ہم جنس اشیاء کا تفاوت کے ساتھ لین دین

{۲۶۹۲} **وَعَنْهُ** قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ لَا يُعْلَمُ مَكِيْلَتُهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمّٰى مِنَ التَّمْرِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۶، کتاب البیوع، باب تحریم بیع صبرۃ التمر المجھولۃ القدر بتمر، حدیث نمبر: ۱۵۳۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کے ڈھیر کو جس کا کیل معلوم نہ ہو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے مقدار معلوم کھجوروں کے عوض۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپسی لین دین کی اس صورت کو بھی منع فرمایا ہے کہ ایک طرف تو کھجوروں کی غیر معین مقدار کا ڈھیر ہو اور دوسری طرف کھجوروں کا متعین مقدار ہو۔ مثلاً دس کیلو ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس ڈھیر کی مقدار غیر معلوم ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ ڈھیر اس متعینہ مقدار کھجور سے کم رہ جائے یا اس سے زیادہ ہوجائے اور یہ دونوں شکلیں سود کی ہیں۔ اس لئے اس طرح بیع کرنا بھی ناجائز ہوا،

چونکہ اس میں سود کا اندیشہ ہے، لین دین کی یہ صورت ناجائز اس وقت ہے کہ باہم تبادلہ کی جانے والی چیزیں ہم جنس ہوں اگر مختلف الجنس ہیں تو پھر ممنوع نہیں ہے۔ (مظاہر حق: ۳/۴۷۱)

سونے کی خرید وفروخت کا مسئلہ

{۲۶۹۳} **وَعَنْ** فَضَالَةَ بْنِ اَبِيْ عُبَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اِشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلَادَةً بِاِثْنَيْ عَشَرَ دِيْنَارًا فِيْهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيْهَا اَكْثَرَ مِنْ اِثْنَيْ عَشَرَ دِيْنَارًا فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: لَا تُبَاعُ حَتّٰى تُفَصَّلَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۲۵، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب بیع القلادۃ فیھا خرز وذھب، حدیث نمبر: ۱۵۹۱۔

ترجمہ: حضرت فضالہ بن ابی عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے خیبر والے دن ایک ہار بارہ دینار کے عوض خرید کیا، جس میں سونا اور نگینہ تھا، میں نے ان نگوں کو سونے سے جدا کر دیا، پس میں نے اس ہار میں بارہ دینار سے زائد سونا موجود پایا۔ تو پھر میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فروخت نہ کیا جائے یہاں تک کہ علاحدہ علاحدہ کرلیا جائے۔

تشریح: اس حدیث میں یہ ضابطہ بتایا ہے کہ اگر اموال ربویہ میں ایسی دو ہم جنس چیزوں کی آپس میں خرید وفروخت کی جائے کہ ان دونوں چیزوں میں سے ایک طرف کی چیز میں کوئی اور غیر جنس کی چیز بھی شامل ہو تو یہ جائز نہیں۔ تاکہ ہم جنس چیزوں کی کمی بیشی کے ساتھ باہمی لین دین میں سود کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔

مثلاً ایسا ہار جس میں سونا اور نگینے ہوں اس کی بیع اگر دیناروں کے بدلہ میں ہو رہی ہو تو پہلے ہار میں لگے ہوئے سونے کی مقدار معلوم کرلینا ضروری ہے، اگر اس سونے کی مقدار ثمن میں دیئے جانے والے دیناروں سے زیادہ ہے یا اس کے برابر ہے تو بیع ناجائز ہے کیونکہ سونے اور دیناروں کی مقدار اگر برابر

ہے تو نگینے بلاعوض رہ جائیں گے جس سے ربالازم آئے گا۔ (مرقاۃ: ۶/۶۴)

اور اگر ہار میں سونا دنانیر کے سونے سے زیادہ ہوگا تو زائد سونے اور نگینوں کا بلاعوض ہونا لازم آئے گا۔ البتہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر یقینی طور پر معلوم ہو کہ ثمن میں جو سونا دیا جارہا ہے خواہ وہ اشرفیوں کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں، وہ سونا ہار کے سونے سے زائد ہے، تو اس صورت میں نگینوں کو سونے سے جدا کرنے اور سونے کو وزن کرنے کے بغیر بھی بیع جائز ہے تاکہ سونا سونے کے مقابلے میں آجائے اور جو سونا ثمن میں زائد ہے وہ نگینوں کے مقابلے میں آجائے۔ تلوار وغیرہ اور زیورات کا بھی یہی حکم ہے۔

لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بغیر فصل اور جدائی کے بیع جائز نہیں اور ان کا استدلال حدیث مذکور سے ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے جواب یہ ہے کہ اس حدیث شریف میں بھی بغیر فصل کے ممانعت کی علت یہ ہے کہ ثمن کی جانب میں سونا کم ہے اور ہار کی جانب میں سونا زیادہ ہے اور نگینے بھی زائد ہیں جس کی وجہ سے ربالازم آتا ہے، جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ایسی صورت بتائی ہے کہ جس سے ربالازم نہیں آتا یعنی یہ کہ ثمن کی جانب میں سونا زیادہ ہوتا کہ وہ سونا ہار کے سونے کے مقابلے میں بھی آجائے اور جو سونا زائد ہے وہ ہار کے نگینوں کے مقابلے میں آجائے اور ظاہر ہے کہ اس طرح تقابل سے تفاضل بلاعوض لازم نہیں آئے گا۔ (اعلاء السنن: ۱۴/۲۷۸)

الفصل الثانی

سود کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی

{۲۶۹۴} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عن رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیَاتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی اَحَدٌ اِلَّا اٰکِلَ الرِّبٰا فَاِنْ لَّمْ یَاْکُلْهُ اَصَابَهٗ مِنْ بُخَارِهٖ وَیُرْوٰی مِنْ غُبَارِهٖ۔ (رواه احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجة)

حواله: مسند احمد: ۲/۲۳۹، کتاب البیوع، الباب الرابع فی الربا، الفصل الثانی فی احکام الربا، ابوداؤد: ۲/۴۷۳، کتاب البیوع، باب اجتناب الشبهات، حدیث نمبر: ۳۳۳۱، نسائی شریف: ۲/۱۸۶، کتاب البیوع، باب اجتناب الشبهات فی الکسب، حدیث نمبر: ۴۴۶۰، ابن ماجه: ۱۶۵، ابواب التجارات، باب التغلیظ فی الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۸،

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا ضرور آئے گا کہ (اس وقت) کوئی شخص باقی نہ رہے گا، مگر سود کھائے گا، اور اگر اس نے سود نہیں کھایا تو اس کا دھواں ضرور پہنچے گا اور ایک روایت میں منقول ہے: "من غبارہ" یعنی اس کا گرد وغبار۔

تشریح: عرب کے اندر ربا اور سودی معاملات کا لین دین بہت عام تھا، جس کو وہ بالکل جائز سمجھتے تھے، اسلام نے آکر اس کو حرام قرار دیا اور حضور اقدس ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبوں میں دوسرے امور کے ساتھ اس کی بھی حرمت کا بار بار اعلان فرمایا اور زمانہ جاہلیت سے جو لوگوں کے ربوی معاملات چل رہے تھے، سب پر آپ نے روک لگائی: "وربا الجاهلية موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبدالمطلب فانه موضوع كله" (مسلم شریف) اور فرمایا کہ سابقہ سودی

معاملات کی باقی رقم جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے معاملات کی ہے، اس کے چھوڑنے میں پہل میں کرتا ہوں، غرضیکہ لوگوں نے اس حرمت کے بعد سودی کاروبار و معاملات بند کر دئے، پھر آپ اس حدیث الباب میں فرمارہے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ سودی معاملات کا سلسلہ پھر زور و شور کے ساتھ پایا جائے گا اور یہ وبا ایسی عام ہوگی جس سے کوئی نہ بچ سکے گا، اور اگر کوئی بہت ہی کوشش کر کے صریح سود کے کھانے سے پرہیز کرے گا بھی تو کم از کم اس کا بخار اور دھواں تو ضرور ہی اس تک پہنچ کر رہے گا، یعنی سود کا اثر اس کو کسی نہ کسی طرح پہنچے گا، مثلاً سودی معاملات میں شاہد بننے کی نوبت آئے گی، یا کاتب بننے کی یعنی سودی معاملات لکھنے لکھانے کی، یا آکل ربا کے یہاں ضیافت کھانے یا اس کی طرف سے ہدیہ وغیرہ ملنے سے۔ (الدر المنضود: ۵/۳۳۰)

مختلف الجنس اشیاء کے دست بدست لین دین میں کمی بیشی

{۲۶۹۵} وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَبِيْعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ وَلَا الْبُرَّ بِالْبُرِّ وَلَا الشَّعِيْرَ بِالشَّعِيْرِ وَلَا التَّمْرَ بِالتَّمْرِ وَلَا الْمِلْحَ بِالْمِلْحِ اِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ عَيْنًا بِعَيْنٍ يَدًا بِيَدٍ وَلٰكِنْ بِيْعُوا الذَّهَبَ بِالْوَرِقِ وَالْوَرِقَ بِالذَّهَبِ وَالْبُرَّ بِالشَّعِيْرِ وَالشَّعِيْرَ بِالْبُرِّ وَالتَّمْرَ بِالْمِلْحِ وَالْمِلْحَ بِالتَّمْرِ يَدًا بِيَدٍ كَيْفَ شِئْتُمْ۔ (رواه الشافعي)

حوالہ: مسند شافعی: کتاب البیوع، باب الربا الطعام بالطعام۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہ فروخت کرو تم سونے کو سونے کے عوض اور نہ چاندی کو چاندی کے عوض اور نہ گیہوں کو گیہوں کے عوض اور نہ جو کو جو کے عوض اور نہ کھجور کو کھجور کے عوض اور نہ نمک، نمک کے عوض مگر برابر برابر کے عوض نقد در نقد، ہاتھ در ہاتھ، لیکن فروخت کرو تم سونے کو چاندی کے عوض اور چاندی کو سونے کے عوض اور گیہوں کو جو کے اور جو کو گیہوں کے عوض اور کھجور کو نمک کے اور نمک کو کھجور کے عوض جس طرح چاہو۔

تشریح: حدیث شریف کا خلاصہ اور مطلب یہ ہے کہ اگر ایسی دو چیزوں کا آپس میں لین دین اور تبادلہ کرو جو ہم جنس ہوں جیسے گیہوں گیہوں کے بدلہ میں تو اس صورت میں برابر سرابر اور دست بدست ہونا ضروری ہے کہ دونوں ایک ہی مقدار کے ہوں اور مجلس عقد ہی میں دونوں کا قبضہ ہو جائے اور اگر ایسی دو چیزوں کا لین دین کیا جائے جو ہم جنس نہ ہوں بلکہ الگ الگ جنس کی ہوں جیسے گیہوں جو کے بدلے میں تو اس صورت میں صرف دست بدست، یعنی دونوں کا قبضہ مجلس عقد ہی میں ہونا ضروری ہے، برابر سرابر ہونا ضروری نہیں۔

رطب و یابس پھلوں کے باہمی لین دین کا مسئلہ

{۲۶۹۶} **وَعَنْ** سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ شِرَاءِ التَّمْرِ بِالرُّطَبِ فَقَالَ اَیَنْقُصُ الرُّطَبُ اِذَا یَبِسَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ! فَنَهَاهُ عَنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ مالك والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

حوالہ: موطا امام مالک: ۲۵۶، کتاب البیوع، باب مایکرہ من بیع التمر، ترمذی شریف: ۲۳۲/۱، کتاب البیوع، باب ماجاء فی النھی عن المحاقلۃ، حدیث نمبر: ۱۲۲۵، ابوداؤد شریف: ۴۷۷/۲، کتاب البیوع، باب فی التمر بالتمر، حدیث نمبر: ۳۳۵۹، نسائی شریف: ۱۹۱/۲، کتاب البیوع، باب اشتراء التمر بالرطب، حدیث نمبر: ۴۵۴۹، ابن ماجہ شریف: ۱۶۴/۲۔ ابواب التجارات، باب بیع الرطب بالتمر، حدیث نمبر: ۲۲۶۴۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کئے گئے (تھے) کھجور کو تازہ کھجور کے عوض خرید کرنے سے متعلق، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تازہ کھجور گھٹ جاتی ہے جب کہ وہ سوکھ جائے؟ تو کہا: جی ہاں! تو پھر نے اس سے منع فرمادیا۔

تشریح: رطب تر کھجور کو کہا جاتا ہے اور تمر خشک کھجور کو کہا جاتا ہے۔

بیع الرطب بالتمر ائمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ناجائز اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز

ہے اس مسئلہ میں صاحبین نے بھی ائمہ ثلاثہ کا مسلک اختیار کیا ہے۔

ان کا استدلال حدیث مذکورسے ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے ''بیع الرطب بالتمر'' کے بارے میں پوچھا گیا تو آنحضرت ﷺ نے استفسار فرمایا: کہ تر کھجوریں خشک ہو کر کم ہو جاتی ہیں۔ عرض کیا گیا جی ہاں! چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس طرح لین دین سے منع فرمادیا، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا استفسار فرمانا کہ وہ تر کھجوریں خشک ہو کر کم ہو جاتی ہیں، استعلام کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ بات بالکل جلی اور واضح ہے کہ تر کھجوریں خشک ہو کر کم ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ مماثلت کا تحقق رطب ہونے کی حالت میں شرط نہیں بلکہ یابس اور خشک ہونے کی حالت میں مماثلت کا تحقق شرط ہے، لہٰذا رطب ہونے کی حالت میں مماثلت نہیں ہوگی، تخمینہ اور اندازہ ہوگا اور جب تک مماثلت کا تحقق نہ ہو تو بیع بھی جائز نہیں ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہم جنس خشک اور تازہ پھلوں کے باہمی لین دین کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ دونوں طرف پھل مقدار یا وزن میں برابر ہوں۔

امام صاحب جب بغداد تشریف لائے تو وہاں لوگوں نے آپ سے یہی مسئلہ پوچھا وہ آپ کے سخت مخالف تھے کہ آپ نے حدیث کی مخالفت کی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ رطب بھی تمر کی جنس سے ہے یا نہیں؟ اگر رطب تمر ہی کی جنس سے ہے تو یہ بیع جائز ہونی چاہئے، اس حدیث کی رو سے ''التمر بالتمر مثلا بمثل'' اور اگر رطب تمر کی جنس سے نہیں ہے تو اسی حدیث کے آخری حصہ کی وجہ سے یہ بیع جائز ہونی چاہئے۔ ''اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم'' امام صاحب کے اس استدلال کا تو وہ حضرات کوئی جواب نہ دے سکے۔

زیر بحث حدیث کا جواب امام صاحب کی طرف سے ایک تو یہ ہے کہ یہ حدیث نسیئۃ پر محمول ہے، یعنی ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے کہ ایک فریق تو اپنا عوض نقد دے اور دوسرا اپنا عوض بعد میں دینے کا وعدہ کرے اور وہ اس کے ذمہ پر ادھار ہو، امام صاحب کی رائے کی تائید اسی راوی کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے جس میں ادھار کی تصریح ہے۔ ''انہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الرطب بالتمر نسیئۃ'' (طیبی: ۶/۵۴، مرقاۃ: ۶/۶۶)

دوسرے یہ کہ حدیث مذکور کی سند کا مدار ابوعیاش پر ہے جو مجہول ہے۔(التعلیق المجد:۳۳۳)

اشکال مع جواب

اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر مجہول سے مجہول العین مراد ہے تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ ابوعیاش سے دو ثقہ حضرت عبداللہ بن یزید اور حضرت عمران بن ابی انس نے روایت کی ہے اور اگر مجہول الحال مراد ہے تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اگر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نہیں جانتے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حقیقت میں بھی مجہول ہو چنانچہ بہت سارے ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے، جن میں ابن حبان، امام ترمذی، ابن خزیمہ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ ہیں اور چونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی امامت اور ان کی روایات کی صحت پر اجماع ہے اس لئے بھی اس روایت کو تقویت ملتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابوعیاش زید کو مجہول کہنے میں منفرد نہیں، بلکہ دیگر ائمہ حدیث بھی ان کی تجہیل کے قائل ہیں، اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کرنے پر اعتماد نہیں کیا، چنانچہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ خود مستدرک میں فرماتے ہیں: ”لم یخرجاہ لما خشیا من جہالۃ زید“ اسی طرح ابن حزم، طبری، اور ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو غیر معروف اور مجہول قرار دیا ہے۔ ثانیاً یہ کہ روایت مذکورہ میں ابوعیاش زید متعین نہیں کہ یہ صحابی ہیں یا تابعی، چنانچہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوعیاش زرقی ایک صحابی کا نام بھی ہے اور ایک تابعی کا نام بھی ہے۔

اور روایت مذکورہ میں کسی کی تعیین نہیں ہوئی، جیسا کہ حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ابوعیاش زرقی صحابی تو نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ اجلۂ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، ان کے بارے میں جہالت کی بات نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کے زمانہ کو عبداللہ بن زید نے پایا ہے کہ ان سے وہ روایت کرتے، خلاصہ یہ کہ حضرات ائمہ کے نزدیک زید مجہول رہتے ہیں، لہٰذا اگر کسی امام نے ان کی تعدیل کی ہے اور پہچانا ہے تو ان کی حدیث اسی پر حجت ہوگی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر حجت نہیں ہوگی، کیونکہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مجہول ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تقلیداً امام صاحب حکم لگانے کے مکلف نہیں بلکہ خود مجتہد مطلق ہیں، کسی اور کی تقلید کے محتاج

نہیں ۔(تفصیل کے لئے دیکھئے: اعلاء السنن: ۳۲۰/ ۱۴، الدر المنضود، بذل المجہود، اشرف التوضیح: ۴۳۲/ ۲)

گوشت کے عوض زندہ جانور کی بیع

{۲۶۹۷} وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ مُرْسَلًا اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعِ اللَّحْمِ بِالْحَيْوَانِ قَالَ سَعِيْدٌ: كَانَ مِنْ مَيْسِرِ اَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ۔ (رواه فی شرح السنة)

حوالہ: شرح السنہ: ۵/ ۵۷، کتاب البیوع، باب بیع اللحم بالحیوان، حدیث نمبر: ۲۰۶۶۔

ترجمہ: حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے مرسلاً روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے گوشت کی بیع زندہ حیوان کے عوض۔ حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ یہ دورِ جاہلیت کا جوا تھا۔

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میسر'' کا لفظ یا ''یسر'' سے مشتق ہے اور چونکہ جوئے میں دوسرے کا مال بغیر تکلیف و مشق کے آسانی اور سہولت سے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے جوئے کو ''میسر'' کہا گیا ہے۔ یا پھر ''یسار'' سے مشتق ہے اور اس میں بھی دوسرے آدمی کو یسار سلب ہو جاتی ہے اس لئے ''میسر'' کہا گیا ہے۔ لیکن یہاں زمانہ جاہلیت کے جوئے کی قسم سے مراد یہ ہے کہ جس طرح جوئے کی صورت میں لوگوں کا مال کھایا جاتا ہے، اسی طرح اس میں بھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے اگر چہ دونوں میں فرق ہے کیونکہ وہاں تو جوا کھیلا جاتا تھا اور یہاں لین دین کا معاملہ کیا جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حدیث مرسل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے اس بات پر کہ گوشت کی بیع حیوان کے بدلہ میں جائز نہیں، چاہے وہ گوشت اسی حیوان کی جنس سے ہو یا کسی اور حیوان کی جنس سے ہو اور خواہ وہ حیوان ماکول اللحم ہو یا غیر ماکول اللحم ہو۔ (طیبی: ۶/۵۵د)

جب کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گوشت کی بیع حیوان کے بدلے جائز ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اس معاملہ میں ایک موزوں چیز ''یعنی گوشت'' کا تبادلہ ایک غیر موزوں چیز ''یعنی جانور'' کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جنس اور قدر دونوں متحقق نہیں، لہٰذا دونوں طرف کی چیزوں کا برابر

برابر ہونا ضروری نہیں ہے۔(ہدایہ:۸۲/ ۳)

اور اس صورت میں لین دین کا دست بدست ہونا ضروری ہے، اور حدیث نہی کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ لین دین دست بدست نہ ہو، بلکہ ایک طرف نقد ہو اور دوسری طرف ادھار ہو، لہٰذا بیع اللحم بالحیوان نسیئۃً ناجائز ہے اور اگر نقد ہو تو جائز ہے۔(مرقاۃ:۶۶/ ۶، اعلاء السنن:۳۱۵/ ۱۴)

امام علاء الدین کاسانی ''بدائع الصنائع'' میں فرماتے ہیں کہ اگر حیوان اور گوشت مختلف الجنس ہیں، مثلاً زندہ بکرے کے بدلے میں اونٹ یا گائے کا گوشت تو اس صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ نقداً یعنی دست بدست بھی جائز ہے اور نسیئۃً بھی جائز ہے، کیونکہ قدر اور جنس دونوں مفقود ہیں۔

اور اگر گوشت اسی حیوان کی جنس سے ہے مثلاً بکرے کا گوشت بکرے کے مقابلے میں تو ہمارے مشائخ میں سے بعض حضرات نے اس کو مختلف الجنس شمار کیا ہے اور وہی حکم لگایا ہے یعنی نقداً و نسیئۃً جواز کا۔ اور بعض مشائخ نے اس کو متحد الجنس شمار کیا ہے، لہٰذا دست بدست تو دونوں کا تبادلہ جائز ہے، اگرچہ کمی بیشی کے ساتھ ہو البتہ ادھار اور نسیئۃً کے طور پر جائز نہیں۔

(بدائع الصنائع:۱۸۹/ ۵ نفحات التنقیح:۴۳۳/ ۳)

جانور کی بیع جانور کے بدلے

{۲۶۹۸} **وَعَنْ** سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ نَسِيْئَةً۔ (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجة والدارمی)

حواله: ترمذی شریف:۲۳۳/ ۱، کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة بیع الحیوان بالحیوان نسیئة، حدیث نمبر:۱۲۳۷، ابوداؤد شریف:۴۷۷/ ۲، کتاب البیوع، باب فی الحیوان بالحیوان نسیئة، حدیث نمبر:۳۳۵۶، نسائی شریف:۱۹۷/ ۲، کتاب البیوع، باب بیع الحیوان بالحیوان نسیئة، حدیث نمبر:۲۳۸۶، ابن ماجہ شریف:۱۶۴، ابواب التجارات، باب الحیوان الحیوان، نسیئة، حدیث نمبر:۲۲۷۰، دارمی شریف:۲۳۳/ ۱، کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة بیع الحیوان بالحیوان، نسیئة، حدیث نمبر:۱۲۳۷۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے زندہ جانور کی بیع سے زندہ جانور کے عوض بطور ادھار کے۔

تشریح: شافعیہ کے نزدیک بیع الحیوان بالحیوان مطلقاً جائز ہے، خواہ نسیئۃً ہو یا نقداً، حنفیہ کے نزدیک اگر نقد ہو تو جائز ہے، اگر نسیئۃً ہو تو ناجائز ہے، حضرت سمرہ بن جندب کی یہ حدیث حنفیہ کی دلیل ہے۔ شافعیہ اس کے بعد آنے والی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ لشکر کی تیاری کے وقت اونٹ کم ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے اونٹ لینے کا حکم فرمایا، ایک اونٹ کے بدلہ میں دو اونٹ ظاہر ہے یہ معاملہ نسیئۃً ہی تھا، کیونکہ لشکر کے پاس اس وقت اتنے اونٹ نہیں تھے۔

علامہ توربشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اول تو اس حدیث کی سند میں کچھ کلام ہے، بنا بر تسلیم صحت جواب یہ ہوگا کہ یہ واقعہ تحریم ربا سے پہلے کا ہے، اس واقعہ میں توجیہ اس لئے کرنی پڑی کہ نہی والی حدیث اس سے اقویٰ واثبت ہے۔ (التعلیق: ۳۱۰/ ۳، اشرف التوضیح: ۲۹۰/ ۲)

ایضاً

{۲۶۹۹} **وَعَنْ** عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَهٗ اَنْ يُّجَهِّزَ جَيْشًا فَنَفِدَتِ الْاِبِلُ فَاَمَرَهٗ اَنْ يَّاْخُذَ عَلٰى قَلَائِصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَاْخُذُ الْبَعِيْرَ بِالْبَعِيْرَيْنِ اِلٰى اِبِلِ الصَّدَقَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۲/ ۴۷۷، کتاب البیوع، باب فی الرخصۃ، حدیث نمبر: ۳۳۵۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یقیناً حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا: کہ وہ ایک لشکر کا سامان تیار کریں؛ چنانچہ (جب انہوں نے اس کی تیاری کی تو) اونٹ کم ہو گیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم فرمایا: کہ وہ زکوۃ کے اونٹ آنے تک کے وعدہ پر (فی الوقت) اونٹ خرید کرلیں؛ چنانچہ وہ ایک اونٹ دو اونٹوں کے عوض خرید کرتے تھے، زکوۃ کے

اونٹ کی آمد کے وعدہ پر۔

تشریح: اس حدیث شریف سے امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے استدلال کیا ہے کہ حیوان کی بیع حیوان کے بدلے نسیئۃ جائز ہے۔

(۱)......ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا جواب دیا کہ یہ تحریم ربا سے پہلے کا واقعہ ہے۔

(۲)......جو اونٹ خریدا تھا وہ قیمت کے ساتھ تھا اور پھر بعد میں اس قیمت کے برابر اونٹ دیدیا، حقیقتاً اونٹ کی اونٹ کے بدلے بیع نہیں ہوئی ہے۔

(۳)......علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ ابن عمرو کی یہ حدیث سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہے، اس لئے کہ سند میں ایک راوی عمرو بن حریش متکلم فیہ ہیں اور اس کے بالمقابل حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث نہایت قوی ہے۔

الفصل الثالث

ادھار میں سود

{۲۷۰۰} وَعَنْ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلرِّبَا فِی النَّسِیْئَۃِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ: لَا رِبًا فِیْمَا کَانَ یَدًا بِیَدٍ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۹۱/۱، کتاب البیوع، باب بیع الدینار بالدینار نساء، حدیث نمبر: ۲۱۷۸، مسلم شریف: ۲۵/۲، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب فی الربا، حدیث نمبر: ۱۵۸۵۔

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بالیقین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ادھار میں سود ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ سود نہیں ہے اس چیز میں جو دست بدست ہو۔

تشریح: مقصد بیان یہ ہے کہ اکثر سودی معاملات وہ ہیں جو ادھار کی صورت میں ہوا کرتے ہیں، اگرچہ بعض صورتیں نقد کی بھی سود میں شامل ہیں۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ربا صرف نسیئۃً کی صورت میں ہے، یہی ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اولاً مذہب تھا، اس کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رجوع کر لیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے رجوع کے اندر تردد ہے۔ باقی تمام جمہور کا اتفاق ہے کہ صرف نسیئہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اور اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ شدۃ مقصود ہے۔

سود پر وعید شدید

{۲۷۰۱} وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ حَنْظَلَۃَ غَسِیْلِ الْمَلَائِکَۃِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دِرْھَمُ رِبًا یَّاْکُلُہٗ

الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِيْنَ زِنْيَةً۔ (رواہ احمد والدار قطنی)
وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا وَزَادَ
وَقَالَ مَنْ نَبَتَ لَحْمُهٗ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ۔

حوالہ: مسند احمد: ۲/۲۳۸، کتاب البیوع، الباب الرابع فی الربا، الفصل الاول فی الترهیب عنه۔ دارقطنی: ۲/۱۱، کتاب البیوع، حرف الدال، حدیث نمبر: ۲۸۱۹، مطبوعة دار الفكر، بيهقى فى شعب الايمان: ۴/۳۹۴، الباب الثامن و الثلاثون من شعب الایمان، (۳۸) حدیث نمبر: ۵۵۱۸،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیلہ ملائکہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سود کا ایک درہم جس کو آدمی کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے (کہ یہ سود کا ہے) تو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ بھاری ہے۔ (از روئے معصیت)۔ (مسند احمد، دارقطنی) اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما مزید یہ بھی نقل فرمایا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے بدن کا گوشت مالِ حرام سے پرورش پائے تو دوزخ کی آگ زیادہ بہتر ہے اس کو۔

تشریح: سود کھانے کے گناہ کو زنا کے گناہ سے بھی زیادہ سخت اور بڑا گناہ اس لئے کہا ہے کہ سود کھانے والے کے حق میں اللہ تعالیٰ نے جتنی سخت اور غضبناک تنبیہ فرمائی ہے اتنی سخت اور غضبناک تنبیہ زنا کیا کسی بھی گناہ کے بارے میں نہیں فرمائی ہے، چنانچہ سود کھانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں متنبہ کیا ہے: "فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کا۔

یہ بات ہر ذی شعور شخص جانتا ہے کہ کسی کے خلاف اعلان جنگ کا کیا مطلب ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کا رسول جس شخص کے خلاف اعلان جنگ کرے یا جو شخص اللہ اور اسکے رسول سے برسر جنگ ہو اس کی محرومی، شقاوت، بدبختی اور دنیا و آخرت کی مکمل تباہی و بربادی کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ سود کھانے والے کے حق میں اتنی سخت وعید کا سبب یہ ہے کہ سود کے بارہ میں عملی طور پر ہی گمراہی کا صدور نہیں ہوتا بلکہ سود کی پہچان مشکل ہونے کی وجہ سے عموماً اعتقادی گمراہی میں بھی لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ سود کو حرام بھی نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے ذہن وفکر اور قلب و دماغ پر گمراہی و کجروی کی اتنی ظلمت چھا جاتی ہے کہ وہ سود کو حلال سمجھتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ سود کی حرمت کا اعتقاد رکھتے ہوئے، اس

کا مرتکب ہونا گناہ کبیرہ ہے، جس پر معافی بھی ممکن ہے، مگر سود کی حرمت کا اعتقاد نہ رکھنا بلکہ اس سے بڑھ کر اس کو حلال سمجھنا اعتقادی گمراہی و کجروی ہے، جس کا آخری نتیجہ کفر ہے، اور اس کی معافی و بخشش ناممکن ہے، جبکہ زنا ایک فعل ہے، جس کی حرمت و برائی سے کوئی انکار نہیں کرتا، جو شخص اس فعل میں مبتلا ہے وہ بھی اس کی برائی کا بہر صورت اعتقاد رکھتا ہے، یہاں تک کہ اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب و فرقہ میں زنا ایک برائی ہی تصور کی جاتی ہے، کوئی بھی اسے جائز اور حلال نہیں سمجھتا۔ اب رہی یہ بات کہ چھتیس کا عدد بطور خاص کیوں ذکر کیا گیا تو ہوسکتا ہے اس کا مقصد محض سود کی حرمت کی اہمیت بتلانا ہو۔

سود کی مذمت

{۲۷۰۲} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَيْسَرُهَا اَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ۔

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۶۴ /، ابو اب التجارات، باب تغلیظ فی الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۴،

بیھقی: ۳۹۵/۴، باب: ۳۸، باب فی قبض الید عن الاموال المحرمة، حدیث نمبر: ۵۵۲۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سود (کے گناہ) کے ستر اجزاء (حصے) ہیں ان میں سے سب سے کم درجہ آدمی کا اپنی ماں سے زنا کرنا ہے۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

ربا کا انجام

{۲۷۰۳} **وَعَنِ** ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّبَا وَاِنْ كَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِيْرُ اِلٰی قُلٍّ۔ (رَوَاهُمَا ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَوَى اَحْمَدُ الْاَخِيْرَ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۶۵، ابو اب التجارات، باب التغلیظ فی الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۹،

بیہقی:۳۹۲/۴، باب:۳۸، باب تحریم السرقۃ، حدیث نمبر: ۱۱۵۵۱، مسند احمد: ۲۳۸/۲، کتاب البیوع، الباب الرابع فی الربا، الفصل الاول فی الترھیب عنہ۔

حل لغات: قل: بضم القاف و کسرھا: کم، کمتر۔ قَلَّ (ض) قِلًّا: کم ہونا۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یقیناً (مال) سود اگر چہ (فی الحال صورتاً) زیادہ ہوتا ہے، سو اس کا انجام رجوع کرتا ہے کمی کی طرف۔ (یعنی انجام کار وہ کم ضرور ہوگا)

تشریح: سودی ذرائع سے حاصل ہونے والا مال بظاہر تو بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے، مگر چونکہ سودی مال میں خیر و برکت کا کوئی جزء نہیں ہوتا، اسلئے انجام کار وہ مال تباہ و برباد اور ختم ہو جاتا ہے، اور اس کا نام ونشان تک نہیں رہتا، یہ محض ایک وعیدی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو روزانہ نظروں کے سامنے آتی رہتی ہے، چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن مقدس میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبَا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ" [اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دیتا ہے اور صدقات کو بڑھا دیتا ہے۔] بلکہ سود جس مال میں مل جاتا ہے وہ مال بھی بعض اوقات اس طرح تباہ و برباد ہو جاتا ہے کہ اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا، جیسا کہ سود اور سٹہ کے بازاروں میں دیکھا جاتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو سود جیسی لعنت سے مکمل حفاظت فرمائے۔ آمین! یارب العالمین۔

سود پر عذاب قبر اور عذاب آخرت

{۲۷۰۴} وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَیْتُ لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ عَلٰی قَوْمٍ بُطُوْنُهُمْ کَالْبُیُوْتِ فِیْهَا الْحَیَّاتُ تُرٰی مِنْ خَارِجِ بُطُوْنِهِمْ فَقُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ یَا جِبْرِیْلُ!؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ اَكَلَةُ الرِّبَا۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

حوالہ: مسند احمد: ۲۳۸/۲، کتاب البیوع، الباب الرابع فی الربا، الفصل الاول فی الترھیب عنہ، ابن ماجہ شریف: ۱۶۴، ابواب التجارات، باب التغلیظ فی الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شب میں مجھ کو سیر کرائی گئی (یعنی معراج ہوئی) تو میں ایک ایسی قوم کے پاس آیا، جن کے پیٹ گھروں کی طرح تھے، جن کے اندر سانپ تھے جو کہ ان کے پیٹوں سے دکھلائی دے رہے تھے، میں نے دریافت کیا: اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ سود کھانے والے ہیں۔

تشریح: تشریح ترجمہ سے واضح ہے۔

سودی معاملات کرنے والا اور صدقہ روکنے والا

{۲۷۰۵} **وَعَنْ** عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اٰكِلَ الرِّبٰا وَمُؤْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَمَانِعَ الصَّدَقَةِ وَكَانَ يَنْهٰى عَنِ النَّوْحِ۔ (رواہ النسائی)

حوالہ: نسائی شریف: ۲۳۸ / ۲، کتاب الزینۃ من السنن الفطرۃ، باب المؤتشمات، حدیث نمبر: ۵۱۰۶۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی سود کھانے والے اور کھلانے والے اور اس کو لکھنے والے اور صدقاتِ واجبہ کے نہ دینے والے پر۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا نوحہ کرنے سے۔

تشریح: صدقہ سے منع کرنے والا سے مراد یا تو وہ شخص ہے جو دوسرے کو صدقہ خیرات کرنے سے منع کرے اور روکے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو ملعون قرار دیا ہے، یا پھر وہ شخص مراد ہے جو واجب صدقہ یعنی زکوۃ وغیرہ ادا نہ کرے۔

نوحہ سے مراد کسی مردہ شخص کے اوصاف بیان کر کے اور چلا چلا کر رونا ہے، چونکہ یہ انتہائی نازیبا اور خلاف وقار و دانش فعل ہے، اس لئے شریعت نے اس سے منع فرمایا ہے۔

سود اور شبہ سود سے بچنے کی تاکید

{۲۷۰۶} **وَعَنْ** عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ اٰخِرَ مَا

نَزَلَتْ اٰیَةُ الرِّبٰوا وَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُبِضَ وَلَمْ یُفَسِّرْ ھَا لَنَا فَدَعُوْا الرِّبٰوا وَالرِّیْبَةَ۔ (رواہ ابن ماجة والدارمی)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۶۴، ابواب التجارات، باب التغلیظ فی الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۶، دارمی: ۱/۱۵۱، مقدمة، باب کراھیة الفتیا، مطبوعة دار الکتب العلمیة۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: بلا شبہ جو آیت (احکام سے متعلق) آخر میں نازل ہوئی ہے (وہ آیت) ربوا ہے، اور بلا شبہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قبض کی گئی اس حالت میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی ہمارے لئے تفسیر بیان نہیں فرمائی۔ لہٰذا تم لوگ سود کو (بھی) چھوڑ دو اور شبہ (سود) کو بھی۔

تشریح: آخر ما نزلت: آخر میں اترنے والی، یعنی معاملات کے بارے میں جو آیات اتری ہیں ان میں یہ سب سے بعد میں اتری ہے، یہ مراد نہیں کہ یہ آخری آیت ہے، کیونکہ احکام کی آیات میں سب سے آخری اترنے والی آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" [آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔] ہے۔

ولم یفسرھا: اس آیت کے اترنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ دنوں تک دنیا میں زندہ نہیں رہے، بلکہ روایات کے مطابق ۱۰۰/دن بعد تک زندہ رہے، اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جزوی معاملات میں مشغول رہے، جس کی وجہ سے اس کے متعلق ایسا مفصل بیان نہیں کیا جس میں سود کی تمام جزئیات تفصیلاً ذکر کی ہوں، پس مناسب یہی ہے کہ کھلے سود کو چھوڑ دیا جائے اور جس میں سود کا شبہ ہو احتیاط اور تقویٰ کی وجہ سے اسکو بھی چھوڑ دیا جائے، باقی اس کی پوری تفصیل باب الربا کے شروع میں گذر چکی، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

قرض کے بدل میں حاصل ہونے والا نفع ربا ہے

{۲۷۰۷} وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَقْرَضَ اَحَدُکُمْ قَرْضًا فَاَھْدٰی اِلَیْہِ اَوْ حَمَلَہٗ عَلَی الدَّابَّةِ فَلَا یَرْکَبُہٗ وَلَا یَقْبَلْھَا اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ جَرٰی بَیْنَہٗ وَبَیْنَہٗ قَبْلَ ذٰالِكَ۔

(رواہ ابن ماجۃ والبیھقی فی شعب الایمان)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۷۵، ابواب الصدقاۃ، باب القرض، حدیث نمبر: ۲۴۳۲۔ بیھقی فی شعب الایمان: ۳۹۷/۴، باب: ۳۸، بات تحریم السرقۃ، حدیث نمبر: ۵۵۳۲۔ مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم کسی شخص کو قرضہ دو اور وہ تم کو ہدیہ دے یا وہ اس کو سواری پر سوار کرے تو وہ اس پر سوار نہ ہو اور نہ وہ ہدیہ کو قبول کرے، مگر یہ کہ اس سے قبل ان کے درمیان یہ جاری تھا۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنے قرض دار سے تحفہ وہدیہ کے طور پر کوئی بھی چیز قبول نہ کرے، ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سود کا شبہ ہوسکتا ہے، کیونکہ قرض خواہ کو قرض کے ذریعہ جو بھی نفع حاصل ہوتا ہے وہ سود کے حکم میں ہے، ہاں اگر قرض کے لین دین سے پہلے ہی سے دونوں کے تعلقات کی نوعیت یہ ہو کہ ان کا آپس میں تحفہ تحائف لینے دینے کے رسوم جاری ہوں تو پھر اس صورت میں قرض لینے کے بعد بھی قرض دار قرض خواہ کے پاس کوئی چیز بھیجے تو اسے وہ قبول کرسکتا ہے، اسلئے ظاہر یہ ہے کہ یہ تحفہ تحائف کا لینا دینا قرض کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سابقہ تعلقات اور پہلے سے جاری رسومات کی بنیاد پر ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”کل قرض جر نفعا فھو ربا“ جو قرض بھی قرض خواہ کو نفع پہنچانے کا سبب بنے وہ ربا ہے۔ اس لئے چاہئے کہ قرض دار کی دعوت بھی قبول نہ کرے، بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قرض خواہ کے لئے اپنے قرض دار کی دیوار کے سائے میں بیٹھنا بھی مکروہ ہے۔ (مرقاۃ: ۳۱۴/۳)

ایضاً

{۲۷۰۸} **وَعَنْهُ** عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلَا يَأْخُذْ هَدِيَّةً۔ (رواہ البخاری فی تاریخہ ھکذا فی المنتقی)

حوالہ: المنتقی، کتاب القرض، باب فضیلۃ القرض۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص کسی کو قرضہ دے تو وہ (مقروض سے) ہدیہ قبول نہ کرے۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

مقروض سے ہدیہ لینا بھی سود ہے

{۲۷۰۹} **وَعَنْ** اَبِیْ بُرْدَةَ ابْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ: قَدِمْتُ الْمَدِیْنَةَ فَلَقِیْتُ عَبْدَاللهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ فَقَالَ اِنَّكَ بِاَرْضٍ فِیْهَا الرِّبَا فَاشٍ فَاِذَا كَانَ لَكَ عَلٰی رَجُلٍ حَقٌّ فَاَهْدٰی اِلَیْكَ حِمْلَ تِبْنٍ اَوْ حِمْلَ شَعِیْرٍ اَوْ حَبْلَ قَتٍّ فَلَا تَأْخُذْهُ فَاِنَّهٗ رِبٰوا۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۵۳۸، مناقب الانصار، باب مناقب عبداللہ بن سلام، حدیث نمبر: ۳۸۱۴۔

ترجمہ: حضرت ابوبردہ بن ابی موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا اور میں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یقیناً تم ایسی سرزمین (یعنی ملک) میں رہتے ہو کہ وہاں سود خوب عام ہے، اگر تمہارا کسی شخص کے ذمہ کوئی حق ہو اور وہ تم کو بھس کی گٹھری یا جو کی گٹھری یا گھاس کا گٹھا ہدیۃً دے تو تم اس کو قبول نہ کرنا، کیونکہ وہ یقیناً سود ہے۔

تشریح: دراصل مقروض سے کسی بھی قسم کا نفع حاصل کرنا جائز نہیں احتمالِ سود کی وجہ سے۔

جن علاقوں میں سود بکثرت عام ہو اس علاقہ میں بالخصوص بہت احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے کہ عوام میں سود داخل ہو جانے کی وجہ سے سودی طریقہ کار اختیار کیا جانے کا احتمال زیادہ ہوگا۔

مسئلہ: اگر قرض خواہ اپنے قرض دار سے قرض کی ادائیگی سے پہلے کوئی نفع حاصل کرے تو دیکھا جائیگا کہ وہ نفع موعود مشروط ہے یا نہیں، اگر وہ نفع موعود یا مشروط ہو تو اس صورت میں اسکی حرمت میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ نفع سود کے حکم میں ہوگا۔ اور اگر وہ نفع موعود و مشروط نہیں تو پھر اسکے بارہ میں بھی علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جواز کے قائل ہیں، مگر ایک جماعت ممانعت کی طرف مائل ہے، لیکن حاصل یہی ہے کہ اگر وہ نفع قرض کے دباؤ یا قرض کی رعایت یا مہلت اور تسامح کی بناء پر حاصل ہوگا تو بہر حال ناجائز ہے، ہاں اگر مروت و احسان یا سابقہ تعلقات و مراسم کے تحت ہوگا تو پھر اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

باب المنہی عنہا من البیوع

(ممنوعہ بیوع کا بیان)

رقم الحدیث: ۲۷۱۰/تا۲۷۴۹/

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب المنھی عنھا من البیوع

(ممنوعہ بیوع کا بیان)

اس باب میں بیع کی ان اقسام کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی شریعت میں ممانعت ہے۔ ابتدائی احادیث میں جن بیوع کا ذکر ہے ان کی مختصر سی وضاحت کی جاتی ہے:

بیع محاقلہ

محاقلہ کا مطلب ہے کھڑی ہوئی کھیتی کو اسی جنس کے نکلے ہوئے غلہ کے بدلہ میں بیچنا۔ یہ بیع ممنوع ہے، کیونکہ اس میں تفاضل کا احتمال ہے، ہوسکتا ہے کھیتی کے اندر غلہ کم ہو اور نکلا ہوا زیادہ یا اس کے برعکس اس صورت میں ربا لازم آئے گا۔

بیع مزابنہ

درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کو اسی جنس کے اترے ہوئے پھلوں کے بدلہ میں بیچنا، یہ بھی ممنوع ہے، کیونکہ اس میں بھی سود کا احتمال ہے، کبھی مزابنہ کا اطلاق مزابنہ اور محاقلہ دونوں پر بھی آجاتا ہے۔

بیع العرایا

اس باب کی بعض احادیث میں آرہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عرایا کی بیع کی اجازت

دی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بیع العرایا جائز ہے البتہ عرایا کی تفسیر وتصویر میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک عرایا کی تفسیر

عرب میں یہ رواج تھا کہ جب باغ میں پھل لگ جاتے تو اس میں سے چند درختوں پر لگے ہوئے پھل کسی فقیر کو ہبہ کر دیتے، اس کو "عریہ" کہتے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا کہ فقیر اپنے پودوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے باغ میں آنے جانے لگ جاتا، باغ کا مالک بھی اپنے اہل وعیال سمیت باغ میں ہی مقیم ہوتا، فقیر کے آنے جانے سے ان کو تکلیف ہوتی اس لئے باغ والا فقیر سے یہ کہتا کہ اندازے سے ان درختوں پر جتنا میوہ ہوگا اتنا اترا ہوا میوہ لے کر یہ درخت والے پھل ہمیں دے دو۔ اس معاملہ کو عرایا کہتے تھے۔

اس معاملہ کی شکل اگرچہ بیع مزابنہ کے ساتھ ملتی جلتی ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک حقیقۃً بیع نہیں بلکہ اسکی حقیقت استرداد الھبہ بالھبہ ہے، مالک نے درختوں پر لگی ہوئی کھجوریں فقیر کو ہبہ کیں، لیکن چونکہ فقیر نے اس پر قبضہ نہیں کیا تھا اس لئے ہبہ تام نہیں ہوا تھا، مالک ہبہ کے تام ہونے سے پہلے اپنے ہبہ سے رجوع کر کے اس کی جگہ دوسرا ہبہ دے رہا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، چونکہ یہ معاملہ درحقیقت بیع نہیں ہے اس لئے اس میں سود بھی لازم نہیں آتا، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس کی اجازت دے دی۔

بعض احادیث میں عرایا کا مزابنہ سے استثناء کیا گیا ہے، حنفیہ کے نزدیک وہ استثناء منقطع ہوگا، چونکہ عرایا کی صورت مزابنہ سے ملتی جلتی ہے، اس لئے مزابنہ سے نہی کرنے سے شبہ ہوسکتا تھا، کہ شاید عرایا والا معاملہ بھی ناجائز ہو اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کا استثناء فرمادیا۔

مالکیہ کے نزدیک عرایا کی تفسیر

امام مالک سے عرایا کی دو تفسیریں منقول ہیں، ایک یہی حنفیہ والی، اس کی تخریج وتنقیح ان کے ہاں مختلف ہے، وہ اس کو صورۃً اور حقیقۃً بیع مزابنہ شمار کرتے ہیں، جبکہ حنفیہ کے نزدیک صورۃً بیع ہے، حقیقۃً استرداد الھبہ بالھبہ ہے۔

دوسری تفسیر امام مالک سے یہ منقول ہے کہ بعض اوقات کسی کے چند پودے دوسرے کے باغ میں ہوتے ہیں، پھلوں کے موسم میں جب یہ شخص اپنے مملوکہ درختوں کی دیکھ بھال کے لئے آتا ہے تو باغ والے کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لئے وہ درختوں والے سے کہتا ہے کہ ان درختوں پر لگے ہوئے پھل مجھے بیچ دو اور اس کے بدلہ میں اندازے سے اسی مقدار میں اترے ہوئے پھل مجھ سے لے لو۔ یہ معاملہ حقیقۃً بیع مزابنہ ہے، کیونکہ بائع ان درختوں کا مالک تھا، لیکن دفع حرج کے لئے شریعت نے اس خاص صورت کی اجازت دے دی۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک عرایا کی تفسیر

شافعیہ کے نزدیک عریہ کی صورت یہ ہے کہ جب تازہ کھجوریں اترنے کا موسم آتا تو جن کے باغ نہ ہوتے ان کا بھی دل چاہتا کہ ہم بھی تازہ کھجوریں کھائیں، ان کے پاس خریدنے کے لئے دراہم و دنانیر تو نہ ہوتے البتہ پچھلے سال کی اتری ہوئی کھجوریں ہوتیں، وہ ان تمر کے بدلہ میں کسی درخت پر لگی ہوئی رطب خرید لیتے، یہ معاملہ بھی حقیقۃً بیع مزابنہ ہے، لیکن دفع ضرورت کے لئے اس کی اجازت دی گئی ہے۔

اس باب کی بعض حدیثوں میں آ رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پانچ وسق میں اس کی اجازت دی ہے، حنفیہ کے نزدیک پانچ وسق کی قید واقعی ہوگی، کیونکہ جب یہ معاملہ حقیقۃً مزابنہ ہے ہی نہیں، تو پانچ وسق سے زیادہ میں بھی جائز ہونا چاہئے۔ حدیث میں پانچ وسق کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس وقت عموماً پانچ وسق ہی میں یہ معاملہ ہوتا تھا۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ حقیقۃً بیع مزابنہ ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت دی گئی ہے اور اصول ہے "الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ" اور ضرورت پانچ وسق سے پوری ہو جاتی ہے، اسلئے پانچ وسق سے زیادہ میں بیع العرایہ جائز نہیں، ان کے نزدیک پانچ وسق کی قید احترازی ہوگی۔

بیع الثنیا

بائع باغ وغیرہ فروخت کرتا ہے اور اس میں سے غیر معین حصہ کا استثناء کر لیتا ہے یہ ناجائز ہے، اگر

مستثنیٰ کی مقدار متعین ہوتو جائز ہے۔مثلاً یہ کہے کہ اس باغ کی کھجوریں بیچ رہا ہوں سوائے دو من کھجوروں کے۔

بیع قبل بدو الصلاح

اس باب کی بعض حدیثوں میں آرہا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ بیع قبل بدو الصلاح سے منع فرمایا ہے، بدو الصلاح کی تفسیر حنفیہ کے ہاں یہ ہے کہ یہ پھل عاہت اور آفت وغیرہ سے محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ مشکوۃ (ص:۲۴۷) پر مسلم شریف کے حوالہ سے ایک روایت میں "ویأمن العاهة" کے لفظ صراحۃً مذکور ہیں، شافعیہ کے نزدیک بدو الصلاح سے مراد "ظهور النضج" یعنی پھل پکنا شروع ہو جائیں۔

حدیث شریف میں بدو الصلاح کی جگہ اور بھی مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں۔مثلاً:

(۱) حتی یزهو۔ (۲) حتی یبیض۔ (۳) حتی تزهی۔ (۴) حتی تحمر۔ (۵) حتی یحمار۔ (۶) حتی یشتد۔ (۷) حتی یسود۔ وغیر ذلک۔

ان تمام احادیث میں بات ایک ہی بتانی مقصود ہے کہ بدوصلاح سے پہلے بیع نہ کرو، اور بدوصلاح سے مراد ہے آفت سے مامون ہو جانا، لیکن آفت سے مامون ہونے کی علامات مختلف ہوتی ہیں، بعض کھیتیاں سفید ہونے پر آفت سے مامون ہوتی ہیں، بعض سرخ ہونے پر۔ علی هذا القیاس۔ ان حدیثوں میں مختلف چیزوں کی مختلف علامات ذکر کی گئی ہیں، مقصد ایک ہی ہے، کہ ایسی علامت ظاہر ہو جائے جس سے اس کا آفت سے مامون ہونا معلوم ہو جائے۔

صور بیع الثمار

پھلوں اور کھیتی کی بیع کی دو صورتیں ہیں:

(۱)......بیع قبل بدو الصلاح۔ (۲)......بعد بدو الصلاح۔

پھر ان میں سے ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں۔

(۱)......بیع بشرط القطع یعنی بائع یہ شرط لگادے کہ اپنے پھل فوراً درخت سے کاٹ لو گے۔

(۲)......بیع بشرط الترک، یعنی عقد میں یہ شرط ہو کہ فلاں وقت تک یہ پھل درخت پر ہی لگے رہیں گے۔

(۳)......بیع الاطلاق، یعنی عقد کے اندر نہ قطع کی شرط لگائی گئی ہو اور نہ ہی ترک کی۔

اس طرح کل چھ قسمیں ہوگئیں، تین قبل بدو الصلاح کی اور تین بعد بدو الصلاح کی۔ ان اقسام کے بارے میں مذہب حسب ذیل ہیں۔

صور مذکورہ کے احکام ائمہ کے نزدیک

امام شافعی و احمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک بدو صلاح کے بعد کی تینوں صورتیں جائز ہیں اور بدو صلاح سے پہلے کی تینوں صورتیں ناجائز ہیں، لیکن ایک صورت عقلاً مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ بیع قبل بدو الصلاح بشرط القطع ہو کیونکہ نہی کی اصل علت "مفضی الی المنازعت" ہونا ہے اور بشرط القطع کی صورت میں منازعت کا احتمال نہیں۔ گویا ان کے نزدیک چھ میں سے چار صورتیں جائز ہیں، تین بعد بدو الصلاح کی اور ایک قبل بدو الصلاح بشرط القطع والی۔ قبل بدو الصلاح کی باقی دو صورتیں ناجائز ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک اگر بیع بشرط الترک ہو تو قبل بدو الصلاح بھی ناجائز ہے اور بعد بدو الصلاح بھی ناجائز ہے اور اگر بشرط القطع ہو تو قبل بدو الصلاح بھی جائز ہے اور بعد بدو الصلاح بھی اطلاق والی بھی دونوں صورتیں جائز ہیں، کیونکہ یہاں لفظوں میں اگرچہ اطلاق ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ بشرط القطع ہی کی طرف راجع ہے، کیونکہ بائع کو قطع کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوگا، وہ کسی بھی وقت اپنا درخت خالی کرا سکتا ہے۔

مالکیہ کی روایات اس مسئلہ میں مختلف ہیں، حنفیہ کے ساتھ بھی ہیں اور شافعیہ و حنابلہ کے ساتھ بھی۔

دلیل احناف

بیع بشرط القطع کی دونوں صورتوں کو شافعیہ و حنابلہ بھی جائز مانتے ہیں، اس لئے اس میں کوئی اشکال نہیں، اطلاق والی صورت بھی قطع ہی کی طرف راجع ہے اس لئے اس کے لئے بھی دلیل کی ضرورت نہیں۔ بیع بشرط الترک کی دونوں صورتوں کے عدم جواز کی وجہ صریح حدیث ہے: "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط" [حضرت رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا

ہے۔] بیع میں شرط کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ شرطیں جو مقتضائے عقد کے موافق ہیں، دوسری وہ شرطیں جو مقتضائے عقد کے موافق نہیں اور اس میں احد العاقدین کا نفع ہے، پہلی قسم کی شرط جائز ہے اور دوسری قسم کی شرطوں سے اس حدیث میں ممانعت کی گئی ہے۔ ترک علی الشجرۃ کی شرط بھی مقتضائے عقد کے خلاف ہے، اس لئے کہ عقد کا تقاضا تو یہ ہے کہ مشتری اپنے مملوکہ پھل لے جائے اور بائع کا درخت فارغ کر دے اور اس شرط میں مشتری کا نفع ہے، اس لئے یہ عقد ناجائز ہوگا، معلوم ہوا شرط ترک والی دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔ قطع کی شرط مقتضائے عقد کے موافق ہے۔

شافعیہ کی دلیل: ''نهی عن البیع قبل بدو الصلاح'' والی حدیثوں کا منطوق یہ ہے کہ بدو الصلاح سے پہلے بیع کی سب صورتیں ناجائز ہیں اور مفہوم مخالف ان کا یہ ہے کہ بعد بدو الصلاح کی سب صورتیں جائز ہیں، شافعیہ وحنابلہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہمارا مذہب حدیث کے منطوق کے بھی موافق ہے اور مفہوم مخالف کے بھی، اگرچہ ایک صورت عقلاً مستثنیٰ کرلی گئی ہے، جبکہ حنفیہ کا اس حدیث کے نہ منطوق پر عمل ہے نہ مفہوم پر۔

جوابات

(١)......امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث میں ان صور ستہ کا حکم شرعی بیان کرنا مقصود نہیں ان کے احکام دوسرے دلائل سے معلوم ہو چکے ہیں، یہاں جو بیع قبل بدو الصلاح سے نہی کی گئی ہے یہ نہی ارشادی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ بیع تمہاری مصلحت دنیوی کے خلاف ہے، صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ لوگ بدو صلاح سے پہلے بھی بیع کرلیا کرتے تھے، لیکن جب ادائے ثمن کا موقع آتا تو مشتری کہتا کہ پھلوں کو فلاں فلاں بیماری لگ گئی تھی، فلاں آفت آ گئی تھی، اب میں پورے ثمن کیسے ادا کرسکتا ہوں، بائع پورے ثمن کا مطالبہ کرتا، آئے روز اس قسم کے جھگڑے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش ہوتے رہتے، اس لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مشورہ یہ فرمایا: کہ جب تک پھل آفت سے مامون نہ ہوجائیں اس وقت تک بیع کیا ہی نہ کرو، تاکہ اس قسم کی صورت حال

پیش ہی نہ آئے، صحیح بخاری کے لفظ یہ ہیں: "فلاتبتاعوا حتی یبدو صلاح الثمر کالمشورۃ یشیر بھا لکثرۃ خصومتھم" (بخاری شریف: ۲۹۲/۱) [پس بیع نہ کیا کرو یہاں تک کہ پھلوں کی صلاح ظاہر ہو جائے، مشورہ کے طور پر اس کا مشورہ دیا لوگوں کے کثرت خصومات کی وجہ سے۔]

(۲)...... امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث شریف میں بدوصلاح سے پہلے مطلق بیع سے نہی نہیں بلکہ بیع سلم سے نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جوازِ سلم کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مسلم فیہ بیع کے وقت سے لے کر اس کی وصولی تک بازار سے نایاب نہ ہو، بیع سلم قبل بدوالصلاح سے اس لئے نہی فرمادی کہ بدوصلاح سے پہلے عموماً وہ چیز بازار سے نایاب ہو جاتی، بدوصلاح کے بعد نایابی کا خطرہ نہیں رہتا، اس لئے بیع سلم کو فساد سے بچانے کے لئے یہ حکم فرمایا۔

(۳)...... حنفیہ میں سے امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ بیع قبل بدوصلاح بشرط الاطلاق ناجائز ہے اور بعد بدوصلاح بشرط الاطلاق جائز ہے۔ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق یہ حدیث اطلاق والی صورت پر محمول ہوگی اور حدیث کے منطوق اور مفہوم دونوں پر عمل ہو جائے گا۔

یاد رہے کہ حدیث کے ظاہر پر مکمل عمل شافعیہ وحنابلہ نے بھی نہیں کیا کیونکہ انہوں نے قبل بدوالصلاح والی صورتوں میں سے شرط قطع والی صورت کو عقلاً مستثنیٰ قرار دیا ہے، جبکہ ہم نے دوسری صریح حدیثوں کی وجہ سے حدیث کے ظاہر کو چھوڑا ہے۔ (اشرف التوضیح: ۲۹۰/۲)

008 Babul Manhi Anha minal buyoo

﴿الفصل الاول﴾

بیع مزابنہ کا حکم

{۲۷۱۰} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ نَہٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُزَابَنَۃِ اَنْ یَّبِیْعَ ثَمَرَ حَائِطِہٖ اِنْ کَانَ نَخْلًا بِتَمْرٍ کَیْلًا وَاِنْ کَانَ کَرْمًا اَنْ یَّبِیْعَہٗ بِزَبِیْبٍ کَیْلًا اَوْ کَانَ وَعِنْدَ مُسْلِمٍ وَاِنْ کَانَ زَرْعًا اَنْ یَّبِیْعَہٗ بِکَیْلِ طَعَامٍ نَہٰی عَنْ ذٰلِکَ کُلِّہٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ) وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَّہُمَا نَہٰی عَنِ الْمُزَابَنَۃِ قَالَ: اَلْمُزَابَنَۃُ اَنْ یُّبَاعَ مَا فِیْ رُؤُوْسِ النَّخْلِ بِتَمْرٍ بِکَیْلٍ مُّسَمًّی اِنْ زَادَ فَلِیْ وَاِنْ نَقَصَ فَعَلَیَّ۔

حوالہ: بخاری شریف:۱/۲۹۱، باب بیع المزابنۃ، حدیث نمبر:۲۱۳۵، مسلم شریف:۹/۲، باب تحریم بیع الرطب بالتمر الافی العرایا، حدیث نمبر:۱۵۴۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا مزابنہ سے (اور مزابنہ یہ ہے کہ) اپنے باغ کے پھل کو فروخت کرنا، اگر وہ پھل کھجور ہیں تو تمر کے عوض از روئے کیل اور اگر وہ انگور ہیں تو ان کو فروخت کرلے خشک انگوروں کے عوض از روئے کیل یا ہو۔ اور مسلم کی روایت میں اور اگر وہ کھیتی (غلہ وغیرہ کی) ہے تو فروخت کرلے اس کو بعوض غلہ کے کیل کے حساب سے، آنحضرت ﷺ نے سب سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری ومسلم)

اور ان دونوں کی ایک روایت میں ہے: آنحضرت ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے، اور مزابنہ (کی صورت یہ ہے کہ) کھجور کے درخت پر جو کھجوریں ہیں ان کو مقررہ کھجوروں کے عوض بحساب کیل فروخت کرنا (اس شرط سے کہ) اگر درخت والی کھجوریں زائد ہوں گی تو وہ میری اور اگر کم ہوں تو مجھ پر ہے۔ (یعنی نقصان کو میں برداشت کروں گا۔)

تشریح: مزابنہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کو اسی جنس کے اترے ہوئے پھلوں کے بدلے میں بیچنے کو کہا جاتا ہے۔

اس کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ درخت پر جو پھل لگا ہوا ہے اس کا کیل نہیں ہوسکتا، صرف اندازے کے طور پر بیچا جائے گا اس میں تفاضل کا احتمال رہے گا اور اموال ربویہ میں یعنی جن میں سود کا تحقق ہوتا ہے ان اموال میں تفاضل کا احتمال بھی ربوا اور سود کے حکم میں ہے۔

(تکملہ فتح الملہم: ۴۰۶/۱، فتح الباری: ۴/۳۸۴)

"مزابنہ" باب مفاعلہ سے ہے، زبن سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں سختی سے دفع کرنا، اسی وجہ سے لڑائی کو "زبون" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں سختی سے مدافعت ہوتی ہے۔ (لسان العرب: ۱۳/۱۹۵، لفظ زبن)

اس "بیع" کو بھی اسی وجہ سے "مزابنہ" سے مسمی کیا گیا ہے کہ اس میں متبایعین میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کو اس کے حق سے دفع کرتا ہے۔ (التعلیق: ۳/۳۱۳)

یہاں دو روایتیں نقل کی گئی ہیں، پہلی روایت سے مزابنہ کا عموم معلوم ہوتا ہے، یعنی جو پھل درخت پر لگا ہوا ہے جیسے آم کھجور انگور وغیرہ اسے اترے ہوئے پھل سے بیچنا جبکہ دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزابنہ کا تعلق صرف کھجور سے ہے حالانکہ مزابنہ میں عموم ہے کہ غیر معلوم المقدار کو معلوم المقدار کے بدلے میں بیچنا صرف کھجور کا ذکر دوسری روایت میں محض بطریق تمثیل ہے نہ بطریق حصر۔

(التعلیق: ۲/۳۱۳، نفحات التنقیح: ۳/۴۳۵)

بیع مخابرہ ومحاقلہ کا حکم

{۲۷۱۱} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُخَابَرَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةُ اَنْ يَّبِيْعَ الرَّجُلُ الزَّرْعَ بِمِائَةِ فَرَقٍ حِنْطَةٍ وَالْمُزَابَنَةُ اَنْ يَّبِيْعَ التَّمْرَ فِيْ رُؤُسِ النَّخْلِ بِمِائَةِ فَرَقٍ وَالْمُخَابَرَةُ كِرَاءُ الْاَرْضِ بِالثُّلُثِ وَالرُّبُعِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱۰/۲، باب النھی عن المحاقلۃ والمزابنۃ، حدیث نمبر: ۱۵۳۶۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا مخابرہ اور محاقلہ اور مزابنہ سے، اور محاقلہ (کی صورت یہ ہے کہ) آدمی کا کھیتی کو فروخت کرنا (کاٹنے سے قبل، مثلاً) ایک سوفرق گیہوں کے عوض، اور مزابنہ کھجور کے درختوں پر کھجوروں کو فروخت کرنا (مثلاً مقررہ) ایک فرق کھجوروں کے عوض۔ اور مخابرہ: زمین کو ایک تہائی یا ایک چوتھائی (پیداوار) کے عوض بٹائی پر دینا۔

تشریح: تفصیل بعد کی حدیث میں آرہی ہے۔

ایضاً

{۲۷۱۲} **وَعَنْهُ** قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ وَعَنِ الثُّنْيَا وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۱۱، باب النھی عن المحاقلة والمزابنة، حدیث نمبر: ۱۵۳۶۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے محاقلہ اور مزابنہ اور مخابرہ اور معاومہ سے اور استثناء کرنے سے (یعنی بوقت بیع نامعلوم مقدار کا استثناء کرنا) اور آنحضرت ﷺ نے اجازت دی ہے عرایا میں۔

تشریح: محاقلہ: باب مفاعلہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی کاشت اور جائے کاشت کے، اور کاشت جبکہ پھیل جائے جیسا کہ حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: "الحقل الزرع اذا تشعب" کٹنے سے پہلے کھیت میں کھڑے ہوئے گیہوں کو رکھے ہوئے گیہوں کے عوض میں بیچنا، اسی کو محاقلہ کہا جاتا ہے، اور محاقلہ کی ممانعت کی وجہ وہی ہے جو مزابنہ میں گذر گئی ہے۔

"المخابرہ" مخابرہ کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو بٹائی پر کاشت کے لئے کسی دوسرے کو دیدینا، مثلاً کوئی شخص اپنی زمین کسی دوسرے کو اس شرط کے ساتھ دے دے کہ اس زمین میں کاشت کرنا اور جو کچھ اس سے پیداوار ہو اس میں سے تہائی یا چوتھائی مجھے دیدینا۔

مخابرت کی ممانعت کی وجہ اوّل تو یہ ہے کہ اس میں اجرت مجہول رہتی ہے، دوسرے حاصل

ہونے والی چیز معدوم ہوتی ہے، جو چیز معدوم ہوتی ہے اس کا کوئی معاملہ معتبر نہیں ہوتا۔

مخابرت کو مزارعت بھی کہتے ہیں، البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مخابرت میں بیج کاشت کرنے والے کا ہے اور مزارعت میں زمین کے مالک کا، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مزارعت اور مخابرت میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہیں۔(نووی:۱۰/۲)

لفظ "مخابرہ" یا تو خبر اور خبیر سے مشتق ہے، جس کے معنی فلاح اور کاشت کار کے ہیں، یا خبار سے "بفتح الخاء" بمعنی نرم زمین کے اور یا خبرۃ سے بضم الخاء بمعنی حصہ کے اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خیبر سے مشتق ہے، کیونکہ یہ معاملہ سب سے پہلے خیبر میں ہوا ہے۔(نووی شرح مسلم:۱۰/۲)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مزارعت اور مخابرت بھی ناجائز ہے البتہ جمہور اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے کیونکہ یہ کثیر الوقوع اور بہت زیادہ احتیاج کی چیز ہے۔ (نووی شرح مسلم:۱۴/۲)

"المعاومة" معاومة عام سے ماخوذ ہے، بمعنی سنہ اور سال کے جیسا کہ **مسانهة** **"سنة"** سے اور **"مشاهرة"** شہر سے ماخوذ ہیں، اور مطلب اس کا یہ ہے کہ درختوں کے پھلوں کو نمودار ہونے سے پہلے ایک سال دو سال یا زیادہ مدت کے لئے فروخت کر دیا جائے، یہی معنیٰ "بیع السنین" کے بھی ہیں۔

اس بیع کے بطلان کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دھوکہ ہے اور غیر مخلوق چیز کی خرید و فروخت ہے جیسا کہ بچہ کی پیدائش سے پہلے خرید و فروخت۔(ہدایہ:۴۲۵/۴)

"الثنيا" ثنیا: **بضم الثاء بروزن دنیا** استثناء کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک مجہول حصے اور مقدار کا استثناء کرے اور اسے نہ بیچا جائے۔(مرقاۃ:۱۷/۶) مثلاً یوں کہے: **"بعتك هذه الصبرة الا بعضها"** "**او هذه الثياب الا بعضها**" جہالت بیع کی بنا پر یہ ناجائز ہے۔

البتہ اگر مستثنیٰ معین ہے اور مبیع بھی معلوم ہے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں، مثلاً یوں کہے: **"بعتك هذه الثياب الا هذا المعين"** اس صورت میں بیع بالاجماع جائز ہے، چنانچہ ترمذی کی روایت میں "اِلَّا اَنْ تعلم" کی تصریح آئی ہے۔(ترمذی:۵۸۵/۳)

لیکن اگر استثناء معین مقدار کا ہے اور اس کے باوجود مبیع کی جہالت لازم آتی ہے تو اس میں

اختلاف ہے۔

مثلاً: یوں کہے: "بعتک ھذہ الصبرۃ من الطعام الا صاعا واحدا" [غلہ کے اس ڈھیر کو میں نے تجھ کو فروخت کیا ایک صاع کے علاوہ۔]

امام ابوحنیفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور جمہور کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے، کیونکہ استثناء کے بعد باقی مبیع مجہول ہے اور ظاہر ہے کہ مبیع کی جہالت ہی علت فساد ہے۔

البتہ اگر کسی شائع حصہ کا استثناء کرے مثلاً یوں کہے: "بعتک ھذہ الصبرۃ الا نصفھا" [یہ ڈھیر میں نے تجھ کو فروخ کیا نصف کے علاوہ۔] اس صورت میں بیع جائز ہے، اس لئے کہ استثناء کے بعد باقی مبیع مجہول نہیں بلکہ معلوم ہے۔

جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پہلی صورت میں بھی جائز ہے بشرطیکہ مستثنیٰ کی مقدار ثلث مبیع سے زائد نہ ہو۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ بیع میں استثناء کی ممانعت کی وجہ مبیع کی جہالت ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک "الا ان تعلم" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت جہالت تک ہے، اگر جہالت نہ آئے تو ممانعت بھی نہیں اور صورت مذکورہ میں چونکہ جہالت لازم آتی ہے، اس لئے ممانعت بھی برقرار رہے گی۔ (تکملہ فتح الملہم: ۱/۴۳۱)

ورخص فی العرایا: "بیع مزابنہ" کی حرمت پر اور "بیع عرایا" کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے، البتہ عرایا کی تفسیر میں شدید اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع عرایا بعینہٖ بیع مزابنہ ہے جبکہ پانچ وسق سے کم میں ہو، لہٰذا اگر درخت پر لگا ہوا پھل کٹے ہوئے پھل کے بدلے میں بیچا جائے اور وہ پانچ وسق سے زیادہ ہو تو یہ بیع مزابنہ ہے اور حرام ہے اور اگر پانچ وسق سے کم ہے تو بیع عرایا ہے اور یہ جائز ہے۔

اور اگر پورے پانچ وسق ہیں نہ کم اور نہ زیادہ تو اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں، قول اصح عدم جواز کا ہے۔ (المغنی لابن قدامۃ: ۴/۵۷)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع العرایا بیع مزابنہ سے مستثنیٰ ہے، یعنی ہے تو بیع مزابنہ

لیکن حرام نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ کچھ لوگ محتاج تھے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ ہمارے پاس تمر ہے، درہم و دینار نہیں، اس لئے ہم رطب خرید نہیں سکتے، آنحضرت ﷺ نے اجازت عنایت فرمائی کہ تمر دیکر رطب خرید لیا کریں، لیکن پانچ وسق سے کم میں زیادہ میں جائز نہیں۔ (مرقاۃ: ۲۷/۶، طیبی: ۶۲/۶)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع العرایا یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو اپنے درخت کا پھل ہبہ میں دیدے، پھر موہوب لہ اس پھل کو واہب کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچ دے اور یہ ان کے نزدیک پانچ وسق سے کم میں جائز ہے۔ (المغنی لابن قدامۃ: ۵۹/۴)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ''بیع العرایا'' یہ ہے کہ صاحب باغ اپنے درختوں میں سے ایک دو درختوں کے پھل کسی کو بطور ہبہ دیدے، پھر موہوب لہ اپنے پھل کی دیکھ بھال کے لئے باغ میں آنا شروع کرے، چونکہ لوگوں کا دستور تھا کہ پھلوں کے پکنے کے وقت وہ باغ میں اپنے اہل وعیال کو بھی لے جاتے تھے اس لئے ایک اجنبی یعنی موہوب لہ کے آنے سے ان کو تکلیف ہوتی، لہٰذا اس تکلیف کی بنا پر واہب کے لئے جائز قرار دیا گیا کہ موہوب لہ سے وہ ہبہ کیا ہوا پھل اندازہ کر کے کٹے ہوئے پھل سے خرید لے۔ (بحوالہ بالا)

تو گویا یہ معاملہ حقیقتاً بیع مزابنہ ہے، کیونکہ یہاں درخت پر لگے ہوئے پھلوں کی بیع کٹے ہوئے پھلوں کے ساتھ ہو رہی ہے۔ لیکن دفع حرج کے لئے شریعت نے اس خاص صورت کی اجازت دے دی۔

چوتھا قول امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، ان کے نزدیک عرایا کی تفسیر بعینہ وہی ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے، البتہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اس کو حقیقتاً بیع نہیں مانتے، صرف صورۃً بیع مانتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ موہوب لہ نے موہوب پر قبضہ نہیں کیا تھا اور درخت پر لگے ہوئے موہوب پھل، پر قبضہ سے پہلے اس کو دوسرا موہوب (کٹا ہوا پھل مل گیا، لہٰذا یہ قبل القبض استبدال الھبہ بالھبہ کے قبیل سے ہوا، جس کو بیع نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ بیع میں ملکیت ضروری ہے، اور ظاہر ہے کہ قبل القبض ''موہوب'' چیز یعنی درخت پر لگا ہوا پھل موہوب لہ کی ملکیت نہیں۔ لیکن چونکہ صورتاً

یہ بیع ہے اس لئے اس کو مجازاً بیع العرایا کہا گیا ہے۔(تکملہ فتح الملہم:۱/۴۰۸، اعلاء السنن:۱۴/۱۳۲)

خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع العرایا حقیقۃً بیع ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مزابنہ کی حرمت سے اس کا استثناء کیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ وسق سے کم میں بیع مزابنہ کو عرایا قرار دیا ہے، اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے موہوب چیز کو واہب کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچنے کو عرایا کہا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موہوب چیز واہب ہی کے ہاتھ فروخت کرنے کو عرایا شمار کیا ہے اور ان سب حضرات کے نزدیک بیع عرایا مزابنہ کی حرمت سے مستثنیٰ ہے، لیکن مستثنیٰ متصل جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع العرایا صورۃً بیع ہے، حقیقۃً بیع نہیں، بلکہ استرداد الھبہ بالھبہ ہے اور یہ بیع مزابنہ سے مستثنیٰ منقطع ہے نہ کہ متصل۔

بیع عرایا میں حنفیہ کا مسلک لغۃً روایۃً اور درایۃً ہر لحاظ سے راجح ہے، لغۃً تو اس لئے کہ عرایا جمع ہے "عریہ" کی اور عریہ لغت میں عطیہ اور ہبہ کو کہا جاتا ہے اور کھجور کے اس درخت کو جس کا پھل ہبہ میں دیا گیا ہو "النخلة المعراة" اس سے معلوم ہوا کہ لغت میں عریہ کا ہبہ ہونا تو ثابت ہے بیع ہونا ثابت نہیں۔(لسان العرب:۱۵/۴۹ تحت لفظ عرا)

اور روایۃً امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس لئے راجح ہے کہ متعدد احادیث میں عرایا کی تفسیر یہی آئی ہے کہ معری یعنی واہب کے گھر والے اس کے لینے والے ہیں اور وہی تمر دیکر رطب کھانے والے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ تفسیر امام اعظم اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے قول پر ہو سکتی ہے۔

چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم رخص فى العرية ياخذها اهل البيت بخرصها تمرا ياكلونها رطبا" (مسلم شریف:۲/۸)

[حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عریہ میں اجازت دی کہ گھر والے اندازہ کر کے کھجور کے بدلے اس کو لے لیں تا کہ وہ تازہ کھجور کھا سکیں۔] اس روایت میں تصریح ہے کہ عریہ کے لینے والے واہب اور معری کے گھر والے ہونگے۔

اور درایۃً امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اس لئے راجح ہے کہ مزابنہ ربا کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے، جس کی حرمت قرآن کریم اور سنت متواترہ سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ ربا میں قلیل

وکثیر کا اعتبار نہیں اور نہ ہی ربا میں اجناس کے اعتبار سے کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ شریعت اسلامیہ میں اس کی کوئی نظیر ہے کہ صرف رطب کھانے کے لئے تمر کا تبادلہ رطب کے ساتھ احتمال ربوا کے باوجود جائز قرار دیا جائے۔

نیز عقلاً یہ بھی بہت بعید بات ہے کہ کوئی معاملہ پانچ اوسق سے کم میں تو حلال ہو اور پانچ اوسق یا اس سے کچھ زائد میں حرام ہو، لہٰذا اگر بعض اخبار آحاد سے کسی سودی معاملہ کی حلت ثابت ہوتی ہو تو اس کی تاویل قرآن اور سنت کے موافق ضروری ہوگی، اگرچہ تاویل بعید نہ ہو؟ خاص کر کے اس مسئلہ میں جو لغت اور روایات کثیرہ سے مؤید بھی ہے اور اہل مدینہ کے عرف کے موافق بھی ہے جن کی اصطلاح کے موافق حضور اقدس ﷺ کے ارشادات وارد ہیں۔(تکملہ فتح الملہم: ۴۱۴/۱، تفسیر العرایا)

بعض شافعیہ کی طرف سے حنفیہ پر چند اشکالات کئے جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ ایک موہوب کو دوسرے موہوب کے ساتھ قبل القبض تبدیل کرنا تو ہر وقت جائز ہے تو پھر رخصۃ فی العرایا کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ کلمہ رخصت کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز نہیں تھا اور حضور اقدس ﷺ نے ضرورت کی وجہ سے اجازت دے دی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس تبدیل کرنے میں وعدہ خلافی ہوتی ہے، کیونکہ وعدہ ایک موہوب کا ہوا تھا اور اب دوسرا موہوب دے رہا ہے، اس وعدہ خلافی کی وجہ سے ظاہر میں یہ مکروہ تھا لیکن آنحضرت ﷺ کی رخصت سے یہ کراہت ختم ہوگئی۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ ''عرایا'' کو بیع مزابنہ کی حرمت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیع مزابنہ میں داخل ہے، جبکہ حنفیہ کی تفسیر کے مطابق یہ مزابنہ میں داخل ہی نہیں عطیہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حقیقۃً استثناء منقطع ہے اور صورۃً مستثنیٰ متصل ہے اور چونکہ اس کی صورت مزابنہ کی ہے اس لئے اس کو مزابنہ کی سیاق میں ذکر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اقتران فی اللفظ اقتران فی الحکم کو مستلزم نہیں، ہمارے نزدیک بیع العرایا حقیقتاً ہبہ اور عطیہ ہے، لیکن چونکہ صورۃً بیع ہے، لہٰذا اس پر بیع کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہے۔(تکملہ فتح الملہم: ۴۱۵/۱، حکم العرایا)

ایضاً

{۲۷۱۳} وَعَنْ سَھْلِ بْنِ اَبِیْ حَثْمَۃَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ التَّمْرِ بِالتَّمْرِ اِلَّا اَنَّہٗ رَخَّصَ فِی الْعَرِیَّۃِ اَنْ تُبَاعَ بِخَرْصِھَا تَمْرًا یَاکُلُھَا اَھْلُھَا رُطَبًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۹۲/۱، باب بیع التمر علی رؤس النخل، حدیث نمبر: ۲۱۴۱، مسلم شریف: ۸/۲، باب تحریم بیع الرطب، حدیث نمبر: ۱۵۴۰۔

ترجمہ: حضرت سہل بن حثمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے (درختوں پر میوہ فروخت کرنے سے)۔(یعنی) خشک کھجوروں کے عوض؛ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرایا میں اجازت دی ہے یہ کہ اندازہ کے ساتھ درختوں پر کھجوروں کو فروخت کردے (تاکہ) ان کے مالک تازہ کھجوریں کھائیں۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

عرایا کی بیع

{۲۷۱۴} وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَخَّصَ فِیْ بَیْعِ الْعَرَایَا بِخَرْصِھَا مِنَ التَّمْرِ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ اَوْ فِیْ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ شَکَّ دَاوٗدُ بْنُ الْحُصَیْنِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۲۰/۱، باب الرجل یکون لہ ممر، حدیث نمبر: ۲۳۲۱، مسلم شریف: ۹/۲، باب تحریم بیع الرطب بالتمر الا فی العرایا، حدیث نمبر: ۱۵۴۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ کے ساتھ عرایا کو خشک کھجوروں کے عوض فروخت کرنے کی رخصت دی ہے، پانچ وسق سے کم ہوں یا پانچ وسق میں۔(اس روایت کے ایک راوی) اور داؤد ابن حصین نے شک کیا ہے۔

تشریح: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”رخص فی العرایا یعنی فی النخلة والنخلتین توھبان للرجل“ (طحاوی) [عرایا کی رخصت فرمائی، یعنی کھجور کا ایک درخت یا دو درخت کسی شخص کو ہبہ کر دئے جائیں۔] اور چونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اصحاب نخیل میں سے ہیں، لہٰذا ان کا قول اس سلسلہ میں حجت ہوگا، وہ صراحتاً فرماتے ہیں کہ ”عریۃ“ ہبہ اور عطیہ ہے، یہ تمام تفصیل احناف کے قول کے مطابق ہے اور دوسرے فقہاء کا اس میں اختلاف ہے، اولاً احناف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس کی تشریح یہ ہوگی کہ صورتاً تو عرایا کی بیع مزابنہ کے ہی مثل ہے، البتہ فی الحقیقت (عندالاحناف) ہبہ ہونے کی وجہ سے ان درختوں کے پھل (اور کھجور) کو نقد پھلوں کے عوض تبادلہ کرنا ہے، اندازہ کرنے کے بعد مباح ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی رخصت ہے، گویا کہ یہ ہبہ اور عطیہ کی نوعیت کا تبادلہ ہو رہا ہے، اور چونکہ معاملہ اور عقد کی ضرورت ہوگئی ہے، اس لئے اس کو بیع العرایا سے موسوم کیا گیا ہے۔

پھلوں کی بیع کب ہو سکتی ہے؟

{۲۷۱۵} **وَعَنْ** عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا نَهٰى الْبَائِعَ وَالْمُشْتَرِيَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ نَهٰى عَنْ بَيْعِ النَّخْلِ حَتّٰى تَزْهُوَ وَعَنِ السُّنْبُلِ حَتّٰى يَبْيَضَّ وَيَاْمَنَ الْعَاهَةَ۔

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۹۲، باب بیع الثمار قبل ان یبدو صلاحھا، حدیث نمبر: ۲۱۹۴، مسلم شریف: ۲/۸، باب النھی عن بیع الثمار قبل بدو صلاحھا، حدیث نمبر: ۱۵۳۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا پھلوں کی فروختگی سے یہاں تک کہ اس کا نفع ظاہر ہو جائے (اس سے) بائع اور مشتری دونوں کو منع فرمایا۔

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ درختوں (کے پھلوں) کو فروخت کرنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ پختہ ہوں اور منع فرمایا کھیتی کو خوشہ میں یہاں تک کہ وہ پختہ ہو اور آفات سے مامون ہو جائے۔

بدوصلاح کی تفسیر

تشریح: البدو (بفتح الباءوسکون الدال وتخفیف الواو) یا (بضم الباء والدال وتشدید الواو) مصدر ہے ظہور کے معنی ہیں۔

بدوصلاح کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔حنفیہ کے نزدیک جیسا کہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے بدوصلاح یہ ہے کہ وہ پھل آفت اور عاہت سے محفوظ ہوجائیں، یعنی اس حد تک پہنچ جائیں کہ آفت وفساد سے مامون ہوجائیں۔

اور شافعیہ کے نزدیک بدوصلاح یہ ہے کہ پھل پکنا شروع ہوجائے اور اس میں مٹھاس آنا شروع ہوجائے۔(فتح القدیر:۴۸۹/۵)

جیسا کہ علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ شافعی صغیر سے مشہور ہیں۔''نہایۃ المحتاج'' میں فرماتے ہیں: ''وبدو صلاح الثمر ظھور مبادی النضج والحلاوۃ بان یتموہ ویلین'' (نہایۃ المحتاج:۱۴۸/۴)

یعنی پھل کا بدوصلاح اس کے پکنے کے اور مٹھاس کے آثار کے ظہور کو کہتے ہیں کہ وہ رس بھرا اور نرم ہوجائے۔

شافعیہ کی دلیل ایک تو حضرت یحیٰ بن سعید کی روایت ہے، جس میں ارشاد ہے: ''یبدو صلاحہ حمرتہ وصفرتہ'' (مسلم شریف:۲/۷)

اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''نھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الثمر حتی یطیب'' (بحوالہ بالا) [حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پکنے سے پہلے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا ہے۔]

اور ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے: ''نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع النخل حتی یأکل منہ او یوکل'' (مسلم شریف:۲/۸) [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی بیع سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ کھانے کے قابل ہوجائیں۔] ان تینوں روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''بدوصلاح'' سے مراد پھل کا پکنا اور اس میں مٹھاس کا آنا ہے۔

حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ مجموعہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدوصلاح'' سے مراد پھل کا آفات اورفسادات سے محفوظ رہنا ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی روایت میں جس میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ منفرد ہیں ارشاد ہے: ''وعن السنبل حتی یبیض ویأمن العاھة'' (مسلم شریف: ۲/۷) [اور گیہوں وغیرہ کی بالوں کی بیع سے یہاں تک کہ وہ سفید ہو جائیں اور بیماری سے محفوظ ہو جائیں۔]

اور یحییٰ بن سعید کی روایت میں ارشاد ہے: ''حتی یبدو صلاحه وتذھب عنه الأفة'' [یہاں تک کہ صلاح ظاہر ہو جائے اور آفت سے حفاظت ہو جائے۔] اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک اور روایت میں ارشاد ہے: ''فقیل لابن عمر رضی اللہ عنھما ما صلاحه؟ قال: تذھب عاھته'' (بحوالہ بالا)

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ایک اور طریق سے ذکر فرمائی ہے، جس میں ارشاد ہے: ''نھی النبی صلی اللہ علیه وسلم عن بیع الثمرة حتی یبدو صلاحھا وکان اذا سئل عن صلاحھا قال: حتی تذھب عاھته'' (بخاری شریف: ۱/۲۰۱)

نیز امام مالک اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرسلاً اور موصولاً یہ روایت تخریج فرمائی ہے جس میں ارشاد ہے: ''ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم نھی عن بیع الثمار حتی تنجو من العاھة'' (طحاوی: ۲/۲۲۹)

ان تمام روایات سے یہ معلوم ہوا کہ بدوصلاح سے مراد پھل کا آفات سے محفوظ رہنا ہے، البتہ چونکہ پھل مختلف اور متفاوت ہیں، اس واسطے پھلوں کا آفات سے مامون ہونا بھی متفاوت ہے، چنانچہ بعض پکنے اور مٹھاس آنے سے مامون ہوتے ہیں اور بعض سرخی اور سفیدی آنے سے، چنانچہ ان پھلوں کے پیش نظر بعض احادیث میں فساد سے مامون ہونے کی تفسیر اسی سے کی گئی ہے کہ اس میں حلاوۃ آجائے اور پک جائے ورنہ اصل علت آفات سے محفوظ رہنا ہے، چاہے وہ کسی بھی طریقے سے ہو۔

چنانچہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بدوصلاح پھلوں کے تفاوت سے متفاوت ہوتا ہے، چنانچہ انجیر میں بدوصلاح کی یہ صورت ہوگی کہ اس میں خوشبو پیدا ہو جائے اور مٹھاس ظاہر ہو جائے اور کالے انگور کے لئے

بدوصلاح کا یہ معیار ہے کہ سواد کی طرف مائل ہوجائے اور سفید انگور کا معیار یہ ہے کہ سفیدی کی طرف مائل ہوجائے اور ساتھ ساتھ پک جائے۔

اسی طرح زیتون کا بدوصلاح اس کا سواد کی طرف مائل ہونا ہے۔(عمدۃ القاری:۲۹۸/۱۱)

اس بات پر اجماع ہے کہ بیع ثمار قبل الظہور باطل ہے۔(المغنی لابن قدامۃ:۷۲/۴)

اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں کیونکہ یہ بیع المعدوم ہے، البتہ ظہور کے بعد اس میں دو احتمال ہیں، یا بیع قبل بدوصلاح ہوگی یا بعد بدوصلاح ہوگی اور ہر صورت میں تین احتمال ہیں:

(۱)......**بیع بشرط القطع:** بائع کی طرف سے یہ شرط ہو کہ مشتری فوراً اپنا پھل درخت سے کاٹ لے۔

(۲)......**بیع بشرط الترک:** مشتری یہ شرط لگائے کہ فلاں متعین وقت تک یہ پھل درخت پر لگے رہیں گے۔

(۳)......**بیع الاطلاق:** بغیر کسی شرط کے عقد ہوجائے نہ تو اس میں قطع کی شرط لگائی گئی ہو اور نہ ہی ترک کی۔

قبل بدوصلاح کا حکم

قبل بدوصلاح کی صورت میں اگر بیع بشرط القطع ہو تو یہ فقہاء امت اور ائمہ اربعہ کے اجماع سے جائز ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ ''مغنی'' میں فرماتے ہیں:

''القسم الثانی ان یبیعها بشرط القطع فی الحال فیصح بالاجماع لان المنع انما کان خوفا من تلف الثمرة و حدوث العاهة علیها قبل أخذها، و هذا مأمون فیما یقطع فیصح بیعه کما لو بدأ صلاحه'' (المغنی لابن قدامۃ:۷۲/۴)[دوسری قسم یہ ہے کہ بیع اس شرط پر ہو کہ مشتری فی الحال پھل توڑ لے تو یہ بالاجماع جائز ہے، کیونکہ ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ پھل توڑنے سے پہلے کہیں وہ کسی آفت کی وجہ سے ہلاک نہ ہوجائے اور ظاہر ہے کہ قطع کے بعد یہ خطرہ نہیں ہوتا، لہٰذا بیع جائز ہوگی، جیسے بدوصلاح کے بعد بیع جائز ہوتی ہے۔]

اور اگر بیع بشرط الترک ہو یعنی مشتری یہ شرط لگادے کہ فلاں وقت تک پھل درخت پر رہیں گے تو

یہ بالاجماع باطل ہے۔(المغنی لابن قدامۃ:۲/۷۲)

ایک تو حدیث مبحوث عنہ کی وجہ سے دوسرے یہ کہ بیع شرط کے ساتھ ہے جو کہ جائز نہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بیع بغیر قید وشرط کے ہو نہ اس میں ترک کی شرط ہو اور نہ قطع کی، یہ صورت اختلافی ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بیع باطل ہے، جیسا کہ دوسری صورت میں باطل ہے۔

جبکہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بیع جائز ہے، جیسا کہ صورت اولیٰ میں جائز ہے اور بائع کے لئے جائز ہے کہ مشتری کو فی الحال پھل توڑنے پر مجبور کرے۔

ائمہ ثلاثہ کا استدلال حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث مذکور کے عموم اور اطلاق سے ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں بیع قبل بدوصلاح سے مطلقاً ممانعت آئی ہے، جس میں تمام صورتیں داخل ہیں، البتہ صورت اولیٰ یعنی بیع بشرط القطع عقلاً مستثنیٰ ہے، کیونکہ قطع کے بعد بیع محل نزاع نہیں، چونکہ دراصل وہ ثمر مقطوع کی بیع ہے، نہ کہ ثمر معلق کی۔(المغنی:۴/۷۲)

حنفیہ کے نزدیک صورت ثلاثہ حقیقتاً صورت اولیٰ میں داخل ہے اور اطلاق صرف لفظی ہے، حقیقی نہیں، چنانچہ اگر بائع نے اس کو بیع کے بعد پھل کاٹنے کا حکم دیا تو مشتری پر کاٹنا واجب ہو جائے گا، تو گویا کہ بظاہر تو اطلاق ہے اور حقیقت میں اطلاق نہیں بلکہ قطع کی شرط کے ساتھ ہے، لیکن اگر بائع نے کاٹنے کا حکم نہیں دیا تو اس صورت میں مشتری پر کاٹنا واجب نہیں، اس وجہ سے نہیں کہ کاٹنا بیع کا مقتضیٰ نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ بائع نے اپنے حق کے بارے میں تساہل سے کام لیا ہے جیسا کہ بائع شرط قطع کے ساتھ بیع کرے اور پھر نرمی کر کے کاٹنے کا حکم نہ دے تو جائز ہے، لہٰذا صورت اولیٰ اور ثالثہ میں مآلاً کوئی فرق نہیں۔(فتح القدیر:۵/۴۸۹)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے صورت ثالثہ کے جواز پر ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس کی تخریج امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب البیوع میں کی ہے۔(شرح معانی الآثار:۲/۲۳۰)

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ بَاعَ نَخْلًا قَدْ اُبِّرَتْ فَثَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ" [حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس شخص نے کھجور کے درخت کی بیع کی جس

کی تابیر کی جاچکی ہوتو اس کا پھل بائع کا ہوگا الا یہ کہ مشتری اس کی شرط کرلے۔]

اورطریق استدلال یہ ہے کہ تابیر''پیوندکاری'' بدوصلاح سے پہلے ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے کھجور کے درخت کی بیع کی اجازت تابیر کے فوراً بعد دی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ بیع قبل بدوصلاح جائز ہے، اسی لئے فرمایا کہ پھل بائع کا ہوگا مگر یہ کہ مشتری شرط لگادے۔

اس پر اگر کوئی اشکال کرے کہ یہ تو درحقیقت کھجور کے درخت کی بیع ہے اور تبعاً کھجور کے پھل کی بیع ہے، لہٰذا اگرچہ قبل بدوصلاح پھل کی بیع تو ہے مگر اصلاً نہیں تبعاً ہے، جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ منفرداً بھی قبل بدوصلاح پھل کی بیع جائز ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات فقہ میں مسلم ہے کہ جو چیز شرط کے بغیر بیع میں داخل نہ ہو اس چیز کی بیع منفرداً جائز ہے، لہٰذا جب پھل کی بیع اشتراط کی صورت میں درخت کے ساتھ قبل بدوصلاح جائز ہے، تو انفراد کی صورت میں بھی قبل بدوصلاح پھل کی بیع جائز ہوگی۔

جیسا کہ ولد الشاۃ ہے کہ بیع شاۃ میں شرط لگانے کے بغیر داخل نہیں، لہٰذا انفراداً بھی اس کی بیع جائز ہے، برخلاف حمل کے کہ وہ بیع میں بغیر اشتراط کے داخل ہے، لہٰذا انفراداً اس کی بیع جائز نہیں۔

اور حدیث شریف میں آنحضرت ﷺ نے تصریح فرمائی ہے کہ کھجور کا پھل درخت کی بیع میں داخل نہیں، مگر یہ کہ شرط لگالے، لہٰذا حدیث سے بیع الثمر قبل بدوصلاح کا جواز معلوم ہوتا ہے، خواہ پھل درخت کے تابع ہو یا منفرداً اسی کی بیع ہو۔

شافعیہ کے استدلال کا جواب

شیخ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے شافعیہ کے استدلال کا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث شریف میں نہی دوسری صورت پر محمول ہے، یعنی جبکہ بیع بشرط الترک ہو اور مشتری یہ شرط لگادے کہ متعین وقت تک یہ پھل درخت پر لگے رہیں گے اور ظاہر ہے کہ حدیث کے عموم پر انہوں نے بھی عمل نہیں کیا کیونکہ حدیث کے عموم میں تینوں صورتیں داخل ہیں، چنانچہ انہوں نے صورت اولیٰ یعنی بیع بشرط القطع والی صورت کو عقلاً مستثنیٰ قرار دے کر جائز کہا ہے، جبکہ ہم نے صریح حدیثوں کی وجہ سے حدیث کے ظاہر کو چھوڑا ہے اور

تیسری صورت یعنی بیع بشرط الاطلاق کو جائز کہا ہے۔

ہمارے مسلک کے راجح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس بیع کی ممانعت کی وجہ دھوکہ اور غرر کو بتایا ہے، جبکہ دھوکہ صرف صورت ثانیہ میں ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ بیع بشرط الترک کی جائے نہ کہ صورت اولیٰ اور ثالثہ میں، اور وہ دھوکہ یہ ہے کہ جب غیر پختہ وغیر تیار پھل بشرط الترک بیچا جائے گا اور اس کی قیمت وصول کی جائے گی تو ممکن ہے کہ پھل تیار ہونے سے پہلے ہی کسی آفت مثلاً آندھی، بارش وغیرہ کی وجہ سے ضائع ہوجائیں اور مشتری کو اپنا حق نہ مل سکے، تو جب علت نہی دھوکہ ہے اور وہ تیسری صورت میں موجود نہیں، لہٰذا ممانعت بھی نہیں ہوگی بلکہ جواز کا حکم لگایا جائے گا۔

بعد بدو صلاح کا حکم

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بعد بدو صلاح پھلوں کی بیع تینوں صورتوں میں جائز ہے، یعنی بشرط القطع، وبشرط الترک، والاطلاق۔

اور ان کے نزدیک اطلاق کی صورت میں مشتری کو یہ حق حاصل ہے کہ پھلوں کو توڑنے کے وقت تک درختوں پر باقی رکھے، جیسا کہ بشرط الترک کی صورت میں وہ اس کا حقدار ہے۔

ان حضرات کا استدلال مفہوم حدیث سے ہے چونکہ حدیث میں نہی قبل بدو صلاح کے ساتھ مقید ہے، لہٰذا نہی اسی کے ساتھ مختص ہوگی اور جو پھل بعد بدو صلاح بیچا جائے گا اس سے نہی کا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک بعد بدو صلاح میں بھی صرف دو صورتوں میں بیع جائز ہے، یعنی بشرط القطع کی صورت میں کہ بائع یہ شرط لگادے کہ مشتری فوراً اپنا پھل درخت سے کاٹ لے اور اطلاق کی صورت میں کہ بغیر کسی شرط کے عقد ہوجائے نہ اتارنے کی شرط ہو اور نہ رکھنے کی شرط ہو۔

اطلاق کی صورت میں مشتری سے اگر بائع کی طرف سے اتارنے کا مطالبہ ہو تو اس پر اتارنا واجب ہوگا۔

اور ایک صورت میں بیع فاسد ہے، یعنی بشرط الترک کہ مشتری یہ شرط لگادے کہ پھل اتارنے کے

وقت تک درخت پر لگے رہیں گے۔

گویا کہ حضرات شیخین کے نزدیک قبل بدوصلاح اور بعد بدوصلاح میں کوئی فرق نہیں ہے اور ان حضرات کے نزدیک دونوں صورتوں میں حکم برابر ہے، کیونکہ یہ حضرات مفہوم کو حجت تسلیم نہیں کرتے، البتہ قبل بدوصلاح کی قید احتراز کے لئے ذکر نہیں کی گئی بلکہ عرف اور عادت کے پیش نظر اس کو ذکر کیا ہے، اس لئے کہ عموماً لوگ قبل بدوصلاح پھل کی خرید وفروخت بشرط الترک کرتے تھے۔

اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسئلہ میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ اگر بعد بدوصلاح پھل میں پوری بڑھوتری نہیں آئی ہے اور ابھی تک اجزاء مکمل نہیں ہوئے ہیں تو پھر شیخین کے قول کی طرح بیع بشرط الترک فاسد ہے، کیونکہ جب ترک کی وجہ سے مزید اجزاء بڑھیں گے تو گویا ایک معدوم چیز کی شرط بیع میں لگائی گئی جو کہ مشتری کو بلاعوض مل رہی ہے۔لیکن اگر بعد بدوصلاح پھل کے اجزاء مکمل ہو گئے اب مزید بڑھوتری نہیں ہوگی صرف پکنے کی دیر ہے تو پھر درخت پر پھل چھوڑنے سے مزید اجزاء نہیں بڑھیں گے اور اس صورت میں ”شرط الترک“ اگرچہ عقد کے تقاضا کے خلاف ہے اور اس میں احد العاقدین کا نفع بھی ہے اس لئے قیاساً یہ بیع بھی جائز نہیں ہونی چاہئے، البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے استحساناً اس کو جائز قرار دیا ہے اور وجہ استحسان لوگوں کا تعامل اور عموم بلوی ہے، جس کی وجہ سے جواز کی گنجائش ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی قول ہے بلکہ ”المنتقی“ میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے ساتھ ذکر کیا ہے۔(فتح القدیر مع عنایہ:۴۸۹/۵ نفحات التنقیح:۴۴۴/۳)

ممانعت بیع قبل صلاح ثمر

{۲۷۱۶} وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الثِّمَارِ حَتّٰی تُزْھِیَ قِیْلَ: وَمَا تُزْھِیْ قَالَ: حَتّٰی تَحْمَرَّ وَقَالَ: اَرَاَیْتَ اِذَا مَنَعَ اللّٰہُ الثَّمَرَۃَ بِمَ یَاْخُذُ اَحَدُکُمْ مَالَ اَخِیْہِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۹۲، باب بیع النخل قبل ان یبدو صلاحھا، حدیث نمبر:۲۱۴۷، مسلم شریف:۲/۱۶، باب وضع الجرائع، حدیث نمبر:۱۵۵۵۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے (درختوں پر) پھلوں کی بیع سے یہاں تک کہ وہ پختہ ہوں، کسی نے عرض کیا: "تزھی" (پختہ ہونے) سے کیا مراد ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہاں تک کہ سرخی آجائے اور آنحضرت ﷺ نے (یہ بھی) فرمایا: بتلاؤ! اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک دے (کہ پیداواری نہ ہو) تو (پھر) کوئی شخص اپنے بھائی کے مال کو کس وجہ سے لے گا؟

تشریح: تفصیل اوپر گذرچکی۔

ایک سے زائد سال کے لئے فروخت کرنا

{۲۷۱۷} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ السِّنِيْنَ وَاَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۲/۱۶، باب وضع الجرائح و کراء الارض، حدیث نمبر:۱۵۵۴۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا چند سالوں کی بیع سے (باغ کے پھلوں کی) اور آنحضرت ﷺ نے حکم فرمایا: آفات (کی وجہ سے درختوں کے پھل میں مشتری کو جو نقصان ہوا ہے اس بناء پر اس) کے وضع کرنے کا۔

تشریح: بیع السنین بیع معاومہ کو ہی کہتے ہیں، وضع الجوائح سے مراد یہ ہے کہ مشتری کے مبیع پر قبضہ کر لینے کے بعد اس پر کوئی آفت آجائے تو بائع ثمن کم کر دے۔ اس صورت میں وضع جوائح کا امر حنفیہ اور جمہور کے نزدیک استحبابی ہے وجوبی نہیں، کیونکہ مشتری کے قبضہ کر لینے کے بعد وہ چیز مشتری کے ضمان میں چلی گئی، اگر آفت قبل القبض آئے تو وضع جوائح واجب ہوگا، کیونکہ وہ مبیع بائع کی ضمان میں ہلاک ہوئی ہے اس کے ہلاک ہونے سے بیع فسخ ہو جائے گی اور بائع ثمن کا مستحق نہیں رہے گا۔

اگلی حدیث میں لفظ آ رہے ہیں: "فلا یحل لک أن تأخذ منه شیئاً" [تیرے لئے حلال نہیں کہ اس میں کچھ لے۔ یہاں عدم حلت سے مراد مطلقاً کراہت اور غیر مناسب ہونا ہے، جو بطور عموم مجاز کے کراہت تحریمی اور تنزیہی دونوں کو شامل ہے۔ قبل القبض کی صورت میں کراہت تحریمی ہوگی اور بعد القبض کی صورت میں تنزیہی۔ (اشرف التوضیح: ۲/۳۹۵)

نقصان کا ضامن کون؟

{۲۷۱۸} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ بِعْتَ مِنْ اَخِيْكَ ثَمَرًا فَاَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ فَلَا يَحِلُّ لَكَ اَنْ تَاْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا بِمَ تَاْخُذُ مَالَ اَخِيْكَ بِغَيْرِ حَقٍّ. (رواه مسلم)

حواله: مسلم شریف: ۲/۱۶، کتاب المساقاۃ، باب وضع الجوائح، حدیث نمبر: ۱۵۵۴۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم نے اپنے بھائی (مسلمان) کو پھل فروخت کیا (یعنی درخت پر) اور پھر اس کو آفت پہنچ جائے تو (از روئے تقویٰ اور پرہیزگاری) تیرے لئے حلال نہیں اس سے کچھ (بھی مال) وصول کرنا، ناحق اپنے بھائی کا مال کس بناء پر لوگے؟

تشریح: اس حدیث شریف کے اندر وضع جوائح کا حکم ہے، یعنی اگر مشتری کے پاس سامان ہلاک ہو جائے تو بائع کو چاہئے کہ اس کے ثمن کو معاف کر دے۔

جوائح: جائحه کی جمع ہے، آفت سماویہ کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے چوری کو اس کے اندر داخل کیا ہے اور بعض نے خارج مانا، اب اس مسئلہ کے اندر اختلاف ہے کہ اس ہلاکت کی صورت میں مبیع کا ضمان مشتری پر آئے گا، یا ضمان بائع پر آئے گا؟ جمہور کے نزدیک دو حال سے خالی نہیں، اگر وہ مشتری کے قبضہ میں آ جانے کے بعد اس کے اندر نقصان ہوا تو ضمان مشتری سے اور اگر بائع کے قبضہ کے اندر نقصان پہنچا تو بائع کے ضمان سے ہلاک ہوگا۔ امام مالک وغیرہ نے اس حدیث سے استدلال کیا، ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث بدو صلاح سے قبل پر محمول ہے۔

اشیاء منقولہ میں صحت بیع کے لئے قبضہ لازم

{۲۷۱۹} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ کَانُوْا یَبْتَاعُوْنَ الطَّعَامَ فِیْ اَعْلَی السُّوْقِ فَیَبِیْعُوْنَہٗ فِیْ مَکَانِہٖ فَنَھَاھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِہٖ فِیْ مَکَانِہٖ حَتّٰی یَنْقُلُوْہُ۔ (رواہ ابوداؤد) وَلَمْ اَجِدْہُ فِی الصَّحِیْحَیْنِ۔

حوالہ: ابوداؤدشریف: ۴۹۲/۲، باب بیع الطعام قبل ان یشتوفی، حدیث نمبر: ۳۴۹۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بازار کے بالائی حصہ میں غلہ خرید کرتے اور پھر اس کو اسی جگہ (قبضہ کئے جانے سے قبل ہی) فروخت کر دیتے تھے، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسی جگہ میں فروخت کرنے سے منع فرمادیا، یہاں تک کہ وہ اس کو اس جگہ سے منتقل کر دیں۔

تشریح: اس حدیث میں بیع الطعام قبل الاستیفاء کی ممانعت ہے، استیفاء بمعنی قبض اور وصول کرنا، یعنی اگر کوئی شخص غلہ کی قسم کی کوئی چیز خریدے اور خریدنے کے بعد اس کو فروخت کرنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ پہلے اس پر قبضہ کرے، اس کے بعد اس کو فروخت کرے، لیکن ہر چیز کا قبضہ اور استیفاء اس کے حال کے مناسب ہوتا ہے، بعض چیزوں کا قبضہ یہ ہے کہ اس شی کو دوسرے شخص کے ہاتھ میں دیا جائے اور بعض چیزوں کا قبضہ تخلیہ سے ہوتا ہے، یعنی بائع چیز کو فروخت کرنے کے بعد مشتری سے کہے کہ تیری چیز یہ رکھی ہے تو اس کو جب چاہے یہاں سے اٹھا، اور بعض صورتوں میں قبضہ نقل شی سے ہوتا ہے، یعنی مشتری نے اس مبیع کو جس جگہ سے خریدا ہے وہاں سے اس کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دے، اور یہ وہاں ہوتا ہے جہاں پر غلہ کی بیع جزافاً (اٹکل سے) ہو، یعنی غلہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بیع جزافاً کی صورت میں یہی اس کا قبضہ ہے۔ اور اگر کوئی شی کیلاً یا وزناً فروخت کی جائے تو وہاں پر اس کو کیل کر لینا یا وزن کر لینا یہی اس کا قبضہ ہے۔

بیع قبل القبض سے نہی کن کن اشیاء میں ہے؟

اسی کے بعد جاننا چاہئے کہ یہ حکم طعام میں تو متفق علیہ ہے کہ اس کی بیع قبل القبض جائز نہیں، متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے، طعام کے علاوہ باقی کن کن اشیاء میں یہ حکم جاری ہوگا اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس میں چار قول ہیں:

(۱)......حضرت امام شافعی ومحمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک ہر چیز کا یہی حکم ہے، "سواء کان من المکیلات او الموزونات ومن الماکول او المشروب والمنقول وغیر المنقول"

(۲)......اور شیخین امام ابوحنیفہ وابویوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک عقار (زمین) کے علاوہ تمام منقولات کا یہی حکم ہے، اس مذہب میں صرف عقار کا استثناء ہے، بخلاف پہلے مذہب کے کہ اس میں کسی چیز کا استثناء نہیں۔

(۳)......حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جملہ مکیلات وموزونات کا یہی حکم ہے، اس کے علاوہ باقی دوسری چیزوں کا یہ حکم نہیں ہے۔

(۴)......حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف ماکول اور مشروب کا ہے۔

امام مالک اور جمہور کا ایک اور اختلاف

اس کے بعد یہاں ایک اختلاف اور ہے، وہ بھی سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ جمہور علماء اور ائمہ ثلاث کے نزدیک بیع طعام مطلقاً قبل القبض جائز نہیں۔ یعنی چاہے اس کو جزافاً (اٹکل سے) خریدا ہو یا کیلاً، اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول مشہور میں جزاف اور غیر جزاف میں فرق ہے، وہ یہ کہ جو غلہ جزافاً خریدا گیا ہو اس کی بیع قبل القبض جائز ہے اور جو کیلاً خریدا گیا ہو اس کی بیع قبل القبض جائز نہیں اور مشتری کا اس کو کیل کرلینا یہی اس کا قبضہ ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال اس حدیث شریف سے ہے جس کے لفظ یہ ہیں: "نھی ان یبیع احد طعاما اشتراہ بکیل حتی یستوفیہ" یعنی آپ نے منع فرمایا ہے اس بات سے کہ کوئی شخص اس طعام کو جس کو اس نے کیلاً خریدا ہو وہ اس کی بیع قبل الاستیفاء کرے،

اس حدیث شریف میں "اشتراہ بکیل" کی قید مذکور ہے، جمہور یہ کہتے ہیں کہ "اشتراہ بکیل" کی قید احترازی نہیں، جس کا قرینہ باب مذکورہ کی حدیث اول ہے، جو مطلق ہے۔ (الدرالمنضود:۴۰۸/۵)

اشیاءِ منقولہ میں تصرف قبل القبض جائز نہیں

{۲۷۲۰} وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِيْعُهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ حَتّٰى يَكْتَالَهُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف:۲۸۶/۱، باب بیع الطعام قبل ان یقبض، حدیث نمبر:۲۰۸۹، مسلم شریف:۵/۲، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض، حدیث نمبر:۱۵۲۵۔

ترجمہ: اوران یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے غلہ خرید کیا تو اس کو فروخت نہ کرے، یہاں تک کہ اس پر مکمل قبضہ حاصل کرلے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ اس کو کیل کرلے۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

ایضاً

{۲۷۲۱} وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ اَمَّا الَّذِيْ نَهٰى عَنْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهُوَ الطَّعَامُ اَنْ يُّبَاعَ حَتّٰى يُقْبَضَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا وَلَا اَحْسَبُ كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا مِثْلَهٗ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف:۲۸۶/۱، باب بیع الطعام قبل ان یقبض، حدیث نمبر:۲۰۸۸، مسلم شریف:۵/۲، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض، حدیث نمبر:۱۵۲۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس امر سے منع فرمایا ہے سو وہ غلہ ہے کہ جب تک قبضہ (نہ) ہو فروخت (نہ) کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ ہر شی کا حکم اسی کے مانند ہے۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

تلقی رکبان کا حکم

{۲۷۲۲} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ لِبَيْعٍ وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَيْعِ بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا يَبِيْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَلَا تُصَرُّوا الْاِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ اَنْ يَّحْلُبَهَا اِنْ رَضِيَهَا اَمْسَكَهَا وَاِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِّنْ تَمْرٍ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَفِیْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ مَنِ اشْتَرٰی شَاةً مُصَرَّاةً فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَاِنْ رَدَّهَا رَدَّ مَعَهَا صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَآءَ.

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۸۸، باب النھی للبائع ان لا یحفل الابل والبقر والغنم، حدیث نمبر: ۲۱۰۳، مسلم شریف: ۲/۳، باب تحریم بیع الرجل علی بیع اخیہ، حدیث نمبر: ۱۵۱۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (غلہ لانے والے) قافلے سے آگے جا کر خرید کرنے کی وجہ سے ملاقات نہ کرو (بلکہ اس کو منڈی میں لانے دو) اور تم میں سے کوئی شخص ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ دوسرے سے بڑھ کر قیمت لگائے (بولی لگائے حالانکہ خریدنے کی نیت نہیں تاکہ دوسرا دھوکہ میں پڑ جائے) اور شہری دیہاتی کے لئے فروخت نہ کرے اور اونٹ اور بکری کے تھنوں میں دودھ محبوس نہ کرو، (جس سے کہ خریدار کو دھوکہ ہو اور وہ زیادہ دودھ والا خیال کرے) سو اگر کسی شخص نے اس کے بعد اس جانور کو خرید لیا تو دودھ نکالنے کے بعد اس کو اختیار ہے (دونوں صورتوں میں جو بہتر جانے) کہ اگر وہ اس پر رضامند ہے تو روک لے اس کو اور اگر وہ ناخوش ہے تو اس کو واپس کر دے ایک صاع کھجوروں کے ساتھ۔

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: جس شخص نے دودھ روکی ہوئی بکری خریدی تو اس کو تین روز

تک اختیار رہے، پھر اگر وہ اس کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع طعام (بھی) ہو گیہوں نہ ہو۔

تلقی رکبان

تشریح: احادیث شریفہ میں اس کی تعبیر مختلف الفاظ سے کی جاتی ہے، تلقی الرکبان، تلقی السلع، تلقی الجلب، تلقی البیوع اور کبھی صرف تلقی کا اطلاق اس پر ہوتا ہے۔ جبکہ معنی سب کے ایک ہیں اور وہ یہ کہ جو تجارت اور دیہاتیوں کے قافلے باہر سے غذا وغیرہ اموال لا رہے ہیں، منڈی اور شہر میں آنے سے پہلے اور بازار کا بھاؤ معلوم کرنے سے پہلے راستہ میں ان سے سودا کر لینا گویا کہ شہر سے نکل کر ان کا استقبال اسی لئے کیا جاتا ہے تا کہ ان کو بھاؤ کا پتہ نہ چلے۔ اور اصل بھاؤ معلوم ہونے سے قبل ان سے سامان خرید لیا جائے۔

اس بیع کی ممانعت کی حکمت بعض حضرات نے یہ بتائی ہے کہ ’’جالبین‘‘ ’’یعنی شہر کی طرف سامان لانے والے تاجر‘‘ نقصان سے بچ جائیں، کیونکہ اگر انہوں نے شہر آنے اور بھاؤ معلوم کرنے سے پہلے سامان بیچا تو اس میں ہو سکتا ہے کہ ان کو دھوکہ ہو جائے اور ’’متلقی‘‘ ان کا استقبال کرنے والا ان سے کم قیمت پر خرید لے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں شہر والوں کو ضرر سے محفوظ کرنا ہے، اس لئے کہ ’’متلقی‘‘، یعنی ان کا استقبال کرنے والا جب ان سے سامان خرید لے گا وہ فوراً شہریوں پر نہیں بیچے گا بلکہ بھاؤ بڑھنے کا انتظار کرے گا، جس سے شہریوں کو تکلیف ہو گی اور ان کے حق میں مہنگائی بڑھ جائے گی۔ (المغنی: ۱۵۲/ ۴)

’’تلقی البیوع‘‘ کے عدم جواز اور کراہت پر ائمہ کا اتفاق ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے جب کہ کسی کو ضرر نہ ہو، یعنی ’’جالب‘‘ سامان لانے والے پر بھاؤ بھی واضح کیا جائے اور شہر والوں پر تنگی بھی نہ کی جائے، تو اس صورت میں جائز ہے، کیونکہ علت عدم جواز اضرار ہے اور وہ یہاں مفقود ہے، تلقی کی صورت میں جب بیع اضرار اہل بلد کے ساتھ کی جائے گی تو یہ جمہور کے نزدیک گناہ کا ارتکاب کے ساتھ نافذ ہو گی، جب کہ اہل ظواہر کے نزدیک بیع باطل ہے۔ (ہدایہ: ۶۷/ ۳، اعلاء السنن: ۱۸۸/ ۱۴، المغنی: ۱۵۲/ ۴)

پھر حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک جالب یعنی شہر میں سامان لانے والا آدمی اگر راستے میں سامان تجارت بیچ دے تو شہر آنے کے بعد اس کو تین دن تک خیار حاصل ہوگا کہ مشتری سے واپس اپنا مال لے لے تا کہ دھوکہ سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ جبکہ حنفیہ کے نزدیک بیع تام ہوگئی، لہٰذا اس کو خیار حاصل نہیں۔ (اعلاء السنن: ۱۴/۱۸۹)

ان حضرات کا استدلال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جو اس کے بعد متصلاً مذکور ہے، جس میں ارشاد ہے: "فاذا اتی سیدہ السوق فھو بالخیار" یعنی جب "مال مجلوب" کا مالک شہر میں آجائے اور بھاؤ معلوم کرے تو پھر اس کو عقد کے رد کرنے میں اختیار ہے چاہے برقرار رکھے اور چاہے فسخ کردے۔ (المغنی: ۴/۱۵۲)

حنفیہ کے نزدیک مالک کو کوئی خیار حاصل نہیں، اس لئے کہ جو ضرر اس کو لاحق ہوا وہ اس کا اپنا قصور ہے کہ قیمت کے سلسلے میں اس نے مشتری کی بات پر اعتماد کیا ہے حالانکہ مشتری کا نصب العین تو قیمت کو کم کرنا ہی ہوتا ہے۔ (مبارق الازہار: ۱/۲۳۳)

اور ظاہر ہے کہ مشتری کے دھوکہ دینے سے خیار ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ کے لئے شارع علیہ السلام نے شرط لگانے کے بغیر خیار ثابت نہیں کیا، لہٰذا یہاں بھی شرط کے بغیر خود بخود خیار ثابت نہیں ہوگا۔

حدیث کا جواب حنفیہ کی طرف سے ایک تو یہ ہے کہ یہ حدیث متروک الظاہر ہے، اس لئے کہ ظاہر حدیث کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کو ہر حال میں خیار حاصل ہوگا، حالانکہ اگر خرید و فروخت بازار کی قیمت کے موافق ہو یا اس سے بھی زیادہ قیمت پر ہو تو اس صورت میں ان حضرات کے نزدیک بھی خیار نہیں ہوگا، لہٰذا یہ حدیث احناف کے خلاف حجت نہیں۔ (اعلاء السنن: ۱۴/۱۸۹)

دوسرے یہ کہ یہ حدیث سیاست پر محمول ہے، خیار کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سیاست کیا ہے تا کہ لوگ اس عمل سے باز آجائیں اور ان کو خوف ہو کہ بائع کو جب خیار ہے تو وہ مال واپس لے سکتا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس حدیث کو دیانت پر محمول کیا ہے نہ کہ قضاء پر، اسلئے کہ دھوکہ دینے والے

پر دیانۃً یہ لازم ہے کہ بیع فسخ کردے یا جب مشتری تقاضا کرے تو یہ اقالہ کرے۔(تکملہ فتح الملہم:۳۳۳/۱)

البیع علی بیع البعض

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے سے کوئی چیز خیار شرط رکھ کر خریدے اور تیسرا کوئی آدمی آجائے اور مشتری سے کہے کہ تم اس عقد کو فسخ کردو، میں اس جیسی چیز اس سے کم قیمت پر یا اس سے اچھی چیز اسی قیمت پر تمہیں دونگا۔

اسی کے حکم میں "شراء علی شراء البعض" بھی داخل ہے اور وہ یہ ہے کہ خیار بائع نے رکھا ہے، اب تیسرا کوئی شخص آتا ہے اور بائع سے کہتا ہے کہ تم یہ چیز اس مشتری کو نہیں بیچو میں اس قیمت سے زیادہ پر خریدلوں گا، یہ دونوں صورتیں حدیث کی وجہ سے ممنوع ہیں، لیکن بیع ہوجائے گی، اگرچہ ایسا عمل کرنے میں کسی ایک کو نقصان ہے۔(المغنی:۱۴۹/۴)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے اور یہ اس وقت ہے جبکہ بیچنے والا اور خریدار کسی ایک قیمت پر متفق ہوگئے ہوں اور عقد بیع کی طرف مائل ہوگئے ہوں، لہٰذا اب کسی تیسرے کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اس چیز کو لینے کا ارادہ کرے اور زیادہ دام لگا کر ان کا معاملہ خراب کرے۔(اکمال المعلم:۱۷۸/۴)

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی آنے والی حدیث میں ارشاد ہے: **"ولا یسم المسلم علی سوم اخیہ"** [اور کوئی مسلمان کسی مسلمان کے بھاؤ پر بھاؤ نہ لگائے۔]

بعض حضرات نے اس حکم کو لفظ **"مسلم"** اور **"اخ"** کی وجہ سے مسلمان کے ساتھ خاص کیا ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس حکم میں مسلمان کے علاوہ ذمی اور مستامن بھی داخل ہیں، البتہ چونکہ اکثر معاملات مسلمانوں کے آپس میں ہوتے ہیں اس لئے غالب عادت کی بنیاد پر لفظ **"مسلم"** اور **"اخ"** ذکر کیا گیا ہے، یہ کوئی احترازی قید نہیں۔(ابی شرح مسلم:۱۷۸/۴، مرقاۃ:۶۷/۶، فتح الباری:۳۵۳/۴)

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وذکر الاخ فی الحدیث لیس قیدا بل لزیادۃ التنفیر لان السوم علی السوم یوجب

ایحاشا و اضرار او هو فی حق الاخ اشد منعا"

حدیث میں بھائی کا ذکر آیا ہے کیونکہ دوسرے کے بھاؤ پر بھاؤ کرنا باعث وحشت اور ضرر رہے اور ظاہر ہے کہ بھائی کے حق میں اس کی ممانعت اور زیادہ ہے، جیسا کہ غیبت کے بارے میں کہا ہے: "**ذکرک اخاک بمایکرہ**" اپنے بھائی کا ایسا ذکر کرنا جس کو وہ پسند نہیں کرتا۔ اور ظاہر ہے کہ غیبت صرف مسلمان کی ممنوع نہیں بلکہ ذمی کی غیبت بھی ناجائز ہے۔ (فتاویٰ شامیہ:۱۴۸/۴)

واضح رہے کہ نہی اس صورت میں ہے جب کہ بائع اور مشتری کے درمیان ثمن متعین ہو جائے اور دونوں عقد بیع کی طرف مائل ہو جائیں، لیکن تعیین ثمن سے پہلے اور عقد کی طرف میلان سے پہلے اگر کوئی تیسرا آجائے اور بھاؤ لگائے تو یہ ممنوع نہیں جیسا کہ "**خطبة علی الخطبة**" اس وقت ممنوع ہے جبکہ عورت کی طرف سے پہلے آدمی کی طرف میلان ظاہر ہو جائے اور اگر میلان ظاہر نہ ہو تو پھر ممانعت نہیں۔ (عمدۃ القاری:۲۵۷/۱۱)

اس بیع سے نہی کا مقصد کراہت بیع ہے، اگر کسی نے ایسا کیا تو بیع صحیح اور تام ہوگئی، البتہ دوسرا آدمی جو بھاؤ لگانے والا ہے گنہگار ہوگا، اور اہل ظاہر کے نزدیک بیع ہی منعقد نہیں جبکہ مالکیہ اور حنابلہ سے فساد اور عدم فساد دونوں قسم کی روایات منقول ہیں۔ (فتح الباری:۳۵۴/۴)

ولا تناجشوا: "**نجش**" **بفتح النون و سکون الجیم،** لغت میں شکار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف برانگیختہ کرنے اور بھگانے کے معنی میں مستعمل ہے، بعض نے فریب اور دھوکہ دینے کے معنی اور بعض نے رغبت دلانے اور بیجا تعریف کرنے کے معنی بیان کئے ہیں اور اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ صرف مشتری کو دھوکہ دینے کے لئے اور اس کو سودے کی طرف زیادہ راغب کرنے کے لئے زیادہ ثمن کی پیش کش کرنا حالانکہ خود خریدنے کا ارادہ نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیم حربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نجش یہ ہے کہ وہ شخص جس کا خریدنے کا ارادہ نہیں مبیع کی زیادہ قیمت لگائے یا مبیع کی خوب تعریف کرے تا کہ اس کے علاوہ کوئی اور گراں قیمت میں خریدنے کیلئے تیار ہو جائے۔ (تاج العروس من جواہر القاموس:۳۵۴/۴)

اور اس کو نجش اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں مشتری کی رغبت کو ابھارنا ہے اور سامان کی قیمت کو

بڑھانا ہے یا اس بنیاد پر کہ اس میں سامان تجارت کی مبالغہ آمیز تعریف ہوتی ہے۔(فتح الباری: ۴/۳۵۴)

اور یا اس لئے کہ اس میں دھوکہ ہوتا ہے اور نجش بھی اصل میں دھوکہ کو کہتے ہیں، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "وھو خداع باطل" (عمدۃ القاری: ۱۱/۲۶۳)

حکم اس کا یہ ہے کہ نجش بالاجماع حرام ہے، اگر ناجش نے بائع کو بتائے بغیر اپنی طرف سے یہ عمل کیا ہے تو صرف وہی گنہگار ہوگا اور اگر دونوں کی موافقت سے یہ کام ہوا تو دونوں گنہگار ہونگے۔(فتح الباری: ۴/۳۵۴)

البتہ اگر کسی بائع کو مال فروخت کرنے میں دھوکہ ہوتا ہو اور لوگ اس سے قیمت مثل سے کم پر خریدتے ہوں تو اس صورت میں اگر کوئی نجش کرے صرف اس لئے کہ فروخت کرنے والے کو دھوکہ نہ ہو اور اس کا مال صحیح قیمت پر بک جائے تو یہ جائز ہے، بلکہ باعث اجر ہے کہ ایک مسلمان بھائی دھوکہ سے محفوظ رہا، یعنی بائع اور مشتری کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔(ابی شرح مسلم: ۴/۱۸۱)

بیع نجش کا حکم

جو بیع نجش کے طریقے سے منعقد ہو جائے حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک بیع صحیح ہے، البتہ فعل حرام کے ارتکاب کی وجہ سے گناہ ہوگا۔ جبکہ اہل ظواہر اور ایک روایت میں امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ علیہما کے نزدیک بیع باطل ہے۔(عمدۃ القاری: ۱۱/۲۶۲)

یہ حضرات فساد کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نجش سے نہی فرمائی ہے اور نہی عقد کے فساد کو مقتضی ہے۔

ہمارا استدلال اس سے ہے کہ نہی کا تعلق ناجش سے ہے نہ کہ عاقد سے، لہٰذا عقد بیع میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور پھر افعال شرعیہ سے نہی خود اس فعل کی صحت کی دلیل ہے، لہٰذا نہی کی وجہ سے کراہیت آتی ہے نہ کہ فساد، البتہ ہمارے نزدیک اس بیع کو دیانۃً فسخ کرنا واجب ہے تاکہ گناہ کے ارتکاب سے بچ جائے۔

ولا یبیع حاضر لباد: اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں:

(۱)……شہری آدمی زیادہ قیمت ملنے کے لالچ میں اپنا مال دیہاتیوں کے علاوہ دوسروں پر نہ بیچے، صاحب ہدایہ نے یہی مطلب بیان کیا ہے اور نہی کو اس صورت کے ساتھ خاص کیا ہے جبکہ شہر والے تکلیف اور قحط سالی میں ہوں۔

(۲)……جمہور فقہاء اور محدثین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ شہری دیہاتی سے یہ کہے کہ تم اپنا مال خود نہیں بیچو، میرے پاس چھوڑ جاؤ، میں تم سے زیادہ ماہر ہوں، بڑی آسانی کے ساتھ گراں نرخ پر بیچ دوں گا، تو گویا کہ عقد بیع میں وہ شہری دیہاتی کا وکیل بن جاتا ہے۔ (اعلاء السنن: ۱۸۸/ ۱۴)

دونوں تفسیروں میں فرق یہ ہے کہ پہلی تفسیر میں حاضر اور شہری اپنے مال کا بائع ہے اور دیہاتی ''بادی'' اس کا خریدار ہے، جبکہ دوسری تفسیر میں بائع اور فروخت کرنے والا دیہاتی ہے اور حاضر اس کا وکیل ہے۔

لفظ حدیث کے اعتبار سے دوسری تفسیر راجح ہے، کیونکہ لفظ ''بیع'' کو ''لام'' کے واسطے سے متعدی کیا ہے، جو توکیل کے معنی میں ظاہر ہے، لہٰذا ''لا یبیع حاضر لباد'' کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی شہری دیہاتی کا وکیل بن کر اس کا مال فروخت نہ کرے اور اسی معنی کا استنباط امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی کیا ہے، جس میں ارشاد ہے: ''دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض'' (طحاوی شریف: ۲۲۱/ ۲، مسلم شریف: ۴/ ۲) [لوگوں کو چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ ان میں بعض کو بعض سے رزق پہنچائے۔]

اگر پہلی تفسیر مراد ہوتی اور حدیث کا مطلب یہ ہوتا کہ کوئی شہری دیہاتی کے ہاتھ مال نہ بیچے تو لفظ ''بیع'' کو ''من'' کے واسطے سے متعدی کیا جاتا اور یوں کہا جاتا: ''لا یبیع حاضر من باد''

حکم

جمہور کی تفسیر کے مطابق حنفیہ کے نزدیک یہ بیع اس وقت مکروہ ہے جبکہ شہر والوں کو ضرر ہو اور وہ اس لئے کہ دیہاتی اگر خود بیچتا تو وہ سستے داموں بیچتا اور مخلوق خدا کو فائدہ ہوتا اور شہری کے بیچنے سے

لوگوں پر تنگی ہوگی، چونکہ وہ مہنگا بیچے گا، اس تنگی اور ضرر کی وجہ سے اس بیع میں کراہت آتی ہے، لہٰذا حنفیہ کے نزدیک اگر ضرر نہ ہو تو کراہت بھی نہیں ہوگی۔

حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ نہی معلول ہے علت ضرر کے ساتھ، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ارشاد ہے، جو اس روایت کے بعد فصل اول ہی میں مذکور ہے: **"دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض"** [لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ کسی کے ذریعہ کسی کو رزق پہنچائے۔]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیع فی حد ذاتہٖ ممنوع نہیں، بلکہ دفع ضرر کی وجہ سے ممنوع ہے۔

لہٰذا جب ضرر منتفی ہوگا تو اس بیع کی ممانعت بھی منتفی ہو جائے گی، بلکہ یہ ایک قسم کی خیر خواہی ہوگی کہ دیہاتی آدمی کو نقصان ہوتا ہو اور وہ خرید و فروخت کے معاملات سے ناواقف ہو اور کوئی شہری اس کا وکیل بن جائے اور مناسب دام پر اس کا مال لوگوں کے ہاتھ فروخت کرے، جس میں لوگوں کو نقصان بھی نہیں ہوگا اور دیہاتی کا فائدہ ہو جائے گا اور خیر خواہی کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے: "الدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" (اعلاء السنن: ١٤/١٧٩) [دین خیر خواہی ہے۔]

حنفیہ کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی تخریج سعید بن منصور نے اپنی سنن میں کی ہے، جس میں ارشاد ہے: **"انما نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبیع حاضر لباد لانہ اراد ان یصیب المسلمون غرتھم فاما الیوم فلا بأس"** (الفتح: ٤/٢٧١) یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہری کو دیہاتی کے مال بیچنے سے اس لئے منع فرمایا تاکہ تمام مسلمان اس عمدہ مال سے مکمل فائدہ حاصل کر سکیں، لیکن اب چونکہ تجارت میں وسعت ہو چکی ہے اور بیع حاضر لباد سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لہٰذا آج اس عمل کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حکم انعقاد

بیع کے انعقاد اور صحت کے بارے میں حنیفہ، شافعیہ، مالکیہ اور ایک روایت میں امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حدیث کی مخالفت کر کے اس طرح عقد کرتا ہے تو اس کا عقد صحیح اور تام ہو جائے گا، البتہ وہ مخالفت حدیث کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

جبکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ دوسری روایت کے مطابق ابن حزم اور بعض اہل ظاہر کے نزدیک ظاہری نہی کی وجہ سے بیع باطل ہوتی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک اس بیع میں بھی دیانۃً فسخ ضروری ہے تاکہ ارتکاب معصیت سے بچے۔(فتح الملہم:۶/۳۳۶/۱)

مصراۃ کی تفصیل

ولا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعها بعد ذلک فھو بغیر النظرین: "**مصراۃ**" اسم مفعول ہے، تصریہ سے اور تصریہ کے اصل معنی روکنے کے ہیں، جیسے کہ پانی روکنے کے لئے "صریت الماءَ" بولا جاتا ہے۔

اور اس کی اصطلاحی تعریف حضرات فقہاء نے یوں کی ہے: "**التصریۃ ھی حبس اللبن فی الضروع حتی یجتمع اللبن فیکثر فیظن المشتری ان ذلک عادۃ الحیوان فیرغب فی الشراء**" اور بعض حضرات نے مدت حبس کو متعین ذکر فرمایا ہے، چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**وھی ربط ضرع الناقۃ او الشاۃ وترک حلبھا لیومین او الثلاثۃ حتی یجتمع اللبن**" (رد المحتار علی الدر المختار:۴/۱۰۷)

یعنی اونٹنی، بکری وغیرہ کے تھنوں میں دو تین دن تک دودھ روک لیا جائے تاکہ تھنوں میں دودھ زیادہ جمع ہو جائے اور مشتری یہ گمان کرے کہ زیادہ دودھ دینا اس جانور کی عادت ہے اور وہ اس کے خریدنے کی طرف راغب ہو۔

اس عمل کو تصریہ اور ایسے جانور کو مصراۃ کہا جاتا ہے، نیز تصریہ پر تحفیل اور مصراۃ پر محفلۃ کا اطلاق بھی ہوتا ہے، کیونکہ "تحفیل" کے معنی ہیں: "تجمیع" یعنی جمع کرنا اور یہاں بھی دودھ جمع کیا جاتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: "ضرع حافل ای عظیم"

حدیث کے اس آخری حصہ میں تصریہ کے عمل کو ناجائز قرار دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص حدیث کی مخالفت کر کے ایسا عمل کرے اور خریدار کو دھوکہ ہو جائے تو پتہ چلنے کے بعد خریدار کو اختیار ہے۔ یا تو اس جانور کو اپنے پاس اسی حالت میں رکھ لے اور اگر چاہے تو جانور کو واپس کر دے اور ساتھ

ایک صاع تمر بھی بائع کو دے۔ (مرقاۃ: ۵۷/۶)

ظاہر حدیث دو اجزاء پر مشتمل ہے:

☆......ایک تو یہ کہ تصریہ ایک عیب ہے، لہٰذا مشتری کو خیار عیب حاصل ہے، پتہ چلنے کے بعد وہ جانور کو رد کرنے کا مجاز ہے۔

☆......دوسرا یہ کہ دوہے ہوئے دودھ کے بدلے میں ایک صاع کھجور مشتری بائع کو دے۔

ائمہ ثلاثہ اور جمہور نے پہلے جزء پر تو اتفاق کیا ہے کہ تصریہ ایک عیب ہے، جس کی وجہ سے جانور کو واپس کیا جا سکتا ہے، جبکہ دوسرے جزء میں اختلاف ہے، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے جزء میں بھی حدیث پر عمل کیا ہے کہ ''لبن محلوب'' کے بدلے میں ایک صاع کھجور دینا متعین ہے، کوئی اور چیز نہیں دی جائے گی چاہے دودھ کم ہو یا زیادہ ہو۔

جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دوسرے جزء میں تاویل کر کے فرماتے ہیں کہ ایک صاع غالب قوت البلد سے دیا جائے گا، یعنی جو چیز اس علاقے میں غالب طور پر بطور غذا کے استعمال ہوتی ہو اسی کا ایک صاع دیا جائے گا۔ اور حدیث میں تمر کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ تمر اس وقت غالب قوت البلد تھی، کسی اور خصوصیت کی بناء پر تمر کا ذکر نہیں ہوا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳۴۰/۱)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ دوسرے جزء میں تاویل کر کے فرماتے ہیں کہ ''لبن محلوب'' کی قیمت دی جائے گی، چاہے جتنی ہو، اس لئے کہ اصل ضمان تو قیمت ہے، اور چونکہ اس وقت دودھ کی قیمت غالب طور پر ایک صاع تمر کے برابر ہوتی تھی، اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاع تمر کی تعیین فرمائی اور جب قیمتوں میں تغیر آ گیا تو حکم اصل قیمت کی طرف راجع ہوگا نہ کہ ایک صاع کی طرف۔

البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر حدیث پر عمل نہیں کیا اور دونوں جزؤں میں تاویل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ تصریہ کوئی ایسا عیب نہیں جس کی وجہ سے جانور ''مبیع'' کو رد کیا جا سکے، البتہ مشتری کو یہ حق حاصل ہے کہ جانور میں جو نقصان آیا ہے اس کی قیمت بائع سے وصول کرے، حضرات طرفین کا ظاہر حدیث پر عمل نہ کرنا اور تاویل کرنا محض قیاس کی وجہ سے نہیں، جیسا کہ مخالفین کا یہی پروپیگنڈہ ہے کہ امام صاحب صحیح حدیث کو قیاس کی وجہ سے ترک کرتے ہیں، بلکہ تاویل اس وجہ سے کی

گئی ہے کہ حدیث کا ظاہر ان اصول مسلمہ کلیہ کا معارض ہے جو کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے ثابت ہیں۔(فیض الباری مع الحاشیۃ:۲۲۹/۳)

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

"فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ" (البقرۃ:۱۹۴)

[پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے زیادتی تم پر کی ہے۔]

"وَجَزَاءُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (الشوریٰ:۴۰)

[اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔]

اور "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ" (النحل:۱۲۶)

[اور اگر بدلہ لو تو اسی قدر لو جس قدر تم کو تکلیف پہنچائی جائے۔]

ان نصوص سے صراحۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہلاک شدہ چیز کا جو ضمان دیا جاتا ہے وہ ضمان اس کے مساوی ہونا چاہئے، اور ظاہر ہے کہ حدیث مذکور میں تاویل کے بغیر یہ مساوات ممکن نہیں، جبکہ حنفیہ کے مسلک میں مساوات ہے کہ جو نقصان آیا ہے اس کے مثل صوری کے ساتھ ذوات الامثال میں یا مثل معنوی کے ساتھ ذوات القیم میں رجوع کرے۔

اسی طرح حدیث میں ارشاد ہے: "الخراج بالضمان" خراج کے لغوی معنی نفع کے ہیں، یعنی جو چیز جس آدمی کے ضمان اور ذمہ داری میں ہو اس کا نفع اسی شخص کا ہوگا جو اس کا ضامن ہے اور یہی ائمہ فقہ کا متفقہ ضابطہ ہے۔(شرح معانی الآثار:۲۲/۲، فیض الباری مع الحاشیۃ البدر الساری:۲۳۱/۳)

مثلاً کسی نے کوئی چیز خریدی اور اس پر قبضہ کرلیا، اب یہ اس کی ملکیت ہے اور اس کے ضمان میں ہے، اگر ہلاک ہو جائے تو اسی کا نقصان ہوگا، لہٰذا اس کے منافع بھی اسی کے لئے ہوں گے، یہاں بھی مشتری نے جو جانور کا دودھ استعمال کیا ہے وہ شرعاً اسی کی ملکیت ہے، کیونکہ جانور اس کا ہے اگر ہلاک ہو جائے تو بالاجماع مشتری کا نقصان شمار ہوتا ہے، تو پھر اسی دودھ کے عوض تمر یا گندم کی ادائیگی کا کیا مطلب؟ نیز اگر اس مصراۃ کو چند دن رکھ کر تصریہ کے علاوہ کسی اور عیب کی وجہ سے رد کیا جائے تو شافعیہ کے نزدیک بھی اس کے دودھ کے بدلے میں کوئی چیز نہیں دی جائے گی اور اس بات

کی تائید اس ضابطہ سے بھی ہوتی ہے۔

الغُرمُ بِالْغُنَمِ: یعنی فائدہ اور تاوان دونوں ساتھ ساتھ ہیں اور ظاہر بات ہے کہ مسئلہ مذکورہ میں مصراۃ واپس کرنے سے پہلے اس کا نقصان اور غرم چونکہ مشتری پر تھا، اس لئے اس کا غنم یعنی دودھ بھی اسی کا ہوگا، لہٰذا کوئی چیز بھی بدلے میں نہیں دی جائے گی، کیونکہ اس نے اپنی مملوک چیز کو استعمال کیا ہے۔ نیز اجماع سے بھی یہ ثابت ہے کہ ضمان کی دو قسمیں ہیں:

☆……ایک مثل صوری کے ساتھ۔

☆……دوسری مثل معنوی کے ساتھ، یعنی "ضمان بالقیمۃ"

ظاہر ہے کہ دودھ کے بدلے میں کھجور کا دینا نہ ضمان بالمثل کے قبیل سے ہے اور نہ ضمان معنوی "ضمان بالقیمۃ" کے قبیل سے ہے۔

کھجور کا مثل نہ ہونا تو ظاہر ہے اور کھجور کا ضمان بالقیمۃ نہ ہونا اس لئے ہے کہ ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاع کھجور بدلے میں دی جائے گی خواہ دودھ کم ہو یا زیادہ، اگر کھجور دودھ کے لئے قیمت ہوتی تو دودھ کی کمی بیشی سے کھجور میں کمی بیشی آنی چاہئے، حالانکہ ایک صاع کھجور دینا ہی متعین ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دودھ کی قیمت نہیں۔

اسی طرح قیاس کے رو سے بھی مصراۃ کا رد کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر مصراۃ کے رد کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو وہ دودھ جس کو مشتری نے استعمال کیا ہے اس کے دو حصہ ہیں، ایک تو وہ جو بوقت بیع جانور کے تھنوں میں ہوتا ہے اور ایک حصہ وہ جو بیع کے بعد تھنوں میں پیدا ہوا ہے، اب اگر مصراۃ کو رد کیا جائے تو بائع دودھ کے پہلے حصہ کا مستحق ہے، اس لئے وہ بیع کا جزء ہے اور مشتری دوسرے حصہ کا مستحق ہے، اس لئے کہ اس کی ملکیت اور ضمان میں وہ دودھ پیدا ہوا ہے، اگر مشتری دونوں حصوں کی قیمت ادا کرے گا تو اس میں مشتری کو نقصان ہوگا، کیونکہ وہ اپنے حصہ کی قیمت بھی ادا کر رہا ہے، جس کا وہ خود مستحق ہے اور اگر دونوں کی قیمت ادا نہ کرے تو اس میں بائع کا نقصان ہے، کیونکہ بائع مبیع کا مستحق ہے بجمیع اجزائھا اور دودھ کا پہلا حصہ مبیع کا جزء ہے اس کی قیمت دی جانی چاہئے اور اگر صرف اس حصہ کی قیمت ادا کرے جو بوقت بیع تھنوں میں تھا تو اس میں اگرچہ نقصان کسی کا نہیں لیکن ایسا ہو نہیں سکتا،

کیونکہ دونوں حصوں کی مقدار مجہول ہے، متعین نہیں اور پھر کسی جزء کے الگ معاوضہ دینے میں عقد کی تجزی لازم آتی ہے جو اصول شرعیہ کے منافی ہے۔

لہٰذا جب تینوں احتمالات باطل ہیں تو معلوم ہوا کہ مصراۃ کا تصریہ کی وجہ سے رد کرنا باطل ہے، بلکہ مشتری اس نقصان کی تلافی کے لئے بائع سے زائد قیمت واپس لے گا، عیب تصریہ معلوم ہونے کے بعد اس جانور کی قیمت لگائی جائے گی اور وہی قیمت بائع کو ملے گی جو تصریہ کے بغیر اس کی قیمت ہونی چاہئے، اس سے زیادہ حصہ جو بائع نے بذریعہ تصریہ دھوکہ دے کر زیادہ وصول کیا ہے مشتری کو واپس دیا جائے گا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳۴۲/۱، اعلاء السنن: ۵۶/۱۴)

فھو بالخیار ثلاثۃ ایام: جو حضرات خیار عیب کے قائل ہیں ان میں سے بعض حضرات نے اس کی مدت تین دن متعین کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے تین دن اس لئے متعین کئے ہیں کہ تین دن گذرنے سے پہلے عیب تصریہ کا پتہ نہیں چلتا، کیونکہ پہلے دن تو وہی دودھ ہوگا جو تصریہ کی وجہ سے تھنوں میں ہے، دوسرے دن ہوسکتا ہے دودھ میں کمی تبدیلی مکان کی وجہ سے یا چارہ کی تبدیلی کی وجہ ہو، اسی طرح تیسرے دن اور جب تین دن گذر گئے تو واضح ہوا کہ تصریہ ہے اور مشتری کو علی الفور اختیار حاصل ہے، اگر اس کے بعد مشتری نے اس کو اپنے پاس رکھا اور واپس نہیں کیا تو پھر اختیار ختم ہو جائے گا، البتہ تین دن کے گذرنے سے پہلے اختیار نہیں ہوگا۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اختیار تین دن کے ساتھ مقید نہیں بلکہ جب پتہ چل جائے کہ تصریہ ہے تو فوری طور پر اختیار حاصل ہے، چاہے تین دن سے پہلے ہو یا تین دن کے بعد ہو، البتہ چونکہ عموماً تین دن سے پہلے پتہ نہیں چلتا، اس لئے حدیث شریف میں تین دن کا ذکر آیا ہے، لہٰذا تین کے ساتھ تقیید مقصود نہیں۔ (شرح ابی: ۱۸۷/۴)

حنفیہ کے نزدیک حدیث شریف کی توجیہ

حضرات حنفیہ میں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا تعلق خیار شرط سے ہے، نہ کہ خیار عیب سے اور مطلب یہی ہے کہ جب مشتری اپنے لئے خیار کی شرط لگائے تو اس کو واپس

کرنے کا حق ہے اور تصریہ کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا کہ عیب تصریہ کی وجہ سے خیار ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ عیب تصریہ سبب اور داعی خیار ہے اور دلیل اس پر یہ ہے کہ آگے روایت میں خیار کو تین دن کے ساتھ مقید کیا ہے، حالانکہ خیار عیب کے لئے کوئی مدت نہیں بلکہ اس کا مدار عیب کے معلوم ہونے پر ہے، تو اس تقیید سے معلوم ہوا کہ یہ خیار شرط ہے، البتہ کھجور یا گندم کا ضمان میں دینا بطور صلح کے ہے، قضاء تمر یا گندم کا دینا ضروری نہیں۔ (مبسوط للسرخسی: ۱۳/۳۸)

اور محدث العصر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دیانت پر محمول ہے، کیونکہ تصریہ کا عمل ایک دھوکہ ہے، لہٰذا بائع پر دیانۃً یہ لازم ہے کہ مشتری کے ساتھ اقالہ کرے تاکہ وہ دھوکہ سے حتی الامکان محفوظ رہ سکے۔

لہٰذا حنفیہ کے نزدیک حدیث پر دیانۃً عمل ہوگا، قضاءً نہیں ہوگا، اور کھجور وغیرہ کا ضمان میں دینا مصالحت پر مبنی ہوگا، قضاء کی وجہ سے دینا لازم نہیں۔

(فیض الباری: ۳/۲۳۱ نفحات التنقیح: ۳/۴۵۴)

ایضاً

{۲۷۲۳} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقَّاهُ فَاشْتَرٰى مِنْهُ فَاِذَا اَتٰى سَيِّدُهُ السُّوْقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۴، باب تحریم تلقی الجلب، حدیث نمبر: ۱۵۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غلہ لانے والوں سے آگے بڑھ کر ملاقات نہ کرو، سو اگر کسی نے اس سے ملاقات کی اور پھر اس سے خرید لیا تو وہ اس غلّہ کا مالک اگر بازار میں آئے (اور بھاؤ میں فرق پائے) تو اس کو اختیار ہوگا۔ (کہ اس عقد کو باقی رکھے یا اس کو فسخ کردے)

تشریح: تفصیل مفصلاً اوپر گذر چکی۔

منڈی اور بازار میں لایا جائے

{۲۷۲۴} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَلَقُّوْا السِّلَعَ حَتّٰی یُھْبَطَ بِھَا اِلَی السُّوْقِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف:۲۸۹/۱،باب النھی عن تلقی الرکبان، حدیث نمبر:۲۱۶۷،مسلم شریف:۴/۲، باب تحریم تلقی الجلب، حدیث نمبر:۱۵۱۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: آگے بڑھ کر سامان (لانے والوں) سے ملاقات نہ کرو، یہاں تک کہ اس کو بازار میں لاکر اتارا جائے۔

تشریح: السلع: سلعۃ کی جمع ہے،بھا:ضمیر برائے سلع اور باءحرفِ جر برائے تعدیہ،سامان اور وہ مال جو برائے تجارت ہو،مقصد بیان اس کا بھی وہی ہے جو گذشتہ روایات میں معلوم ہو چکا ہے۔

یھبط: مضارع مجہول یعنی جب تک بازار اور منڈی میں تجارتی اموال نہ آ جائے اس وقت تک باہر جا کر ان سے ملاقات نہ کی جائے، احادیث مبارکہ میں وارد شدہ کلمات ایک دوسرے کی تفسیر اور تشریح کرتے ہیں۔(تعلیق:۳۲۱/۳)

درمیان عقد میں خریداری نہ کی جائے

{۲۷۲۵} **وَعَنْہُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَبِیْعَ الرَّجُلُ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْہِ وَلَا یَخْطُبُ عَلٰی خِطْبَۃِ اَخِیْہِ اِلَّا اَنْ یَّأْذَنَ لَہٗ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۳/۲، باب تحریم بیع الرجل علی بیع اخیہ، حدیث نمبر:۱۴۱۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشادفرمایا: اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح نہ دے، مگر یہ کہ وہ اس کو اجازت دے۔

تشریح: لا یبیع الرجل الخ: اس کے دو مطلب ہیں:

(۱)......ایک شخص سے کوئی دوسرا آدمی کوئی چیز خرید رہا ہے تو دوسرا شخص کہنے لگے کہ میرے یہاں سے اس سے کم میں خرید لے۔

(۲)......ایک آدمی کوئی شی خرید رہا ہے تو دوسرا شخص کہنے لگے کہ مجھے اس سے زیادہ قیمت پر دیدے، یہ دونوں ناجائز ہیں۔

بعض مالکیہ، حنابلہ، ظاہریہ کے نزدیک یہ بیع اگر کرلی ہے تو جائز ہے۔

اس کے اندر اختلاف ہے کہ "علی بیع اخیہ" کے اندر "اخ" کا مصداق کون ہے؟

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ صرف مسلمان ہے، جمہور کے نزدیک عام ہے مسلمان اور کافر سب کو شامل ہے۔

اور اسی طرح نکاح کے پیغام (منگنی) کے درمیان دخیل نہ ہو۔ "الا ان یأذن له" البتہ اگر شخص اول دوسرے کو معاملہ کرنے کی (بخوشی) اجازت دے دے تو خریداری، فروختگی اور پیغام نکاح درست ہوگا۔

بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے

{۲۷۲۶} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَسِمُ الرَّجُلُ عَلٰى سَوْمِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ۔ (مسلم شریف)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۳، باب تحریم بیع الرجل علی بیع اخیہ، حدیث نمبر: ۱۵۱۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا: کہ اپنے بھائی کی قیمت پر قیمت نہ لگائے کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے

سودے پر سودانہ کرے۔

تشریح: لا یسم الرجل الخ: گذشتہ حدیث کے مفہوم کے ہی مطابق یہ بھی ہے، فقط کلمات کا فرق ہے۔"سودے پر سودا نہ کرے" دخیل نہ ہو جب کہ عقد کی تکمیل قریب ہے، یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ بیچنے والا اور خریدار دونوں کسی ایک قیمت پر راضی ہو گئے ہوں، لہٰذا اب کسی اور کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو لینے کا ارادہ کرے اور زیادہ دام لگا کر ان کا معاملہ خراب کرے ایسا کرنا مکروہ ہے، اگر چہ بیع صحیح ہو جائے گی۔

شہری آدمی کا دیہاتی آدمی کے مال کو فروخت کرنا

{۲۷۲۷} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَبِیْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعُوْا النَّاسَ یَرْزُقُ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ مِنْ بَّعْضٍ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۴، باب تحریم بیع الحاضر للبادی، حدیث نمبر: ۱۵۲۲۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شہری دیہاتی کے لئے فروخت نہ کرے، تم لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے (کے واسطہ سے) رزق عطا فرماتا ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ شہری کو دیہاتی کے لئے دلال نہیں بننا چاہئے، دیہاتی دیہات سے جو مال شہر میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں تو چونکہ شہر میں ان کے قیام کی کوئی جگہ باقاعدہ نہیں ہوتی تو وہ اس شی کو "بسعر الیوم" فروخت کر کے چلے جاتے ہیں، یعنی اس چیز کا اس روز منڈی میں جو بھی بھاؤ ہوتا ہے، اور چونکہ منڈی میں اشیاء کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اس لئے کوئی شہری اپنے واقف دیہاتی سے یہ کہے کہ تو اپنا یہ سامان میرے پاس رکھ دے جس روز منڈی کا بھاؤ مناسب ہوگا اس وقت میں اس کو تیری طرف سے فروخت کر دوں گا تو اس میں اگر چہ اس دیہاتی کا تو فائدہ ہے، لیکن عام لوگوں کا نقصان ہے، اس لئے شریعت نے انفرادی فائدہ پر اجتماعی فائدہ کو ترجیح دیتے ہوئے ایسا

کرنے سے منع کیا ہے۔

لا بیع حضار لباد و ذروا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض: یعنی ان دیہاتیوں کو چھوڑو اور جس طرح وہ معاملہ از خود کریں شہر والوں سے سستا یا مہنگا جیسے بھی ہو کرنے دو۔ اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

مذاہب ائمہ

اب یہ کہ یہ ممانعت کس صورت میں ہے؟ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ کراہت مطلقاً ہے، بشرطیکہ وہ چیز لوگوں کی عام حاجت وضرورت کی ہو، اور بشرط العلم بالنہی۔

اور حنفیہ کے نزدیک ایک تو شرط یہی ہے کہ وہ چیز ایسی ہو کہ "**مایحتاج الیہ اھل المصر**" اور دوسرے یہ کہ زمانہ غلاء اور گرانی کا ہو۔ "**عندنا مختص بزمن الغلاء وبما یحتاج الیہ اھل المصر**"

تیسرا مذہب اس میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا ہے کہ یہ کراہت اور نہی اس صورت میں ہے جب کہ وہ شہری یہ کام کچھ اجرت (کمیشن) لے کر کرے۔ **والا فلا یکرہ**۔ اسی لئے انہوں نے باب قائم کیا ہے: "**وھل یبیع حاضر لباد بغیر اجر وھل یعینہ او ینصحہ**" اور پھر تعلیقاً یہ حدیث ذکر کی۔ "**وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا استنصح احدکم اخاہ فلینصح لہ ورخص فیہ عطاء**"

[حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں کوئی شخص جب اپنے بھائی سے نصیحت طلب کرے تو چاہئے کہ وہ اس کو نصیحت کرے اور اس میں کچھ عطا کرنے کی بھی رخصت فرمائی ہے۔]

شراح نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہی لکھا ہے کہ کراہت اجرت کی صورت میں ہے ورنہ پھر اس میں کوئی کراہت نہیں، بلکہ وہ تو باب نصیحت سے ہے، ہاں اجرت لینے کی صورت میں نصیحت نہیں بلکہ خودغرضی ہے۔ (الدر المنضود: ۵/۳۸۴)

بیع ملامسہ وبیع منابذہ کا حکم

{۲۷۲۸} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ نَھٰی

رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ لِبْسَتَیْنِ وَعَنْ بَیْعَتَیْنِ نَھٰی عَنِ الْمُلَامَسَۃِ وَالْمُنَابَذَۃِ فِی الْبَیْعِ وَالْمُلَامَسَۃُ لَمْسُ الرَّجُلِ ثَوْبَ الْاٰخَرِ بِیَدِہٖ بِاللَّیْلِ اَوْ بِالنَّھَارِ وَلَا یُقَلِّبُہٗ اِلَّا بِذٰلِکَ وَالْمُنَابَذَۃُ اَنْ یَّنْبِذَ الرَّجُلُ اِلَی الرَّجُلِ بِثَوْبِہٖ وَیَنْبِذَ الْاٰخَرُ ثَوْبَہٗ وَیَکُوْنُ ذٰلِکَ بَیْعَھُمَا مِنْ غَیْرِ نَظْرٍ وَلَا تَرَاضٍ وَاللِّبْسَتَیْنِ اِشْتِمَالُ الصَّمَّاءِ وَالصَّمَّاءُ اَنْ یَّجْعَلَ ثَوْبَہٗ عَلٰی اَحَدِ عَاتِقَیْہِ فَیَبْدُوْ اَحَدُ شِقَّیْہِ لَیْسَ عَلَیْہِ ثَوْبٌ وَاللِّبْسَۃُ الْاُخْرٰی اِحْتِبَاءُہٗ بِثَوْبِہٖ وَھُوَ جَالِسٌ لَیْسَ عَلٰی فَرْجِہٖ مِنْہُ شَیْءٌ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲/۸۶۵، کتاب اللباس، باب اشتمال الصمائ، حدیث نمبر: ۵۵۹۱، مسلم شریف: ۲/۲، باب ابطال بیع الملامسۃ والمنابذۃ، حدیث نمبر: ۱۵۱۲۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا دوطرح کے لباس کو (پہناوا) اور دوقسم کی بیع سے منع فرمایا، بیع ملامسہ اور منابذہ سے، اور ملامسہ (کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی شخص کا دوسرے کے کپڑے کو ہاتھ سے چھو دینا خواہ رات میں یا دن میں (یعنی بغیر دیکھے ہوئے) اور نہ وہ اس کپڑے کو الٹ پلٹ کرے، مگر فقط لمس ہی کرے، اور منابذہ (کی صورت یہ ہوتی ہے) کہ ایک شخص اپنے کپڑے کو دوسرے شخص کی طرف پھینک دے اور دوسرا شخص اپنا کپڑا اس کی طرف پھینک دے اور بس یہی ان دونوں کے درمیان بیع ہو بغیر دیکھے (اور غور وفکر کے بغیر) اور باہم بلا رضامندی کے، اور دو قسم کے پہناوے (اور وہ یہ ہیں) بصورت صماء کپڑا پہننا، اور صما (کی صورت یہ ہے) کہ ایک مونڈھے پر کپڑا ڈالا جائے اور ایک جانب اس کی کھلی ہوئی رہے جس پر کپڑا نہ ہو، اور دوسری قسم کا لباس (اور پہناوا کہ) آدمی کا اپنے کپڑے سے گوٹھ مارنا ہے اور وہ شخص اس طرح بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی شرمگاہ پر کپڑا بالکل نہ ہو (شرمگاہ دکھائی دے)۔

تشریح: اس حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوطرح کے پہناوے سے اور دو طرح کی بیع سے منع کیا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

دوطرح کی بیع سے مراد "ملامسہ" اور "منابذہ" ہے اور یہ دونوں زمانہ جاہلیت کی بیوع میں سے ہیں۔

"ملامسہ" باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور لمس سے ماخوذ ہے، جس کے معنی چھونے کے ہیں، زمانہ جاہلیت میں اس بیع کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی چیز کو خریدنے کے لئے مثلاً کپڑا خریدنے جاتا تو کپڑے کو ہاتھ لگا دیتا اور ہاتھ لگاتے ہی یہ سمجھا جاتا تھا کہ بیع تام ہوگئی، نہ تو آپس میں قولی ایجاب اور قبول ہوتا تھا کہ "بعت و اشتریت" کے الفاظ ہوتے اور نہ ہی فعلی لین دین یعنی تعاطی ہوتی کہ دکاندار برضاء ورغبت خاموشی کے ساتھ وہ چیز دیتا اور خریدار اس کی قیمت ادا کر دیتا، بلکہ بیع کو ہاتھ سے چھو دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔

"بیع ملامسہ" کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں:

چنانچہ مغرب میں ملامسہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "اذا لمست ثوبک و لمست ثوبی فقد وجب البیع" کہ بائع یا مشتری ایک دوسرے سے کہے کہ جب میں آپ کے کپڑے کو ہاتھ لگاؤں اور آپ میرے کپڑے کو ہاتھ لگائیں تو بیع لازم ہو جائے گی۔

(عمدۃ القاری: ۱۱/۲۶۶، المغرب فی ترتیب المعرب: ۲/۲۴۹)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ بائع یا مشتری ایک دوسرے سے کہے: "أبیعک ھذا المتاع بکذا فاذا لمستک وجب البیع" اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نقل کیا ہے کہ بائع یا مشتری ایک دوسرے سے کہے: "أبیعک ثوبی بثوبک" اور ایک دوسرے کے کپڑے کو نہ دیکھے، بلکہ ہاتھ لگائے۔

"منابذۃ" نبذ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی پھینکنے کے ہیں۔

"بیع منابذۃ" میں بھی ایجاب اور قبول نہ قولی ہوتا اور نہ فعلی بلکہ صرف پھینکنا ہی بیع ہے، اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دونوں عاقدین میں سے کوئی ایک دوسرے کی طرف کپڑا یا ثمن کو پھینک دیتا تو بیع تام ہو جاتی تھی، یا بیع کو لازم کرنے کے لئے کوئی کنکری پھینک دیتا، جب وہ لگ جاتی تھی خواہ بائع اور مشتری میں سے کسی کو لگے یا مبیع کو تو بیع لازم سمجھی جاتی تھی، کسی کو دیکھنے بھالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، چنانچہ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے بیع منابذہ کی یہی تفسیر نقل فرمائی ہے اور اس کو "بیع الحصاۃ" کی نظیر قرار دیا ہے۔ (معالم السنن: ۵/۴۶)

یہ بھی ایام جاہلیت میں رائج بیع کا ایک طریقہ تھا اور اس کی ممانعت کی وجہ وہی ہے جو ''ملامسہ'' میں گذرگئی۔کہ بیع مجہول ہے اور تراضی مفقود ہے۔(عمدۃ القاری:۲۶۷/۱۱)

اور دوطرح کے لباس پہننے سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے، جس میں ایک اشتمال الصماء ہے، ''صمّاءَ'' بفتح الصاد وتشدید المیم ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ایک مونڈھے پر اس طرح کپڑا ڈال دے کہ اس کی دوسری جانب جس پر کپڑا نہ ہو ظاہر و برہنہ رہے۔جس میں بے پردگی ظاہر ہے اس لئے اس سے منع فرمایا۔

اور ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص کپڑا لے کر سر سے پاؤں تک اپنے بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ دونوں ہاتھ بھی اس کے اندر لپٹے رہیں اور جسم کہیں سے بھی کھلا نہ رہے، تمام منافذ بند ہوں چونکہ اس طرح آدمی مفلوج و ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ تمام منافذ اور پورا بدن چھپ جاتا ہے اس وجہ سے اس کو ''صمائ'' کہا گیا، جیسا کہ ''الصخرۃ الصمائ'' اس چٹان کو کہتے ہیں جس میں کوئی شگاف نہ ہو۔دوسرا پہناوا جس سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا یہ ہے کہ کوئی شخص کولہوں پر بیٹھ جائے اور دونوں زانو کو کھڑا کرے اور پھر اپنے زانو اور کمر کے گرد کوئی کپڑا اس طرح لپیٹ لے کہ ستر کھلا رہے، آنحضرت ﷺ نے اس سے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں پردہ پوشی نہیں ہوتی۔لہٰذا اگر کوئی ایسی صورت اختیار کرے جس میں ستر چھپا رہے تو پھر یہ ممانعت نہیں رہے گی، بلکہ احتباء کی شکل اختیار کرنا اور زانو کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا کر بیٹھنا مسنون ہے۔(طیبی:۷۳/۳،مرقاۃ:۷۷/۶،نفحات التنقیح:۴۵۴/۳)

بیع حصاۃ وبیع غرر کی ممانعت

{۲۷۲۹} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۲/۲، باب بطلان بیع الحصاۃ، حدیث نمبر:۱۵۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا

ہے حصاۃ (والی) بیع اور بیع غرر سے۔

تشریح: ”بیع حصاۃ“ بھی جاہلیت کی بیوع میں سے ہے۔”حصاۃ“ کنکری کے معنی میں ہے، اس کی صورت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتائی ہے کہ مشتری بائع سے کہے کہ جب میں تیری طرف کنکری پھینک دوں تو بیع لازم ہوگی۔

یا بائع مشتری سے کہے کہ تمہاری کنکری جس ”مبیع“ پر لگ جائے وہ میں نے تمہیں بیچ دی یا جہاں تک کنکری پہنچ جائے وہاں تک زمین تمہاری ہوگی۔

چونکہ اس بیع میں نفس کنکری پھینکنے کو بیع قرار دیا ہے اور مبیع بھی مجہول ہے، لہٰذا دھوکہ اور فریب کی وجہ سے اس بیع کو حرام قرار دیا گیا ہے۔(مرقاۃ:۷۷/۶، طیبی:۷۳/۶)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بیوع ”منابذہ، ملامسہ اور بیع الحصاۃ“ پر بیع تعاطی کو بھی قیاس کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان بیوع کے فساد کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ ایجاب اور قبول سے خالی ہیں، لہٰذا ان پر تعاطی کو بھی قیاس کیا جائے گا، کیونکہ وہ بھی ایجاب اور قبول سے خالی ہے۔

ہماری طرف سے جواب یہ ہے کہ بیع تعاطی کا ان بیوع پر قیاس کرنا قیاس فاسد ہے، اس لئے کہ ان بیوع میں عدم جواز کی وجہ جہالت مبیع، عدم تراضی اور دھوکہ ہے، جبکہ تعاطی میں نہ جہالت ہے اور نہ کوئی دھوکہ ہے اور بیع بھی رضامندی سے ہے تو گویا کہ ایجاب قبول لفظی نہیں فعلی ہے، جبکہ ایجاب اور قبول لفظی شرط بھی نہیں، بلکہ رضامندی شرط ہے اور بیع میں عرف کا اعتبار ہے، اگر بیع میں ایجاب اور قبول کا لفظی طور پر ہونا شرط ہوتا تو بیع جیسے عموم البلویٰ والے معاملے کے بارے میں عام اور واضح طور پر اس کو بتایا جاتا، جبکہ بیع تعاطی خیر القرون کے عرف سے آج تک بلانکیر لوگوں کا معمول ہے۔(المغنی:۴/۴)

وعن بیع الغرر: ”غرر“ ”الغین والراء الاولیٰ“ دھوکہ دہی کے معنی میں اور یہ تعمیم بعد التخصیص ہے، جس میں ہر طرح کی ناجائز و فاسد بیوع آجاتی ہیں، کیونکہ وہ تمام بیوع جو شرعاً ناجائز ہیں ان میں کسی نہ کسی طرح کا فریب پایا جاتا ہے اور یہ ایک عام ضابطہ ہے جس میں عاقدین کے لئے ایک قاعدہ متعین کیا گیا ہے کہ دھوکہ کے ساتھ بیع نہ کریں۔

”بیع غرر“ میں چونکہ عموم ہے، لہٰذا اس میں ہر وہ بیع داخل ہے جس میں ”مبیع“ مجہول ہو یا بائع

کی قدرت سے باہر ہو، جیسے مچھلی کی بیع جو دریا میں ہو یا فضاء میں اڑنے والے پرندے کی بیع یا معدوم کی بیع یا وہ مبیع اس طرح ہے کہ اس کی تسلیم پر بائع قادر نہیں، مثلاً عبد آبق کی بیع۔

ان تمام بیوع کے درمیان ما بہ الاشتراک جہالت مبیع یا بائع کا مبیع کی تسلیم پر قادر نہ ہونا ہے۔

لیکن یہ بات واضح رہے کہ اگر جہالت معمولی ہے تو اس کی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوگی، البتہ اگر جہالت زیادہ ہو اور مفضی الی النزاع ہو تو پھر بیع فاسد ہوگی۔ چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اجمع المسلمون علی جواز اشیاء فیھا غرر حقیر" یعنی اس بات پر اجماع ہے کہ معمولی دھوکہ کی وجہ سے بیع کو فاسد نہیں کہا جائے گا جیسا کہ اجارہ ہوتا ہے، مثلاً کسی چیز کو ایک مہینے تک اجارہ پر دیتے ہیں، حالانکہ کبھی مہینہ تیس دن کا ہوتا اور کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے، اس طرح رقم دے کر حمام میں غسل بالاتفاق جائز ہے، لوگوں کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے، بعض لوگ زیادہ پانی استعمال کرتے ہیں اور بعض کم اسی طرح بعض زیادہ وقت لگاتے ہیں بعض کم۔ (شرح نووی: ۲/۲)

اسی طرح آج کل کے دور میں بڑے ہوٹلوں میں مختلف قسم کے کھانے مختلف برتنوں میں رکھے جاتے ہیں، اور لینے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ جتنا کھائے اور جس چیز سے کھائے، لیکن رقم متعین لیتے ہیں تو قیاس کی رو سے جائز نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ کھانوں کی مقدار مجہول ہے، البتہ چونکہ جہالت یسیرۃ ہے اور اس پر تعامل اور عرف جاری ہے، یہ مفضی الی النزاع نہیں، اس لئے عدم جواز کا حکم نہیں لگتا۔

اور اسی کے حکم میں آج کل گاڑیوں کا سفر بھی ہے کہ نہ مسافت سفر معلوم ہوتی ہے اور نہ ہی ابتداء سفر میں کرایہ متعین ہوتا ہے، البتہ چونکہ میٹر کے بتائے ہوئے کرایہ پر سواری اور گاڑی والے کا اتفاق ہوتا ہے، اسلئے مفضی الی النزاع نہ ہونے کی وجہ سے جہالت مفسد نہیں۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳۲۰/ انفحات التنقیح: ۷/۴۵۷/۳)

بیع حبل الحبلہ کی ممانعت

{۲۷۳۰} وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ حَبَلِ الْحَبَلَۃِ وَکَانَ بَیْعًا یَتَبَایَعُہٗ اَھْلُ الْجَاھِلِیَّۃِ کَانَ الرَّجُلُ یَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ اَنْ تُنْتَجَ النَّاقَۃُ ثُمَّ تُنْتَجُ الَّتِیْ فِیْ بَطْنِھَا۔

(مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲۸۷/۱، باب بیع الخمار و حبل الحبلة، حدیث نمبر: ۲۰۹۶، مسلم شریف: ۲/۲، باب تحریم بیع حبل الحبلة، حدیث نمبر: ۱۵۱۴۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے حاملہ کے حمل کی بیع سے اور وہ ایک قسم کی بیع تھی کہ دورِ جاہلیت کے لوگ اس کی خرید وفروخت کرتے تھے، (جس کی تشریح یہ ہے کہ) ایک شخص اونٹ خریدکرتا یہاں تک کہ اونٹنی بچہ جنے پھر وہ حمل جنے جو اس کے پیٹ میں ہے۔

تشریح: "حبل" بفتح الحاء و الباء، مصدر ہے، مجہول کے معنی میں، یعنی جنا ہوا بچہ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "حبلت المرأة تحبل حبلا ای حملت جنینا"

اور لفظ "حبلہ" جمع ہے حابل کی، جیسے ظلمة جمع ہے ظالم کی۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳۲۱/۱)

اس بیع کی تفسیر میں علماء کے متعدد اقوال ہیں:

(۱)......ثمن مؤجل کے ساتھ بیع ہو اور اس کا وقت یہ مقرر کیا جائے کہ فلاں اونٹنی کا حمل جب بڑا ہو کر حاملہ ہو جائے اور پھر بچہ دے اس وقت مبیع کا ثمن ادا کروں گا، یہ تفسیر خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

(۲)......ثمن مؤجل کے ساتھ بیع ہو اور اس کا وقت یہ مقرر کیا جائے کہ فلاں حاملہ اونٹنی بچہ دے اس وقت ثمن اور قیمت ادا کروں گا، گویا کسی جانور کے وضع حمل کو ادائیگی ثمن کے لئے معیار مقرر کیا جائے۔ یہ تفسیر حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، چنانچہ بخاری شریف میں تصریح ہے: "فسرہ نافع الی ان تنتج الناقة ما فی بطنھا"

(۳)......ثمن مؤجل کے ساتھ بیع ہو اور ادائیگی ثمن کا وقت یہ مقرر کیا جائے کہ جب فلاں حاملہ اونٹنی بچہ جن لے اور پھر وہ بڑا ہو کر حاملہ ہو جائے اس وقت ثمن ادا کی جائے گی، یہ تفسیر بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے متبادر ہے جو مسلم میں مذکور ہے۔

یہ تینوں صورتیں بالاجماع ممنوع ہیں، کیونکہ اس میں اجل مجہول ہے۔

(۴)......حبل سے مراد بچہ اور حبلہ سے مراد حاملہ ہے، یعنی حاملہ جانور کے بچہ کو بیچنا کہ جب یہ اونٹنی بچے دے تو یہ مشتری کا ہوگا، اور ابھی تک وہ بچہ اس کے پیٹ میں ہے، یا حبل اور حبلہ دونوں سے مراد جنین اور بچہ ہو، یعنی جانور کے حمل کے حمل کو بیچنا کہ مالک خریدار سے یوں معاملہ کرے کہ اس اونٹنی کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہوگا اور وہ بچہ اونٹنی بن کر جو بچے دے گی وہ بچہ اتنی قیمت پر میں بیچتا ہوں۔(تکملہ فتح الملہم:۱/۳۲۱)

ظاہر ہے کہ یہ صورت بالاجماع حرام اور ناجائز ہے، کیونکہ یہ بیع المعدوم ہے، جو کہ بوجہ ارشاد نبوی "لا تبع ما لیس عندک" [جو چیز تمہارے پاس نہیں اس کو مت بیچو۔] حرام ہے۔ اسی طرح اس بیع میں غرر اور دھوکہ بھی ہے جس کے متعلق ارشاد ہے: "نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع الغرر" (مسلم شریف:۲/۲،نفحات التنقیح:۳/۴۵۸)[حضرت رسول اللہ ﷺ نے بیع الغرر (دھوکہ والی بیع) سے منع فرمایا ہے۔]

عسب الفحل کی ممانعت

{۲۷۳۱} **وَعَنْهُ** قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ۔ (رواه البخاری)

حواله: بخاری شریف: ۱/۳۰۵، باب عسب الفحل، حدیث نمبر: ۲۲۲۹۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے نر کے جفت کرانے (کی قیمت) سے۔

تشریح: فحل: یعنی نر جانور مطلقاً فرساً کان او جملاً او تیساً۔

اور "عسب" بمعنی "ماء الحیوان" اور اس کا ضراب یعنی جفتی دونوں معنی لکھے ہیں، اور حدیث الباب میں ہے "نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن عسب الفحل" یہاں پر عسب کا مضاف محذوف ہے، یعنی "عن کراء عسب الفحل" یعنی نر کی جفتی کی اجرت لینے سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا، اور کہا گیا ہے کہ عسب کا اطلاق اجرتِ ضراب پر بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس صورت میں حذف

مضاف ماننے کی حاجت نہ ہوگی، جمہور علماء اور ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہی ہے کہ نر کو جفتی کیلئے کرایہ پر دینا حرام ہے، کیونکہ اس میں غرر ہے، اسلئے کہ نر کبھی جفتی کرتا ہے، کبھی نہیں کرتا، کبھی اس سے علوق یعنی حمل ٹھہرتا ہے، کبھی نہیں ٹھہرتا، نیز ماء الفحل یعنی اس کی منی مال غیر متقوم ہے، اجرت لینے کی صورت میں گویا اس کی بیع ہے جو فاسد ہے، ہاں عاریت پر فحل دینا چاہئے یہ مندوب الیہ ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے: "ومن حقھا اطراق فحلھا" لیکن اس میں امام مالک علیہ الرحمۃ کا اختلاف منقول ہے، بایں طور کہ مدت ضراب کو معین کر دیا جائے، مثلاً ساعت یا نصف ساعت تو اس پر جو اجرت لی جائے گی وہ ثمن ماء کے طور پر نہیں بلکہ آپ نے اپنا جانور دوسرے کے کام کے لئے مدت معینہ کے لئے دیا ہے، یہ اس کی اجرت ہے، عند الجمہور اجرت پر دینا تو ممنوع ہے، لیکن مستعیر بطور کرامت کے اگر کچھ دے تو اس کا لینا جائز ہے۔ (الدر المنضود: ۹/۳۷۹/۵)

پانی بیچنے کی ممانعت

{۲۷۳۲} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ وَعَنْ بَيْعِ الْمَاءِ وَالْاَرْضِ لِتَحْرُثَ۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱۸/۲، باب تحریم بیع فضل الماء الذی یکون بالفلاۃ، حدیث نمبر: ۱۵۶۴۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اونٹ کے جفت کرانے کے عقد (یعنی اجرت طے کرنے) سے اور پانی اور زمین کاشت کے لئے فروخت کرنے سے (یعنی مالک زمین اپنی زمین اور پانی برائے کاشت بٹائی پر دے)

تشریح: اس حدیث شریف میں اس بات کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کو جفتی کے لئے کرایہ پر دینے اور اپنی زمین کو کاشت کرنے لئے بیچنے سے منع فرمایا۔

اسی طرح اس روایت سے پہلی والی روایت میں ارشاد ہے: "نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن عسب الفحل"

"عسب الفحل الناقۃ یعسبھا عسبا" اسی طرح "ضرب الفحل الناقۃ ضرابا" بولتے ہیں، یہ اطلاق نر جانور کی جفتی کے لئے ہوتا ہے۔ اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ نر جانور خواہ اونٹ ہو خواہ گھوڑا ہو، خواہ کوئی اور جانور ہو، اس کو مادہ پر چھوڑنے کے لئے کسی کو بطور کرایہ دینا اور اس کی اجرت وصول کرنا منع ہے، کیونکہ اجارہ میں تعیین عمل اور عمل کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے، جبکہ یہاں عمل اور مقدار مجہول ہے، اور اس میں دھوکہ ہے، کیونکہ ایسے کام کی اجرت لی جاتی ہے جس کا وقوع پذیر ہونا متیقن نہیں ہوتا، چنانچہ نر جانور کبھی جست کرتا ہے، اور کبھی جست نہیں کرتا، اسی طرح مادہ کبھی بار آور ہوتی ہے اور کبھی بار آور نہیں ہوتی۔

اسی وجہ سے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فقہاء نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور بعض حضرات نے انقطاع نسل کے خطرے سے اس کو جائز قرار دیا ہے اور اس کو قیاس کیا ہے رضاعت اور پیوندکاری کی اجرت پر، اور نہی کو تحریم پر نہیں بلکہ تنزیہ پر حمل کیا ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: چونکہ بقاء نسل مطلوب بالذات ہے اور ضرورت کی چیز ہے اس لئے اس اجارہ کو جہالت یسیرہ کی وجہ سے حرام نہیں کہا جائے گا۔

البتہ عاریۃً جانور کا دینا مستحب ہے اور عاریت کی صورت میں اگر "مستعیر" عاریت پر لینے والے نے اپنی طرف سے بطریق انعام کچھ دے دیا تو اس اکرام کا قبول کرنا درست ہے۔ (طیبی: ۶/۷۵)

"وعن بیع الماء والارض لتحرث" یہاں پانی اور زمین کے بیچنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی دوسرے کو زمین اور پانی اس شرط پر دے کہ زمین اور پانی میرا ہے بیج اور محنت تمہاری ہوگی اور زمین کی پیداوار آپس میں تقسیم کریں گے، مثلاً آدھا حصہ یا ایک تہائی میں لے لوں گا۔ اور باقی تمہارا ہوگا، مخابرہ کی صورت ہے، جس کی تفصیل اس باب کی فصل اول میں گذر چکی ہے۔ (مرقاۃ: ۶/۷۸، نفحات التنقیح: ۳/۴۵۹)

ایضاً

{۲۷۳۳} **وَعَنْهُ** قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ. (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۱۸، باب تحریم بیع فضل الماء، حدیث نمبر: ۱۵۶۴۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نے زائد پانی کو فروخت کرنے سے منع فرمایا۔

تشریح: قد مرّ تشریح الحدیث۔

تالاب اور کنویں وغیرہ کا پانی فروخت کرنا درست نہیں

{۲۷۳۴} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یُبَاعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِیُبَاعَ بِهِ الْکَلَاءُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱۰۳۰/۲، باب ما یکرہ من الاحتیال فی البیوع، حدیث نمبر: ۶۹۶۳، مسلم شریف: ۱۹/۲، باب تحریم بیع فضل الماء، حدیث نمبر: ۱۵۶۴۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: زائد پانی فروخت نہ کیا جائے تاکہ فروخت کی جائے اس بناء پر گھاس۔

پانی کی قسمیں اور ان کے احکام

تشریح: پانی کی کئی قسمیں ہیں، ایک وہ پانی ہے جو بالاجماع کسی کی ملکیت نہیں، بلکہ مباح ہے، سب اس کو استعمال کر سکتے ہیں، جیسے دریاؤں وغیرہ کا پانی، جس کے استعمال سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا اور نہ بیچا جا سکتا ہے۔ دوسرا وہ پانی جو بالاجماع مملوک ہے، جیسے ماءِ محرز یعنی جو برتنوں وغیرہ میں جمع کر لیا گیا ہو اس کو بیچا جا سکتا ہے۔

تیسرا وہ پانی ہے جس کے مملوک ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے، جیسے کنویں اور چشمے کا پانی، جن حضرات کے نزدیک یہ پانی مملوک ہے ان کے نزدیک اس کا بیچنا بھی جائز ہے اور جن کے نزدیک مملوک نہیں ان کے نزدیک بیچنا بھی جائز نہیں۔ (اعلاء السنن: ۱۴/۱۵۷)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ حدیث میں ''عام پانی'' مراد نہیں، بلکہ ''خاص پانی'' مراد ہے، یعنی وہ

پانی جو مملوک نہیں ہے اس کا بیچنا جائز نہیں ۔ (بحوالہ بالا)

اور فضل کی قید احترازی نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ پانی اپنی ضرورت سے زائد نہ ہو تو بیچ سکتے ہیں، اور اگر ضرورت سے زائد ہو تو نہیں بیچ سکتے، بلکہ زیادت تقبیح کے لئے اس قید کا اضافہ کیا گیا ہے کہ غیر مملوک پانی کا بیچنا تو ویسے ہی جائز نہیں اور اگر ضرورت سے بھی زائد ہو تو اس کی بیع کی قباحت میں مزید اضافہ ہوگا۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث شریف کا مطلب یہ بتایا ہے کہ کوئی شخص کسی غیر آباد زمین میں کنواں کھودے اور آباد کرنے کی وجہ سے اس زمین کا مالک بن جائے، پھر لوگ اس زمین کے گھاس میں اپنے جانوروں کو چرائیں اور ظاہر ہے کہ جانوروں کو چرنے کے بعد پانی کی ضرورت ہوتی ہے، اب اگر ان کو بلا قیمت پانی پینے نہ دیا جائے تو وہ شخص مجبوری کی وجہ سے پانی خریدے گا اس لئے کہ پانی کے بغیر جانوروں کا چرانا ممکن نہیں، اس طرح پانی کا بیچنا دراصل گھاس کا بیچنا ہوگا اور گھاس کا بیچنا جائز نہیں، لہٰذا اس آدمی پر یہ لازم ہے کہ کنویں کے پانی سے جو ضرورت سے زائد ہو بلا قیمت ان لوگوں کو دے اور ان کو تنگی میں نہ ڈالے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے اس نہی کو تحریم پر حمل کیا ہے اور بعض حضرات نے تنزیہ پر، زیادہ صحیح یہی ہے کہ نہی تنزیہی ہے ۔ (مرقاۃ:۶/۷۹، طیبی:۶/۷۷)

اسی طرح بعض روایات میں الفاظ اس طرح وارد ہیں: **"لا یمنع فضل الماء لیمنع بہ الکلا"**

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی صورت کو راجح قرار دیا ہے۔

اس روایت میں لام عاقبت کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد پانی کے استعمال سے کسی کو نہ روکو، کیونکہ پانی سے روکنا نتیجہ کے اعتبار سے گھاس سے روکنا ہوگا اور یہ اس آدمی کے حق میں ہے جو کسی غیر آباد زمین میں کنواں کھودے اور پھر وہاں سے لوگوں کو پانی سے منع کرے تاکہ وہ گھاس سے منع ہو جائیں ۔ (التعلیق:۳/۳۲۴)

فریب دینا اور عیب چھپا کر فروخت کرنا حرام ہے

{۲۷۳۵} **وَعَنْهُ** اَنَّ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ

عَلٰی صُبْرَةِ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ یَدَهٗ فِیْهَا فَنَالَتْ اَصَابِعُهٗ بَلَلًا فَقَالَ: مَا هٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟ قَالَ: اَصَابَتْهُ السَّمَاءُ یَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: اَفَلَا جَعَلْتَهٗ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰی یَرَاهُ النَّاسُ؟ مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱/۷۰، کتاب الایمان، باب قول النبی من غشنا فلیس منا، حدیث نمبر: ۲۰۲،

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غلہ کی ایک ڈھیری کے پاس سے گذرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ڈھیری میں اپنا دست مبارک داخل فرمایا (تاکہ اندرونی دانوں کا حال معلوم ہو) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کو تری محسوس ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: اے غلہ کے مالک! یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس پر بارش پڑگئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو پھر تم نے اس کو غلہ کے اوپر کیوں نہ ڈال دیا تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیں، جس شخص نے دھوکہ دیا (اور خیانت کی) تو وہ میرے میں سے نہیں۔ (یعنی میرے طریقہ پر نہیں)

تشریح: ظاہر حدیث سے معلوم ہورہا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کو دھوکہ دے وہ جماعت مسلمین ہی سے خارج ہے، حالانکہ غش کی وجہ سے اسلام سے تو خارج نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی تاویل کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو مسلمان دوسروں کو دھوکہ دے وہ ہمارے طریق پر نہیں ہے، اور ہماری سیرت پر نہیں ہے۔ (الدرالمنضود: ۵/۳۸۹)

الفصل الثانی

استثناء مجہول فی البیع

{۲۷۳۶} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَہٰی عَنِ الثُّنْیَا اِلَّا اَنْ یُّعْلَمَ۔ (رواہ الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/ ۲۴۲، باب ماجاء فی النھی عن الثنیا، حدیث نمبر: ۱۲۹۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نے منع فرمایا: استثناء (فی البیع) کرنے سے، مگر یہ کہ مقدار معلوم ہو۔

تشریح: تفصیل فصل اول میں گذر چکی۔

انگور کی فروختگی تیگری کے بعد

{۲۷۳۷} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ نَہٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الْعِنَبِ حَتّٰی یَسْوَدَّ وَعَنْ بَیْعِ الْحَبِّ حَتّٰی یَشْتَدَّ۔ (ھٰکَذَا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ) وَلَیْسَ عِنْدَھُمَا بِرِوَایَتِہٖ نَہٰی عَنْ بَیْعِ التَّمَرِ حَتّٰی تَزْھُوَ اِلَّا بِرِوَایَۃِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ نَہٰی عَنْ بَیْعِ التَّمَرِ حَتّٰی تَزْھُوَ۔ (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ) وَالزِّیَادَۃُ الَّتِیْ فِی الْمَصَابِیْحِ وَھِیَ قَوْلُہٗ نَہٰی عَنْ بَیْعِ التَّمَرِ حَتّٰی تَزْھُوَ اِنَّمَا ثَبَتَ فِیْ رِوَایَتِہِمَا عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ: نَہٰی عَنْ بَیْعِ النَّخْلِ حَتّٰی تَزْھُوَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۳۲، باب ماجاء فی کراھۃ بیع الثمرۃ قبل ان یبدو صلاحھا، حدیث نمبر: ۱۲۲۸،

ابو داؤد شریف: ۲/۴۷۸، باب فی بیع الثمار قبل ان یبدو صلاحھا، حدیث نمبر: ۳۳۷۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا انگور کی بیع سے یہاں تک کہ سیاہ ہوجائیں اور غلہ کی بیع سے یہاں تک کہ (دانہ) سخت ہوجائے (اس حدیث کو امام ترمذیؒ، ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہما نے اسی طرح نقل کیا ہے) اور ان دونوں کی روایت میں "نھی عن بیع التمر حتی تزھو" نہیں ہے البتہ بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہے۔ "قال نھی الخ" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نقل کیا کہ کھجوروں کی بیع سے منع فرمایا، یہاں تک کہ وہ خوش رنگ ہوں (تیاری کے قریب ہوں)۔ (ترمذی، ابوداؤد بروایت انسؓ)

اور جو زیادتی مصابیح کی روایت میں ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "نھی عن بیع التمر حتی تزھو" یہ عبارت ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہما ثابت ہے۔ "قال نھی عن بیع النخل حتی تزھو" اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کی پوری تفصیل فصل اول میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔ البتہ روایت کے آخر میں مؤلف مشکوۃ نے مصابیح کے مؤلف امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ پر کی نقل کردہ روایت پر اشکال فرمایا ہے۔

(۱)…… یہ کہ روایت مذکورہ بالا میں مزید الفاظ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بتائے ہیں جب کہ یہ الفاظ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔

(۲)…… یہ کہ انہوں نے ان مزید الفاظ میں بیع التمر نقل کیا ہے جب کہ اصل روایت میں بیع النخل ہے۔

بیع الکالی بالکالی کی ممانعت

{۲۷۳۸} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْكَالِئِ بِالْكَالِئِ۔ (رواہ الدار قطنی)

حوالہ: دار قطنی: ۲/۵۳، حدیث نمبر: ۳۰۴۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع

فرمایا ادھار کی بیع ادھار کے عوض۔

تشریح: کالئ: ہمزہ کے ساتھ مستعمل ہے۔ "کلأ" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی تاخیر کے ہیں۔ "کلأالدین کلوا اذاتأخر"

اسی طرح "کلأته انسأته" ادھار دینے کے بعد میں مستعمل ہے اور تخفیفاً بغیر ہمزہ کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ (طیبی: ٩٧/٦)

حدیث شریف میں ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً الف ب سے کوئی چیز ایک متعین مدت کے وعدے پر خریدے اور طے ہو جائے کہ خریدار "الف" اس چیز کی قیمت جب فلاں متعین مدت کے آنے پر ادا کرے گا تو بیچنے والا "ب" وہ چیز "مبیع" اسے دیدے گا، مگر جب متعین تاریخ آجائے اور اس وقت بھی خریدار "الف"، قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بیچنے والے "ب" سے کہے کہ اب اس چیز کو ایک اور مدت کے لئے کچھ زیادہ قیمت پر فروخت کر دو، مثلاً پہلے دس میں بیچی تھی اب گیارہ روپئے میں بیچ دو اور فلاں متعین مدت کے آنے پر میں قیمت ادا کروں گا، اور بیچنے والا "ب" راضی ہو جائے اور کہہ دے کہ میں نے بیچ دی اس طرح ان کا معاملہ آپس کے قبضہ کے بغیر طے ہو جائے، یہ "بیع قبل القبض" کہلاتی ہے، نہ تو مبیع پر قبضہ ہوا نہ قیمت پر، بلکہ مبیع بائع کے پاس رہے اور قیمت مشتری کے پاس رہے اور خرید و فروخت کا معاملہ طے ہو جائے۔ (مرقاة: ٨٠/٦)

بعض حضرات نے اس کی ایک اور صورت بیان کی ہے کہ مثلاً "الف" کے پاس "ب" کا ایک متعین کپڑا ہے اور "الف" کے ذمہ "ج" کے دس روپئے ہیں، اب "ب" "ج" سے یہ کہے کہ میرا کپڑا "الف" کے پاس ہے اور تمہارے دس روپئے بھی اس کے پاس ہیں، تم بجائے روپئے کے اس سے میرا کپڑا لے لو اور میں بجائے کپڑے کے اس سے تمہارے دس روپئے لے لوں گا، اس طریقے سے میں آپ کے ہاتھ وہ کپڑا بیچتا ہوں جو میرا "الف" کے پاس ہے ان دس روپئے کے عوض میں جو آپ کے الف پر واجب ہیں۔

اب "ج"، جب "ب" کے اس عقد کو منظور کرے گا تو یہ بیع قبل القبض ہو جائے گی جو کہ ناجائز ہے۔ (مظاہر حق: ١٠٦/٣، نفحات التنقیح: ٤٦١/٣)

بیعانہ کا حکم

{۲۷۳۹} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ۔ (رواه مالك وابوداؤدوابن ماجة)

حوالہ: موطا امام مالک: ۲۵۰، باب ماجاء فی بیع العربان، ابو داؤد شریف: ۲/۴۹۴، باب فی العربان، حدیث نمبر: ۳۵۰۲، ابن ماجہ شریف: ۱۵۸، باب بیع العربان، حدیث نمبر: ۲۱۹۲۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد و دادا روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا عربان کی بیع سے۔

تشریح: لفظ "عربان" کے اندر مختلف لغات ہیں، بعض شراح نے چھ لغات ذکر کئے ہیں۔ عُرْبَان، اُرْبَان، عُرْبُوْن، اُرْبُوْن میں ضم حرف اول اور سکون ثانی کے ساتھ، اسی طرح دو لغت مزید عَرَبُوْن، اَرَبُوْن، پہلے دو حرفوں کے فتحے کے ساتھ۔

اور یہ سب نام ہیں اس چیز کے جو چیز مشتری بائع کو اسی "بیع عربان" کے اندر دیتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ مشتری بائع سے کوئی چیز خریدے اور بائع کو کوئی چیز دے کر یہ طے کر دے کہ اگر معاملہ مکمل ہو گیا تو یہ چیز قیمت میں مجرا ہو جائے گی یعنی اس کے بقدر قیمت میں کمی ہو گی اور اگر معاملہ مکمل نہ ہوا تو پھر وہ مشتری کی دی ہوئی چیز بائع ہی کے پاس رہے گی واپس نہیں ہو گی۔ (مرقاۃ: ۶/۸۰)

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرات فقہاء کے نزدیک یہ بیع ناجائز ہے، اس لئے کہ اس میں شرط بھی ہے اور غرر "دھوکہ" بھی ہے اور اس میں بائع مشتری کا مال بغیر کسی حق کے باطل طریقے سے کھاتا ہے، لہٰذا اگر ایسا عقد ہو جائے تو اس کا فسخ کرنا ضروری ہے، البتہ اگر فسخ نہیں کیا تو بیع نافذ ہو جائے گی، کیونکہ یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور تابعین کی ایک جماعت اس کے جواز کے قائل ہیں، لیکن بیع کے نفاذ کے ساتھ "عربان" وہ چیز جو بائع کو دی گئی ہے مشتری کو واپس کی جائے گی تاکہ غیر کا مال باطل طریقے سے استعمال نہ ہو۔ (اعلاء السنن: ۱۴/۱۶۶)

جو حضرات جواز کے قائل ہیں انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ کے فرمان سے استدلال کیا ہے، چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جواز کی روایت نقل کی ہے، اسی طرح حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے:

''انه سئل رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم عن العربان فی البیع فأحله''

(اعلاء السنن: ۱۶۶/۱۴) [حضرت رسول پاک ﷺ سے بیع میں بیعانہ کے بارے میں سوال کیا گیا، آنحضرت ﷺ نے اس کو حلال فرمایا۔]

حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ جواب میں فرماتے ہیں کہ اولاً تو جواز کی کوئی روایت صحیح نہیں، سب میں کلام ہے، پھر اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو وہ اس پر محمول ہے کہ اگر بیع تام ہوگئی تو ''عربان'' کے بقدر بائع کو قیمت کم دی جائے گی اور بیع تام نہ ہونے کی صورت میں بائع اس چیز کا مستحق نہیں ہوگا۔

بیع عربان سے ممانعت کی وجہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتائی ہے کہ یہ دو فاسد شرطوں پر مشتمل ہے، ایک تو یہ کہ جو چیز بائع کو دی گئی ہے اگر بیع نہ ہو تو وہ بائع کو مجاناً مفت ملے گی اور دوسری یہ کہ بیع کا تام ہونا بائع کی رضامندی پر ہو کہ اگر بائع راضی نہ ہو تو مبیع واپس اس کو دی جائے گی اور بیع فسخ ہو جائے گی، گویا کہ بیع کا مدار مشتری نہیں بلکہ صرف بائع ہے۔

(اعلاء السنن: ۱۶۶/۱۴، نیل الاوطار: ۱۷۳/۵، نفحات التنقیح: ۴۶۲/۳)

بیع مضطر کا حکم

{۲۷۴۰} **وَعَنْ** عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ وَعَنْ بَيْعِ الثَّمْرَةِ قَبْلَ اَنْ تُدْرِكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۴۷۹/۲، باب بیع المضطر، حدیث نمبر: ۳۳۸۲۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا مجبور کی بیع، غرر کی بیع اور پھلوں کی بیع سے پختہ (اور تیار) ہونے سے قبل۔

تشریح: لفظ بیع سے یہاں مراد خرید نا ہے اور بیع المضطر کی دو صورتیں ہیں:

(۱)......ایک یہ کہ زبردستی بطریق اکراہ اس سے کچھ خریدا جائے، یعنی مضطر سے مراد مکرہ ہے اور مکرہ اس کو کہا جاتا ہے جس کو اپنے نفس کے ہلاک ہونے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا خوف ہو، ظاہر ہے کہ کسی سے اس طرح زبردستی کچھ خرید نا بغیر رضامندی کے قطعاً جائز نہیں اور ایسی بیع فاسد ہے۔ کیونکہ یہاں تراضی طرفین نہیں جو کہ شرط بیع میں داخل ہے۔

(۲)......دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی مصیبت کی وجہ سے اپنا سامان بیچنے پر مجبور ہو جائے، مثلاً کسی کو قرض کی ادائیگی کے لئے رقم کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنے مال میں سے کوئی چیز سستے دام سے فروخت کر رہا ہے۔ اس صورت میں اس سے کچھ خرید نا خلاف مروت اور مکروہ عمل ہے، مروت کا تقاضا یہ ہے کہ اس مجبور کا خیال رکھا جائے اور اس کا سامان خریدنے کے بجائے قرض کے ذریعہ سے اس کا تعاون کیا جائے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ پہلی صورت میں نہی تحریمی ہوگی اور دوسری صورت میں تنزیہی ہوگی۔

نر کی جفتی کا عطیہ

{۲۷۴۱} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَجُلًا مِنْ کِلَابٍ سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ فَنَہَاہُ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللہِ! اِنَّا نُطْرِقُ الْفَحْلَ فَنُکْرَمُ فَرَخَّصَ لَہٗ فِی الْکَرَامَۃِ۔ (رواہ الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۴۰، باب کراھۃ عسب الفحل، حدیث نمبر: ۱۲۷۴۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبیلہ کلاب کے ایک شخص نے سوال کیا: نر کی جفتی (کی اجرت لینے) سے (متعلق)۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرما دیا (اس شخص نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ! ہم نر کی جفتی کراتے ہیں اور پھر بطور عطیہ دئے جاتے ہیں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس عطیہ کی اجازت دے دی۔

تشریح: یہ اباحت بصورتِ عطیہ اور ہدیہ ہے جس میں کوئی قباحت نہیں۔ باقی تشریح اوپر گذر چکی۔

اگر مال موجود نہ ہوتو اس کی بیع؟

{۲۷۴۲} **وَعَنْ** حَکِیْمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ نَھَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَبِیْعَ مَا لَیْسَ عِنْدِیْ۔ (رواہ الترمذی) فِیْ رِوَایَۃٍ لَّہٗ وَلِاَبِیْ دَاؤُدَ وَالنَّسَائِیُّ قَالَ: قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! یَاْتِیْنِیْ الرَّجُلُ فَیُرِیْدُ مِنِّیْ الْبَیْعَ وَلَیْسَ عِنْدِیْ فَاَبْتَاعُ لَہٗ مِنَ السُّوْقِ قَالَ: لَا تَبِعْ مَا لَیْسَ عِنْدَکَ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۳۳، باب کراھۃ بیع مالیس عندہ، حدیث نمبر: ۱۲۳۵۔

ترجمہ: حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو منع فرمایا اس شی کی بیع سے جو میرے پاس موجود نہ ہو۔ (ترمذی) ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت میں ہے انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے پاس ایک شخص آتا ہے اور وہ مجھ سے اس شی کے خرید کرنے کا ارادہ کرتا ہے جو میرے پاس موجود نہ ہو، پھر میں اس کو بازار سے خرید کر (دے دوں)؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شی تمہارے پاس موجود نہ ہو (اس کو) مت فروخت کرو۔

تشریح: عقد بیع کے بعد فروخت شدہ مال پر خریدار کو قبضہ دیا جانا حق بیع ہے، اور مشتری کا بھی حق ہے اور اگر کوئی شی بائع کی ملکیت ہی میں نہ ہو تو وہ اس کی بیع کس طرح کرسکتا ہے؟ البتہ بیع سلم اس حکم سے مستثنیٰ ہے، جو مشروع بالنص ہے اور اگر مال گودام وغیرہ میں موجود ہے تو یہ بھی حاضر اور موجود ہے اور اسی طرح جن اشیاء کو آڈر دے کر کاریگروں سے تیار کرایا جائے اور صفات وغیرہ کی جملہ شناخت کے ساتھ عقد کیا جائے یہ بھی جائز ہے اور اس نہی کے ساتھ شامل نہیں، بلکہ مستثنیٰ ہے۔

بیع فضولی

اگر کوئی شخص ملک غیر کو اجازت اور اطلاع کئے بغیر فروخت کردے تو یہ بیع فضولی ہے اور عند الاحناف اگر مالک نے اس کے بعد اس کو منظور اور قبول کرلیا تو بیع نافذ ہوگی۔ ورنہ وہ بیع کالعدم ہوگی،

اور یہ از روئے استحسان جائز ہے۔ قبضہ سے پہلے فروخت کرنا بھی "مالیس عندک" کے حکم میں ہے۔ کذافی التقریر۔

ایک بیع میں دو معاملے

{۲۷۴۳} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ۔ (رواه مالك والترمذی وابوداؤد والنسائی)

حوالہ: موطا امام مالک: ۲۷۴، باب النهی عن بیعتین فی بیعة، ترمذی شریف: ۱/۲۳۳، باب النهی عن بیعتین فی بیعة، حدیث: ۱۲۳۱، ابو داؤد شریف: ۲/۴۹۰، باب فیمن باع بیعتین فی بیعة، حدیث نمبر: ۳۴۶۱، نسائی شریف: ۲/۱۹۷، باب بیعتین فی بیعة، حدیث نمبر: ۴۶۳۶،

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ایک عقد بیع میں دو بیع (یعنی دو معاملے) کرنے سے۔

تشریح: ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "بیعتین فی بیعة" کی دو صورتیں ہیں:

(۱)...... ایک یہ کہ بائع کہے مثلاً یہ کپڑا میں تمہارے ہاتھ دس روپئے میں نقد اور بیس روپیے میں ادھار بیچتا ہوں۔ یہ صورت اکثر اہل علم کے نزدیک فاسد ہے، کیونکہ اس میں ثمن مجہول ہے اور ظاہر ہے کہ جہالت ثمن فساد بیع کا سبب ہے۔ البتہ فاسد اس وقت ہے کہ جب نقد اور ادھار میں سے کسی ایک کی تعیین نہ ہو جائے، بلکہ معاملہ مبہم رہے، لیکن اگر ایک جانب طے ہو جائے کہ معاملہ نقد پر طے کر لیا گیا یا ادھار پر، تو پھر چونکہ ثمن مجہول نہ رہا، بلکہ نقد کی صورت میں دس روپئے متعین ہو گئے، یا ادھار کی صورت میں بیس روپئے متعین ہو گئے، اس لئے یہ عقد جائز اور درست ہوگا۔

(۲)...... دوسری صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ مثلاً میں اپنا غلام دس دینار کے عوض میں تمہارے ہاتھ بیچتا ہوں بشرطیکہ تم اپنی جاریہ اتنی رقم کے عوض میں میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ یہ عقد بھی فاسد ہے، کیونکہ اس میں بیع اور شرط ہے، جس کی وجہ سے جہالت ثمن بھی لازم آتی ہے،

اس لئے کہ بائع نے ''دس دینار اور جاریہ کا فروخت کرنا'' دونوں کے مجموعے کو عبد کے لئے ثمن مقرر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جاریہ کا فروخت کرنا ایک شرط غیر لازم ہے، لہٰذا جب وہ لازم نہیں تو اس کو ساقط کہا جائے گا، تو گویا کہ ثمن کا بعض حصہ ساقط ہو گیا، جس کی وجہ سے بیع کا بعض بھی ساقط ہو جائے گا اور چونکہ مبیع یعنی غلام کے اندر تعیین نہیں تھی تو ایک حصہ کے ساقط ہونے کے بعد دوسرا حصہ جو دس دینار کے بدلے میں ہے مجہول رہا چونکہ کونسا حصہ اس کا دس دینار کے عوض ہے اور کونسا حصہ جاریہ کی شرط کے عوض ہے معلوم نہیں، اس لئے یہ مبیع کی جہالت فساد کا سبب ہوگی۔ (اعلاء السنن: ۱۷۳/۱۳،۲، مرقاۃ: ۶/۸۱، طیبی: ۶/۸۱، نفحات التنقیح)

ایضاً

{۲۷۴۴} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ صَفْقَةٍ وَاحِدَةٍ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

حوالہ: شرح السنہ: ۱۰۷/۵، باب النھی عن بیعتین فی بیعۃ، حدیث نمبر: ۲۱۱۲۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد خود از جد امجد نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے ایک عقد میں دو بیع کرنے سے۔

تشریح: اس حدیث شریف کی تشریح بھی ما قبل والی حدیث کے تحت گذر چکی۔

قرض کے ساتھ عقد بیع کرنا

{۲۷۴۵} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ وَلَا رِبْحُ مَالَمْ يَضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۳۳، باب کراھیۃ بیع ما لیس عندہ، حدیث نمبر: ۱۲۳۴، ابوداؤد شریف: ۲/۴۹۵، باب الرجل یبیع مالیس عندہ، حدیث نمبر: ۳۵۰۴، نسائی: ۲/۱۹۷، باب شرطان فی بیع، حدیث نمبر: ۴۶۳۴۔

ترجمہ: انہی سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں حلال ہے قرض اور بیع (کا یک ساتھ معاملہ) کرنا اور عقد بیع میں دو شرط لگانا اور نفع حلال نہیں جس وقت تک کہ ضمان میں نہیں آئے اور جو شی تمہارے پاس نہ ہو اس کی بیع (درست) نہیں ہے۔

تشریح: سکف: بفتح السین واللام کا اطلاق سلم اور قرض پر ہوتا ہے، یعنی قرض اور بیع کے دو الگ الگ معاملوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط اور منسلک نہیں کرنا چاہئے، جس کی دو صورتیں ہیں:

(۱)……ایک یہ کہ بائع مشتری سے کہے میں آپ کے ہاتھ یہ کپڑا دس روپئے کے عوض میں بیچتا ہوں بشرطیکہ تم مجھے دس روپئے قرض میں دو۔

(۲)……دوسری صورت یہ ہے کہ بائع مشتری کو کچھ روپئے بطور قرض دے اور قرض دینے کی وجہ سے کوئی چیز قرض دار کے ہاتھ اصل قیمت سے زائد پر بیچے۔

پہلی صورت تو اس لئے حرام ہے کہ اس میں ایسی شرط لگائی گئی جو مقتضائے عقد کے خلاف ہے اور شرط جب غیر لازم ہو تو اس کی وجہ سے فساد آتا ہے۔

اور دوسری صورت اس لئے حرام ہے کہ اس آدمی نے قرض سے نفع اٹھایا اور قرض دینے کی وجہ سے مشتری سے زائد قیمت وصول کی جبکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے: "کل قرض جر نفعا فھو حرام" (مرقاۃ: ۶/۸۲)

ولا شرطان فی البیع: شرط کی تین قسمیں ہیں:

ایک وہ شرط ہے جو عقد کے ساتھ مناسب اور ملائم ہو اور عقد کا مقتضی ہو تو اس کی شرط لگانے سے بیع فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ وہ شرط مقتضاء عقد ہونے کی وجہ سے خود بخود ثابت ہوتی ہے، جیسے مشتری کے لئے ملک کی شرط لگانا کہ بیع کے بعد مشتری مبیع کا مالک ہوگا، ظاہر ہے کہ یہی عقد کا تقاضا ہے۔ دوسری وہ شرط

ہے جو عقد کے ساتھ ملائم تو نہیں اور نہ عقد کا مقتضی ہے، لیکن اس میں نہ عاقدین کو کوئی نفع ملتا ہے اور نہ معقود علیہ کو جیسا کہ کوئی یہ شرط لگائے کہ جانور اس شرط پر دے رہا ہو کہ اس کو آگے نہیں بیچو گے، ظاہر ہے کہ عاقدین کا اس میں نفع نہیں اور نہ معقود علیہ جانور کا، کیونکہ وہ اہل استحقاق میں سے نہیں تو اس سے بھی بیع فاسد نہیں ہوتی، کیونکہ جانور کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا تو اس میں نہ زیادتی بلا عوض ہے اور نہ نزاع لازم آتا ہے۔

تیسری وہ شرط ہے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو اور عاقدین میں سے کسی ایک کا اس میں نفع ہو یا معقود علیہ کا نفع ہو بشرطیکہ وہ انسان ہو، یعنی اہل استحقاق ہو، مثلاً کسی غلام کو اس شرط پر بیچا کہ مشتری اس کو فروخت نہیں کریگا، تو اس شرط میں عاقدین کا تو کوئی فائدہ نہیں، لیکن معقود علیہ کا فائدہ ہے اور اس کی طرف سے جب اس شرط کو پورا کرنے کا مطالبہ ہوگا تو نزاع لازم آئے گا اور یہ زیادتی بلا عوض بھی ہے، اس لئے یہ شرط مفسد عقد ہے اور اس کے لگانے سے عقد کا ثابت شدہ حکم لغو ہو جاتا ہے۔ (ہدایہ:۵۹/ ۳)

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ فساد عقد کے لئے ایک ہی شرط مفسد کافی ہے یا کم از کم دو شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ حنفیہ، شافعیہ اور جمہور فرماتے ہیں کہ اگر بیع میں ایسی شرط لگائی جائے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو تو بیع اور شرط دونوں لغو اور باطل ہوں گے، خواہ ایک شرط لگائی جائے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو تو بیع اور شرط دونوں لغو اور باطل ہوں گے خواہ ایک شرط لگائی جائے یا ایک سے زائد۔

جبکہ مالکیہ، حنابلہ، امام ابن ابی شبرمہ وغیرہ حضرات کے نزدیک ایک شرط فاسد سے بیع فاسد نہیں ہوگی، بلکہ فساد کے لئے کم از کم دو شرطیں ضروری ہیں۔

ان حضرات کا استدلال ایک تو اسی روایت سے ہے کہ اس میں تثنیہ کا ذکر احتراز کے لئے ہے اتفاقی نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو شرط فاسد ہوں تو بیع جائز نہیں اور اگر ایک شرط فاسد غیر ملائم ہو تو جائز ہے۔

دوسرا استدلال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے، جس میں ارشاد ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ فروخت کیا اور "مدینہ منورہ" پہنچنے

تک اپنے لئے سواری کی شرط لگائی۔(بخاری ۳۱۶/۱)

دلائل جمہور

جمہور کا استدلال ایک تو حضرت عمرو بن شعیب کی روایت سے ہے:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نهی عن بیع و شرط" اس حدیث میں تصریح ہے کہ ایک شرط لگانے کی صورت میں بھی بیع ممنوع ہے اور شرط بھی ممنوع ہے۔

دوسری دلیل اس روایت سے ہے جس میں متعدد اشیاء کی ممانعت کے ساتھ "وعن الثنیا" کے الفاظ بھی آئے ہیں اور "ثنیا" کے معنی کسی حکم سے کسی چیز کو مستثنیٰ کرنے کے ہیں اور شرط لگانا یقیناً استثناء ہی ہے، لہٰذا شرط لگانا منہی عنہ اور ممنوع ہے۔

عقلی اعتبار سے بھی جمہور کا مسلک راجح ہے، کیونکہ ایجاب و قبول سے بیع تام ہو جاتی ہے اور بالاجماع مبیع مشتری کی ملک میں آجاتی ہے، اب مشتری کو اختیار ہے جیسے چاہے اس میں تصرف کرے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی شرط کا لگانا مقصد عقد کے منافی ہوگا اور مشتری کے اختیار میں خلل کا باعث بنے گا، لہٰذا شرط کا لگانا لغو اور ناجائز ہونا چاہئے۔

ائمہ کے استدلال کا جواب

پہلے استدلال کا جواب یہ ہے کہ تثنیہ کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے، چنانچہ اسی حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ آئے ہیں: "نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرط" لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، خواہ ایک شرط ہو خواہ ایک سے زائد ہوں۔

اور اتفاقی ہونے کی صورت میں بھی یہ شرطین کی قید بے فائدہ نہیں، بلکہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ چونکہ یہ احتمال تھا کہ اگر عقد بیع میں ایک ہی شرط غیر ملائم ہو اور اس میں بائع کا یا مشتری کا نفع ہو تو ناجائز ہوگا، اس لئے کہ ایک کا نفع ہے دوسرے کا نہیں اور اگر دونوں طرف سے شرطیں ہوں کہ ایک میں بائع کا نفع ہو اور دوسری میں مشتری کا فائدہ ہو تو جائز ہوگا اس اشتباہ کو دور کرنے کے لئے

فرمایا: ”ولا شرطان فی بیع“ (التعلیق: ۳/۳۲۶)

لطیف حکایت

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ”المحلی“ میں عبد الوارث بن سعید رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ تین حضرات فقہاء امام ابو حنیفہ، امام ابن شبرمہ اور امام ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے ایام حج میں میری ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوگئی۔

چنانچہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مسئلہ مذکور کے بارے میں پوچھا کہ جو آدمی بیع کرے اور شرط لگائے اس کا کیا حکم ہے؟

انہوں نے فرمایا: ”البیع باطل والشرط باطل“ کہ بیع اور شرط دونوں باطل ہیں، پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا انہوں نے جواب دیا: ”البیع جائز والشرط باطل“ کہ بیع جائز اور شرط باطل ہے۔

اور اخیر میں ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: ”البیع جائز والشرط جائز“ حضرتِ عبد الوارث ابن سعید رحمۃ اللہ علیہ کو حیرت ہوئی اور فرمانے لگے: ”یا سبحان اللہ ثلاثۃ من فقھاء العراق اختلفوا فی مسئلۃ واحدۃ“ پھر وہ واپس امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال سے آگاہ کیا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”لا ادری ما قالا“ مجھے ان کے فتویٰ کے بارے میں علم نہیں۔

البتہ میں نے فتویٰ حضرت عمرو بن شعیب کی اس روایت پر دیا ہے جس میں ارشاد ہے: ”نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع وشرط“ چنانچہ اس حدیث میں تصریح ہے کہ بیع اور شرط دونوں منہی عنہ اور باطل ہیں، پھر یہ ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور ان کو بھی دیگر حضرات کے اقوال سے آگاہ کیا، انہوں نے بھی جواب میں یہی فرمایا: ”لا ادری ما قالا“ اور اپنے قول کیلئے انہوں نے بطور دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کی جس میں ارشاد ہے: ”البیع جائز والشرط باطل“

اس کے بعد وہ ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لائے اور واقعہ بتانے کے بعد انہوں نے بھی جواباً یہی فرمایا: "لا ادری ما ذا قالا" اور اپنے فتویٰ کے اثبات کے لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی: "انہ باع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جملا و اشترط ظہرہ الی المدینۃ" [کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹ فروخت کیا اور مدینہ طیبہ تک اس پر سواری کی شرط کرلی۔]

چنانچہ اس روایت سے معلوم ہوا کہ بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔(فتح القدیر:۷۶/۶)

ان حضرات کے مختلف اقوال میں حضرات متاخرین نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ عقد بیع میں اگر ایسی شرط لگائی جائے جو مقصد بیع کے منافی نہ ہو اور جس سے حقیقت بیع میں نقص نہ آئے تو بیع بھی صحیح ہوگی اور شرط بھی صحیح، جیسا کہ امام ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور اگر ایسی شرط ہو جو عقد بیع کے منافی ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں، اگر شرط کو بیع سے جدا کرنا ممکن ہو تو بیع صحیح ہوگی، اور شرط باطل، جیسا کہ ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور اگر ایسی شرط ہو جو بیع سے جدا نہ ہو سکے تو بیع اور شرط دونوں باطل ہوں گے مثلاً اگر کوئی شخص کوئی جانور خریدتا ہے اور شرط لگاتا ہے کہ وہ حمل نہیں لے گا تو یہ بیع اور شرط دونوں درست نہیں، کیونکہ حمل بمنزلہ اطراف حیوان کے ہے اور اطراف کا استثناء درست نہیں، جبکہ اگر کوئی شخص ایک غلام اور ایک مدبر کو ملا کر عقد کرتا ہے تو ایسی صورت میں صرف غلام کے اندر بحصۃ من الثمن بیع درست ہوگی اور بیع میں مدبر کو شامل کرنے کی شرط باطل قرار پائے گی۔(ہدایہ:۶۰/۳)

ولا ربح مالم یضمن: جو چیز ضمان میں نہ ہو اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، یہ ایک مسلمہ ضابطہ ہے: "الخراج بالضمان" جو چیز جس آدمی کے ضمان اور ذمہ داری میں ہو اس کا نفع اسی شخص کا ہوگا اور اگر اس کے ضمان اور ذمے داری میں نہ ہو تو وہ اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔

اور اسی قاعدہ کے تحت "بیع قبل القبض" بھی آجاتی ہے۔ امام احمد اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک "بیع قبل القبض" کے بارے میں جو نہی وارد ہے وہ مطعومات کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا مطعومات کے علاوہ دیگر اشیاء میں ان کے نزدیک بیع قبل القبض جائز ہے۔

امام اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نہی مطعومات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام مکیلات وموزونات کا یہی حکم ہے۔

جبکہ شیخین امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک تمام منقولات کا یہی حکم ہے، البتہ غیر منقول چیز میں قبل القبض تصرف جائز ہے۔

اور امام شافعی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک یہ حکم تمام منقولات وغیرہ منقولات کا یہی حکم ہے، البتہ غیر منقول چیز میں قبل القبض تصرف جائز ہے۔

اور امام شافعی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک یہ حکم تمام منقولات وغیرہ منقولات کو شامل ہے۔

شیخین کا مسلک دوسرے ائمہ سے قوی ہے، اس لئے کہ "بیع قبل القبض" کے ناجائز ہونے کی وجہ یہی ہے کہ قبضہ سے پہلے مبیع کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ مبیع مشتری کے ضمان میں داخل نہیں ہوتی، لہٰذا اس کو اس میں تصرف کا حق بھی نہیں ملے گا اور ظاہر ہے کہ غیر منقول میں یہ علت موجود نہیں، کیونکہ وہاں ہلاکت کا احتمال بہت بعید ہے، اس لئے غیر منقول کو مستثنیٰ کیا گیا۔ (نفحات التنقیح: ۳/۴۶۴)

ادائیگی قیمت میں سکہ کی تبدیلی

{۲۷۴۶} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْهُمَا قَالَ كُنْتُ اَبِيْعُ الْاِبِلَ بِالنَّقِيْعِ بِالدَّنَانِيْرِ فَاٰخُذُ مَكَانَهَا الدَّرَاهِمَ وَاَبِيْعُ بِالدَّرَاهِمِ فَاٰخُذُ مَكَانَهَا الدَّنَانِيْرَ فَاَتَيْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ: لَا بَأْسَ اَنْ تَأْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَالَمْ تَفْتَرِقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْئٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۳۵، باب ماجاء فی الصرف، حدیث نمبر: ۱۲۴۲، ابوداؤد شریف: ۲/۴۷۶، باب اقتضاء الذهب من الورق، حدیث نمبر: ۳۳۵۴، نسائی: ۲/۱۹۴، باب بیع الفضة بالذهب، حدیث نمبر: ۴۵۸۶، دارمی: ۲/۳۳۶، باب الرخصة فی اقتضاء الورق من الذهب، حدیث نمبر: ۲۵۸۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: کہ میں بازار نقیع میں دنانیر کے عوض اونٹ فروخت کرتا تھا، پھر میں دنانیر کے بدلہ میں دراہم وصول کرلیتا اور فروخت کرتا دراہم

کے عوض تو اس کے عوض دنانیر وصول کرلیتا، چنانچہ میں حضرت رسول اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا، تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ کوئی مضائقہ نہیں ان کو (بدلہ میں) وصول کرنا اس روز کے بھاؤ کے مطابق بشرطیکہ دونوں علاحدہ علاحدہ نہ ہوں۔ اور (ابھی تک) تم لوگوں کے درمیان کچھ (عقد کا جز باقی) ہے۔

تشریح: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا کہ میں دراہم کو دنانیر کے بدلے اور اس کا عکس کرکے لیتا ہوں مثلاً اگر اس پر پانچ سو دینار ہوتے تو میں اس کے بدلے پانچ ہزار درہم لے لیتا ہوں اور اگر پانچ ہزار درہم کسی پر واجب ہوتے تو اس کے عوض میں پانچ سو دینار لے لیتا ہوں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

حضور اقدس ﷺ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے، ایک یہ کہ سعر الیوم ہو، اور ثانی یہ ہے کہ تقابض ہو، جمہور کے نزدیک سعر الیوم کی شرط استحبابی ہے، ابن ابی لیلیٰ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک وجوبی ہے، اور تقابض کی شرط سب کے نزدیک وجوبی ہے۔

ایضا

{۲۷۴۷} **وَعَنِ** الْعَدَّاءِ بْنِ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ اَخْرَجَ كِتَابًا هٰذَا مَا اشْتَرٰى الْعَدَّاءُ بْنُ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِشْتَرٰى مِنْهُ عَبْدًا اَوْ اَمَةً لَا دَاءَ وَلَا غَائِلَةَ وَلَا خِبْثَةَ بَيْعَ الْمُسْلِمِ۔ (رواہ الترمذی) وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۳۰، باب فی کتابۃ الشروط، حدیث نمبر: ۱۲۱۶۔

ترجمہ: حضرت عدّاء بن خالد بن ہوذہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک تحریر نکالی (اور دکھلائی جس میں عقد بیع سے متعلق یہ تحریر تھی) یہ وہ شی ہے جس کو محمد رسول اکرم ﷺ سے عداء بن ہوذہ نے خرید کیا ہے (جس کی یہ تحریر ہے) انہوں نے آنحضرت ﷺ سے ایک غلام اور ایک باندی خرید کی تھی کہ جن میں نہ کوئی بیماری ہے اور نہ کوئی عیب اور نہ کوئی خبث ہے ایک مسلمان نے بیع کی

ایک مسلمان سے۔

تشریح: اس حدیث کے اندر حضور اقدس ﷺ کو بائع اور عداء بن خالد کو مشتری قرار دیا گیا ہے، ایسے ہی سنن طبقات ابن سعد ابن شاہین معرفۃ الصحابہ لابن مندہ، معانی الآثار وغیرہ کے اندر ہے لیکن بخاری شریف کے اندر اس کا عکس وارد ہوا کہ بائع تو عدا ابن خالد ہیں اور مشتری سرکار دوعالم ﷺ ہیں، اب علماء کے اندر اختلاف ہوگیا کہ کونسی حدیث صحیح وراجح ہے، بعض نے کہا: کہ سنن کے اندر صحیح ہے ابن مطرزی نے اس کو راجح قرار دیا ہے، بعض لوگوں نے کہا: کہ بخاری اور اس حدیث کے اندر کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ وہاں اشتراء کے معنی میں ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دراصل یہ بیع مفایضہ تھی اور اس کے اندر ہر ایک بائع اور مشتری ہوتا ہے۔

بیع بطریق نیلامی

{۲۷۴۸} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَاعَ حِلْسًا وَقَدَحًا فَقَالَ مَنْ یَّشْتَرِیْ ھٰذَا الْحِلْسَ وَالْقَدَحَ فَقَالَ رَجُلٌ: اٰخُذُھُمَا بِدِرْھَمٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ یَّزِیْدُ عَلٰی دِرْھَمٍ فَاَعْطَاہُ رَجُلٌ دِرْھَمَیْنِ فَبَاعَھُمَا مِنْہُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/ ۲۳۱، باب فی بیع من یزید، حدیث نمبر: ۱۲۱۸، ابوداؤد شریف: ۲۳۲/ ۱، کتاب الزکوۃ، باب ما تجوز فیہ المسألۃ، حدیث نمبر: ۱۶۴۱، ابن ماجہ شریف: ۱۵۸، باب بیع المزایدہ، حدیث نمبر: ۲۱۹۸۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ایک چادر اور ایک پیالہ کو فروخت فرمایا، پس آنحضرت ﷺ نے (اس کے فروخت کرنے کے لئے یوں) فرمایا: کہ اس چادر اور پیالہ کو کون خریدتا ہے؟ تو ایک شخص نے کہا میں ان دونوں کو ایک درہم کے عوض خریدتا ہوں۔ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ ایک درہم سے زائد کون دے گا؟ تو ایک شخص نے

آنحضرت ﷺ کو دو درہم دیئے، آنحضرت ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کو فروخت کردیں۔

تشریح: اس حدیث شریف سے بیع مزایدہ (نیلام) کا ثبوت ہوا، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ یہ بیع ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز ہے وابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ مکروہ ہے، اسحق بن راہویہ امام اوزاعی کے نزدیک یہ بیع غنائم اور مواریث کے ساتھ خاص ہے۔

الفصل الثالث

عیب دار چیز کی بیع

{۲۷۴۹} وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللهِ اَوْلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهٗ۔ (رواه ابن ماجة)

حواله: ابن ماجه شریف: ۱۶۲، باب من باع عیبا فلیبینه، حدیث نمبر: ۲۲۴۷۔

ترجمه: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے، آنحضرت ﷺ فرمارہے تھے: جس شخص نے عیب دار چیز کو فروخت کردیا (اور) اس عیب کو بیان نہیں کیا تو وہ شخص برابر اللہ تعالیٰ کے غصہ میں مبتلا رہے گا۔ یا (یہ ارشاد فرمایا تھا) برابر اس پر فرشتے لعنت کرتے رہیں گے۔

تشریح: طلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں کوئی عیب ہے تو اس کو فروخت کرتے وقت اس عیب کا ظاہر کردینا ضروری ہے، اگر اس نے عیب کو ظاہر کئے بغیر فروخت کردیا تو اس نے سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کام کیا۔ اس لئے اس سے پورا پورا اجتناب واحترام لازم ہے۔

رقم الحدیث: ۲۷۵۰ / تا ۲۷۵۷ /

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بابٌ

﴿الفصل الاوّل﴾

درخت کی بیع میں پھل داخل نہیں

{۲۷۵۰} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ اَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُہَا لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ یَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ وَمَنِ ابْتَاعَ عَبْدًا وَلَہٗ مَالٌ فَمَا لُہٗ لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ یَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ۔ (رواہ مسلم) وَرَوَی الْبُخَارِیُّ اَلْمَعْنٰی الْاَوَّلَ وَحْدَہٗ۔

حوالہ: بخاری شریف:۳۲۰/۱، باب المساقاۃ، الرجل یکون لہ تمر او حائط، حدیث نمبر:۲۳۱۸، مسلم شریف:۱۰/۲، کتاب البیوع، من باع نخلا علیھا تمرا، حدیث نمبر:۱۵۴۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کھجور کے درخت خرید کئے ان کی تابیر کرنے کے بعد تو ان کے پھل بائع کے لئے، مگر یہ کہ خریدنے والا (ان پیدا ہونے والے) پھلوں کی (بھی) شرط لگادے، اور اگر کسی شخص نے غلام خرید کیا اور اس غلام کے پاس مال ہے تو وہ بائع کے لئے ہے، مگر خریدار شرط لگائے (تو پھر خریدار کے

لئے ہوگا۔(مسلم)اورامام بخاری نےفقط اول کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔

تشریح: ''تؤبر'' صیغہ مجہول ہے، ''تأبیر'' سے مشتق ہے، مزید میں تفعیل اور مجرد میں ''نصر'' سے ایک ہی معنی میں مستعمل ہے، یعنی درخت کو پیوند لگانا اور اصلاح کرنا، جیسا کہ عرب کا دستور تھا کہ نر کھجوروں کے خوشے مقررہ وقت میں مادہ کھجوروں کے خوشوں میں ڈال کر پیوند کرتے تھے، جس سے پھل اور پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا۔

اس بات پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر کسی نے کھجور کے درخت پیوند لگانے کے بعد بیچے تو ان کا پھل بائع کا ہوگا اور وہ پھل بیع میں درخت کے تابع نہیں، البتہ اگر عقد میں یہ شرط لگائی گئی کہ پھل مشتری کا ہوگا تو پھر وہ بائع کا حق نہیں رہے گا مشتری کا ہوگا۔

لیکن اگر تابیر اور پیوندکاری سے پہلے درخت فروخت کئے تو یہ پھل بائع کے ہوں گے یا مشتری کے؟ اس میں اختلاف ہے۔

چنانچہ ائمہ ثلاثہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر عمل تابیر سے پہلے درخت کی خرید وفروخت ہو جائے تو پھر پھل مشتری کے ہوں گے، بائع ان کا مالک نہ ہوگا، مگر یہ کہ بائع یہ شرط لگا دے کہ پھل میرے ہیں، جیسا کہ بعد التابیر پھل بائع کا حق ہے مگر یہ کہ مشتری شرط لگا دے کہ پھل میرا ہوگا تو وہ مشتری کو مل جائے گا۔

جبکہ حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ پھل ہر حالت میں بائع کے ہوں گے اور درخت کے تابع نہیں ہونگے، خواہ بیع عمل تابیر سے پہلے ہو یا اس کے بعد، البتہ اگر مشتری نے بوقت عقد پھل کے متعلق شرط لگا دی تو پھر وہ مشتری کا حق ہے۔(عمدۃ القاری: ۱۲/۱۲)

اور یہی بات قرین قیاس بھی ہے، چنانچہ اگر بائع زمین فروخت کرے تو اس پر جو کھیتی ہوتی ہے مشتری کا اس میں کوئی حق نہیں ہوتا، ایسے ہی درخت کا پھل بھی بائع کا ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ حدیث مذکور کے مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں ''بعد ان تؤبر'' کی قید احترازی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بعد التابیر بائع کا حق ہے شرط کے بغیر مشتری کا حق نہیں، لہٰذا قبل التابیر مشتری کا حق ہوگا بغیر شرط لگائے بائع کا حق نہیں ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ تابیر کی قید احترازی نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ بائع

پھل کااس وقت مستحق ہے جبکہ پھل درخت پرظاہر ہواور پھل کے ظہور کاوقت یہی ہے جس میں تابیر اور پیوند ہوتی ہے،لہٰذااس وقت میں اگر بیع ہوگی تو پھل بائع کا ہوگااور ظہور کی وجہ سے پھل درخت کے تابع نہیں ہوگا،بلکہ مستقل شمار کیا جائے گا چاہے تابیر ہو یا نہ ہو۔

لیکن چونکہ پھل کے ظاہر ہونے کے وقت درختوں کی تابیر ہوتی ہے اوراس کے بغیر عادۃً تابیر نہیں کی جاتی اس وجہ سے پھل ظاہر ہونے کے وقت کی تعبیر تابیر سے کی گئی۔(فیض الباری:۳/۲۵۷)

لہٰذااستحقاق پھل میں تابیر کا کوئی دخل نہیں، بلکہ ظہور کا دخل ہے، چنانچہ اگر کوئی پھل ظاہر ہو جائے اور تابیر و پیوندکاری کے بغیر پک جائے اور توڑنے کے قابل ہو جائے تو بالاتفاق وہاں وہ درخت کے تابع نہیں ہوگا بلکہ بائع کا حق ہوگا،اس سے معلوم ہوا کہ تابیر سے فعل تابیر مراد نہیں، کیونکہ اس کا کوئی دخل نہیں بلکہ پھل کا ظاہر ہونا مراد ہے۔

چنانچہ بہت سے محققین نے ”تابیر“ کی تفسیر ظہور ثمر سے کی ہے، جیسا کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:”**لعله عبر عن الظهور بالتأبير لأنه لا يخلو عنه غالباً**“(طیبی:۶/۸۶)

یعنی ظہور کی تعبیر ”تابیر“ سے اس لئے کی گئی ہے کہ تابیر عموماً ظہور ثمر کے وقت ہی ہوتی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت یہ نزاع حقیقی نہیں لفظی ہے، کیونکہ شوافع نے بھی اس بات پر تصریح کی ہے کہ اگر صاحب نخلة نے خود تابیر نہ کی ہو بلکہ خود سے پھل درخت پر نکل آیا ہو تو پھر یہی حکم ہے کہ پھل بیع کے اندر داخل نہیں ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرات شوافع کے نزدیک ”**بعد أن تؤبر**“ کا مفہوم ”**بعد ان يظهر**“ ہے،یعنی اگر پھل ظاہر ہونے کے بعد بیع ہو جائے تو اس صورت میں پھل بائع کا ہوگا، چاہے وہ پھل چھوٹا ہو یا بڑا۔(فیض الباری:۳/۲۵۷)

ومن ابتاع عبدا وله مال: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل ظاہر کے نزدیک مال کی اضافت عبد کی طرف بطور تملیک کے ہے،یعنی عبد کو اگر کسی چیز کا مالک بنایا جائے تو وہ مالک بن سکتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب کسی غلام کو آزاد کرتے تھے تو اس کے پاس جو مال ہوتا تھا اس کے درپے نہیں ہوتے تھے:”**عن ابن عمر رضي الله عنهما انه كان اذا اعتق عبدا وله مال لم يتعرض لماله**“ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ غلام تملیک کی وجہ سے اس

مال کا مالک ہو جاتا تھا۔

لیکن جمہور کے نزدیک غلام کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا، اگر چہ مولی اس کو مالک بنا دے، کیونکہ وہ خود مملوک ہے، لہٰذا اس کے پاس جو مال ہے وہ بھی مولی کا مملوک ہوگا تو گویا کہ مال کے معاملے میں غلام کی حیثیت بہائم کی طرح ہے، جیسے وہ مالک نہیں بن سکتے اسی طرح غلام بھی مالک نہیں بن سکتا۔

البتہ "وَلَهُ مَالٌ" کے اندر ظاہر قبضہ واتصال کی بنا پر مجازاً غلام کی طرف نسبت کی گئی ہے، جیسا کہ "سرج" زین کی نسبت گھوڑے کی طرف "اکاف" پالان کی نسبت گدھے کی طرف اور بکریوں کی نسبت چرواہے کی طرف ملک کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ ظاہری قبضہ واتصال کی وجہ سے مجازاً اضافت ہوتی ہے۔

اور اس بات پر قرینہ یہ ہے کہ اسی حدیث شریف میں "**فماله للبائع**" فرما کر اس مال کی ملکیت کی نسبت بائع کی طرف کی گئی ہے جبکہ یہ ممکن نہیں کہ یہ چیز ایک ہی حالت میں مکمل طور پر دو آدمیوں کی مملوک بن جائے، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مال کی اضافت عبد کی طرف اتصال اور اختصاص کی وجہ سے مجازی ہے جبکہ مولی کی طرف ملک کی وجہ سے حقیقی ہے۔ (شرح الطیبی: ۶/۸۶)

ثمرہ اختلاف یہ ہے کہ چونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل ظاہر کے نزدیک غلام مالک بن سکتا ہے، لہٰذا اپنے مملوک میں تصرف کر سکتا ہے، اسی وجہ سے وہ ملک یمین کی بنیاد پر جاریہ سے وطی کر سکتا ہے، جبکہ جمہور رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غلام مالک نہیں بن سکتا، لہٰذا ملک یمین کی وجہ سے وہ جاریہ سے وطی نہیں کر سکتا۔ (نفحات التنقیح: ۳/۴۰۷)

بیع بالشرط کی ایک صورت

{۲۷۵۱} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ عَنْهُ كَانَ يَسِيْرُ عَلَىٰ جَمَلٍ لَهٗ قَدْ اَعْيَىٰ فَمَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٖ فَضَرَبَهٗ فَسَارَ سَيْرًا لَيْسَ يَسِيْرُ مِثْلَهٗ ثُمَّ قَالَ: بِعْنِيْهِ بِوُقِيَّةٍ قَالَ: فَبِعْتُهٗ فَاسْتَثْنَيْتُ حُمْلَانَهٗ اِلٰى اَهْلِيْ

فَلَمَّا قَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ اَتَيْتُهُ بِالْجَمَلِ وَنَقَدَنِيْ ثَمَنَهُ. وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاَعْطَانِيْ ثَمَنَهُ وَرَدَّهُ عَلَيَّ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ اَنَّهُ قَالَ لِبِلَالٍ: اِقْضِهِ وَزِدْهُ فَاَعْطَاهُ وَزَادَهُ قِيْرَاطًا.

حوالہ: بخاری شریف:۳۷۵/۱، کتاب الشروط، باب اذا اشترط البائع ظهر الدابة، حدیث نمبر:۲۶۳۹، مسلم شریف:۲۸/۲، کتاب المساقاة، باب بیع البعیر و استثناء رکوبه، حدیث نمبر: ۷۱۵،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اپنے اونٹ پر سفر کر رہے تھے جو کہ تھک (کر سست رفتار ہو) چکا تھا۔ سو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گذرے (اور دیکھا کہ اونٹ تھک چکا ہے) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹ کو مارا۔ تو پھر وہ اس طرح (تیز رفتار) چلنے لگا کہ دوسرا اونٹ اس کے مانند نہیں چلتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (تیز رفتاری) کے بعد فرمایا: تم اس کو ایک اوقیہ چاندی کے عوض مجھ کو فروخت کر دو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اونٹ فروخت کر دیا اور اپنے گھر پہنچنے تک اس پر سوار ہونے کو مستثنیٰ کر لیا، چنانچہ جس وقت میں مدینہ طیبہ آ گیا تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اونٹ لے کر حاضر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس کی قیمت عنایت فرمائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس کی قیمت عنایت کی اور وہ اونٹ (بھی) مجھ کو واپس لوٹا دیا۔ (بخاری، مسلم)

اور بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: اس کو قیمت ادا کر دو اور کچھ زائد دے دو، چنانچہ حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ نے وہ قیمت دی اور ایک قیراط مزید دیا۔

تشریح: کوئی جانور اس شرط پر بیچنا کہ مشتری کو معینہ مدت تک اس پر سواری کا حق حاصل ہوگا، جائز ہے یا نہیں؟ حنفیہ شافعیہ اور جمہور کے نزدیک یہ شرط لگانا صحیح نہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رکوب یسیر کی شرط جائز ہے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ شرط صحیح ہے اور اس کا ایفاء ضروری ہے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اس زیر بحث واقعہ سے استدلال کرتے ہیں، اس میں ہے کہ سفر سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ خریدا تھا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ شرط

لگائی تھی کہ گھر پہنچنے تک میں اس پر سوار رہوں گا، آنحضرت ﷺ نے یہ شرط قبول فرمالی، مدینہ طیبہ پہنچ کر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں یہ اونٹ پیش کیا تو آنحضرت ﷺ نے ثمن اداء کرنے کے ساتھ یہ اونٹ بھی واپس فرمادیا، جمہور کی طرف سے اس استدلال کے کئی جواب دئے گئے ہیں:

(۱)...... یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت تھی۔

(۲)...... یہاں یہ شرط صلب عقد میں نہیں تھی بلکہ عقد ہو چکنے کے بعد یہ بات ہوئی تھی، چنانچہ حدیث کے لفظ بھی یہ ہیں: "قال فبعته فاستثنیت حملانه الی اهلی"

(۳)...... اصل بات یہ ہے کہ یہ حقیقی بیع نہیں تھی، آنحضرت ﷺ درحقیقت وہ اونٹ خریدنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس بہانہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی امداد کرنا چاہتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ثمن بھی ادا کر دیا اونٹ بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس رہنے دیا۔ یہ جواب حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے دیا ہے۔ (اشرف التوضیح: ۲/۴۰۳)

عقد بیع کے ساتھ شرط کا ہونا

{۲۷۵۲} **وَعَنْ** عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهَا قَالَتْ جَاءَتْ بَرِيْرَةُ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهَا فَقَالَتْ اِنِّيْ كَاتَبْتُ عَلىٰ تِسْعِ اَوَاقٍ فِيْ كُلِّ عَامٍ وُقِيَّةٌ فَاَعِيْنِيْنِيْ فَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهَا اِنْ اَحَبَّ اَهْلُكِ اَنْ اَعُدَّهَا لَهُمْ عُدَّةً وَاحِدَةً وَاُعْتِقُكِ فَعَلْتُ وَيَكُوْنُ وَلَاءُ لِكِ فَذَهَبَتْ اِلىٰ اَهْلِهَا فَاَبَوْا اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ الْوَلَاءُ لَهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذِيْهَا وَاعْتِقِيْهَا ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي النَّاسِ فَحَمِدَ اللهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُوْنَ شُرُوْطًا لَيْسَتْ فِيْ كِتَابِ اللهِ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَاِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ فَقَضَاءُ اللهِ اَحَقُّ وَشَرْطُ اللهِ اَوْثَقُ وَاِنَّمَا الْوَلَاءُ

لِمَنْ اَعْتَقَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۴۸، کتاب المکاتب، باب استعانۃ المکاتب وسوال الناس، حدیث نمبر: ۲۴۹۲، مسلم شریف: ۱/۴۹۴، کتاب العتق، باب بیان الولاء لمن اعتق، حدیث نمبر: ۱۵۰۴۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں اور عرض کیا: کہ میں نے (اپنے مالک سے) نو اوقیہ چاندی (جو کہ) ہر سال میں ایک اوقیہ ادا کرنے کی شرط کے ساتھ میں نے عقد کتابت کیا ہے، لہٰذا تم میری اعانت کرو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر تمہارے مالک کو پسند ہو تو میں ایک ہی وقت میں تمام مالِ کتابت شمار (یعنی ادا) کردوں گی اور تجھ کو آزاد کردوں گی، (اگر ان کی رضامندی ہوگی تو) میں کرلوں گی اور ولاء میرے لئے ہوگی۔ چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اپنے مالک کے پاس گئیں (اور انہوں نے تمام صورتِ حال بیان کی) انہوں نے انکار کردیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ ولاء ان (فروخت کرنے والے مالکوں) کے لئے ہوگی۔ (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اس کو خرید لو اور اس کو آزاد کردو۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان (برائے خطبہ) قیام فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء فرمائی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امابعد! لوگوں کو کیا ہوگیا کہ وہ ایسی شرائط قائم کرتے ہیں جن کی (اباحت واجازت) کتاب اللہ میں نہیں ہے، جو ایسی شرط ہو کہ کتاب اللہ میں نہ پائی جائے تو وہ باطل ہے، اگرچہ سو شرائط ہوں۔ (تب بھی وہ معتبر نہ ہوں گی)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ زیادہ لائق ہے اور اللہ تعالیٰ کی شرط زیادہ مستحکم ہے اور ولاء اس شخص کا حق ہے جس نے آزاد کیا ہو۔

تشریح: اس حدیث شریف کے اندر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ "خذیھا الخ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع مکاتب جائز ہے، چنانچہ امام مالک اور امام احمد کا یہی مذہب ہے، امام شافعی اور امام صاحب کے نزدیک جائز نہیں ہے، اور اس حدیث شریف کا جواب یہ ہے کہ یہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کی رضامندی کی بنا پر تھا، آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "واشترطی" اس پر اعتراض ہوا کہ یہ شرط تو باطل تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لگانے کا حکم کیسے دیا؟

جواب: (۱)......قاضی یحییٰ بن اکثم نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے، اس "اشترطی" کی وجہ سے۔

جواب: (۲)...... یہ شرط کا حکم نہیں تھا بلکہ یہ امر تعبدی تھا۔

جواب: (۳)...... "اشترطی لھم" کے اندر لام علی کے معنی میں ہے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ توجیہ کی ہے لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس توجیہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔

الولاء لمن اعتق الخ: بیع ولاء کے اندر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ جائز نہیں ہے، ایسے ہی ہبہ کی بیع بھی جائز نہیں ہے۔ عروہ بن الزبیر اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے جواز مروی ہے کہ بیع ہبہ جائز ہے، جمہور کا مستدل اس مسئلہ کے اندر اس کے بعد والی ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔

حق ولاء کا حکم

{۲۷۵۳} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَعَنْ هِبَتِهٖ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۱/۳۴۴، کتاب العتق، باب بیع الولاء وھبته، حدیث نمبر: ۲۴۶۶، مسلم شریف: ۱/۴۹۵، کتاب العتق، باب النھی عن بیع الولاء وھبته، حدیث نمبر: ۱۵۰۶۔

ترجمه: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے ولاء کی بیع کرنے اور اس کا ہبہ کرنے سے۔

تشریح: ایک شخص نے مثلاً غلام آزاد کیا جس کی وجہ سے حق ولاء اس کے لئے ثابت ہوگیا اب اگر وہ یہ چاہے کہ اس حق ولاء کو کسی کے ہاتھ بیچ دے یا کسی کو ہبہ کر دے تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ ولاء کوئی مال نہیں ہے کہ اس کو بیچا یا ہبہ کیا جاسکے، اس بارہ میں تمام علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے۔ (مظاہر حق: ۳/۵۸۳)

الفصل الثانی

جو نقصان کا ذمہ دار ہے وہی نفع کا حقدار ہے

{۲۷۵۴} **وَعَنْ** مُخَلَّدِ بْنِ خِفَافٍ قَالَ اِبْتَعْتُ غُلَامًا فَاسْتَغْلَلْتُهٗ ثُمَّ ظَهَرْتُ مِنْهُ عَلٰی عَيْبٍ فَخَاصَمْتُ فِيْهِ اِلٰی عُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ فَقَضٰی لِيْ بِرَدِّهٖ وَقَضٰی عَلَيَّ بِرَدِّ غَلَّتِهٖ فَاَتَيْتُ عُرْوَةَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَرُوْحُ اِلَيْهِ الْعَشِيَّةَ فَاُخْبِرُهٗ اَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا اَخْبَرَتْنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰی فِيْ مِثْلِ هٰذَا اَنَّ الْخَرَاجَ بِالضِّمَانِ فَرَاحَ اِلَيْهِ عُرْوَةُ فَقَضٰی لِيْ اَنْ اٰخُذَ الْخَرَاجَ مِنَ الَّذِيْ قَضٰی بِهٖ عَلَيَّ لَهٗ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

حوالہ: شرح سنۃ: ۵/۱۲۲، کتاب البیوع، باب من اشتری عبدا فاستغلہ، حدیث نمبر: ۲۱۱۸،

ترجمہ: حضرت مخلد بن خفاف سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خرید کیا اور پھر میں نے اس کو اجرت (ومزدوری) پر چھوڑ دیا، اس کے بعد اس غلام میں (میں نے) عیب پر اطلاع پائی اور اس معاملہ کو پیش کیا، میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، تو انہوں نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا، اس کو واپس لوٹانے کا اور مجھ پر اس کی آمدنی کے واپس کرنے کا (بھی) فیصلہ کر دیا۔ پھر میں حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوا اور میں نے ان کو اس (معاملہ) کی خبر دی، تو حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ میں شام کے وقت حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاؤں گا اور ان کو خبر دوں گا کہ بے شک ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مجھ کو خبر دی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے قصہ میں فیصلہ (یہ) دیا تھا کہ یقینا خراج (منفعت) ضمان کے بدلہ میں ہے، چنانچہ حضرت عروہ ان کے پاس تشریف لے آئے (اور انہوں نے یہ حدیث بیان کر دی) لہٰذا انہوں نے میرے لئے فیصلہ کیا کہ میں اس شخص سے (غلام کی دی ہوئی) آمد اس سے

009 BabuN

واپس لوں جس کو دیئے جانے کا مجھ پر (اولاً فیصلہ میں) حکم دیا تھا۔

تشریح: منفعت ضمان یعنی تاوان کے ساتھ ہے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اگر وہ خرید نے والے کے پاس مرجاتا یا اس میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ اس خریدار ہی کا نقصان ہوتا بیچنے والے کا کچھ نہیں جاتا، اسی طرح غلام سے کوئی منفعت حاصل ہوگی تو اس کا حقدار خریدار ہی ہوگا بیچنے والے کا اس پر کوئی حق نہیں ہوگا۔

نزاع فی البیع کی صورت میں کس کا قول معتبر ہے؟

{۲۷۵۵} **وَعَنْ** عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ۔ (رواه الترمذی) وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيِّ قَالَ الْبَيِّعَانِ اِذَا اخْتَلَفَا وَالْمَبِيْعُ قَائِمٌ بِعَيْنِهٖ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ الْبَيْعَ۔

حواله: ترمذی شریف: ۱/۲۴۰، ابواب البیوع، باب ماجاء اذا اختلف البیعان، حدیث نمبر: ۱۲۷۰، ابن ماجه شریف: ۱۵۸/۲، ابواب التجارات، باب البیعان یختلفان، حدیث نمبر: ۲۱۸۶، دارمی شریف: کتاب البیوع، باب اذا اختلف المتبایعان۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جب بائع اور مشتری دونوں میں اختلاف ہو تو بائع کا قول معتبر ہوگا اور خریدار کو اختیار رہے (خواہ وہ عقد بمطابق قولِ بائع قائم رکھے یا فسخ کر دے)۔ (ترمذی) اور ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جب بائع اور مشتری دونوں اختلاف کریں اور فروخت شدہ مال اسی حالت پر موجود ہو اور ان دونوں کے درمیان شہادت نہ ہو تو پھر قول وہ معتبر ہوگا جو بائع نے بیان کیا، یا دونوں بیع کو واپس کر لیں، یعنی فسخ کر دیں۔

تشریح: اذا اختلف البیعان: یعنی جب بائع اور مشتری مقدار قیمت میں، یا خیار شرط

میں یا تعیین مدت وغیرہ صفات عقد میں اختلاف کریں تو ایسی صورت میں کس کا قول معتبر ہوگا؟ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بائع کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا، یعنی قسم کھانے کے بعد اس کے قول کا اعتبار کیا جائے گا، پھر مشتری کو اختیار ہوگا چاہے بائع کی اس بات پر راضی ہو جائے اور عقد کو برقرار رکھے اور چاہے تو خود بھی قسم کھائے اور کہے کہ میں نے اس قیمت پر نہیں خریدی جو بائع بتا رہا ہے، اپنی اپنی بات پر قسم کھانے کے بعد بھی اگر ایک دوسرے کی بات پر راضی ہوتے ہیں تو عقد برقرار ہوگا ورنہ قاضی کے حکم سے وہ معاملہ فسخ ہو جائے گا۔

مسئلہ مذکور میں ”مبیع فروخت شدہ چیز بعینہ باقی ہو، یا بعینہ باقی نہ ہو، دونوں صورتوں میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بائع کا قول معتبر ہوتا ہے۔

جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مذکورہ صورت میں اگر مبیع بعینہ موجود نہ ہو بلکہ ہلاک ہوگئی ہو تو دونوں قسم نہیں کھائیں گے، بلکہ اس صورت میں مشتری کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا۔ ”وفی روایة ابن ماجة والدارمی قال البیعان اذا اختلفا والمبیع قائم بعینه ولیس بینهما بینة فالقول ما قال البائع او یترادان البیع“ (طیبی: ۶/۹۳) [بائع اور مشتری جب اختلاف کریں اور مبیع بعینہ موجود ہو اور کوئی گواہ نہ ہو تو بائع کا قول معتبر ہوگا ورنہ دونوں بیع کو لوٹا لیں۔]

اس روایت سے بھی امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ (مرقاۃ: ۶/۹۰)

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مبیع بعینہ باقی ہو اور بائع و مشتری کے درمیان قیمت وغیرہ میں اختلاف ہو جائے اور کسی کے پاس کوئی بینہ نہ ہو تو اس صورت میں بائع سے قسم کھلائی جائے، اگر وہ قسم کھالے تو مشتری کو اختیار ہوگا چاہے بائع کی بات کو تسلیم کرے اور چاہے خود بھی قسم کھائے اور پھر ایک دوسرے کی بات کو تسلیم کریں یا بیع فسخ کر دیں۔

لیکن اگر اختلاف کے وقت فروخت شدہ مال بعینہ باقی نہ ہو تو پھر اس وقت مشتری ہی کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا، بائع سے قسم نہیں کھلائی جائے گی۔ (مرقاۃ: ۶/۹۰)

لیکن یہ تائید مفہوم مخالف کا اعتبار کرنے پر مبنی ہے۔ (نفحات التنقیح: ۳/۴۷۱)

009 BabuN

ایضاً

{۲۷۵۶} وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (رواه ابوداؤد وابن ماجة) وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِیْحِ عَنْ شُرَیْحِ الشَّامِیِّ مُرْسَلًا۔

حواله: ابو داؤد شریف: ۲/۴۹۰، کتاب البیوع، باب فی فضل الاقالة، حدیث نمبر: ۳۴۶۰، ابن ماجه شریف: ۲/۱۵۹، ابواب التجارات، باب الاقالة، حدیث نمبر: ۲۱۹۹، شرح السنه: ۵/۱۲۰، کتاب البیوع، باب الاقالة، حدیث نمبر: ۲۱۱۷،

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بحالت اسلام (عقد بیع کا) اقالہ کرلیا تو اللہ تعالیٰ بروز قیامت اسکے گناہوں سے اقالہ فرمادیں گے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور شرح سنہ میں مصابیح کے الفاظ میں بروایت شریح شامیؒ مرسلاً مروی ہے۔

تشریح: اقاله: بمعنی فسخ، باب افعال سے، اور مجرد میں سمع یسمع سے، قال یقال، فی القاموس: وقلته البیع بالکسر واقلته فسخته، واستقاله طلب الیه ان یقیله۔ (بذل: ۱۱/۱۷۶)

من اقال مسلما اقال الله عثرته: یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص تمام بیع کے بعد اپنے ساتھی سے اقالہ کرلے یعنی بیع کا فسخ کرنا قبول کرلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی لغزشوں کو معاف فرمادیں گے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو شخصوں نے آپس میں بیع وشراء کا معاملہ کیا، معاملہ کی تکمیل کے بعد کسی ایک کو اس پر ندامت ہوئی، بیچ کر یا خرید کر پچھتایا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ اگر تو اس معاملہ کو فسخ کردے تو مہربانی ہوگی، دوسرے نے اس کی اس درخواست کو قبول کرلیا، اس حدیث شریف میں اقالہ قبول کرنے والے کے لئے اس کی لغزشوں کی معافی کی بشارت ہے۔

دیکھئے بیع وشراء کوئی عبادت تو نہیں ہے، ایک مباح کام ہے، جس کو آدمی اپنی ضرورت کے لئے اختیار کرتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص شریعت پر چلے اور حدیثوں کو سامنے رکھے تو مباحات بھی اس کی مغفرت کا ذریعہ بن سکتے ہیں، عبادات کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ الموفق۔

الفصل الثالث

امانت کا سبق آموز واقعہ

{۲۷۵۷} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِشْتَرٰی رَجُلٌ مِمَّنْ كَانَ قَبْلَكُمْ عَقَارًا مِنْ رَجُلٍ فَوَجَدَ الَّذِیْ اِشْتَرَی الْعِقَارَ فِیْ عَقَارِهٖ جَرَّةً فِيْهَا ذَهَبٌ فَقَالَ لَهٗ: الَّذِیْ اشْتَرَی الْعَقَارَ خُذْ ذَهَبَكَ عَنِّیْ اِنَّمَا اشْتَرَيْتُ الْعَقَارَ وَلَمْ اَبْتَعْ مِنْكَ الذَّهَبَ فَقَالَ بَائِعُ الْاَرْضِ اِنَّمَا بِعْتُكَ الْاَرْضَ وَمَا فِيْهَا فَتَحَا كَمَا اِلٰی رَجُلٍ فَقَالَ الَّذِیْ تَحَا كَمَا اِلَيْهِ: اَلَكُمَا وَلَدٌ فَقَالَ اَحَدُهُمَا: لِیْ غُلَامٌ وَقَالَ الْاٰخَرُ لِیْ جَارِيَةٌ فَقَالَ: اَنْكِحُوْا الْغُلَامَ الْجَارِيَةَ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِمَا مِنْهُ وَتَصَدَّقُوْا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۴۹۴/ ۱، کتاب الانبیاء، باب: ۵۴، حدیث نمبر: ۳۳۵۳، مسلم شریف: ۷۷/ ۲، کتاب الاقضیۃ، باب استحباب اصلاح الحاکم بین الخصمین، حدیث نمبر: ۱۷۲۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں سے قبل (گذشتہ امت میں سے) ایک شخص نے کسی سے زمین خریدی، پس زمین کے خریدار کو اس زمین میں سے ایک گھڑا ملا، جس میں سونا تھا، تو خریدار نے اس فروخت کنندہ سے کہا؛ تم مجھ سے اپنا سونا لے لو، کیونکہ میں نے تو محض زمین خریدی تھی اور تم سے سونا نہیں خریدا تھا، زمین کے فروخت کنندہ نے کہا: میں نے تم کو زمین اور زمین میں جو کچھ ہے اس کو (بھی) فروخت کر دیا ہے (لہٰذا میں نہ لوں گا وہ تو تمہارا ہی حق ہے) پس یہ دونوں (خریدار اور فروخت کنندہ) ایک شخص کے پاس برائے فیصلہ گئے، جس شخص کے پاس برائے فیصلہ پہنچے تھے اس نے دریافت کیا: کیا تم دونوں کے اولاد ہے؟ تو ان

میں سے ایک شخص نے کہا: میرے لڑکا ہے اور دوسرے نے کہا: میری لڑکی ہے، اس (ثالث) نے یہ بات کہی کہ تم دونوں لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر دو اور وہ سونا ان دونوں پر صرف کر دو اور (جو مزید بچ رہے تو) اس کو صدقہ کر دو۔

تشریح: یہ واقعہ حضرت داوٗد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، جیسا کہ بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں نے جس شخص کو اپنا حکم و فیصل بنایا تھا وہ حضرت داوٗد علیہ السلام تھے، چنانچہ حضرت داوٗد علیہ السلام نے صدور فیصلہ میں کمال ذہانت و ذکاوت کا ثبوت دیا اور ایسا معتدل و معقول فیصلہ دیا کہ جو نبوت ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بیچنے والے اور خریدنے والے کے درمیان صلح وصفائی کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے، نیز علماء لکھتے ہیں کہ دو مخالف اشخاص میں صلح وصفائی کرانا قاضی وحاکم کے لئے اسی طرح مستحب ہے جس طرح غیر قاضی کے لئے مستحب ہے۔ (مظاہر حق: ۵۸۶/ ۳)

010 BabuS Salam w Rahan

باب السلم والرهن

رقم الحدیث:۲۷۵۸/تا ۲۷۶۵/

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب السلم والرھن

اس میں دوسری لغت سلف ہے، سلف اہل عراق کی لغت ہے، اور سلم اہل حجاز کی، اس بیع کی تعریف یہ کی گئی ہے: ”بیع موصوف فی الذمة“ یعنی بائع مبیع کے اچھی طرح اوصاف وغیرہ بیان کر کے مکمل طریقے سے اور اس کو اپنے ذمہ میں لے کر نقد ثمن کے مقابلہ میں فروخت کرے، اس کی تعریف اس طرح بھی کی جاتی ہے: ”بیع آجل بعاجل“ یعنی شیء مؤجل کی بیع ثمن معجل کے ساتھ، اس بیع کی شریعت نے اجازت دی ہے، خلاف قیاس دفعاً لحاجۃ المفالیس یعنی نادار قسم کے لوگوں کی حاجت وضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ورنہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ بیع جائز نہ ہو، کیونکہ یہ اس شی کی بیع ہے جو غیر موجود عند البائع ہے، اسی لئے اس بیع کی صحت کے لئے بہت سی شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

صحت سلم کی شرائط

چنانچہ قدوری میں ہے: ”ولا یصح السلم عند ابی حنیفة الا بسبع شرائط تذکر فی العقد جنس معلوم، ونوع معلوم، وصفة معلوم، ومقدار معلوم، واجل معلوم، ومعرفة مقدار رأس المال، وتسمیة المکان الذی یوافیه فیه اذا کان له حمل ومؤنة“

اسی طرح جن چیزوں میں یہ بیع جائز ہے وہ بھی متعین ہیں۔ ففی القدوری: ”السلم جائز فی المکیلات والموزونات والمعدودات التی لا تتفاوت کالجوز والبیض وفی المزروعات، ولا یجوز السلم فی الحیوان الی آخرہ“ (ص:۸۴) اس میں بعض اور اختلافی مسائل بھی ہیں، جو آگے احادیث کے ضمن میں آرہے ہیں، جاننا چاہئے کہ بیع سلم میں ثمن کو رأس المال اور مبیع کو مسلم فیہ، بائع

کو مسلم الیہ اور مشتری کو رب المسلم کہتے ہیں۔

رہن کے معنی حبس کے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ”کل نفس بما کسب رھنه“ ای ممنوعه، اور اصطلاح میں رہن کہا جاتا ہے: ”جعل الشیء محبوسا بحق یمکن استیفائه منه“

الفصل الاول

عقد صحت سلم کی شرائط کا بیان

{۲۷۵۸} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُسْلِفُوْنَ فِی الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ وَالثَّلٰثَ فَقَالَ مَنْ اَسْلَفَ فِیْ شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِیْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ اِلٰی اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۲/۲۹۸، کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم، حدیث نمبر: ۲۱۸۸، مسلم شریف: ۲/۵۰، کتاب المساقات، باب السلم، حدیث نمبر: ۱۷۲۱۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور مدینہ طیبہ کے باشندے پھلوں میں ایک سال اور دو سال اور تین سال تک کے لئے عقد سلم کیا کرتے تھے، تو آنحضرت ﷺ نے (ان لوگوں سے) فرمایا: اگر کوئی شخص کسی چیز میں عقد سلم کرے تو کیل معلوم اور وزنِ معلوم میں عقد سلم مدت معلوم تک کرے۔

تشریح: بیع سلم کے جواز پر تو اتفاق ہے، بشرطیکہ تمام شرائط جواز پائی جائیں، شرائط جواز کچھ اتفاقی ہیں اور کچھ اختلافی ہیں، مذکورہ حدیث شریف میں دو شرطوں کی طرف اشارہ ہے:

(۱)......کیل اور وزن کا معلوم ہونا۔

(٢)......ادائیگی کی مدت کا متعین ہونا۔

اور مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی بیع سلم کی جارہی ہو "مسلم فیہ" اگر وہ پیمانہ سے ناپ کر دی جاتی ہے تو اس کا پیمانہ متعین کرنا ضروری ہے، یہ چیز پانچ پیمانے کے برابر ہوگی یا دس پیمانے کے برابر اور اگر وہ چیز "مسلم فیہ" وزن کے ذریعہ دی جاتی ہے تو اس کا وزن متعین کرنا ضروری ہے کہ یہ چیز اتنے سیر ہوگی۔

اسی طرح مسلم فیہ یعنی بیع سلم میں خریدی جانے والی چیز کی ادائیگی کی مدت کا تعین بھی ضروری ہے کہ یہ چیز ایک ماہ بعد دی جائے گی یا ایک سال کے بعد۔

اِلٰی اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ: یہ شرط ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک "مسلم فیہ" کی ادائیگی کے وقت کا متعین ہونا صحت سلم کے لئے شرط ہے، لہٰذا بیع سلم میں تاجیل ضروری ہے، یعنی مسلم فیہ کے لئے وقت کا تعین ضروری ہے، اسی وجہ سے بیع سلم حالاً نہیں ہوسکتی بلکہ مؤجلاً ہوگی۔

جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس شرط پر بیع سلم کی صحت موقوف نہیں اور اجل کا ذکر اس حدیث شریف میں اس لئے نہیں آیا کہ یہ جواز عقد کے لئے شرط ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر بیع سلم مؤجلاً منعقد کی جائے تو اجل معلوم ہونی چاہئے اور ظاہر بات ہے کہ جب بیع سلم مؤجلاً ہوسکتی ہے تو حالاً بطریق اولیٰ ہوسکتی ہے، کیونکہ اس میں دھوکہ سے زیادہ حفاظت ہے۔ (طیبی: ٦/٩٥)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس استدلال کا جواب ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ "سلم اور سلف" کے معنی یہ ہیں کہ ایک عوض تعجیل سے دیا جائے اور دوسرا عوض تاخیر سے، اور پھر بیع سلم کو خلاف القیاس رخصت کے طور پر لوگوں کے لئے نرمی کرنے کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے، جبکہ نرمی اسی صورت میں ہے کہ بیع مؤجلاً ہو نہ کہ حالاً، لہٰذا لفظی اور شرعی دونوں اعتبار سے بیع سلم میں تاجیل "یعنی مسلم فیہ کی ادائیگی کے وقت کا متعین کرنا ضروری ہے۔ (المغنی: ٤/١٩٣، نفحات التنقیح: ٣/٤٧٣)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ذرہ کو رہن رکھنا

{٢٧٥٩} وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ اِشْتَرٰى

رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا مِنْ يَّهُوْدِيٍّ إِلٰى أَجَلٍ وَرَهَنَهٗ دِرْعًا لَهٗ مِنْ حَدِيْدٍ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۲۹۸، کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم، حدیث نمبر: ۲۱۸۸، مسلم شریف: ۲/۳۱، کتاب المساقاۃ، باب الرھن وجوازہ فی الحضر کالسفر، حدیث نمبر: ۱۵۰۴۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے غلہ ایک وقت مقررہ تک کے لئے خریدا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کے پاس اپنے لوہے کی ذرہ بطور رہن رکھی۔

تشریح: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں تنگدستی اور قلت مال اور فقر وفاقہ کو اپنا کر توکل علی اللہ اور مال وزر سے کلیۃً بے رغبتی کا ثبوت دیا۔

حدیث مذکور سے جمہور نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ رہن رکھنا حضر میں بھی جائز ہے، جیسا کہ سفر میں جائز ہے۔

امام مجاہد، داؤد ظاہری اور اہل ظواہر رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک صرف سفر میں رہن رکھنا جائز ہے، حضر میں جائز نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں رہن رکھنے کے لئے سفر کی قید لگائی گئی ہے۔

"وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ" (البقرہ: ۲۸۳)

[اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا سو رہن رکھنے کی چیزیں ہیں جو قبضہ میں دیدی جائیں۔]

جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ سفر کی قید احترازی نہیں، چونکہ عادۃً رہن سفر میں رکھوایا جاتا ہے، اس وجہ سے سفر کا ذکر کیا ہے، لہٰذا آیت کریمہ کے مفہوم سے اس بات پر استدلال کرنا صحیح نہیں کہ رہن صرف سفر میں ہوتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک تو ظاہر ہے کہ مفاہیم حجت نہیں اور شافعیہ کے نزدیک اس مفہوم کا اس لئے اعتبار نہیں کہ اس کے ساتھ منطوق یعنی حدیث مذکور معارض ہے اور ظاہر ہے کہ منطوق مفہوم پر راجح ہوتا ہے۔

نیز حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل ذمہ کے پاس مسلمانوں کا ہتھیار یا سامان جنگ گروی رکھنا جائز ہے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۱/۶۵۰)

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ یہودی سے کیا اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہیں کیا تو یا بیان جواز کے لئے ایسا کیا ہے کہ اہل ذمہ کے ساتھ یہ معاملات جائز ہیں۔

یا اس لئے کہ اس وقت ضرورت سے زائد غلہ اس شخص کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھا اور یا اس لئے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ رہن لیتے اور نہ ہی قیمت وثمن کا مطالبہ کرتے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ یہودی سے کیا تاکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنگی نہ آئے۔

اور اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اہل ذمہ اور کفار کے ساتھ معاملات کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان کے مال کا حرام ہونا متحقق اور ثابت نہ ہو۔

البتہ کفار کے ہاتھ اسلحہ اور سامان جنگ اسی طرح ہر وہ چیز بیچنا جس سے ان کے مذہب اور دین کو تقویت ملتی ہو جائز نہیں۔ اس کے علاوہ مصحف شریف اور عبد مؤمن کا بیچنا بھی کفار کے ہاتھ جائز نہیں۔ (طیبی: ۶/۹۶، نفحات التنقیح: ۴/۴۷۴)

ایضاً

{۲۷۶۰} **وَعَنْهَا** قَالَتْ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدِرْعُهٗ مَرْهُوْنَةٌ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ بِثَلَاثِيْنَ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ۔ (رواه البخاری)

حواله: بخاری شریف: ۱/۴۰۹، کتاب الجهاد، باب ما قیل فی درع النبی صلی الله علیه وسلم والقمیص فی الحرب، حدیث نمبر: ۲۸۲۸،

ترجمه: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اس حالت میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرع ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کی وجہ سے

رہن رکھی ہوئی تھی۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

انتفاع رہن کا مسئلہ

{۲۷۶۱} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الظَّهْرُ یُرْکَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا کَانَ مَرْهُوْنًا وَلَبَنُ الدَّرِّ یُشْرَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا کَانَ مَرْهُوْنًا وَعَلَی الَّذِیْ یَرْکَبُ وَیَشْرَبُ النَّفَقَةُ۔

(رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف:۱/۳۴۱، کتاب الرھن، باب الرھن مرکوب ومحلوب، حدیث نمبر:۲۴۴۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سواری والے جانور پر خرچ کرنے کی وجہ سے سواری کی جاسکتی ہے جب کہ وہ سواری رہن رکھی گئی ہو، اور تھنوں کا دودھ پیا جاسکتا ہے، اس پر خرچ کرنے کی وجہ سے جب کہ وہ جانور رہن رکھا ہوا ہو اور سوار ہونے والے اور دودھ پینے والے پر نفقہ واجب ہے۔

تشریح: انتفاع بالمرھون: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''مرہون'' چیز کو مہمل اور بے فائدہ نہیں چھوڑنا چاہئے، بلکہ اس پر خرچہ کرکے اس کے منافع سے استفادہ کرنا چاہئے۔ (طیبی:۶/۹۷)

باقی یہ کہ فائدہ کون اٹھائے گا راہن ''مدیون'' یا مرتہن ''دائن'' تو اس میں اختلاف ہے۔

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ رہن کا نفع مطلقاً راہن کے لئے ہے اور اس کا خرچہ بھی اسی کے ذمہ ہے، اس لئے کہ اصل یعنی مرہون چیز اسی کی ہے تو اس کی فروع یعنی نفع اور فائدہ بھی اصل کے تابع ہونے کی وجہ سے اسی کے لئے ہوگا اور یہ مسلم ضابطہ ہے کہ ''الغرم بالغنم''

چنانچہ اگر کوئی غلام مرہون مرجائے تو بالاتفاق اس کا کفن راہن پر ہوگا نہ کہ مرتہن پر، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے رہن میں مرتہن کا صرف یہ حق ہے وہ دین اور قرض کے حصول تک وہ چیز روکے رکھے، لیکن

اس میں کسی قسم کے تصرف کا اس کو حق نہیں۔(بحوالہ بالا)

اس بات کی تائید حضرت ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے:

"عن ابی ہریرۃ انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یغلق الرھن من صاحبہ الذی رھنہ لہ غنمہ وعلیہ غرمہ" (بیہقی:۳۹/۶)

جبکہ امام احمد اور امام اسحق رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سواری یا دودھ والا جانور رہن رکھے تو مرتہن اس سے سواری یا دودھ کا فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ البتہ سواری اور دودھ کے علاوہ کوئی اور استفادہ نہیں کرسکتا۔

اور ان کا استدلال حدیث مذکور سے ہے، اور طریق استدلال یہ ہے کہ حدیث منطوق سے یہ ثابت ہوا کہ خرچ کرنے کی وجہ سے نفع اٹھاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مرتہن کے لئے ہے، راہن کا نفع اٹھانا تو خرچ کرنے کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ملکیت کی وجہ سے ہوتا ہے کہ مرہون شی اس کی ملک ہے۔

اور حدیث شریف کے مفہوم سے یہ ثابت ہوا کہ خرچ کرنے کی وجہ سے صرف دو قسم کا "سواری اور دودھ" کا فائدہ اٹھاسکتا ہے، کسی اور قسم کا استفادہ نہیں کرسکتا، جبکہ یہ بات بھی مرتہن کے لئے ہے، کیونکہ راہن تو رہن سے ملکیت کی بنا پر ہر قسم کا نفع اٹھاسکتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ مرتہن، مرہون چیز سے سواری یا دودھ کا استفادہ اس جانور کا خرچہ اپنے ذمہ لے کر کرسکتا ہے، تو مرتہن جب یہ استفادہ کرے گا تو اس پر خرچہ کرنا بھی واجب ہوجائے گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث آیت ربا سے منسوخ ہوگئی ہے، کیونکہ مرتہن کا مرہون چیز سے انتفاع حاصل کرنا قرض اور دین کی وجہ سے ہے اور قرض سے نفع حاصل کرنا سود ہے۔ "کل قرض جر نفعا فھو ربا" (طیبی:۶/۹۷)

اسی لئے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو قبل تحریم الربوا پر محمول کیا ہے کہ اس وقت سود حرام نہیں تھا اور قرض سے فائدہ حاصل کرنا مباح تھا۔(شرح معانی الآثار:۲/۲۷۸)

اور مرتہن کا رہن سے نفع حاصل کرنا اس لئے ربوا ہے کہ مرتہن "دین" قرض بھی پورا حاصل کرے گا اور یہ زائد نفع بھی حاصل کرے گا تو یہ نفع ایک اضافی چیز ہوگی، جس کی وجہ سے سود لازم آتا ہے کہ بلاعوض

استفادہ کررہا ہے، لہٰذا مرتہن کا نفع حاصل کرنا قواعد شرعیہ اساسیہ کے رو سے حرام ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ "بنفقتہ" میں "با" بدلیت کے لئے نہیں، بلکہ معیت کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ مرہون چیز پر سواری بھی ہوگی اور سواری کے ساتھ خرچہ بھی ہوگا، گویا کہ نہ تو راہن کو مرہون چیز کے استفادے سے منع کیا جائے گا اور نہ راہن سے مرہون چیز کا خرچہ ساقط ہوگا، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہی جواب اولیٰ ہے۔ (طیبی: ۶/۹۷)

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ راہن کو یہ جانور ایسے انداز سے دینا چاہئے کہ دوسرا اس سے نفع حاصل کر سکے، گویا کہ راہن کی طرف سے وہ چیز مرتہن کے پاس عاریت کے طور پر رکھی جائے، جس سے استفادہ کرنا جائز ہے نہ کہ رہن کے طور پر جس سے انتفاع جائز نہیں۔ (الکوکب الدری: ۳۶۶/ انفحات التنقیح: ۳/۴۷۵)

الفصل الثانی

ایضاً

{۲۷۶۲} وَعَنْ سَعِيْدِ ابْنِ الْمُسَيِّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَغْلِقُ الرَّهْنُ الرَّهْنَ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِيْ رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ. (رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ مُرْسَلاً) وَرُوِيَ مِثْلُهُ اَوْ مِثْلُ مَعْنَاهُ لَا يُخَالِفُ عَنْهُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ مُتَّصِلًا۔

حوالہ: مسند شافعی: کتاب البیوع، باب الرھن الصغیر۔

ترجمہ: حضرت سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا: رہن رکھ دینا رہن کو اس کے اس مالک سے منع نہیں کرتا، جس نے اس رہن کو دین رکھا ہے، اس مرہون کی زیادتی (یعنی نفع) راہن کے لئے ہے اور اس کا نقصان (بھی) اسی پر ہے۔ (مسند شافعی مرسلاً) اور اسی کے مثل یا اس کے معنی کے مطابق جو کہ اس کے خلاف نہیں بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ متصلاً مروی ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کے پاس رہن رکھ دے تو اس کا یہ رہن رکھنا اس چیز کی ملکیت کو ختم نہیں کرتا، بلکہ وہ چیز جوں کی توں راہن کی ملکیت میں رہتی ہے، اسی لئے حدیث شریف میں اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس رہن رکھی ہوئی چیز سے اگر کوئی نفع حاصل ہوتا ہے یا اس میں کوئی بڑھوتری ہوتی ہے تو وہ راہن ہی کا حق ہے بایں طور کہ اگر اس چیز کا کرایہ آتا ہے تو راہن وہ کرایہ وصول کر سکتا ہے، اگر وہ کوئی جانور ہے تو اس پر سوار ہو سکتا ہے، یا اسے اپنی بار برداری میں استعمال کر سکتا ہے، ایسے ہی اگر اس جانور کے بچے پیدا ہوں تو وہ بچے بھی راہن ہی کا حق ہوتے ہیں، پھر جس طرح راہن رہن رکھی ہوئی چیز کے منافع کا حقدار ہوتا ہے اسی طرح اس کے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے، بایں طور کہ اگر وہ چیز مرتہن کے یہاں ہلاک وضائع ہو جاتی ہے تو اس کا نقصان راہن ہی برداشت کرتا ہے، اس کی وجہ سے مرتہن کے حق (یعنی جو قرض وغیرہ اس نے راہن کو دیا ہے) میں سے کچھ بھی ساقط نہیں ہوتا بلکہ راہن کو پورا پورا قرض واپس کرنا ہوتا ہے۔

لفظ ''رُوِیَ'' مشکوۃ کے بعض نسخوں میں صیغۂ معروف کے ساتھ یعنی ''رَوَیٰ'' منقول ہے، اس صورت میں اس کے فاعل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہوں گے اور لفظ ''مثلہ'' اور ''مثل'' منصوب ہی رہیں گے۔ (مظاہر حق: ۳/۵۲۰)

مکیال اور میزان کا حکم

{۲۷۶۳} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْمِكْيَالُ مِكْيَالُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَالْمِيْزَانُ مِيْزَانُ

اَھْلِ مَکَّۃَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۲۷۴، کتاب البیوع، باب فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم المکیال مکیال المدینۃ، حدیث نمبر: ۳۳۴۰۔ نسائی شریف: ۲۷۰/۱، کتاب الزکوۃ، کم الصاع، حدیث نمبر: ۲۵۲۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مکیال (تو معتبر ہے) اہل مدینہ کا اور میزان (معتبر ہے) اہل مکہ کا۔

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ حقوق شرعیہ مثلاً زکوۃ وغیرہ میں لین دین کے لئے پیمانہ میں اہل مدینہ کے پیمانہ کا اعتبار ہے اور وزن میں اہل مکہ کے وزن کا اعتبار ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے پیمانوں اور اوزان میں کچھ فرق واختلاف تھا، مدینہ طیبہ کے پیمانہ اور وزن کی مقدار کچھ اور تھی اور مکہ مکرمہ کے پیمانہ اور وزن کی کچھ اور، اس کی وجہ سے حقوق شرعیہ یعنی زکوۃ وصدقۂ فطر وغیرہ میں لینا دینا خلجان کا باعث بنتا ہوگا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا ہدایت جاری فرمائی، گویا اس کا حاصل یہ تھا کہ مثلاً درہموں میں زکوۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ وہ مکہ مکرمہ کے وزن کے مطابق دوسو ہوں گے اور صدقۂ فطر و دیگر صدقات واجبہ میں اہل مدینہ کا صاع معتبر ہوگا۔

مدینہ طیبہ کے وزن کے مقابلہ میں مکہ مکرمہ کے وزن کو اور مکہ مکرمہ کے پیمانہ کے مقابلہ میں مدینہ طیبہ کے پیمانہ کو ترجیح دینے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں وہاں غلہ کا لین دین پیمانہ ہی کے ذریعہ ہوا کرتا تھا اور اہل مدینہ چونکہ زراعت پیشہ تھے اس لئے انہیں پیمانوں کے بارہ میں زیادہ واقفیت رہا کرتی تھی اور اوزان کا استعمال چونکہ تجارت میں زیادہ ہوتا ہے اور اہل مکہ کے تجارت پیشہ تھے اس لئے وہ اوازن کی واقفیت زیادہ رکھتے تھے۔ (مظاہر حق: ۳/۵۲۰)

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے وعید

{۲۷۶۴} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِ الْکَیْلِ وَالْمِیْزَانِ اِنَّکُمْ قَدْ

وُلِّيْتُمْ اَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيْهِمَا الْاُمَمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ ۔ (رواه الترمذی)

حواله: ترمذی شریف: ۱/۲۳۰، ابواب البیوع، باب ماجاء فی المکیال والمیزان، حدیث نمبر:۱۲۱۷۔

ترجمه: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیل اورمیزان والوں سے ارشادفرمایا: بے شک تم لوگ ایسے دوامور کے زمہ دار بنائے گئے ہوکہ ان میں مبتلا ہوکرتم سے قبل کی گذشتہ امتیں ہلاک ہوگئی ہیں۔

تشریح: امت محمدیہ سے قبل کچھ ایسی قومیں گذری ہیں جن کے افراد اس بدترین خصلت میں مبتلا تھے کہ جب وہ کوئی چیزلوگوں سے لیتے تھےتو اسے پورا پورا ناپتے تولتے تھے،مگر جب کسی کوکوئی چیز دیتے تھےتو اس کی ناپ تول میں کمی کردیتے تھے،ان کی اس عام برائی کی وجہ سے ان پراللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوااوروہ تہس نہس کردیئے گئے،ایسی قوموں میں سرفہرست حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا نام آتاہے،اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے افرادکومتنبہ کیا کہ تم ناپنے تولنے میں کمی کرنے سے پوری طرح اجتناب کروتاکہ اس لعنت میں مبتلا ہونے کی وجہ سےکہیں تم بھی خداکے قہر وغضب کا شکارنہ ہوجاؤ۔(مظاہرحق:۳/۵۲۱)

الفصل الثالث

بیع سلم میں مبیع کو قبل القبض فروخت کرنا

{۲۷۶۵} وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَسْلَفَ فِیْ شَیْئٍ فَلَا یَصْرِفُہٗ اِلٰی غَیْرِہٖ قَبْلَ اَنْ یَقْبِضَہٗ۔ (رواہ ابوداؤدوابن ماجۃ)

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۲/ ۴۹۱، کتاب البیوع، باب السلف لا یحول، حدیث نمبر: ۳۴۶۸، ابن ماجہ شریف: ۱۶۵/ ۲، ابواب التجارات، باب من اسلم فی شیء فلا یصرفہ الی غیرہ، حدیث نمبر: ۲۲۸۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی چیز میں عقد سلم کیا ہے تو اس کو کسی دوسرے شخص کی جانب منتقل نہ کرے اس پر قبضہ سے قبل۔

تشریح: اس حدیث شریف کے مطلب میں دو احتمال ہیں:

اول یہ کہ جس شخص نے جس شخص کے ساتھ کسی شی میں بیع سلم کا معاملہ کیا تو اس معاملہ کرنے والے کے لئے یعنی مشتری کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ اس شی مسلم فیہ کو اپنے غیر کی طرف منتقل کرے، باعتبار بیع یا ہبہ کے، یعنی قبل القبض کوئی دوسری چیز نہ لے، یعنی مسلم فیہ کا استبدال کسی دوسری شی کے ساتھ قبل القبض کرنا جائز نہیں، اگر رب السلم مسلم فیہ کے عوض میں کوئی دوسری شی لینا چاہے تو شی اول پر قبضہ کرنے سے پہلے یہ استبدال جائز نہیں، قبضہ کے بعد اختیار ہے، احتمال اول کی صورت میں ''غیرہ'' کی ضمیر ''من'' کی طرف راجع ہوگی۔ ''فی قولہ: من اسلف'' اور دوسری صورت میں یہ ضمیر شی کی طرف راجع ہوگی، جس سے مراد مسلم فیہ ہے، مشہور یہ ہے کہ مسلم فیہ میں استبدال قبل القبض جمہور و منہم الحنفیہ کے نزدیک جائز نہیں، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس مسئلہ میں جمہور کی دلیل ہے۔ (الدر المنضود: ۴۰۰/ ۵)

011 Babul Ahtikar

باب الاحتکار

رقم الحدیث:۲۷۶۶/تا۲۷۷۲/

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الاحتکار

احتکار کی حقیقت وتعریف

احتکار جس کی حدیث کے اندر ممانعت ہے، اس کی تعریف امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھی ہے کہ غلہ کو غلاء اور گرانی کے زمانہ میں تجارت کی نیت سے خرید کر رکھ لینا اور فی الحال اس کی بیع نہ کرنا مزید گرانی کے انتظار میں تاکہ پیسے زیادہ حاصل ہوں، اور ممانعت اس صورت میں ہے جبکہ اس غلہ کو اپنے ہی شہر سے خرید کر روک لے، اور اگر کسی اور جگہ سے خرید کر لایا ہے، یا سستے کے زمانہ میں خرید کر رکھ لیا ہو اور پھر اس کو روک لے، اور اگر کسی اور جگہ سے خرید کر لایا ہے، یا سستے کے زمانہ میں خرید کر رکھ لیا ہو اور پھر اس کو روک لے گرانی کے زمانہ میں فروخت کرنے کے لئے، اس میں کچھ حرج نہیں ہے، یہ احتکار ممنوع نہیں ہے، اور بدائع میں لکھا ہے کہ احتکار یہ ہے کہ اپنے شہر سے غلہ خرید کر رکھ لینا اور اس کو فروخت نہ کرنا، جبکہ اہل شہر کو ایسا کرنے سے نقصان پہنچ رہا ہو اور اگر بڑا شہر ہو جہاں ایسا کرنے سے لوگوں کو نقصان نہ پہنچتا ہو تو یہ احتکار ممنوع نہیں ہے، ایسے ہی اگر کسی دور دراز علاقہ سے غلہ خرید کر اپنے شہر میں لا کر اس کو روک لے تب بھی احتکار نہ ہوگا، ہاں اگر شہر کے قریب کسی بستی سے لا کر جس کا غلہ اس شہر میں آتا ہو روک کر رکھے اور شہر بھی صغیر ہو تب محتکر ہوگا۔ یہ تو احتکار ممنوع کی تعریف ہوئی۔

احتکار کن کن چیزوں میں منع ہے؟

دوسرا مسئلہ یہاں پر یہ ہے کہ احتکار کن کن چیزوں میں ممنوع ہے؟ یہ مسئلہ مشہور اختلافی ہے، امام شافعی واحمد رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک "مافیه عیش الناس واقوات البشر" یعنی جس چیز پر آدمی کی زندگی

کامدار ہو، جس کو عام طور سے لوگ کھا کر زندگی بسر کرتے ہوں، اور طرفین (امام ابوحنیفہ ومحمد) کے نزدیک "مافیہ عیش الناس وعیش البھائم" یعنی انسانوں اور جانوروں دونوں کی غذا اور خوراک میں۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فی کل شی غیر الفواکہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "فی کل ماتعم الحاجۃ الیہ" یعنی تمام وہ چیزیں جو عام حاجت اور ضرورت کی ہوں۔

الفصل الاول

{۲۷۶۶} **وَعَنْ** مَعْمَرٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَکَرَ فَهُوَ خَاطِیٌٔ (رواه مسلم) وَسَنَذْکُرُ حدِیْثَ عُمَرَ رضی الله عنه "کَانَتْ اَمْوَالُ بَنِی النَّضِیْرِ فِی بَابِ الْفَیْءِ" اِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالٰی۔

حوالہ: مسلم شریف: ۳۱/۲، کتاب المساقاۃ، باب تحریم الاحتکار فی الاقوات، حدیث نمبر: ۱۶۰۵۔

ترجمہ: حضرت معمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے گرانی کے انتظار میں ذخیرہ اندوزی کی اس نے گناہ کا ارتکاب کیا۔

اور عنقریب "باب الفیٔ" میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث "کانت اموال بنی النضیر" ان شاء اللہ تعالیٰ نقل کریں گے۔

تشریح: احتکار کے لغوی معنی ہیں: "احتباس الشی انتظار الغلائہ" یعنی گراں فروشی کی نیت سے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرنا۔

اور شرعی اصطلاح میں: "اشتراط طعام ونحوہ وحبسہ الی الغلائ" یعنی طعام یا ایسی چیز جو انسان یا حیوان کی غذائی ضرورت میں کام آتی ہو مہنگا بیچنے کی غرض سے خرید کر روکے رکھنا۔ (شامی: ۵/۲۸۲)

جمہور ائمہ کے نزدیک احتکار مطلقاً حرام نہیں، بلکہ صرف "اقوات" میں احتکار مراد ہے، یعنی وہ چیزیں جو اس علاقے میں طعام اور غذا کے طور پر استعمال ہوتی ہوں ان ہی کا احتکار حرام ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وہ احتکار حرام ہے جس میں تین شرائط ہوں:

(۱)......ایک شرط یہ کہ وہ مال اسی شہر سے خریدا گیا ہو، اگر باہر سے دوسرے شہر سے منگوایا ہو یا خریدا نہیں بلکہ اپنی زمین کی پیداوار ہو تو اس کی ذخیرہ اندوزی اور احتکار حرام نہیں۔

(۲)......دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مال ''اقوات'' طعام اور بنیادی غذا کے قبیل سے ہو، اگر زائد چیز ہے جیسے شہد یا زیتون کا تیل یا چوپایوں کا چارہ تو اس میں احتکار حرام نہیں۔(اگر چہ ''بہائم'' چوپائیوں کی خوراک کا احتکار حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے)۔

(۳)......تیسری شرط یہ ہے کہ اس احتکار سے ضرر عام لازم آئے اور ضرر دو صورتوں میں آتا ہے ایک تو یہ کہ چھوٹے شہر میں ذخیرہ کرنے سے لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تنگدستی کے وقت جب کوئی قافلہ آجائے اور خوشحال و مالدار لوگ تنگ دستی کی اس حالت میں غلے کو خرید کر قیمت بڑھانے کے لئے لوگوں پر سختی کریں اور مال ذخیرہ کریں، لیکن اگر فراوانی کی حالت میں کچھ خریدا ہے اور پھر زیادہ قیمت ملنے کے انتظار میں ذخیرہ کرے تو حرام نہیں۔(المغنی: ۱۵۴/۴)

البتہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احتکار صرف طعام و اقوات کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر وہ چیز جس سے عوام پر تنگی آتی ہو اس کا ذخیرہ کرنا جائز نہیں۔(شامی: ۲۸۲/۵ نفحات التنقیح: ۴۷۷/۳)

الفصل الثانی

تاجر اور محتکر میں فرق

{۲۷۶۷} وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْجَالِبُ مَرْزُوقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُونٌ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۵۶/۲، ابواب التجارات، باب الحکرۃ و الجلب، حدیث نمبر: ۲۱۵۳۔

دارمی شریف: ۳۲۳/۲، کتاب البیوع، باب النہی عن الاحتکار، حدیث نمبر: ۲۰۴۳

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سوداگر (جو کہ غلہ کو شہر میں لے جا کر فروخت کرے اور اسی طرح اور دیگر اموال تو) وہ رزق عنایت کیا جاتا

ہے اور احتکار کرنے والا شخص ملعون ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کہیں باہر سے شہر میں غلہ وغیرہ لاتا ہے کہ اسے موجودہ اور رائج نرخ پر فروخت کرے اور گراں فروشی کی نیت سے اس کی ذخیرہ اندوزی نہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے، یعنی اسے بغیر گناہ کے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے رزق میں برکت عطا کی جاتی ہے، اس کے برخلاف مخلوقِ خدا کی پریشانیوں اور غذائی قلت سے فائدہ اٹھا کر غلہ وغیرہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہگار ہوتا ہے اور خیر و بھلائی سے دور رہتا ہے، جب تک وہ اس لعنت میں مبتلا رہتا ہے اس کو برکت حاصل نہیں ہوتی۔

کیا حاکم کا قیمت مقرر کرنا درست ہے؟

{۲۷۶۸} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ غَلَا السِّعْرُ عَلٰی عَھْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللہِ! سَعِّرْ لَنَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللہَ ھُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَاِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَلْقٰی رَبِّیْ وَلَیْسَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ یَطْلُبُنِیْ بِمَظْلِمَۃٍ بِدَمٍ وَلَا مَالٍ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۴۵، ابواب البیوع، باب ماجاء فی المخابرۃ والمعاومۃ، حدیث نمبر: ۲۳۱۴، ابوداؤد شریف: ۲/۴۸۹، کتاب البیوع، باب فی التسعیر، حدیث نمبر: ۳۴۵۱، ابن ماجہ: ۱۵۹، ابواب التجارات، باب من کرہ ان یسعر، حدیث نمبر: ۲۲۰۰۔ دارمی: ۲/۳۲۴، کتاب البیوع، باب النھی عن ان یسعر فی المسلمین، حدیث نمبر: ۲۵۴۵۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھاؤ تیز ہوگیا، (یعنی خوب گرانی ہوگئی) حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ہمارے لئے قیمت مقرر فرما دیجئے، پس حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر فرماتے ہیں، وہ تنگی کرنے والا، کشادگی کرنے والا اور رزق دینے والا ہے، اور یقیناً میں امید کرتا ہوں کہ میں اپنے رب سے اس طرح ملاقات کروں کہ تم لوگوں میں سے کوئی شخص (بھی) اپنے کسی

خون کا حق اور نہ کسی مال کا حق مجھ سے مطالبہ کرتا ہو۔

تسعیر کا حکم

تشریح: اس حدیث شریف کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں چیزوں کے نرخ بڑھ گئے، تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ چیزوں کے نرخ مقرر کر دیئے جائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اصل نرخ مقرر کرنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہے، وہی نرخ زیادہ کرتے وہی کم کرتے ہیں۔ (میں لوگوں کے مال میں بلاوجہ دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا) میں چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ سے اس حال میں ملوں کہ کسی کے خون یا مال کا مطالبہ میرے ذمہ میں نہ ہو۔

اصل اسلامی اصول یہی ہے کہ حکومت کو اشیاء کے نرخ مقرر نہیں کرنے چاہئیں، بلکہ تجارت کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے، طلب و رسد کے فطری معاشی قانون کی وجہ سے نرخ خود ہی مناسب طریقے سے کم و بیش ہوتے رہیں گے، نرخ مقرر کرنا لوگوں کے مال میں بلاوجہ تصرف ہے، جس کی اسلام میں اجازت نہیں، البتہ اگر کچھ لوگ اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھانے لگ جائیں اور حق تعالیٰ کے بنائے ہوئے فطری قانون سے روگردانی کرنے لگ جائیں، چیزوں کے نرخ تاجروں کے مخصوص طبقہ کی منشاء کے مطابق کم و بیش ہونے لگیں اور تسعیر کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو تو ضرورت کی وجہ سے حکومت دخل اندازی کر کے نرخ مقرر کر سکتی ہے۔ لیکن یہ تسعیر اسی وقت تک ہونی چاہئے جب تک ضرورت ہو بلا ضرورت تسعیر جائز نہیں۔ ''لان الضرورات تتقدر بقدر الضرورۃ''

قیمتوں کو کم کرنے کے لئے صحیح اسلامی طریق یہ ہے کہ تاجروں میں مسابقت و مقابلہ کی فضاء بنائی جائے، چیزوں کی فراوانی کے اسباب پیدا کئے جائیں، تجارت پر مخصوص طبقہ کی اجارہ داری نہ ہونے دی جائے، نئے تاجروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ (اشرف التوضیح: ۳/۴۰۶)

ذخیرہ اندوزی کا نقصان

{۲۷۶۹} **وَعَنْ** عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ احْتَكَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ طَعَامَهُمْ ضَرَبَهُ اللهُ بِالْجُذَامِ وَالْإِفْلَاسِ۔ (رواہ ابن ماجة والبیھقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابہ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱/۱۵۶، ابواب التجارات، باب الحکرۃ والجلب، حدیث نمبر: ۲۱۵۵، بیھقی فی شعب الایمان: ۷/۵۲۶، باب فی ان یحب المسلم لاخیہ، فصل فی ترک الاحتکار، حدیث نمبر: ۱۱۲۱۷، رزین: لم اجدہ،

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے، جس شخص نے مسلمانوں پر ان کے غلہ کا احتکار کیا تو اللہ تعالیٰ اس پر جذام (کی بیماری) اور افلاس نازل کردیں گے۔

تشریح: اس حدیث میں احتکار کو مخصوص فرمایا ہے ''طعام'' کے ساتھ، یہ حدیث (اور اس جیسی تخصیص کے ساتھ والی احادیث) جماہیر علماء اور حضرات ائمہ ثلاث کی دلیل ہے، لہٰذا جس روایت میں طعام کی قید مذکور نہیں ہے اس کو بھی دوسری روایات کی وجہ سے مقید کیا جائے گا۔

وعید شدید

احتکار کرنے والوں پر یہ سخت ترین مرض جذام مسلط ہوگا اور چونکہ ان کے اموال اور ایسی حرام تجارت میں خیر وبرکت نہ ہوگی تو ''افلاس'' بھی مسلط ہوگا۔ اس پر بدنی اور مالی مصائب کے ساتھ ابتلاء ہوگا، فساد اور زوال آئے گا جو درحقیقت ''خدائی مار'' اور لعنت خداوندی ہے۔

خلاصہ کلام: انسان جب کسی بڑے مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو (خاص کر بڑے مالدار) علاج پر کثیر مال خرچ کرتے ہیں اور یہ بھی ان کے افلاس کا سبب ہوتا ہے اور مذکورہ مرض کی وجہ سے لوگ نفرت کرتے ہوئے ایسے مریض سے دور رہتے ہیں۔

کیا احتکار کے لئے کوئی مدت ہے؟

{۲۷۷۰} وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

اللہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَکَرَ طَعَامًا اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا یُرِیْدُ بِہِ الْغَلَاءَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللہِ وَبَرِئَ اللّٰہُ مِنْہُ۔ (رواہ رزین)

حوالہ: رزین: لم اجدہ،

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس روز تک بھاؤ کے بڑھ جانے کے خیال سے غلہ کا احتکار کیا تو وہ اللہ تعالیٰ (کی حفاظت) سے بری ہوگیا اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہو گئے۔

تشریح: فقد برئ من اللہ: [وہ خدا سے بیزار رہوا] کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا وہ عہد توڑ ڈالا جو اس نے احکام شریعت کی بجا آوری اور مخلوق خدا کیساتھ ہمدردی و شفقت کے سلسلہ میں باندھا ہے۔

و برئ اللہ منہ: [اور خدا اس سے بیزار رہوا] کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے اس بدترین عمل کے ذریعہ مخلوق خدا کی پریشانی و تکلیف کا سامان کیا تو خدا نے اس پر سے اپنی حفاظت اٹھالی اور اس کو اپنی نظر کرم وعنایت سے دور کر دیا۔

اربعین یوما: اور بعض نے ایک ماہ مدت بیان کی ہے، اصل بات یہ ہے کہ جتنے دن روکنے سے لوگوں کو ضرر ہو بس یہی احتکار ناجائز ہے۔ (درس مشکوۃ:۲/۲۷۸)

ایضاً

{۲۷۷۱} وَعَنْ مُعَاذٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَکِرُ اِنْ اَرْخَصَ اللّٰہُ الْاَسْعَارَ حَزِنَ وَاِنْ اَغْلَاھَا فَرِحَ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابہ)

حوالہ: بیہقی فی شعب الایمان: ۷/۵۲۵، باب فی ان یحب المسلم لاخیہ، فصل فی ترک الاحتکار، حدیث نمبر: ۱۱۲۱۵، رزین: لم اجدہ۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا: کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمارہے تھے: احتکار کرنے والا بندہ بہت (ہی) برا ہے،

(جس کی خصلت بدیہ ہوتی ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ بھاؤ ارزاں کر دیں تو رنجیدہ ہوتا ہے اور اگر بھاؤ گراں کر دیں تو خوش ہوتا ہے۔

تشریح: اس روایت میں احتکار کنندہ کی بدترین خصلت کو بیان فرمایا ہے کہ جب بازار میں اشیاء کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو اس پر گرانی ہوتی ہے اور وہ رنجیدہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اپنے تصور کے مطابق نفع حاصل نہ ہوگا، اور جب بازار میں گرانی ہوتی ہے تو بہت خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ عام لوگوں کو گرانی سے تکلیف ہوتی ہے، پس محض اپنے ذاتی نفع کی وجہ سے لوگوں کی تکلیف سے خوش ہونا انتہائی بے مروتی اور خلاف انسانیت حرکت ہے۔

ایضاً

{۲۷۷۲} **وَعَنْ** اَبِیْ اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كَفَّارَةٌ۔ (رواہ رزین)

حوالہ: رزین: لم اجدہ،

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس روز تک احتکار کیا اور پھر اس کا صدقہ کر دیا تو اس شخص (کے گناہِ احکار) کے لئے کفارہ نہ ہوگا۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کو اس کا (اب) صدقہ کرنا بھی پسند نہیں ہے اور احتکار پر جو گناہ ہو چکا ہے صدقہ کرنے سے بھی اس گناہ کا کفارہ نہ ہوگا۔ دراصل یہ شدید وعید اور تنبیہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ احتکار عند اللہ نہایت مذموم عمل ہے کہ اپنے نفع کی خاطر عام لوگوں کی تکلیف سے خوش ہوتا ہے اور عام لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے۔

باب الافلاس والانظار

رقم الحدیث: ۲۷۷۳ / تا ۲۸۰۱ /

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب الافلاس والانظار

(افلاس اور مہلت دینے کا بیان)

انسانی زندگی میں کسی ایک حالت کو قرار و دوام نہیں ہے، آج کچھ ہے کل کچھ، یہ روزانہ کے مشاہدہ کی بات ہے، انسان کی اقتصادی و مالی زندگی ہی کو دیکھ لیجئے، جس طرح ایک مفلس اور قلاش شخص راتوں رات رحمت خداوندی کے نتیجہ میں مال وزر کے خزانوں کا مالک بن جاتا ہے، اسی طرح بڑے بڑے کاروباری دیکھتے ہی دیکھتے دیوالیہ ہوجاتے ہیں، جو لوگ ہر وقت لاکھوں میں کھیلتے رہتے ہیں، مال وزر ہی جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے، چشم زدن میں وہ پائی پائی کو محتاج نظر آتے ہیں، یہی کائنات کا نظام ہے اور یہی تقدیر کا کھیل ہے۔ حالات کو کسی ایک راستے پر برقرار رکھنا نہ کبھی کسی کے بس میں رہا ہے اور نہ کبھی کسی کے بس میں رہے گا، یہ سارے کھیل قدرتِ خداوندی کے پابند رہے ہیں، اور ہمیشہ اسی طرح پابند رہیں گے، لیکن بدلے ہوئے حالات کو متوازن بنانا اور متوازن بنانے میں مدد دینا انسان کے بس میں ہے، جسے وہ اختیار کر کے ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹ بھی سکتا ہے اور بدلے ہوئے حالات کو سنوارنے میں مدد بھی دے سکتا ہے، چنانچہ یہاں جو باب قائم کیا گیا ہے اس کے تحت نقل کی جانے والی احادیث کا یہی حاصل ہے کہ اگر کوئی شخص حالات کی تبدیلی کا شکار ہوجائے بایں طور کہ افلاس و تنگدستی اسے اپنی لپیٹ میں لے لے تو دوسرے انسانوں کا نہ صرف یہ فریضہ ہے کہ اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کریں، بلکہ اگر اس شخص پر کسی کا کوئی حق و مطالبہ ہو اور وہ مفلس ہوجانے کی وجہ سے اس کی ادائیگی سے وقتی طور پر عاجز ہو تو صاحب حق اسے اتنی مہلت دیدے کہ جب بھی اسکے حالات سدھریں وہ اسکا حق ادا کردے۔ (مظاہر حق: ۳/۵۲۵)

اور اللہ تعالیٰ اگر توفیق و ہمت دے اور بالکل ہی معاف کردے تو بہت ہی اعلیٰ ہے۔

﴿الفصل الاول﴾

جو شخص مفلس قرار دیا گیا

{۲۷۷۳} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ فَاَدْرَكَ رَجُلٌ مَالَهٗ بِعَیْنِهٖ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ مِنْ غَیْرِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۱/۳۲۳، کتاب الاسقراض، باب اذا وجد مالا عند مفلس فی البیع، حدیث نمبر: ۲۴۰۲۳، مسلم شریف: ۱۷/۲، کتاب المساقاۃ، باب فی ادرک ما بعہ عند المشتری، حدیث نمبر: ۱۵۵۹۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص مفلس ہو جائے اور ایک شخص (قرض خواہ) اپنے مال کو بعینہ (اس شخص مفلس مقروض کے پاس) موجود پائے تو یہ شخص اس کا زیادہ حقدار ہے دوسرے سے۔

تشریح: ''افلاس'' باب افعال کا مصدر ہے، اور فلس سے ماخوذ ہے، جس کے معنی مال اور پیسہ کے ہیں اور یہاں باب افعال کا ہمزہ سلب ماخذ کے لئے ہے یعنی ''افلس الرجل افلاسا'' کے معنی میں ہیں: ''صار فقیرا او لم یبق لہ مال'' اور ''انظار'' کے معنی تاخیر اور مہلت دینے کے ہیں۔ (طیبی: ۵/۱۰۴، مرقاۃ: ۶/۹۵)

افلاس کا مطلب اور حکم

اس مقام پر ''افلاس'' سے مراد یہ ہے کہ قاضی کسی شخص کے بارے میں یہ فیصلہ کر دے کہ یہ مفلس ہے جو کچھ مال اس کے پاس ہوگا وہ تو قرض خواہوں کو ان کے حصوں کے برابر دیا جائے گا اور پھر افلاس کی وجہ سے چونکہ وقتی طور پر قرض کی مکمل ادائیگی سے یہ عاجز ہے اس لئے صاحب حق اسے مال کمانے کے

لئے اتنی مہلت دے گا کہ جب اس کی حالت سدھر جائے تو وہ اس کا پورا حق ادا کرے اور یہی معنی ہیں ''انظار'' کے، گویا کہ ''افلاس'' کے بعد مال کے حصول تک ''انظار'' ہوگا اور مہلت دی جائے گی۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ" (البقرہ:۸۰)

[اور اگر کوئی تنگدست (قرضدار) ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک مہلت دینی ہے اور صدقہ ہی کردو تو یہ تمہارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہے۔ بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو۔]

اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی کو مفلس قرار دیا گیا اور قرض خواہوں میں سے کسی نے اپنی کوئی چیز بعینہ اس کے پاس پائی تو کیا اس چیز میں اس قرض خواہ کے ساتھ دوسرے قرض خواہ بھی شریک ہوں گے یا یہ اپنی ملکیتی چیز کا دوسروں کی بنسبت زیادہ حقدار ہوگا؟

چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ قرض خواہ جس کو اپنی چیز بعینہ مدیون کے پاس مل گئی خواہ یہ چیز مدیون کے پاس غصب کے طریقے سے آئی ہو یا عاریۃً لی ہو یا قرض خواہ نے اس کے پاس ودیعت رکھی ہو یا مفلس اور مدیون نے اس سے خریدی ہو، لیکن قیمت اور ثمن ادا نہ کی ہو ان تمام صورتوں میں صاحب مال قرض خواہ دیگر تمام غرماء اور قرض خواہوں کی بنسبت اس چیز کا حقدار ہے اور ان کا استدلال حدیث مذکور سے ہے، جس میں تصریح ہے: ''فادرک رجل ماله بعینه فهو احق به من غیره'' کہ صاحب مال قرض خواہ دیگر قرض خواہوں سے زیادہ حقدار ہے، کیونکہ بائع کو ثمن نہ ملنے کی وجہ سے اس بات کا حق ہے کہ بیع فسخ کردے اور اپنا سامان واپس لے لے۔ (عمدۃ القاری:۸/۳۳۸/۲)

حنفیہ کا استدلال اس سے ہے کہ بیع کی وجہ سے ''مبیع'' بائع کی ملک سے نکل چکی ہے، البتہ بائع کو یہ حق حاصل تھا کہ ثمن کے حصول تک ''مبیع'' اپنے پاس روک لے لیکن جب اس نے مبیع تسلیم کرکے مشتری کے حوالے کردی تو اس کا حق مبیع سے بالکل ساقط ہوگیا، البتہ مشتری کے ذمہ ''مبیع'' کا ثمن دین کی صورت میں باقی ہے، لہٰذا بائع عام ''غرمائ'' قرض خواہوں کی طرح مستحق دین ہوگا اور ''مبیع'' کے مکمل طور پر بائع سے جدا ہوجانے کی وجہ سے وہ اکیلا اس کا حقدار نہیں ہوگا، بلکہ سب کے ساتھ برابر شریک ہوگا۔

حنفیہ کی تائید حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے آثار سے ہوتی ہے: ''قال علی رضی الله عنه هو فیها اسوة للغرماء اذا وجدها بعینه'' [حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ اور قرض خواہ

اس میں برابر ہیں جب وہ اس کو بعینہ موجود پائے۔]

"وعن عمر بن عبدالعزیز انه قال: اذا افلس المشتری فهو البائع والغرماء فیه سواء"
کہ مشتری کے افلاس کے بعد بائع اور دیگر غرماء سب طلب قرض میں برابر ہوں گے۔(عمدۃ قاری:۲۴۰/۱۲)

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں دیگر احادیث وآثار بھی ہیں، لیکن وہ صرف تائید کے درجہ میں ہیں اور اصل استدلال اصول مسلمہ سے ہے اور وہ یہی کہ عقد بیع کے تام ہونے کے بعد مبیع فوراً مشتری کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے اور قبضہ کے بعد اس کے ضمان میں آجاتی ہے، جیسا کہ مشہور روایت "الخراج بالضمان" گذر چکی ہے، لہٰذا مبیع مشتری کے عام املاک کی طرح ہوگی، جیسے ان میں کسی کو ترجیح نہیں سب قرض خواہ برابر کے شریک ہیں، ایسے ہی "مبیع" میں بھی بائع کو ترجیح نہیں ہوگی، بلکہ سب برابر کے شریک ہوں گے۔(تکملہ فتح الملہم:۴۹۶/۱)

حدیث مذکورہ کا جواب حنفیہ کی طرف سے یہ ہے کہ یہ حدیث غصب، ودیعت، عاریت وغیرہ ان صورتوں پر محمول ہے جہاں مال صاحب مال کی ملک سے نہیں نکلتا اور ظاہر ہے کہ جب مال صاحب مال کی ملک سے نکلا نہیں تو وہی اس کا حقدار ہے۔

چنانچہ اس پر قرینہ بھی ہے کیونکہ حدیث مذکور میں "فادرک رجل ماله بعینه" کی تصریح ہے جس کا مدلول حقیقی، مغصوب، مسروق اور وہ مال ہے جو ودیعت، عاریت میں دیا گیا ہو، اس لئے کہ وہ آدمی کی ملک سے نہیں نکلتا، بخلاف "مبیع" کے کہ وہ مشتری کے قبض کرنے کے بعد بائع کی ملک سے نکل جاتی ہے، لہٰذا وہ بعینہ باقی نہیں رہتی، کیونکہ تبدل "ملک" سے تبدل "عین" ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ "مبیع" جو مشتری کی ملک میں آگئی ہے، بعینہ وہ نہیں رہی جو بائع کی ملک میں تھی۔ "لان الشی یتغیر بتغیر الملک" (عمدۃ القاری:۲۴۰/۱۲، تکملہ فتح الملہم:۴۹۷/۱)[اس لئے کہ بدل جانے سے بدل جاتی ہے۔]

باقی رہی یہ بات کہ مسلم کی روایت میں "بیع" کا ذکر صراحۃً آیا ہے، جس میں ارشاد ہے: "انه لصاحبه الذی باعه" کہ وہ چیز بائع کا حق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ محفوظ حدیث وہی ہے جس میں "بیع" کا ذکر نہیں آیا جو کہ متعدد طرق سے مروی ہے، اور جس طریق میں "بیع" کا ذکر آیا ہے وہ محدثین حضرات کے نزدیک متکلم فیہ ہے، چنانچہ امام کوثری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طریق میں بیع کا ذکر آیا

ہے اس کا راوی ابن ابی عمر اور ہشام مخزومی ہیں۔ابن ابی عمر کا نام محمد بن یحییٰ عدنی ہے اور وہ وضع روایات سے متہم ہے اور ہشام مخزومی کی روایات بھی اضطراب سے خالی نہیں، لہٰذا یہ روایت حنفیہ کے خلاف حجت نہیں۔(نفحات التنقیح: ۴۷۷/۳)

مفلس کی رعایت کرنا

{۲۷۷۴} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اُصِیْبَ رَجُلٌ فِیْ عَہْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ ثِمَارٍ اِبْتَاعَہَا فَکَثُرَ دَیْنُہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقُوْا عَلَیْہِ فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَیْہِ فَلَمْ یَبْلُغْ ذٰلِکَ وَفَاءَ دَیْنِہٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِغُرَمَائِہٖ خُذُوْا مَا وَجَدْتُّمْ وَلَیْسَ لَکُمْ اِلَّا ذٰلِکَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۱۶/۲، کتاب المساقاۃ، باب استحباب الوضع من الدین، حدیث نمبر:۱۵۵۶۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے عہد میں ایک شخص کو خرید کردہ پھلوں میں نقصان اٹھانا پڑ گیا، جس کی وجہ سے وہ زیادہ مقروض ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس پر صدقہ کرو، چنانچہ لوگوں نے اس پر صدقہ کیا۔(صدقہ کی آمد) اس کے قرضہ کے پورا ہونے کی مقدار مکمل نہیں ہوئی، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا: کہ جس قدر موجود ہے اس کو تو وصول کرلو اور اس کے علاوہ کچھ بھی تمہارے لئے نہیں (یعنی باقی معاف کردو)۔

تشریح: اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے ایک پھل دار درخت خریدا، درخت پر لگے ہوئے پھل ابھی اس کے تصرف میں نہیں آئے تھے کہ سوء اتفاق سے ان پر آفت نازل ہوئی اور وہ سب جھڑ گئے، ادھر اس نے اس کی قیمت بھی ادا نہیں کی تھی، چنانچہ جب بیچنے والے نے قیمت کا مطالبہ کیا تو اس نے لوگوں سے قرض لے کر قیمت ادا کی، اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ قرضدار ہو گیا، آنحضرت ﷺ نے جب اس کی پریشان حالی دیکھی تو لوگوں کو اس کی طرف

متوجہ کیا کہ وہ صدقہ وخیرات کے ذریعہ ہی اس کی مدد کر دیں تاکہ وہ قرض کے بارسے ہلکا ہوجائے۔ لوگوں نے اس کی مدد کی، مگر ان کی مدد بھی اس کے قرض کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہوسکی، لوگوں کی مدد سے جتنا قرض وہ ادا کرسکتا تھا ادا کردیا، بقیہ قرض کی ادائیگی سے جب وہ بالکل ہی عاجز ہوگیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے وہ الفاظ ارشاد فرمائے جو حدیث شریف کے آخر میں نقل کئے گئے ہیں۔

چنانچہ قرض خواہوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ جب اس شخص کا افلاس بالکل ظاہر ہوگیا ہے اور اس کی خستہ حالی عیاں ہوچکی ہے تو اب تمہارے لئے قطعاً مناسب نہیں ہے کہ تم اسے پریشان کرو، اسے ڈراؤ دھمکاؤ یا اسے قید وبند کی مصیبت میں مبتلا کرو، بلکہ اس صورت میں تم لوگوں پر واجب ہے کہ اسے مہلت دے دو، جب دیکھو کہ اس کے پاس ادائیگی کا کچھ سامان فراہم ہوگیا ہے اس وقت اپنا مطالبہ کرنا اور اس سے اپنا قرض واپس لے لینا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب قطعاً نہیں تھا کہ قرضدار کے ذمہ سے قرض خواہوں کا حق ہی سرے سے ساقط ہوگیا ہے بلکہ جیسا کہ ابھی بتایا گیا اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد صرف یہ تھا کہ قرضدار کو مہلت مل جائے۔ (مظاہر حق: ۵۲۶/ ۳)

معاف کرنے کا بڑا اجر ہے

{۲۷۷۵} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يُدَايِنُ النَّاسَ فَكَانَ يَقُوْلُ لِفَتَاهُ اِذَا اَتَيْتَ مُعْسِرًا تَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يَّتَجَاوَزَ عَنَّا قَالَ: فَلَقِیَ اللّٰهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۴۹۵/ ۱، کتاب الانبیاء، باب: ۵۴، حدیث نمبر: ۳۳۶۱، مسلم شریف: ۱۷/ ۲، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر، حدیث نمبر: ۱۵۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک شخص لوگوں کو قرضہ دیا کرتا تھا اور وہ اپنے غلام سے یہ کہتا تھا کہ جب کہ تم کسی تنگدست کے پاس

(وصولِ قرض کے لئے) پہنچو تو اس سے درگذر کرو، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے (بھی) درگذر فرمادیں گے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ سے اس نے ملاقات کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرمادیا۔

تشریح: یداین الناس: یعنی لوگوں کو قرض دینا، لین دین کرنا۔

فتاه: دوسری روایت میں صراحت ہے: "غلامه" یعنی اس نے اپنے غلام کو (جو وصول کرنے، حساب رکھنے پر مامور ہوگا) یہ ہدایت دی ہوئی تھی۔

معسرا: تنگ دست، غریب، نادار۔

تجاوز: درگذر کرنا، تمام قرضہ یا بعض حصہ۔

لعل اللہ: امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے (بھی) درگذر کا معاملہ فرمائیں، ہمارے گناہوں کو معاف فرمادیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت فرمادی، درگذر (ہی) کا معاملہ فرمایا۔ اس میں درگذر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

ایضاً

{۲۷۷۶} **وَعَنْ** اَبِیْ قَتَادَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُّنَجِّیَہُ اللّٰہُ مِنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ فَلْیُنَفِّسْ عَنْ مُعْسِرٍ اَوْ یَضَعُ عَنْہُ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱۸/۲، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر، حدیث نمبر: ۱۵۶۳۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو (یہ بات) پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن مشکلات سے نجات دے تو اس کو چاہئے کہ وہ تنگدست کو راحت دے، (یعنی سہولت دے) یا اس کے ذمہ سے کم کردے۔

تشریح: یوں تو فرض اعمال نفل اعمال سے ستر درجے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں، لیکن بعض مسائل ومعاملات میں نفل اعمال فرض اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں، انہیں میں سے ایک تو

تنگدست ومفلس کو اپنا حق (مثلاً قرض وغیرہ) معاف کر دینا ہے کہ یہ اگر چہ مستحب ہے، لیکن مفلس وتنگدست کو قرض وغیرہ ادا کرنے میں مہلت دینے سے افضل ہے، جو واجب ہے دوسرے سلام کرنے میں پہل کرنا سنت ہے، لیکن یہ افضل ہے سلام کا جواب دینے سے جو واجب ہے، تیسرے وقت سے پہلے وضو کرنا مستحب ہے لیکن یہ افضل ہے وقت شروع ہو جانے کے بعد وضو کرنے سے جو فرض ہے۔ (فتاویٰ شامی زکریا:۱/۲۴۹)

ایضاً

{۲۷۷۷} **وَعَنْهُ** قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَنْجَاهُ اللهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱۸/۲، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر، حدیث نمبر: ۱۵۶۳۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، وہ فرما رہے تھے: جس شخص نے تنگدست کو مہلت دی یا اس سے کمی کر دی تو اللہ تعالیٰ اس کو بروز قیامت نجات عطا فرمائیں گے۔

تشریح: اوپر گذر چکی۔

مقروض کو مہلت دینا

{۲۷۷۸} **وَعَنْ** اَبِي الْيُسَرِ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللهُ فِيْ ظِلِّهٖ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۴۱۶، کتاب الزھد، باب حدیث جابر الطویل وقصۃ ھل الیسر، حدیث نمبر: ۳۰۰۶،

ترجمہ: حضرت ابو یسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے: جس شخص نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس سے کم کر دیا، تو اللہ

تعالیٰ اس کو (بروز قیامت) اپنے (عرش کے) سایہ میں سایہ عطافرمائیں گے۔

تشریح: اظلہ: یعنی اس کو روز قیامت کی گرمی سے محفوظیت عطافرمادیں گے، جس کی (ایک) صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عرش کا سایہ عطا فرمادیں گے۔

دوسری احادیث میں اس کے اور بھی فضائل بیان ہوئے ہیں، جس قدر مہلت دی جائے گی وہ صدقہ کے حکم میں ہوگا گویا کہ ہر روز اس قدر صدقہ کیا جارہا ہے اور اس پر ثواب حاصل ہورہا ہے، دراصل یہ مسلمان بھائی کے ساتھ حسن سلوک پر اجروثواب ہے، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ اخلاصِ نیت کے ساتھ اور حصولِ ثواب کی نیت کے ساتھ یہ معاملہ ہونا ضروری ہے۔

قرض کی ادائیگی بحسن وخوبی ہو

{۲۷۷۹} **وَعَنْ** اَبِیْ رَافِعٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اِسْتَسْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكْرًا فَجَاءَ تْهُ اِبِلٌ مِنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُوْرَافِعٍ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقْضِیَ الرَّجُلَ بَكْرَهٗ فَقُلْتُ لَا اَجِدُ اِلَّا جَمَلًا خِيَارًا رَبَاعِيًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطِهٖ اِيَّاهُ فَاِنَّ خَيْرَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَاءً۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/ ۳۰، کتاب المساقاۃ، باب بواز اقتراض الحیوان، حدیث نمبر: ۱۶۰۰۔

حل لغات: جملًا رباعیًا: یعنی وہ اونٹ جس کے رباعی دانت ظاہر ہوچکے ہوں اور وہ ساتویں سال میں داخل ہوجائے۔

ترجمہ: حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان اونٹ قرض لیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ کے اونٹ آ گئے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم دیا کہ میں اس شخص کو جوان اونٹ دے دوں، میں نے عرض کیا: میں پاتا نہیں ہوں مگر اس سے بہتر چارسالہ اونٹ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہی اس کو دے دو، کیونکہ لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو ادا کرنے میں سب سے اچھا ہو۔

تشریح: یہ حسنِ اخلاق ہے کہ ادائیگی میں احسن صورت اختیار کی جائے اور حسن ادائیگی کی ایک صورت یہ ہے کہ قدرے زائد (بھی) دیا جائے، صاحب حق نے جب آپ کے ساتھ بھلائی، احسان اور سہولت کا معاملہ کیا ہے تو لازم ہے کہ بوقت ادائیگی حسن اخلاق ہی کے ساتھ ہو لڑائی نہ ہو۔

سوال: کیا حیوان کا قرض درست ہے؟

جواب: اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مباح ہے، چنانچہ جماہیر علماء کے نزدیک یہ مباح ہے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حدیث منسوخ ہے۔ "مشکوۃ: ۲۴۵" پر روایت گذر چکی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "نھی عن بیع الحیوان بالحیوان نسیئۃ الخ" [حیوان کی بیع حیوان کے بدلے ادھار سے منع فرمایا ہے۔] یہ روایت نسخ کے لئے واضح دلیل ہے، لہٰذا یہ واقعہ قبل از نہی کا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ قیمت پر قرض دیا گیا تھا، پھر اس قیمت کے برابر ایک اونٹ دے دیا گیا، یہ جواب دیا علامہ اکمل الدین نے "شرح مشارق" میں۔

فائدہ: اگر بلاشرط زائد دیا جائے مباح ہے، جب کہ صاحب حق کو یہ کلیۃً گمان نہ ہو کہ زائد ملے گا، وہ اس سے بالکلیہ خالی الذہن ہو۔

تقاضا کرتے ہوئے سخت گفتگو کرنا

{۲۷۸۰} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا تَقَاضٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَغْلَظَ لَهٗ فَهَمَّ اَصْحَابُهٗ فَقَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا وَاشْتَرُوْا لَهٗ بَعِيْرًا فَاَعْطُوْهُ اِيَّاهُ قَالُوْا لَا نَجِدُ اِلَّا اَفْضَلَ مِنْ سِنِّهٖ قَالَ اِشْتَرُوْهُ فَاَعْطُوْهُ اِيَّاهُ فَاِنَّ خَيْرَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَاءً۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۲۱، کتاب الاستقراض، باب استقراض الابل، حدیث نمبر: ۲۳۲۸، مسلم شریف: ۲/۳۰، کتاب المساقاۃ، باب جواز اقتراض الحیوان، حدیث نمبر: ۱۶۰۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

پر (قرضہ کا) تقاضہ کیا تقاضہ میں سختی کی۔ تو آنحضرت ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے ارادہ کیا (جواب دینے یا سزا دینے کا) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ اس کو چھوڑ دو، کیونکہ حقدار کے لئے بات کہنے کا حق ہے اور تم اس کے لئے ایک اونٹ خرید لو اور وہ اس کو دے دو، اصحاب رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کہ ہم نہیں پاتے مگر اس کے اونٹ کی عمر سے زیادہ عمر کا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسی کو خرید لو اور وہی اس کو دے دو، کیونکہ تم لوگوں میں بہتر وہ شخص ہے جو تم میں ادا کرنے میں بہتر ہو۔

تشریح: آنحضرت ﷺ سے اپنے قرض کا تقاضہ کرنے والا اور پھر تقاضا میں سخت کلامی کرنے والا کوئی کافر رہا ہوگا، خواہ وہ یہودی ہو یا کوئی اور۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ شاید کوئی اجڈ گنوار ودیہاتی ہوگا، جو مجلس نبوت اور مقام نبوت کے آداب سے مطلقاً بے بہرہ تھا، جسے یہ سلیقہ بھی نہیں تھا کہ کس سے کس طرح بات کی جاتی ہے، اس کے برعکس سرکار دوعالم ﷺ نے اس کی باتوں کو جس عالی ظرفی اور خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت کیا وہ صرف نبوت ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔

فان لصاحب الحق مقالاً: جس کا حق ہے اسے کہنے کا اختیار ہے، اسکے بارہ میں ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں "حق سے مراد قرض ہے"، یعنی اگر کسی شخص کا کسی پر قرض ہو اور وہ قرضدار ادائیگی قرض میں تاخیر کرے تو قرض خواہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ تقاضہ کرے، اس پر اظہار ناراضگی کرے اور اگر وہ پھر بھی قرض ادا نہ کرے تو حاکم وعدالت کی طرف رجوع کرے۔

دوسری چیز اس حدیث شریف کے اندر یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ نے خرید کر دیا اور اس سے پہلے حدیث کے اندر گذرا کہ آنحضرت ﷺ نے ابل صدقہ کے اندر سے دیا۔

جواب یہ ہے کہ مستحقین صدقہ سے خرید کر اہل صدقہ میں سے اونٹ دیا تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت خرید کر دیا، پھر اہل صدقہ میں سے اس کا بدلہ دیا۔

قرضہ میں بلاوجہ تاخیر کرنا

{۲۷۸۱} **وَعَنْهُ** اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ فَإِذَا اُتْبِعَ اَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيٍّ فَلْيَتْبَعْ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۰۵/۱، کتاب الحوالۃ، باب اذا حال علی کلی فلیس لہ رد، حدیث نمبر: ۲۲۳۳،
مسلم شریف: ۱۸/۲، کتاب المساقاۃ، باب تحریم مطل الغنی و صحۃ الحوالۃ، حدیث نمبر: ۱۵۶۴۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالدار کاٹال مٹول کرنا ظلم ہے، اگر کوئی غنی کے حوالہ کیا جائے تو اس (حوالہ) کو قبول کرلیا جائے۔

تشریح: مطل الغنی ظلم: اضافت اگر فاعل کی طرف ہے تو مطلب ہے کہ مالدار کو چاہئے وہ کسی سے ٹال مٹول نہ کرے۔ اور اگر اضافت مفعول کی طرف ہے تو مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مالدر کا قرض وغیرہ کسی کے ذمہ ہے تو مالدار سمجھ کر اس کو ٹال مٹول نہ کرنا چاہئے۔

آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فاذا اتبع احدکم علی ملی فلیتبع" اس سے حوالہ کا جواز اور ثبوت ہوا، اب اس کے اندر اختلاف ہے کہ فلیتبع کے اندر امر استحبابی ہے یا وجوبی؟

ابوثور، ابن جریر طبری، ظاہریہ کے نزدیک وجوب کے لئے ہے، اور جمہور کے نزدیک استحباب کے لئے ہے۔

اب اس مسئلہ کے اندر اختلاف ہے کہ محتال اور محتال علیہ میں سے کسی کی رضاء بھی شرط ہے، یا نہیں؟

امام صاحب کے نزدیک دونوں کی رضا شرط ہے، حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کسی کی رضا شرط نہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں محتال علیہ کی رضا شرط ہے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر محتال اور محتال علیہ کے درمیان دشمنی ہے تو محتال علیہ کی رضا شرط ہے اور اگر دشمنی نہیں تو رضا شرط نہیں ہے۔

سفارش کرنے پر قرض معاف کرنا

{۲۷۸۲} **وَعَنْ** كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ تَقَاضٰى ابْنَ أَبِيْ حَدْرَدٍ دَيْنًا لَهُ عَلَيْهِ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَهُوَ فِيْ بَيْتِهٖ فَخَرَجَ اِلَيْهِمَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهٖ وَنَادٰى كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ يَا كَعْبُ! قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! فَاَشَارَ بِيَدِهٖ اَنْ ضَعِ الشَّطْرَ مِنْ دَيْنِكَ قَالَ كَعْبٌ قَدْ فَعَلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ قُمْ فَاقْضِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۶۷/۱، کتاب الصلوۃ، باب رفع الصوت فی المسجد، حدیث نمبر: ۴۶۶،
مسلم شریف: ۱۶/۲، کتاب المساقاۃ، باب استحباب الوضع من الدین، حدیث نمبر: ۵۵۸۔

ترجمہ: حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ابن ابی حدرد پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنے قرضہ کا تقاضہ کیا مسجد کے اندر، پس دونوں کی آوازیں تیز ہوگئیں، یہاں تک کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آوازوں کو سن لیا، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان میں تھے، تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، ان دونوں کی طرف (متوجہ ہوئے اور) اپنے حجرۂ شریف کا پردہ اٹھایا اور کعب بن مالک کو آواز دی، فرمایا: یا کعب! انہوں نے عرض کیا: حاضر خدمت ہوں یا رسول اللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اشارہ فرمایا: کہ اپنے قرضہ کے نصف کو کم کردو، حضرت کعب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے نصف کم کردیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی حدرد کو ارشاد فرمایا: چل کھڑا ہو اور اس کا قرض ادا کر۔

تشریح: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اگر مقروض اور مدیون مسجد میں ہے تو اس پر تقاضہ کرنا اور اس سے مطالبہ کرنا درست ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس واقعہ سے اس امر کو ثابت کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان تنازع کو ختم کرنے کی غرض سے یہ تجویز فرمائی کہ صاحب حق اپنا نصف حق ساقط کردے، معاف کردے۔

دریں اصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز اور سفارش تھی، حکم شرعی نہ تھا، صاحب حق نے جب اس کو منظور کرلیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے فریق سے فرمایا: "قم فاقضه" (اب) کھڑا ہو، اور ادائیگی کر۔

آنحضرت ﷺ نے مقروض صحابی رضی اللہ عنہ کے حالات اور کلام وگفتگو سے یہ اندازہ لگاتے ہوئے یہ سفارش کی ہوگی۔

سجف: بکسر السین و سکون الجیم وفتحھا و جاء ککتاب و سحاب بمعنی الستر یعنی جو پردہ مکان کے دروازہ پر رہتا ہے بعض مرتبہ وہ دو اجزاء والا پردہ ہوتا ہے۔

مقروض کی نماز جنازہ

{۲۷۸۳} **وَعَنْ** سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ اُتِيَ بِجَنَازَةٍ فَقَالُوْا صَلِّ عَلَيْهَا فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوْا لَا فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ اُتِيَ بِجَنَازَةٍ اُخْرٰى فَقَالَ هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ قِيْلَ نَعَمْ قَالَ فَهَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوْا ثَلَاثَةَ دَنَانِيْرَ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ اُتِيَ بِالثَّالِثَةِ فَقَالَ عَلَيْهِ دَيْنٌ قَالُوْا ثَلَاثَةَ دَنَانِيْرَ قَالَ هَلْ تَرَكَ شَيْئًا قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ قَالَ اَبُوْ قَتَادَةَ صَلِّ عَلَيْهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَيَّ دَيْنُهٗ فَصَلّٰى عَلَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۰۵، کتاب الحوالۃ، باب اذا احال دین المیت علی رجل جاز، حدیث نمبر: ۲۲۳۴۔

ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ حضرت رسول اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ فی الوقت ہی ایک جنازہ لایا گیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کہ جنازہ کی نماز پڑھا دیجئے، پس آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا اس پر قرضہ ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھا دی، پھر دوسرا جنازہ لایا گیا، آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا اس پر قرضہ ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہاں! آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: کوئی شی چھوڑی ہے؟ (جس سے کہ قرضہ ادا ہوجائے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: تین دینار چھوڑے ہیں، آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز

جنازہ پڑھادی، پھر تیسرا جنازہ لایا گیا، آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا اس پر قرضہ ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: تین دینار، آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا کوئی شی ترک کی ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ (ہی) اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو، حضرتِ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ان کی نمازِ جنازہ پڑھادیں اور ان کا قرضہ میرے ذمہ ہے، پس آنحضرت ﷺ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

تشریح: ہوسکتا ہے کہ تینوں جنازے ایک ہی دن اور ایک ہی مجلس میں لائے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ الگ الگ دن اور الگ الگ مجلس میں یہ جنازے لائے گئے ہوں۔

دوسرے شخص پر جو قرض تھا اس کی مقدار ان ہی تین دینار کے برابر رہی ہوگی، جو وہ چھوڑ کر مرا تھا، اس لئے جب آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوگیا کہ اس شخص پر جتنا قرض ہے اس کی ادائیگی کے بقدر اثاثہ چھوڑ کر مرا ہے تو آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھ لی۔ تیسرا چونکہ اپنے قرض کی ادائیگی کے بقدر مال چھوڑ کر نہیں مرا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا، اس انکار کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس سے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور وہ قرض سے پرہیز کریں اور اگر بدرجۂ مجبوری قرض لیں بھی تو اس کی ادائیگی میں تاخیر وتقصیر سے باز رہیں، یا پھر آنحضرت ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھنا اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ میں اس کے لئے دعا کروں اور دعا قبول نہ ہو کیونکہ اس پر لوگوں کا حق تھا، جس سے بری الذمہ ہوئے بغیر وہ مرگیا تھا۔

اس حدیث شریف میں اس بات کی دلیل ہے کہ میت کی طرف سے ضامن ہونا جائز ہے، خواہ میت نے ادائیگی قرض کے لئے مال چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو، چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے، بخلاف حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کہ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

بعض حنفی علماء لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی، حضرت امام محمد اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ایسی میت کی طرف سے کفالت جائز ہے، جس نے کچھ بھی مال نہ چھوڑا ہو اور اس پر قرض ہو، یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر میت کی طرف سے کفالت جائز نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ

اس تیسرے جنازہ کی نماز نہ پڑھتے۔

لیکن حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مفلس میت کی طرف سے کفالت صحیح نہیں ہے، کیونکہ مفلس میت کی طرف سے کفالت دراصل دین ساقط کی کفالت ہے، اور یہ بالکل صاف مسئلہ ہے کہ دین ساقط کی کفالت باطل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے میت کی طرف سے اس کے قرض کی کفالت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی کفالت کو تسلیم کر کے اس کی نماز جنازہ پڑھ لی، تو اس کے بارہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حدیث شریف کے الفاظ سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کی زندگی ہی میں اس کی طرف سے کفالت کر لی ہوگی، اس موقع پر تو انہوں نے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا اقرار واظہار کیا کہ میں اس کی کفالت پہلے ہی کر چکا ہوں اب میں اس کے قرض کا ذمہ دار ہوں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس اقرار واظہار پر نماز جنازہ پڑھی۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت میت کی طرف سے کفالت نہیں کی تھی بلکہ ازراہِ احسان وتبرع یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں گا۔

ادائیگی قرض کی نیت

{٢٧٨٤} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَاءَ هَا اَدّٰی اللہُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ یُرِیْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللہُ عَلَیْهِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ١/٣٢١، کتاب الاستقراض، باب من اخذ اموال الناس یرید اداء ھا، حدیث نمبر: ٢٣٣٩،

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے لوگوں کے اموال (بطور قرض) لئے ہوں کہ وہ ان کی ادائیگی کا ارادہ کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ

اس کی طرف سے ادا کردیں گے، اور جس شخص نے ان اموال قرض کو ضائع کرنے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع فرمادے گا۔ (یعنی ادائیگی میں اس کی اعانت نہیں فرمائے گا۔)

تشریح: مقصد بیان یہ ہے کہ قرض لیا تھا شدید حاجت کے وقت اور نیت ادائیگی کی تھی خیانت کی نیت نہ تھی تو اب منجانب اللہ قرضہ کی ادائیگی میں اعانت ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اسباب ادائیگی بالضرور فرمادیں گے، کیونکہ جب اس کی نیت بہرصورت ادا کرنے کی ہے تو یقیناً وہ اس کے لئے کوشش بھی جاری رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کی اعانت فرمادیں گے، برکت ہوگی اور ان شاء اللہ تعالیٰ ادائیگی ہوگی۔

اور اگر کوئی شخص قرضہ کی ادائیگی میں لگا رہا اور کوشش کرتا رہا لیکن ادا نہ کرسکا تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے مطابق آخرت میں صاحب حق کو راضی کرلیں گے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعانت ادا کی صورت ہے۔

حقوق العباد کا حکم

{۲۷۸۵} **وَعَنْ** اَبِیْ قَتَادَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَرَاَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ صَابِرًا مُحْتَسِبًا مُقْبِلًا غَیْرَ مُدْبِرٍ یُکَفِّرُ اللّٰہُ عَنِّیْ خَطَایَایَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَعَمْ! فَلَمَّا اَدْبَرَ نَادَاہُ فَقَالَ: نَعَمْ! اِلَّا الدَّیْنَ کَذٰلِکَ قَالَ جِبْرِیْلُ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۱۳۵، کتاب الامارۃ، باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین، حدیث نمبر: ۱۸۸۵۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ مجھ کو خبر دیجئے اگر میں اللہ کے راستے میں بحالت صبر بنیت ثواب مقابلہ کے لئے آگے بڑھتے ہوئے نہ کہ پیچھے ہٹتے ہوئے قتل کردیا جاؤں تو اللہ تعالیٰ میری خطاؤں کا کفارہ (اس شہادت) کی بنا پر کردیں گے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جی ہاں! پھر جب وہ شخص واپس ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو آواز دی اور پھر فرمایا: جی ہاں! مگر قرضہ۔ (کیونکہ) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اسی طرح فرمایا ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت اور کٹھن ہے، اللہ تعالیٰ اپنے حقوق یعنی عبادات وطاعات میں کوتاہی اور گناہ ومعصیت کو تو معاف کر دیتا ہے، مگر بندوں کے حقوق یعنی قرض وغیرہ کو معاف نہیں کرتا، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ تک اللہ تعالیٰ کا صرف وہی پیغام نہیں پہنچاتے تھے جو قرآن کریم کی شکل میں سامنے ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی دیگر ہدایات واحکام پہنچاتے رہتے تھے۔

ایضاً

{۲۷۸۶} **وَعَنْ** عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: یُغْفَرُ لِلشَّهِیْدِ کُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّیْنَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱۳۵/۲، کتاب الاماۃ، باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدین، حدیث نمبر: ۱۸۸۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہید کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر قرضہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔

تشریح: ''دین'' سے مراد حقوق العباد ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص پر بندہ کا کوئی حق ہو یعنی خواہ اس کے ذمہ کسی کا مال ہو یا اس نے کسی کا ناحق خون کیا ہو، یا کسی کی آبروریزی کی ہو، یا کسی کو برا کہا ہو، یا کسی کی غیبت کی ہو تو اگر وہ شخص شہید بھی ہو جائے تب بھی یہ چیزیں معاف نہیں کی جائیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے حقوق کسی حال میں معاف نہیں کرتا۔

لیکن ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس حدیث شریف کا تعلق ''شہداء بر'' یعنی برّی جنگ میں شہید ہونے والوں سے ہے بحری جنگ میں شہید ہونے والے اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ابن ماجہ شریف نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ بحری جنگ میں شہید ہونے والوں کے تمام گناہ حتی

کہ دین (یعنی حقوق العباد) بھی بخشے جاتے ہیں۔

ایضاً

{۲۷۸۷} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْتٰى بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفّٰى عَلَيْهِ الدَّيْنُ فَيَسْأَلُ هَلْ تَرَكَ لِدَيْنِهٖ قَضَاءً فَاِنْ حُدِّثَ اَنَّهٗ تَرَكَ وَفَاءً صَلّٰى وَاِلَّا قَالَ لِلْمُسْلِمِيْنَ صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ فَلَمَّا فَتَحَ اللهُ عَلَيْهِ الْفُتُوْحَ قَامَ قَالَ: اَنَا اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّیَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَتَرَكَ دَيْنًا فَعَلَیَّ قَضَاءُهٗ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۰۸/۱، کتاب الکفالۃ، باب جوار ابی بکر الصدیق، حدیث نمبر: ۲۲۹۳، مسلم شریف: ۳۵/۲، کتاب الفرائض، فصل فی اداء الدین قبل الوصیۃ، حدیث نمبر: ۱۶۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شخص کا جنازہ لایا جاتا کہ جس پر قرضہ ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے کیا اس شخص نے اپنے قرضہ کی ادائیگی کے لئے کچھ چھوڑا ہے؟ پس اگر بیان کیا جاتا کہ اس شخص نے قرضہ کی ادائیگی کے لئے کچھ چھوڑا ہے تو نماز پڑھا دیتے، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے فرمادیتے کہ تم لوگ اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو، پھر جس وقت اللہ تعالیٰ نے فتوحات کھول دیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (برائے خطبہ) قیام فرما ہوئے اور ارشاد فرمایا: میں اہل ایمان کے لئے ان کے نفوس سے زیادہ حق رکھتا ہوں، پس اہل ایمان میں سے جو شخص وفات پاجائے اور اس نے قرضہ (اپنے ذمہ) چھوڑا ہو (اور اس کے پاس مال نہ ہو) تو اس کے قرضہ کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، اور جس شخص نے مال چھوڑا ہو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے۔

تشریح: میں (دین ودنیا کے تمام امور میں) مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جانوں سے زیادہ

عزیز ومحبوب رکھیں، آنحضرت ﷺ کے حکم اور آنحضرت ﷺ کی خواہش کو اپنے نفس کے حکم اور اپنے نفس کی خواہش پر مقدم رکھیں، آنحضرت ﷺ کے حق کو اپنی جانوں کے حق سے مقدم جانیں اور ان کے قلوب اپنی جانوں کی شفقت ومحبت سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی شفقت ومحبت سے لبریز ہوں، اسی طرح آنحضرت ﷺ کی شانِ رحمت بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی ذات پر جتنا شفیق ومہربان ہو سکتا ہے، آنحضرت ﷺ اس کے حق میں اس سے کہیں زیادہ شفیق ومہربان ہیں، ایک مسلمان کی جان، اس کی عزت وآبرو اور اس کا دین آنحضرت ﷺ کو جتنا زیادہ عزیز ومحبوب ہے اتنا خود اس کو نہیں ہے، چنانچہ مسلمانوں پر یہ آنحضرت ﷺ کی بے پناہ شفقت ہی کا پرتو ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات جنگ میں حاصل ہونے والی غنیمت کے ذریعہ آنحضرت ﷺ پر مال وزر کے دروازے کھول دیئے تو آنحضرت ﷺ کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہوا کہ اس مال وزر کو صرف اپنی ہی ذات تک محدود رکھیں، بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود تو سختی وتنگدستی کی سابقہ حالت پر ہی قناعت کی اور سارا مال وزر مسلمانوں ہی کے لئے وقف رکھا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا: کہ اب جبکہ خدا نے مال وزر کے خزانے میرے تصرف میں دے دیئے ہیں تو میں اس بات کا زیادہ حقدار ہوں کہ مسلمانوں کی مالی عزت وآبرو کا تحفظ کروں، لہٰذا مسلمانوں کے قرض کی ادائیگی کا میں خود ذمہ دار ہوں کہ اگر کوئی مسلمان اس حال میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا ہے کہ اس پر قرض ہے اور وہ قرض کی ادائیگی کے بقدر مال نہیں چھوڑ گیا ہے تو اس کا قرض میں ادا کروں گا۔

بعض حضرات تو یہ فرماتے تھے کہ آنحضرت ﷺ مردوں کے قرض کی ادائیگی بیت المال سے فرمایا کرتے تھے اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے، لیکن بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کا قرض اپنے مال میں سے ادا کرتے تھے۔

اسی طرح بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ مردوں کی طرف سے قرض کی یہ ادائیگی آنحضرت ﷺ پر واجب تھی اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ ان کا قرض ادا کرنا آنحضرت ﷺ پر واجب نہیں تھا، بلکہ آنحضرت ﷺ تبرعاً یعنی از راہِ احسان وشفقت ان کے قرض کی ادائیگی فرماتے تھے۔

﴿الفصل الثانی﴾

مفلس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم

{۲۷۸۸} وَعَنْ اَبِیْ خَلْدَةَ الزُّرَقِیِّ قَالَ جِئْنَا اَبَاهُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُ فِیْ صَاحِبٍ لَّنَا قَدْ اَفْلَسَ فَقَالَ هٰذَا الَّذِیْ قَضٰی فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا رَجُلٍ مَاتَ اَوْ اَفْلَسَ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ اَحَقُّ بِمَتَاعِهٖ اِذَا وَجَدَهٗ بِعَیْنِهٖ۔ (رواہ الشافعی وابن ماجۃ)

حوالہ: مسند شافعی: کتاب البیوع، باب التفلیس، ابن ماجہ: ۱۷۰، ابواب الاحکام، باب من وجد؟؟؟، حدیث نمبر: ۲۳۶۰۔

ترجمہ: حضرت ابوخلدہ زرقی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ہم حضرت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنے ایک ساتھی کے سلسلہ میں کہ وہ مفلس ہوگیا تھا، پس حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (میں جوتم سے بیان کررہا ہوں) یہ وہ امر ہے کہ جس کو (اس طرح کے) معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا، جوشخص مرجائے یاغریب ومفلس ہوجائے تو صاحب متاع زیادہ حقدار ہے اپنے سامان کو لینے کا، اگر وہ اپنا مال بعینہٖ (اس مقروض کے پاس) موجود پائے۔

تشریح: اس روایت میں جومضمون ہے وہ ماقبل میں مکمل گذرچکا ہے۔

مقروض کی روح معلق رہتی ہے

{۲۷۸۹} وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَیْنِهٖ حَتّٰی یُقْضٰی عَنْهُ۔

(رواہ الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

012 Babul Aflas wal Anzaar

حوالہ: مسند شافعي: كتاب الجنائز، باب القول عند دفن الميت، مسند احمد: ۲/۴۴۰، حديث نمبر: ۹۶۷۷، ترمذی شریف: ۱/۲۰۶، ابوب الجنائز، باب ماجاء ان نفس المقرض معلقة بدينه، حديث نمبر: ۱۰۷۸، ابن ماجه شريف: ۲/۱۷۳، ابو اب الصدقات، باب من ادان دينا لم ينو قضاءه، حديث نمبر: ۲۴۱۳، دارمی: ۲/۳۴۰، باب ماجاء في؟؟؟؟ في الدين، حديث نمبر: ۲۵۹۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کا نفس معلق رہتا ہے اس کے ذمہ قرض کے ساتھ یہاں تک کہ وہ اس کے ذمہ سے ادا کیا جائے۔

تشریح: بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ جو قرض اپنی ادائیگی کے وقت تک مومن کی روح کو جنت اور بندگان صالحین میں داخل ہونے سے روکتا ہے وہ قرض وہ ہے جو بلا ضرورت واقعی مال وزر کی صورت میں کسی سے لیا گیا ہو، اور مال وزر واہیات اور فضول کاموں میں خرچ کیا گیا ہو اور اسے اسراف کے طور پر لٹایا گیا ہو، ہاں جس شخص نے اپنی واقعی ضرورت کے لئے مثلاً حق واجبہ کی تکمیل یا کسی کے مالی مطالبہ کی ادائیگی کے بقدر روپیہ یا مال قرض لیا ہو اور پھر قرضدار اس کو ادا کرنے سے پہلے مرگیا ہو تو ایسا قرض اس کو جنت اور بندگان صالحین کی جماعت میں داخل ہونے سے ان شاء اللہ نہیں روکے گا، مگر ایسے قرض کے بارہ میں سلطان وقت یعنی حاکم (یا قرضدار کے متعلقین میں سے مستطیع لوگوں) کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ اس کا قرض ادا کر دیں اور اگر کوئی بھی اس کا قرض ادا نہیں کرے گا تو پھر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں قرض خواہوں کو راضی کر دے گا تا کہ وہ اس قرضدار سے آخرت میں کوئی مطالبہ نہ کریں۔

"نفس المومن" سے مراد روح ہے اور "معلقة" کے علماء نے تین مطلب بیان فرمائے ہیں:

(۱)......اس کی روح جنت کے اندر نہیں پہنچتی۔

(۲)......معذب رہتا ہے۔

(۳)......صالحین کے زمرہ کے اندر نہیں پہنچتا ہے۔

مقروض بروز قیامت کیا شکایت کرے گا؟

{۲۷۹۰} **وَعَنِ** الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَاحِبُ الدَّيْنِ مَاسُوْرٌ بِدَيْنِهٖ يَشْكُوْ اِلٰى رَبِّهِ الْوَحْدَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ فی شرح السنة) وَرُوِيَ اَنَّ مُعَاذًا كَانَ يَدَّانُ فَاَتٰى غُرَمَاؤُهٗ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَاعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَهٗ كُلَّهٗ فِيْ دَيْنِهٖ حَتّٰى قَامَ مُعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ مُرْسَلٌ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَلَمْ اَجِدْهُ فِي الْاُصُوْلِ اِلَّا فِي الْمُنْتَقٰى، وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ شَابًّا سَخِيًّا وَكَانَ لَا يُمْسِكُ شَيْئًا فَلَمْ يَزَلْ يَدَّانُ حَتّٰى اَغْرَقَ مَالَهٗ كُلَّهٗ فِي الدَّيْنِ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَهٗ لِيُكَلِّمَ غُرَمَاءَهٗ فَلَوْ تَرَكُوْا لِاَحَدٍ لَتَرَكُوْا لِمُعَاذٍ لِاَجَلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَاعَ رَسُوْلُ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُمْ مَالَهٗ حَتّٰى قَامَ مُعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ۔ رواہ سعید فی سننه مرسلاً۔

حوالہ: شرح السنة: ۵/۱۵۱، کتاب البیوع، باب التشدید فی الدین، حدیث نمبر: ۲۱۴۸،

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: کہ مقروض شخص اپنے قرضہ میں مقید ہے، وہ اپنے پروردگار سے بروزِ قیامت تنہائی کی شکایت کرے گا۔ (شرح السنہ) منقول ہے کہ حضرتِ معاذ رضی اللہ عنہ خوب قرضہ لیتے تھے (جس کی وجہ سے بہت زائد مقروض ہوگئے، اور جب ادائیگی میں تاخیر ہوئی تو) ان کے قرض خواہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ (اور انہوں نے اپنا مطالبہ پیش کیا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے تمام مال کو ان کے قرضہ (کی ادائیگی) میں فروخت کردیا، یہاں تک کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بغیر کسی چیز کے کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔ حدیث مرسل ہے، یہ الفاظ روایت مصابیح کے ہیں، صاحب مشکوۃ فرماتے

ہیں کہ میں نے اس روایت کو اصول (یعنی صحاحِ ستہ وغیرہ کتب) میں موجود نہیں پائی، البتہ المنتقیٰ میں مذکور ہے۔ اور حضرت عبد الرحمن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے نقل کیا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک نوجوان سخی آدمی تھے اور وہ کوئی شی چھوڑتے نہیں تھے (جو چیز بھی ہوتی اس کو صدقہ کر دیتے) برابر قرضہ لیتے رہتے (اور اس قدر مقروض ہوئے) یہاں تک کہ ان کا تمام مال قرضہ میں گھر گیا، چنانچہ حضرتِ معاذ رضی اللہ عنہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قرض خواہوں سے بات چیت فرمائیں، پس اگر قرض خواہ لوگ اپنا قرض کسی کے لئے چھوڑتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قرضہ چھوڑتے۔ (جب ان قرض خواہوں کا مطالبہ قائم رہا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تمام مال کو فروخت کر دیا (تاکہ قرضہ ادا ہو جائے) یہاں تک کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بغیر کسی چیز کے کھڑے ہوئے۔ (اس روایت کو سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں مرسلاً نقل کیا ہے۔)

تشریح: یشکو الی ربہ الوحدۃ یوم القیامۃ: [اپنے پروردگار سے اپنی تنہائی کی شکایت کریگا۔] کا مطلب یہ ہے کہ جب اس شخص کو نہ تو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی اور نہ نیک بخت لوگوں کی صحبت میں اسے جانے دیا جائے گا اور اس طرح جب وہ یہ دیکھے گا کہ تمام ہی نیک بخت لوگ تو جنت میں جا رہے ہیں اور میں ایسا بد بخت ہوں کہ ان کی رفاقت وصحبت کی سعادت سے بھی محروم ہوں، نیز اسے کوئی ایسا سفارشی بھی نظر نہیں آئے گا جو اسے اس قید تنہائی سے نجات دلائے تو وہ اپنی تنہائی اور اس قید کی وحشت سے مضطرب ہو کر بارگاہِ خداوندی میں شکوہ کرے گا، چنانچہ جب تک وہ قرض کی وجہ سے چھٹکارا نہ پا جائے گا، بایں طور کہ یا تو وہ اس قرض کے عوض میں اپنی نیکیاں قرض خواہوں کو دیدے، یا قرض خواہوں کے گناہوں کو ان کے قرض کے عوض اپنے اوپر لادلے، یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کے قرض خواہوں کو راضی کر دے اور وہ اپنا حق معاف کر دیں، اس وقت تک وہ اسی تنہائی میں رہے گا، گویا یہ تنہائی بھی اس کے لئے ایک عذاب کے درجہ کی چیز ہو گی جس سے وہ سخت رنج واذیت محسوس کرے گا۔

ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ قرض دار اپنے قرض کی وجہ سے اپنی قبر میں قید کیا جائے گا

اور پھر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی قید تنہائی کا شکوہ کریگا۔

"اصول" ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں حدیثیں سند کے ساتھ نقل کی گئی ہیں۔

"منتقی" ابن تیمی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب کا نام ہے، لہٰذا مشکوۃ کے مؤلف روایت کے الفاظ "لم اجد الخ" کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مصابیح کے مصنف نے یہ روایت "وروی ان معاذا کان الخ" جن الفاظ میں نقل کی ہے ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت مجھے اصول کی کتابوں میں نہیں ملی ہے، بلکہ یہ روایت منتقیٰ میں منقول ہے اور وہ بھی ان الفاظ میں "وعن عبدالرحمن الخ"

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ منتقیٰ کے ہیں اور ان کو یہاں مؤلف مشکوۃ نے اس لئے نقل کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حدیث اگرچہ اصول کی ان کتابوں میں نہیں ہے جنہیں مؤلف نے دیکھا ہے لیکن منتقی میں موجود ہے، لہٰذا یہ روایت اگر اصول کی کتابوں میں نہ ہوتی تو صاحب منتقیٰ اس کو اپنی کتاب میں نقل نہ کرتے۔

آگے چل کر مصنف نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے اندر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے مال کے متعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کا تذکرہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال کو فروخت کر دیا، اس کے متعلق علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غیر مستقیم المعنی ہے، کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کچھ کہے سنے بغیر ان کے مال کی بیع فرمادی، حالانکہ ابتداءً یہ تھا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے کہ تمہارے ذمہ جن لوگوں کا قرض ہے پہلے وہ ادا کرو اور اگر نہ کرتے تو پھر قید کرنا چاہئے تھا، جیسا کہ قانون شرعی ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کیا کہ اس حدیث کو غیر مستقیم المعنی کہنا اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رضا کے بغیر ان کے مال کو فروخت کر دیا۔

عبد ضعیف کہتا ہے کہ دراصل ملا علی قاری علامہ مذکور کی بات نہ سمجھے، چونکہ علامہ تورپشتی بڑے پکے حنفی ہیں تو تھوڑی سی بات کے اندر حنفیہ کا کام بنا لیتے ہیں، دراصل انہوں نے اپنے کلام سے حنفیہ کے ایک مسلک کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص زیادہ قرضدار ہو جائے اور ادا نہ کرتا ہو تو کیا

امام اور حاکم کو حق ہے کہ اس پر حجر قائم کر دے اور اس کو ہر قسم کے تصرفات سے روک دے یا حق ہیں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس پر حجر کر دیا جائے گا اور اس کے مال وغیرہ کو فروخت کر کے قرض ادا کرایا جائے گا، اور حضرت امام صاحب کے نزدیک اس پر حجر وارد نہیں ہوگا۔ اور نہ اس کے مال کو فروخت کر سکتا ہے، تو اس مسلک کی بناء پر اس حدیث کو ضعیف اور غیر مستقیم المعنی قرار دیدیا گیا ہے۔ **فافہم وتدبر۔**

ضروری وضاحت: اس واقعہ سے یہ امر ثابت ہوا کہ سلطان اور قاضی کو یہ (بھی) حق ہے کہ مفلس قرار دیئے ہوئے کی ملکیت میں اگر کچھ متاع ہے تو اس کو فروخت کر دیا جائے۔

فائدہ: اگرچہ یہ روایت مرسل ہے اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہوا کرتی ہے۔

فائدہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس لوگ امانت رکھتے اور وہ اجازت لے کر (بطور) قرض ضرورت مندوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے، اسلئے وہ مقروض ہو جاتے تھے۔

فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفارش فرمادیں، ان کے قرض خواہوں سے کہ فی الوقت وہ قرضوں کا مطالبہ نہ کریں، یا معاف کر دیں، روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے گفتگو فرمائی تھی، مگر وہ لوگ اس پر رضامند نہ ہوئے۔

فلو ترکوا الخ: یعنی اگر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قرض کو معاف کر سکتے تو وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش کی وجہ سے معاف کر دیتے، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ سفارش کا قبول کرنا لازم اور واجب نہیں ہے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس حقیقت کو جانتے تھے، اس لئے بلا تکلف منع کر دیتے، بہر حال اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان فروخت کرنے کے بعد قرضہ ادا فرمادیا۔

بلاعذر تاخیر کرنے والا

{۲۷۹۱} **وَعَنِ** الشَّرِيْدِ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهٗ وَعُقُوْبَتَهٗ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ يُحِلُّ عِرْضَهٗ يَغَلَّظُ لَهٗ وَعُقُوْبَتَهٗ يُحْبَسُ لَهٗ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۵۱۱، کتاب القضاء، باب فی الدین ھل یحبس بہ، حدیث نمبر: ۳۶۲۸، نسائی شریف: ۲/۲۰۲، کتاب البیوع، مطل الغنی، حدیث نمبر: ۴۶۹۰۔

ترجمہ: حضرت شرید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالدار کی ٹال مٹول اس کی عزت کو مباح کر دیتی ہے اور اس کی سزا کو، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے (اس کی تفسیر میں) فرمایا: اس کی آبرو کو مباح کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ صاحب قرض اس کو سخت، سست کہہ سکتا ہے، اور اس کی سزا کے مباح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو قید کیا جا سکتا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص صاحب استطاعت اور مالدار ہونے کے باوجود بلاعذر اپنے قرض خواہ کا قرض ادا نہ کرتا ہو تو اس کو اس کی آبروریزی بھی مباح ہے، اور اس کو سزا دینا بھی درست ہے، کیونکہ اس کی طرف سے بلا عذر ادائیگی قرض میں ٹال مٹول اور تاخیر ایک طرح کا ظلم ہے، آبروریزی کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے سرزنش کی جائے اور اسے برا بھلا کہا جائے، اور اس کو سزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ حاکم وعدالت سے چارہ جوئی کر کے اسے قید خانہ میں ڈلوا دیا جائے۔

ایضاً

{۲۷۹۲} **وَعَنْ** اَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِجَنَازَةٍ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَقَالَ: هَلْ عَلیٰ صَاحِبِكُمْ دَيْنٌ قَالُوْا: نَعَمْ! قَالَ هَلْ تَرَكَ لَهٗ مِنْ وَفَاءٍ قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلیٰ صَاحِبِكُمْ قَالَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ: عَلَيَّ دَيْنُهٗ يَا رَسُوْلَ اللهِ! فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى عَلَيْهِ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَّعْنَاهُ وَقَالَ فَكَّ اللهُ رِهَانَكَ مِنَ النَّارِ كَمَا فَكَكْتَ رِهَانَ اَخِيْكَ الْمُسْلِمِ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَقْضِيْ عَنْ اَخِيْهِ دَيْنَهٗ اِلَّا فَكَّ اللهُ رِهَانَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه فی شرح السنة)

حوالہ: شرح السنہ: ۵/۱۶۰، کتاب البیوع، باب ضمان الدین، حدیث نمبر: ۲۱۵۵،

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جنازہ لایا گیا تاکہ اس پر نماز پڑھا دیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے (اس) ساتھی پر قرضہ ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا اس نے قرضہ کی ادائیگی کے لئے مال چھوڑا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ! اس کا قرض میرے ذمہ ہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لائے اور اس پر نماز پڑھی۔

اور ایک روایت میں اسی کے ہم معنی مروی ہے اور (مزید یہ بھی) فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ تمہاری گردن کو دوزخ کی آگ سے نجات دے جس طرح تم نے اپنے مسلمان بھائی کو (قرضہ سے) سبکدوش کر دیا، جو بندہ مسلمان اپنے بھائی کے قرضہ کو ادا کر دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی گردن کو خلاصی عنایت فرمائیں گے۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقروض کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار فرما دیتے اور اصحاب رضی اللہ عنہم کو اجازت فرما دیتے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی نماز پڑھ لیں، معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ (تفصیل ما قبل میں گذر چکی)۔

جو شخص مقروض نہ ہو

{۲۷۹۳} **وَعَنْ** ثَوْبَانَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَهُوَ بَرِیٌّ مِّنَ الْکِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّیْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجة والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۸۶، ابواب السیر، باب ماجاء فی الغلول، حدیث نمبر: ۱۵۷۲۔

ابن ماجه شریف: ۱۷۳، ابواب الصدقات، باب من اد ان دینا لم ینو قضاء ہ، حدیث نمبر: ۲۴۱۲۔

دارمی: ۲/ ۳۴۱، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التشدید فی الدین، حدیث نمبر: ۲۵۹۲۔

ترجمہ: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس حالت میں مرجائے کہ وہ تکبر اور خیانت اور قرضہ سے بری ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

تشریح: اس حدیث کے اندر بجائے فرائض کے دخول جنت کو تین چیزوں پر مرتب کیا، کبر، غلول، دین، اس کی وجہ یہ ہے کہ کبر کے معنی تکبر کے ہیں، تو فرائض وغیرہ کو چھوڑا تو اس نے اپنے مالک کے سامنے تکبر کیا، ایسے ہی فرائض کا ترک اپنے آقا ومولیٰ سے غلول اور خیانت ہے، ایسے ہی دین کا ادا نہ کرنا بھی خیانت ہے، تو جو ان امور کے اندر مبتلا ہوگا تو وہ ترک فرائض کریگا، اس وجہ سے ان اشیاء کا تعلق بھی ترک فرائض سے ہے یا یہ کہا جائے کہ فرائض وغیرہ جو حقوق اللہ میں سے ہیں ان پر جیسے ترتب ہوا دخول جنت کا ایسے ہی بعض حقوق عباد کے بھی ہیں، جن پر حقیقت کا ترتب ہوتا ہے، تو اس کے اندر اگرچہ حقوق اللہ کا ذکر نہیں ہے، لیکن ان کے اندر آپ نے حقوق العباد پر تنبیہ کی ہے۔

مقروض ہو کر موت بڑی معصیت ہے

{۲۷۹۴} **وَعَنْ** اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ یَلْقَاہُ بِھَا عَبْدٌ بَعْدَ الْکَبَائِرِ الَّتِیْ نَھَی اللّٰہُ عَنْھَا اَنْ یَّمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَیْہِ دَیْنٌ لَا یَدَعُ لَہٗ قَضَاءً۔

(رواہ احمد وابوداؤد)

حوالہ: مسند احمد: ۴/ ۳۹۳، حدیث نمبر: ۱۹۷۲۴، ابوداؤد شریف: ۲/ ۴۷۴، کتاب البیوع، باب التشدید فی الدین، حدیث نمبر: ۳۳۴۲،

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک عظیم ترین گناہ کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے (وہ یہ ہے) بندہ اس عظیم گناہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے کہ آدمی مرجائے اور اس کے ذمہ قرضہ

ہو(اور) قرضہ کی ادائیگی کے لئے کچھ مال نہ چھوڑا ہو۔

تشریح: اس حدیث کی شرح میں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ حقوق اللہ کی بناء مصالحت اور مسامحت پر ہے، بخلاف حقوق العباد کے کہ ان کا مسئلہ شدید ہے، جیسا کہ اس حدیث شریف میں گذرا: ”یغفر کل ذنب الشهید الا الدین“ [شہید کا ہر گناہ قرض کے علاوہ بخش دیا جاتا ہے۔] اور اس حدیث شریف میں دین کو کبائر کے بعد رکھا ہے، اس سوال کا جواب طیبی نے دیا ہے کہ وہ جو حدیث میں گذرا ہے کہ شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، سوائے دین کے وہ حدیث لوگوں کو دین سے بچانے کیلئے اور ڈرانے کیلئے علی سبیل المبالغہ تھی، اور یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہے، طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے پھر ایک اور سوال قائم کیا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ نفس دین تو معصیت نہیں بلکہ وہ تو مندوب الیہ ہے، چہ جائے کہ گناہ ہو، پھر اس کا جواب انہوں نے خود ہی یہ دیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ نفس دین منہی عنہ نہیں بلکہ مندوب الیہ ہے، بلکہ اس کا گناہ ہونا ایک عارض کی وجہ سے ہے وہ یہ کہ دین حقوق الناس کی اضاعت کا سبب بن جاتا ہے، بخلاف کبائر کے کہ وہ فی حد ذاتہا قبیح اور ممنوع ہیں۔ شارح جامع الصغیر فرماتے ہین کہ اس حدیث شریف میں جو وعید ہے دین پر یہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ مدیون اس کے ادا کرنے میں کوتاہی کرے، (یعنی دین کے ادا کرنے میں مستعد نہ ہو) یا اس صورت پر محمول ہے جب کہ دین کسی معصیت کے لئے لیا گیا ہو۔ (بذل، الدر المنضود: ۵/۳۳۶)

ایضاً

{۲۷۹۵} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا۔ (رواه الترمذی وابن ماجة وابوداؤد) وَانْتَهَتْ رِوَايَتُهٗ عِنْدَ قَوْلِهٖ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۵۱، ابواب الاحکام، باب ماذکر عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

فی الصلح بین الناس، حدیث نمبر: ۱۳۵۲۔ ابن ماجہ شریف: ۲/۱۷۰، ابواب الاحکام، باب الصلح، حدیث نمبر: ۲۳۵۳، ابوداؤد شریف: ۲/۵۰۵، کتاب القضاء، باب فی الصلح، حدیث نمبر: ۳۳۴۲۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے، مگر ایسی صلح کہ جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرے (وہ جائز نہیں) اور مسلمان اپنی شرائط پر قائم ہیں مگر وہ شرط جو کہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد) اور ابوداؤد کی روایت "شروطھم" پر ختم ہوگئی۔

تشریح: ناجائز صلح کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص اس بات پر صلح کرے کہ میں بیوی کی سوکن سے جماع نہیں کروں گا یہ صلح درست نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کو اپنے اوپر حرام کرلینا لازم آتا ہے جو بالکل جائز اور حلال ہے، اسی طرح وہ صلح بھی جائز نہیں ہے جو حرام چیز کو حلال کردے، مثلاً کوئی اس بات پر صلح کرے کہ میں شراب پیوں گا یا سور کھاؤں گا، اس میں ایک چیز کو اپنے لئے حلال سمجھ لینا ہے جو قطعاً حرام ہے۔

جس شرط کی پاسداری و پابندی جائز نہیں ہے اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ شرط وعہد کرلے کہ میں اپنی لونڈی سے جماع نہیں کروں گا، اس میں ایک ایسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی شرط ہے جو حلال ہے، یا مثلاً کوئی اس بات کی شرط کرے کہ میں اپنی بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے شادی کرلوں گا، اس شرط وعہد کی پاسداری بھی درست نہیں کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کو اپنے لئے حلال قرار دے لینا لازم آتا ہے جو قطعاً حرام ہے۔

بظاہر یہ حدیث شریف اس باب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، لیکن چونکہ مؤلف کتاب نے اس حدیث کو یہاں نقل کیا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ خرید وفروخت کے معاملات میں مفلس ودیوالیہ ہوجانے کے وقت اکثر صلح وشرائط کی نوبت آتی ہے، اس لئے اس مناسبت سے اس حدیث شریف کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔

الفصل الثالث

آنحضرت ﷺ نے بذاتِ خود خریداری فرمائی

{۲۷۹۶} وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ قَيْسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ جَلَبْتُ اَنَا وَمَخْرَفَةُ الْعَبْدِيُّ بَزًّا مِنْ هَجَرَ فَاَتَيْنَا بِهٖ مَكَّةَ فَجَاءَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِيْ فَسَا وَمَنَا بِسَرَاوِيْلَ فَبِعْنَاهُ وَثَمَّ رَجُلٌ يَزِنُ بِالْاَجْرِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زِنْ وَاَرْجِحْ. (رواه احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجة والدارمی) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ.

حوالہ: مسند احمد: ۴/۲۵۲، حدیث نمبر: ۱۹۳۰۸، ابو داؤد شریف: ۲/۴۷۴، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن، حدیث نمبر: ۳۵۹۴، ترمذی شریف: ۱/۲۴۴، ابواب البیوع، باب ماجاء فی الرجحان فی الوزن، حدیث نمبر: ۱۳۰۵، ابن ماجہ شریف: ۱/۱۶۰، ابواب التجارات، باب الرجحان فی الوزن، حدیث نمبر: ۲۲۲۰، دارمی شریف: ۲/۳۳۸، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن، حدیث نمبر: ۲۵۸۵۔

ترجمہ: حضرت سوید بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اور مخرفہ عبدی دونوں نے مقامِ ہجر سے کپڑا خریدکیا اور پھر اس کو لے کر مکہ مکرمہ آئے، پس رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سواری کے بغیر تشریف لائے اور ہم سے ایک پاجامہ کا معاملہ کیا، سو ہم نے وہ آنحضرت ﷺ کو فروخت کر دیا، اور اسی جگہ ایک شخص اجرت پر وزن کیا کرتا تھا، آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: وزن کر اور جھکتا ہوا وزن کر۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: سوید بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور مخرفۃ العبدی رضی اللہ عنہ مقامِ ہجر سے کچھ کپڑا

برائے تجارت لے کر مکہ مکرمہ میں آئے، آنحضرت ﷺ ہمارے پاس پاپیادہ تشریف لائے اور ایک سراویل کا ہم سے بھاؤ کیا، ہم نے آنحضرت ﷺ کو وہ فروخت کر دیا۔

ثم رجل یزن بالاجر: یعنی وہاں ایک شخص موجود تھا جو اجرت لے کر اشیاء کا وزن کرتا تھا، تو آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا: کہ اس ثمن کو تول اور جھکتا ہوا تول۔

کوکب میں لکھا ہے کہ غالباً آنحضرت ﷺ نے سراویل کسی وزنی شی (سلعہ) کے بدلہ میں خریدا ہوگا، جس کو آنحضرت ﷺ نے وزن کرا کر بائع کو دیا۔ (ورنہ اگر یہ شراء بالثمن یعنی درہم اور دینار کے ذریعہ ہوتی تو اس کے تولنے کی کیا ضرورت تھی)۔ **"هكذا فهمت من الكوكب فارجع اليه"**

شراح نے لکھا ہے کہ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا وزن بالاجر جائز ہے، نیز یہ کہ وزن ثمن مشتری کے ذمہ ہے، لہٰذا اس کی اجرت بھی اسی پر واجب ہوگی اور اس کے بالمقابل مبیع کا وزن یا کیل بائع کے ذمہ ہے۔ **"فكذا اجرته عليه"** (هدايه: ۳/ ۲۹)

کیا آنحضرت ﷺ کے لئے لبس سراویل ثابت ہے؟

نیز کوکب میں ہے کہ اس حدیث شریف سے حضور اقدس ﷺ کا سراویل کا خریدنا ثابت ہوا، لیکن آنحضرت ﷺ کا اس کو پہننا کسی روایت میں اس کی تصریح نہیں۔

اس کے حاشیہ میں حضرت شیخ نے جمع الفوائد سے یہ روایت نقل کی ہے:

"عن ابی هريرة رضی الله عنه قلت يا رسول الله! انک لتلبس السراويل؟ قال اجل، فی السفر والحضر وبالليل والنهار، فانی امرت بالستر فلم اجد شيئا استر منه"

یعنی آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سوال پر فرمایا: کہ ہاں میں سراویل پہنتا ہوں، سفر وحضر میں اور آنحضرت ﷺ نے سراویل کی تعریف فرمائی کہ اس میں ستر زیادہ ہے (بہ نسبت تہبند کے)۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند پر ضعف کا حکم لگایا ہے، اور فی نفسہ یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا لبس سراویل ثابت ہے یا نہیں؟ ایک

جماعت اس کی قائل ہے، ابن قیم ان ہی میں سے ہیں، اور ایک جماعت نے لبس کا انکار کیا ہے۔
(کوکب: ۳۸۱/۱، الدر المنضود: ۳۳۳/۵)

ایضاً

{۲۷۹۷} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كَانَ لِيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَيْنٌ فَقَضَانِيْ وَزَادَنِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۴۷۵/۲، کتاب البیوع، باب حسن القضاء، حدیث نمبر: ۳۳۴۶

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا کچھ قرضہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو وہ قرض ادا فرمایا اور کچھ مجھ کو زائد عنایت فرمایا۔

تشریح: شراح نے لکھا ہے کہ مستقرض نے ادائے قرض کے وقت جو قرض لیا تھا اگر اس سے احسن یا اکثر ادا کرے بشرطیکہ یہ زیادتی بغیر کسی شرط اور معاہدہ کے ہو تو دینے والا محسن ہوگا، اور مقرض کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقرض کے لئے زیادتی کا لینا جائز ہے، خواہ وہ زیادتی صفت کے اعتبار سے ہو یا عدد کے اعتبار سے، اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ زیادتی فی العدد ممنوع ہے اور ہماری دلیل آپ کی حدیث خیر الناس احسنھم قضاء ہے، اپنے عموم کے پیش نظر۔
(الدر المنضود: ۳۴۰/۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرض لیا

{۲۷۹۸} **وَعَنْ** عَبْدِاللهِ بْنِ اَبِيْ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اِسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعِيْنَ اَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ اِلَيَّ وَقَالَ: بَارَكَ اللهُ تَعَالٰى فِيْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ اِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْاَدَاءُ۔ (رواہ النسائی)

حوالہ: نسائی شریف: ۲۰۲/۲، کتاب البیوع، باب الاستقراض، حدیث نمبر: ۴۵۹۱

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چار ہزار کا قرض لیا، پھر (جس وقت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو وہ قرضہ ادا فرما دیا، اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھ کو برکت دے، تیرے اہل اور تیرے مال میں۔ قرض کی جزا (اور بدلہ) شکریہ ادا کرنا اور قرض ادا کرنا ہے۔

تشریح: محسن کو دعاءِ خیر دینا اور شکریہ ادا کرنا بھی مکارمِ اخلاق میں سے ہے۔

مہلت دینے والے کی فضیلت

{۲۷۹۹} **وَعَنْ** عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۴۴۳/۳، حدیث نمبر: ۲۰۲۱۷۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کا کسی کے ذمہ حق ہو اور وہ اس کو منسوخ کردے تو صاحب حق کے لئے ہر روز کے عوض صدقہ (کا اجر وثواب) ہوگا۔

تشریح: دراصل وقت پر قرضہ وصول نہ ہونے پر قلب پر بہت گرانی ہوتی ہے، اس کے باوجود خندہ پیشانی کے ساتھ مزید مہلت باعث فضیلت ہوگی۔ تفصیل ما قبل میں گذر چکی۔

قرض کی ادائیگی مقدم ہے

{۲۸۰۰} **وَعَنْ** سَعْدِ بْنِ الْاَطْوَلِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ مَاتَ اَخِيْ وَتَرَكَ ثَلَاثَ مِائَةِ دِيْنَارٍ وَتَرَكَ وُلْدًا صِغَارًا فَاَرَدْتُّ اَنْ اُنْفِقَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخَاكَ مَحْبُوْسٌ بِدَيْنِهٖ فَاقْضِ عَنْهُ قَالَ فَذَهَبْتُ فَقَضَيْتُ عَنْهُ ثُمَّ جِئْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ

قَضَيْتُ عَنْهُ وَلَمْ تَبْقَ إِلَّا امْرَأَةٌ تَدَّعِيْ دِيْنَارَيْنِ وَلَيْسَتْ لَهَا بَيِّنَةٌ قَالَ أَعْطِهَا فَإِنَّهَا صَادِقَةٌ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۱۳۷/۴، حدیث نمبر: ۱۷۳۵۹۔

ترجمہ: حضرت سعد بن اطول رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے بھائی کا انتقال ہوگیا تین دینار (ترکہ میں) چھوڑے اور چھوٹے چھوٹے بچے (بھی) چھوڑے، پس میں نے (یہ) ارادہ کیا کہ ان بچوں پر (وہ متروکہ مال) صرف کروں (اور فی الوقت قرض ادا نہ کروں) مجھ سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ یقیناً تیرا بھائی اپنے قرض میں محبوس ہے، لہٰذا تم اس کا قرض ادا کر دو۔ حضرت سعد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا میں گیا اور میں نے قرضہ ادا کر دیا بھائی کی طرف سے، اور پھر میں حاضر خدمت ہوا اور میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے ان کی طرف سے قرض ادا کر دیا اور کوئی قرض خواہ باقی نہ رہا، مگر ایک عورت جو کہ دو دیناروں کا دعویٰ کرتی ہے اور اس کے پاس کوئی شہادت (اور ثبوت) نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو ادا کر دو وہ سچی ہے۔

تشریح: یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی کے قرض کا حال بغیر وحی کے کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا ہوگا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اس کا قرض ادا کرنے کا حکم دیا، کیونکہ حاکم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے حکم جاری کر دے، یا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے اس کے قرض کا حال معلوم ہوا ہوگا۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ دین میراث پر مقدم ہے، یعنی مرنے والے کے مال وزر میں سے پہلے لوگوں کے وہ مطالبات ادا کئے جائیں جو اپنے ذمہ چھوڑ گیا ہو، اس کے بعد جو کچھ بچے وہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔ (سراجی: ۴)

قرضہ کی وجہ سے جنت کا داخلہ

{۲۸۰۱} **وَعَنْ** مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ جَحْشٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا بِفِنَاءِ الْمَسْجِدِ حَيْثُ يُوْضَعُ الْجَنَائِزُ وَرَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ

تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَيْنَا فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَصَرَهٗ قِبَلَ السَّمَاءِ فَنَظَرَ ثُمَّ طَأْطَأَ بَصَرَهٗ وَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰی جَبْهَتِهٖ قَالَ سُبْحَانَ اللهِ سُبْحَانَ اللهِ مَاذَا نَزَلَ مِنَ التَّشْدِيْدِ قَالَ فَسَكَتْنَا يَوْمَنَا وَلَيْلَتَنَا فَلَمْ نَرَ اِلَّا خَيْرًا حَتّٰى اَصْبَحْنَا قَالَ مُحَمَّدٌ فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا التَّشْدِيْدُ الَّذِيْ نَزَلَ؟ قَالَ فِي الدَّيْنِ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ عَاشَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَقْضِيَ دَيْنَهٗ۔ (رواہ احمد) وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ نَحْوَهٗ۔

حوالہ: مسند احمد: ۵/ ۲۹۰، شرح السنہ: ۵/ ۱۴۸، کتاب البیوع، باب التشدید فی الدین، حدیث نمبر: ۲۱۴۵،

ترجمہ: حضرت محمد بن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے جس جگہ جنازے رکھے جاتے تھے اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (بھی) ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور دیکھا پھر اپنی نگاہ کو نیچے کرلیا اور اپنے ہاتھ کو اپنی پیشانی پر رکھا، (از روئے تعجب) ارشاد فرمایا: سبحان اللہ! کس قدر سخت (عذاب) نازل ہوا ہے، حدیث کے راوی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک دن اور رات خاموش رہے (اور ہم منتظر رہے) ہم کو کچھ دکھلائی نہیں دیا، بجز خیر کے یہاں تک کہ ہم نے صبح کی، راوئ حدیث حضرت محمد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کہ میں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: وہ سختی کیا ہے جو نازل ہوئی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قرض کے متعلق، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کردیا جائے اور پھر زندہ ہو اور پھر اللہ کے راستہ میں قتل کردیا جائے، پھر زندہ ہو اور پھر اللہ کے راستہ میں قتل کردیا جائے پھر زندہ ہو اور اس پر قرض ہو تو جنت میں داخل نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اپنا قرضہ ادا کردے (یا اس کا قرض ادا کردیا جائے)۔ (احمد) اور شرح السنہ میں بھی اسی کے مانند مروی ہے۔

تشریح: اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کے لئے جگہ خارج از مسجد مقرر تھی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز جنازہ مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔ اسی وجہ سے فقہائے احناف نے مسجد میں نماز جنازہ کو مکروہ فرمایا ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت کا بھی علم ہوا، لیکن افسوس آج لوگ حقوق العباد کی ادائیگی میں کتنی غفلت برتتے ہیں۔

013 BabusH Shirkati

باب الشرکۃ والوکالۃ

شرکت اور وکالت کا بیان

رقم الحدیث: ۲۸۰۲؍تا۲۸۰۹؍

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الشرکۃ والوکالۃ

شرکت اور وکالت کا بیان

لغت میں ’’شرکت‘‘ کے معنی ہیں: ’’ملانا‘‘ لیکن اصطلاح شریعت میں ’’شرکت‘‘ کہتے ہیں: ’’دو آدمیوں کے درمیان ایک ایسا (مثلاً تجارتی) عقد و معاملہ ہونا جس میں وہ اصل اور نفع دونوں میں شریک ہوں۔‘‘

شرکت کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرکت ملک۔ (۲) شرکت عقد۔

’’شرکت ملک‘‘ اسے کہتے ہیں کہ دو آدمی یا کئی آدمی بذریعہ خرید یا ہبہ یا میراث کسی ایک چیز کے مالک ہوں، یا دو شخص مشترک طور پر کسی مباح چیز کو حاصل کریں، مثلاً دو آدمی مل کر شکار کریں اور وہ شکار دونوں کی مشترک ملکیت ہو، یا دو آدمیوں کا ایک ہی جنس کا الگ الگ مال ایک دوسرے میں اس طرح مل جائے کہ ان دونوں کے مال کا امتیاز نہ ہو سکے، مثلاً زید کا دودھ بکر کے دودھ میں مل جائے یا وہ دونوں اپنے اپنے مال کو قصداً ایک دوسرے کے مال میں ملا دیں، یہ سب شرکت ملک کی صورتیں ہیں، اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ ہر شریک اپنے دوسرے شریک کے حصہ میں اجنبی آدمی کی طرح ہے، اور ہر شریک اپنا حصہ اپنے دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر اس شریک کو یا کسی دوسرے شخص (یعنی غیر شریک کو) فروخت کر سکتا ہے، البتہ آخری دونوں صورتوں میں (یعنی ایک دوسرے کے مال کے آپس میں مل جانے یا اپنے اپنے مال کو ایک دوسرے کے مال میں قصداً ملا دینے کی صورت میں) کوئی بھی شریک اپنا حصہ کسی دوسرے شخص (یعنی غیر شریک) کو اپنے دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر نہیں بیچ سکتا۔

''شرکت عقد'' کا مطلب یہ ہے کہ شرکاء کا ایجاب وقبول کے ذریعہ اپنے اپنے حقوق واموال کو متحد کر دینا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک دوسرے سے یہ کہے کہ میں نے اپنے فلاں حقوق اور فلاں معاملات یعنی تجارت وغیرہ میں تمہیں شریک کیا اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا، اس طرح ''شرکت عقد'' کا رکن (یعنی اس کی بنیاد) تو ایجاب وقبول ہے، اور اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ معاہدہ شرکت میں ایسی کوئی شرط مطلقاً شامل نہ ہو جو شرکت کے بنیادی اصولوں کو فوت کر دے، جیسے شرکاء میں سے کسی ایک کا فائدے میں سے کچھ حصہ کو اپنے لئے متعین ومخصوص کر لینا، مثلاً کسی تجارت میں دو آدمی شریک ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شریک یہ شرط عائد کرے کہ اس تجارت سے حاصل ہونے والے فائدہ میں سے پانچ سو روپئے ماہوار لیا کروں گا، یہ شرط مشترک ومتحد معاملات کے بالکل منافی ہے، جو شرکت کے بنیادی اصول ومقاصد ہی کو فوت کر دیتی ہے، اس لئے معاہدۂ شرکت میں ایسی کسی دفعہ کا شامل نہ ہونا شرکت کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے۔

پھر شرکت عقد کی چار قسمیں ہیں:

(۱)……شرکت مفاوضہ۔

(۲)……شرکت عنان۔

(۳)……شرکت صنائع والتقبل۔

(۴)……اور شرکت وجوہ۔

''شرکت مفاوضہ'' تو یہ ہے کہ وہ شخص یہ شرط کریں یعنی آپس میں ٹھہرالیں کہ مال میں تصرف میں مفاوضہ میں دونوں شریک رہیں گے، لیکن اس شرکت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ دونوں دین ومذہب میں بھی یکساں اور برابر ہوں، یہ شرکت ایک دوسرے کی وکالت اور کفالت کو لازم کر دیتی ہے، یعنی شرکت مفاوضہ میں شرکاء ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں، لہٰذا یہ شرکت مسلمان اور ذمی کے درمیان جائز نہیں ہوتی، کیونکہ دین ومذہب کے اعتبار سے دونوں مساوی اور یکساں نہیں ہیں، اسی طرح غلام اور آزاد کے درمیان اور بالغ ونابالغ کے درمیان بھی یہ شرکت جائز نہیں، کیونکہ یہ تصرف میں مساوی ویکساں نہیں ہیں۔

اس شرکت کے معاہدہ وشرائط میں لفظ ’’مفاوضت‘‘ یا اس کے تمام مقتضیات کو بیان وواضح کر دینا ضروری ہے، اس شرکت میں عقد ومعاہدہ کے وقت شرکاء کا اپنا اپنا مال دینا یا اپنے اپنے مال کو ملانا شرط نہیں ہے، اس شرکت میں شرکاء چونکہ ایک دوسرے کے کفیل ووکیل ہوتے ہیں، اس لئے اگر اس میں سے کوئی بھی اپنے بال بچوں کے کھانے اور کپڑے کے علاوہ جو کچھ خریدے گا وہ تمام شرکاء کی ملکیت ہوگا۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شرکت مفاوضت اور عنان صرف ایسے سرمایہ اور مال میں صحیح ہوسکتی ہے جو روپئے، اشرفی اور رائج الوقت سکوں کی شکل میں ہو، ہاں سونے اور چاندی کے ڈلوں اور ٹکڑوں میں بھی جائز ہے، بشرطیکہ ان کے ذریعہ لین دین ہوتا ہو اور اگر شرکاء میں سے کوئی ایک وارث یا کسی اور ذریعہ سے کسی ایسے مال کا مالک ہوا جس میں مفاوضت درست ہوسکتی ہے جیسے روپئے اور اشرفی وغیرہ تو شرکت مفاوضت باطل ہو کر شرکت عنان ہو جائے گی اور اگر شرکاء میں سے کوئی ایک کسی ایسے مال کا وارث ہوگیا جس میں شرکت مفاوضت نہیں ہوسکتی جیسے اسباب، مکان اور زمین وغیرہ تو شرکت مفاوضت باقی رہے گی۔

’’شرکت عنان‘‘ یہ ہے کہ دو آدمی ایک خاص طور کے معاملہ مثلاً تجارت میں شریک ہوں اور وہ دونوں مذکورہ بالا چیزوں یعنی تصرف اور دین ومذہب وغیرہ میں یکساں و برابر ہوں، یا یکساں و برابر نہ ہوں، یہ شرکت ایک دوسرے کی وکالت کو تو لازم کرتی ہے، مگر کفالت کو لازم نہیں کرتی، ہاں شرکاء ایک دوسرے کے وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ کفیل وامین بھی ہوتے ہیں، مگر اسی کام میں جس میں وہ شریک ہیں۔

’’شرکت صنائع والتقبل‘‘ یہ ہے کہ دو پیشہ ور مثلاً دو درزی یا دو رنگریز اس شرط پر شرکت میں کام کریں کہ دونوں شریک کام لیں گے اور دونوں اس کام کو مل جل کر کریں گے اور پھر جو اجرت حاصل ہوگی اسے دونوں تقسیم کریں گے، اگر ان کے معاہدۂ شرکت میں یہ شرط ہو کہ کام تو دونوں آدھوں آدھ کریں گے، مگر نفع میں سے ایک تو دو تہائی لے گا اور دوسرا ایک تہائی تو یہ شرط جائز ہے۔ دونوں شرکاء میں سے جو بھی کسی کا کام لے گا اس کو کرنا دونوں کے لئے ضروری ہوگا یہ نہیں کہ جس شریک نے کام لیا ہو

وہی اسے کرے بھی، اسی طرح ان کے یہاں کام کرانے والا دونوں شرکاء میں سے کسی سے بھی اپنا کام طلب کرسکتا ہے، ایسے ہی دونوں شرکاء میں سے ہر ایک کو مساوی طور پر یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی بھی کام کی اجرت حاصل کرلے اور ان میں سے کسی ایک کو اجرت دینے والا بری الذمہ ہوجائے گا، کام کے منافع اور کمائی میں دونوں شریک حصہ دار ہوں گے، خواہ کام دونوں کریں یا صرف ایک کرے۔

''شرکت وجوہ'' یہ ہے کہ ایسے دو آدمی جن کے پاس اپنا کوئی سرمایہ اور مال نہ ہو، اس شرط پر مشترک کاروبار کریں کہ دونوں اپنی اپنی حیثیت اور اپنے اپنے اعتبار پر قرض سامان لاکر فروخت کریں گے اور اس کا نفع آپس میں تقسیم کریں گے، اگر ان دونوں کی شرکت میں مفاوضت کی شرط ہوگی تو وہ صحیح ہوجائے گی اور اگر وہ شرکت کو بلا شرط مفاوضت یعنی مطلق رکھیں گے تو ان کی یہ شرکت بطور عنان ہوگی، یہ شرکت تجارت کے لئے خریدے گئے مال میں وکالت کو لازم کرتی ہے، یعنی وہ اپنے یہاں فروخت کرنے کے لئے جو مال خرید کر لائیں گے اس میں وہ ایک دوسرے کے وکیل ہوں گے، لہٰذا اگر دونوں میں یہ شرط طے پائی ہو کہ تجارت کے لئے جو مال خریدا جائے گا وہ دونوں کا آدھوں آدھ رہے گا، تو اس کے نفع میں بھی دونوں آدھوں آدھ کے حقدار ہوں گے اور اگر یہ شرط طے پائے کہ جو مال خرید کر لایا جائے گا اس میں سے ایک کا تو ایک تہائی ہوگا، اور دوسرے کا دو تہائی، یا ایک کا دو تہائی ہوگا، اور دوسرے کا ایک تہائی تو اس کا نفع بھی اسی اعتبار سے تقسیم ہوگا، نفع میں کمی بیشی کی شرط باطل ہوگی، یعنی یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ مال کو تو آدھوں آدھ رکھیں اور نفع میں کمی بیشی کریں، بایں طور کہ ایک تو نفع میں دو حصے لے لے اور دوسرا ایک حصہ لے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نفع کا استحقاق ضمان یعنی ذمہ داری کی وجہ سے ہوتا ہے اور ضمان اس خریدی ہوئی چیز کی ملک کے تابع ہے، مثلاً اگر ان میں سے کوئی مال کے نصف حصہ کا مالک بنا ہے تو اسے نصف قیمت ادا کرنی ہوگی اور جو دو حصوں کا مالک بنا ہے اسے دو حصوں کی قیمت ادا کرنی ہوگی، اس لئے نفع بھی ملکیت کے مطابق ہی قرار پائے گا جو جتنے حصہ کا مالک بنے گا اسے اتنا ہی نفع ملے گا، اور اس چیز میں شرکت جائز نہیں ہے، جس میں وکالت صحیح نہ ہوتی ہو، جیسے لکڑی کاٹنا، گھاس کھودنا، شکار کرنا، اور پانی لانا، دونوں میں سے جو شخص پانی لائے گا وہی اس کا مالک ہوگا، اگر دوسرا اس میں اس کی مدد کرے گا تو وہ رائج اجرتوں کے مطابق اپنی اجرت پانے کا مستحق ہوگا۔

"وکالت" کے معنی ہیں اپنے حقوق ومال کے تصرف (یعنی لینے دینے) میں کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام بنانا۔ وکالت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ مؤکل (یعنی کسی دوسرے کو اپنا وکیل بنانے والا) تصرف (یعنی لین دین) کا مالک ہو اور جس شخص کو وکیل بنایا جارہا ہو وہ اس معاملہ کو جانتا ہو جس میں وہ وکیل بنایا گیا ہے۔

اور جو معاملہ آدمی کو خود کرنا جائز ہے اس میں دوسرے کو وکیل بنانا بھی جائز ہے اور جو معاملہ آدمی کو خود کرنا جائز نہیں ہے اس میں وکیل بنانا بھی جائز نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص شراب یا سور وغیرہ حرام چیزوں کی خرید وفروخت کے لئے کسی کو وکیل کردے تو یہ درست نہیں ہوگا، تمام حقوق کو ادا کرنے اور ان کے حاصل کرنے میں وکیل بنانا جائز ہے، اسی طرح حقوق پر قبضہ کرنے کے لئے بھی وکیل بنانا جائز ہے، مگر حدود اور قصاص میں جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کی انجام دہی پر باوجود موکل کے اس جگہ موجود نہ ہونے کے وکالت درست نہیں ہوتی۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقوق کی جواب دہی کے لئے وکیل کرنا فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے، ہاں اگر مؤکل بیمار ہو یا تین منزل کی مسافت یا اس سے زائد کی دوری پر ہو تو جائز ہے، لیکن صاحبین یعنی حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر بھی حقوق کی جواب دہی کے لئے وکیل بنانا جائز ہے۔

شرکت اور وکالت کے بارہ میں یہ چند اصول ومسائل فقہ کی کتابوں سے تلخیص کرکے لکھ دئے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے اہل علم فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔ (مظاہر حق: ۳/۵۴۱)

الفصل الاول

شرکت مشروع ہے

{۲۸۰۲} **وَعَنْ** زُهْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ اَنَّهٗ كَانَ يَخْرُجُ بِهٖ جَدُّهٗ عَبْدُاللّٰهِ بْنِ هِشَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اِلَى السُّوْقِ فَيَشْتَرِى الطَّعَامَ فَيَلْقَاهُ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ الزُّبَيْرِ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ اَشْرِكْنَا فَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ دَعَا لَكَ بِالْبَرَكَةِ فَيُشْرِكُهُمْ فَرُبَمَا اَصَابَ الرَّاحِلَةَ كَمَا هِيَ فَيَبْعَثُ بِهَا اِلَى الْمَنْزِلِ وَكَانَ عَبْدُاللّٰهِ ابْنُ هِشَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ ذَهَبَتْ بِهٖ اُمُّهٗ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَسَحَ رَأْسَهٗ وَدَعَا لَهٗ بِالْبَرَكَةِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۴۰/۱، کتاب الترکۃ، باب الترکۃ فی الطعام وغیرہ، حدیث نمبر: ۲۴۳۶۔

ترجمہ: حضرت زہرہ بن معبد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انکے دادا حضرت عبداللہ بن ھشام رضی اللہ عنہ ان کو اپنے ساتھ بازار لے جا رہے تھے تاکہ غلہ خریدیں، پس حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم دونوں حضرات کی ان سے ملاقات ہوگئی اور ان دونوں حضرات نے ان سے عرض کیا: کہ ہم کو بھی شریک کر لیجئے، (اور اس گذارش کی وجہ یہ تھی کہ) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لئے دعائے برکت فرمائی تھی؛ چنانچہ انہوں نے ان دونون حضرات کو شریک کرلیا۔ بعض مرتبہ (نفع کی صورتِ حال یہ ہوتی تھی کہ) ایک اونٹ کا بوجھ نفع میں حاصل ہو جاتا بغیر کسی نقصان کے، جس کو وہ اپنے گھر بھیج دیتے اور (واقعہ دعاءِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ) ان کی والدہ عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئی تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے حق میں دعاءِ برکت فرمائی۔

تشریح: (۱)......شرکت کا جائز ہونا معلوم ہوا۔

(۲)......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت و قبولیت کا علم ہوا۔

013 BabusH Shirkati

انصار کے مال میں مہاجرین کی شرکت

{۲۸۰۳} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ قَالَ قَالَتِ الْاِنْصَارُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَقْسِمْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِیْلَ قَالَ لَا تَکْفُوْنَنَا الْمُؤْنَةَ وَنُشْرِکُکُمْ فِی الثَّمَرَةِ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۷۵، کتاب الشروط، باب الشروط فی المعاملۃ، حدیث نمبر: ۲۶۴۰،

ترجمہ: سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جماعت انصار رضی اللہ عنہم نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان کھجور کے درختوں کو تقسیم فرمادیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں (تقسیم کی ضرورت نہیں) تم لوگ ہماری محنت (ومشقت بالعمل) کی کفایت کرو اور ہم پھل میں تمہارے ساتھ شریک ہوں گے، انصار رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔

تشریح: جب مکہ مکرمہ کے مسلمانوں کے وطن کی زمین تنگ کردی گئی اور خدا اور خدا کے رسول کے حکم پر وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آ گئے، تو چونکہ انہوں نے اپنا سارا سامان واسباب اور مال ومتاع مکہ مکرمہ ہی میں چھوڑ دیا تھا، اس لئے یہاں مدینہ طیبہ میں ان کی معاشی زندگی کا تکفل مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے کہ جنہیں ''انصار'' کہا جاتا ہے، اپنے ذمہ لیا، اس کی شکل یہ کی گئی کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ اور مہاجرین مکہ کے درمیان ''بھائی چارہ'' فرمایا، چنانچہ انصار مدینہ نے اپنے تمام مال واسباب میں مہاجرین کو برابر کا شریک بنالیا، اسی موقع پر انصار نے آپ سے درخواست کی کہ ہمارے کھجوروں کے درختوں کو بھی ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم فرمادیجئے، تاکہ ہم اپنے اپنے حصہ کے درختوں میں محنت مشقت کریں اور ان سے پھل پیدا کریں، آپ نے ان سے فرمایا: کہ میں درختوں کی تقسیم نہیں کروں گا، بلکہ تمہیں لوگ ان درختوں کی دیکھ بھال کرو اور ان میں پانی وغیرہ دینے کی محنت ومشقت خود گوارہ کرلو کیونکہ تمہارے ان بیچارے مہاجرین بھائیوں سے یہ محنت ومشقت برداشت نہیں ہوگی، پھر جب پھل تیار ہوجائے گا تو میں تمہارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کردوں گا۔ آپ کے اس فیصلہ کو انصار نے برضاء ورغبت اور بسر وچشم قبول کرلیا۔

فائدہ: (۱)......اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اپنے مہاجر مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان کی طرف سے محنت و مشقت برداشت کرنا مستحب ہے۔

(۲)...... نیز یہ حدیث بھی شرکت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

(۳)......حضرات انصار رضی اللہ عنہم کی کمال قربانی اور حضرات مہاجرین کے ساتھ کمال حسن سلوک اور حضرت نبی اکرم ﷺ کی کمال اطاعت و فرمانبرداری کا علم ہوا۔

معاملات میں وکالت جائز ہے

{۲۸۰۴} **وَعَنْ** عُرْوَةَ بْنِ اَبِي الْجَعْدِ الْبَارِقِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهُ دِيْنَارًا لِيَشْتَرِيَ لَهٗ شَاةً فَاشْتَرٰى لَهٗ شَاتَيْنِ فَبَاعَ اِحْدَاهُمَا بِدِيْنَارٍ وَاَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِيْنَارٍ فَدَعَا لَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْعِهٖ بِالْبَرَكَةِ فَكَانَ لَوِ اشْتَرٰى تُرَابًا لَرَبِحَ فِيْهِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۵۱۴، کتاب المناقب، باب: ۲۸، حدیث نمبر: ۳۵۱۳،

ترجمہ: حضرت عروہ بن ابی جعد البارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ان کو ایک دینار عنایت فرمایا تاکہ آنحضرت ﷺ کے لئے ایک بکری خرید کریں، چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کیلئے دو بکریاں خریدیں، پھر ان میں سے ایک بکری ایک دینار میں فروخت کر دی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک دینار اور ایک بکری لے کر حاضر ہوئے، حضرت رسول کریم ﷺ نے ان کیلئے ان کی بیع کے لئے دعاءِ برکت فرمائی، سو اگر وہ مٹی بھی خرید کرتے تو اس میں بھی نفع ہوتا تھا۔

تشریح: ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ تجارتی معاملات میں وکالت جائز ہے، اسی طرح ان تمام چیزوں میں بھی کسی کو اپنا وکیل بنانا درست ہے، جن میں نیابت اور قائم مقامی چلتی ہو۔

اگر کوئی شخص کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچے تو بیع منعقد ہو جاتی ہے لیکن اس کا صحیح ہونا مال کے مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر مال کا مالک اجازت دے دے گا تو بیع صحیح ہو جائیگی، یہ حنفیہ کا مسلک ہے، لیکن حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مالک کی اجازت کے بغیر اس کا مال بیچنا سرے سے جائز ہی نہیں ہے، اگرچہ بعد میں مالک کی اجازت بھی حاصل کیوں نہ ہو جائے۔ (مظاہر حق: ۳/۱۴۹)

خیانت کا نقصان

{۲۸۰۵} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ رَفَعَہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَقُوْلُ اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکَیْنِ مَا لَمْ یَخُنْ اَحَدُھُمَا صَاحِبَہٗ فَاِذَا خَانَہٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِھِمَا۔ (رواہ ابوداؤد) وَزَادَ رَزِیْنٌ وَجَاءَ الشَّیْطَانُ۔

حوالہ: ابوداؤد شریف:۲/۴۸۰، کتاب البیوع، باب فی الشرکۃ، حدیث نمبر:۳۳۸۳، رزین:لم اجدہ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میں دو شرکاء میں تیسرا (یعنی اعانت و امداد کرنے والا) ہوتا ہوں، جس وقت تک ان میں سے کوئی ایک اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے، جس وقت کوئی ایک خیانت کرتا ہے، میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔ (ابوداؤد) اور رزین نے زیادہ کیا اور شیطان ان کے مابین آجاتا ہے۔

تشریح: شرکت کی کئی اقسام ہیں:

(۱)......ایک یہ کہ عین اور منفعت یعنی اصل اور نفع دونوں میں شریک ہوں، مثلاً ایک جماعت بذریعہ خرید یا ہبہ یا میراث یا وصیت کسی ایک چیز کی مالک ہو جائے، یا ایک ہی جنس کا الگ الگ مال ایک دوسرے میں اس طرح ملایا جائے کہ آپس میں امتیاز نہ ہو سکے تو ان صورتوں میں عین اور منفعت دونوں میں شرکت ہے۔

(۲)......دوسرے یہ کہ صرف ''عین'' میں شرکت ہو ''منفعت'' میں شرکت نہ ہو، مثلاً کوئی شخص دوسرے کے لئے گھر کے منافع کی وصیت کرے اور ''عین دار'' ورثہ کے لئے ہو، چنانچہ اس صورت میں

ورثہ صرف ''عین'' میں شریک ہوں گے اور منافع ''موصی لہ'' کے لئے ہوں گے، یہی ''شرکۃ فی الاعیان'' ہے۔

(۳)...... تیسرے یہ کہ بدنی حقوق میں شرکت ہو جیسا کہ ایک جماعت حد قذف یا قصاص کی وراثت ہو جائے تو یہ لوگ صرف بدنی حقوق میں شریک ہوں گے اور اس کو ''شرکۃ فی حقوق الابدان'' کہتے ہیں۔

(۴)...... چوتھے یہ کہ مالی حقوق میں شرکت ہو جیسا کہ ''شفعہ'' ہے جو ایک جماعت کے لئے ثابت ہو سکتا ہے اور یہ ایک مالی حق ہے جس کو ''شرکۃ فی حقوق الاموال'' کہتے ہیں۔

اختلاط کی صورت میں جب کہ ایک کا مال دوسرے کے مال کے ساتھ ملا دیں تو ہر ایک تصرف مین دوسری کی طرف سے وکیل ہوتا ہے اور اس کا تصرف جائز ہوتا ہے، اور جو نفع اس سے حاصل ہوتا ہے وہ دونوں میں شریک ہوگا اور ہر ایک کو اپنے مال کے بقدر حصہ ملے گا اور اس شرکت کا نام ''شرکت عنان'' ہے۔(طیبی:۱۳۱/۶)

أنا ثالث الشریکین: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شرکت کے معنی ہیں آپس میں اپنے اموال کو اس طرح مخلوط کر دینا کہ وہ اموال ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں اور اللہ تعالیٰ کا شریک ہونا علی سبیل الاستعارہ ہے۔

کیونکہ برکت و فضل اور نفع اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فضل و برکت کو مال مخلوط کی طرح قرار دیا، جس کی وجہ سے اپنے آپ کو عدم خیانت کی صورت میں ''ثالث الشریکین'' فرمایا۔

اسی طرح خیانت اور زوال برکت کو مال مخلوط قرار دیکر خیانت کی صورت میں شیطان کو ''ثالث الشریکین'' فرمایا۔

فائدہ: (۱)...... حدیث مذکور میں استحباب شرکت کی طرف اشارہ ہے کہ شرکت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت آتی ہے۔

(۲)...... اور اللہ تعالیٰ ہر اس بندہ کی نصرت فرماتے ہیں، جو اپنے بھائی کی نصرت میں ہوتا ہے اور یہ نصرت شرکت میں متحقق ہوتی ہے نہ کہ انفراد میں۔(طیبی:۱۲۴/۶، نفحات التنقیح:۴۸۰/۳)

امانت کی ادائیگی واجب ہے

{۲۸۰۶} **وَعَنْهُ** عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲۳۹/ ۱، کتاب البیوع، باب: ۳۸، حدیث نمبر: ۱۲۶۴، ابوداؤد شریف: ۴۹۸/ ۲، کتاب البیوع، باب الرجل یاخذ حقہ من تحت یدہ، حدیث نمبر: ۳۵۳۵، دارمی شریف: ۲/ ۳۴۳، کتاب البیوع، باب فی اداء الامانۃ واجتناب الخیانۃ، حدیث نمبر: ۲۷۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے تمہارے پاس امانت رکھی ہے اس کو امانت ادا کردو، اور تم خیانت نہ کرو، اس کے ساتھ جس نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے۔

تشریح: قاضی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حدیث شریف کی آخری ہدایت سے مراد یہ ہے کہ خائن نے تمہارے ساتھ جو معاملہ کیا ہے وہی معاملہ تم اس کے ساتھ نہ کرو، یعنی اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے تو تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو، کیونکہ اگر تم بھی خیانت کروگے، تو پھر جس طرح وہ خائن ہے اسی طرح تم بھی خائن قرار دیئے جاؤ گے۔ ہاں اس سے وہ شخص مستثنیٰ ہے جو جاحد (کسی کا مال لے کر مکر جانے والا) سے اپنے حق کے بقدر اس کا مال لے لے، کیونکہ وہ تو اپنا حق اس سے لیتا ہے جو کوئی عدوان یعنی ظلم وزیادتی نہیں ہے، جبکہ خیانت ایک صریح عدوان (ظلم) ہے۔

مسئلہ: ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ کوئی حق ہے، جس کو وہ ادا نہیں کرتا تو کیا ایسی صورت میں وہ صاحب حق اپنا حق اس شخص کے مال میں سے بغیر اس کی اجازت کے خفیہ طور پر لے سکتا ہے، یا نہیں؟

اس مسئلہ کے اندر اختلاف ہے امام احمد کے نزدیک ممنوع ہے، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے۔

دوسری روایت امام شافعی کی یہ ہے کہ اگر وہ مال اس کے قرض کی جنس سے ہے تو لے لے، یہی امام صاحب کی ایک روایت ہے۔

تیسری روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ہے کہ ذہب وفضہ میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ لے سکتا ہے، یعنی اگر اس کے ذمہ سونا قرض تھا اور اس کے مال میں سے چاندی ملی تو لے سکتا ہے، ایسے ہی اس کا عکس بھی جائز ہے۔

چوتھی روایت حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ ہے کہ مطلقاً لینا جائز ہے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مثل روایت مروی ہیں، جو لوگ عدم جواز کے قائل ہیں وہ اس حدیث کے ظاہر سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "ولا تخن من خانک" جو لوگ جواز کے قائل ہیں وہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حدیث پاک کو بنظر غائر دیکھا جائے تو ہمارے مذہب کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ آپ نے خیانت سے منع فرمایا ہے اور اپنا حق اس کے اندر سے لینا خیانت نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی کا حق دوسرے کے ذمہ ہو اور حقدار اس کے مال پر قدرت رکھتا ہو تو اپنے حق کے بقدر اس کے مال میں سے لے لے تو یہ جائز ہے، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ جس مال پر قدرت پائی ہے وہ اسی مال کی جنس سے ہو تو اس نے غصب کیا ہے، مثلاً روپئے غصب کئے، تو یہ اتنی مقدار روپئے لے سکتا ہے، کذا یفہم من الہدایۃ، (مظاہر حق: ۴/۱۵۰)

وکیل کے لئے علامت مقرر کرنا جائز ہے

{۲۸۰۷} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلٰى خَيْبَرَ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ اِنِّيْ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلٰى خَيْبَرَ فَقَالَ اِذَا اَتَيْتَ وَكِيْلِيْ فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقًا فَاِنِ ابْتَغٰى مِنْكَ اٰيَةً فَضَعْ يَدَكَ عَلٰى تَرْقُوَتِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۱۵۱، کتاب القضاء، باب فی الوکالۃ، حدیث نمبر: ۳۶۳۲۔

حل لغات: ترقوته: بفتح التاء وسکون الراء وضم القاف وفتح الواؤ، ہنسلی کی ہڈی۔ جمع: تراقی وترائق۔ کہا جاتا ہے: "ترقاہ ترقاۃ" یعنی اس نے اس کی ہنسلی کی ہڈی پر مارا۔

(مصباح اللغات: ۸۴)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے خیبر کی طرف جانے کا قصد کیا، لہٰذا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام پیش کیا، اور میں نے عرض کیا: کہ میرا خیبر جانے کا ارادہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میرے وکیل کے پاس پہنچو (جو کہ خیبر میں ہے) تو اس سے پندرہ وسق کھجوریں وصول کرنا، سو اگر وہ تم سے کوئی علامت (اس امر پر) طلب کرے (کہ تم میرے قاصد ہو) تو اپنے ہاتھ کو تم اس کے حلق پر رکھ دینا۔

تشریح: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرا ارادہ خیبر جانے کا ہوا، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اور اپنے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: کہ تم جب خیبر میں ہمارے فلاں وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے پندرہ وسق غلہ یا کھجوریں میرا نام لے کر لے لینا، اگر وہ اس پر کوئی دلیل اور علامت طلب کرے تو اس کے ترقوہ پر اپنا ہاتھ رکھدینا، یعنی حلق کے نیچے کے حصہ پر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وکیل سے غالباً فرما رکھا ہوگا کہ اگر تجھ سے کوئی شخص میرے نام پر کوئی چیز مانگے تو اگر وہ تیرے طلب دلیل پر اس جگہ ہاتھ رکھدے تو سمجھنا کہ وہ میری ہی طرف سے ہے۔

فائدہ: (۱)……بوقت سفر اپنے بڑوں سے اجازت وملاقات کے بعد سفر پر جانے کا استحباب معلوم ہوا۔

(۲)……کسی کام کے لئے وکیل مقرر کرنے کا جواز معلوم ہوا۔

(۳)……وکیل کے لئے کوئی علامت مقرر کر دینے کا جواز معلوم ہوا۔

(۴)……''خادعین'' دھوکہ دینے والوں سے حفاظت کرنے کا جواز بلکہ استحباب معلوم ہوا۔ اس لئے کہ وکیل کے لئے علامت مقرر کرنے کا منشا یہی ہے۔

الفصل الثالث

برکت کے اسباب معنوی ہوتے ہیں

{۲۸۰۸} وَعَنْ صُهَيْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ فِيْهِنَّ الْبَرَكَةُ الْبَيْعُ اِلىٰ اَجَلٍ وَالْمُقَارَضَةُ وَاِخْلَاطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيْرِ لِلْبَيْتِ لَا لِلْبَيْعِ۔ (رواه ابن ماجة)

حواله: ابن ماجہ شریف:۱۶۵/۲،ابواب التجارات، باب الشرکۃ والمضاربۃ، حدیث نمبر:۲۲۸۹،

ترجمه: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ہیں جن میں برکت ہے:

(۱)......وعدہ پر (کسی مدت تک کے لئے) فروخت کرنا۔

(۲)......مضاربت کرنا۔

(۳)......گھر کے استعمال کے لئے گیہوں کو جو میں ملانا نہ کہ بیع کے لئے۔

تشریح: مضاربت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا مال تجارت کے لئے دے اور وہ اپنی محنت سے کاروبار کرے، پھر اس کاروبار سے جو نفع حاصل ہو وہ دونوں آپس میں تقسیم کریں۔

گھر کے خرچ کے لئے گیہوں میں جو ملانا ایک فائدہ مند چیز ہے کیونکہ اس طرح گھر کی غذائی ضرورت کی تکمیل کفایت کے ساتھ ہو جاتی ہے، البتہ بیچے جانے والے گیہوں میں جو ملا دینا مطلقاً ممنوع ہے، کیونکہ یہ گناہ وفریب ہے۔

بیع فضولی اجازت پر موقوف رہتی ہے

{۲۸۰۹} وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ اَنَّ

رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مَعَہٗ بِدِیْنَارٍ لِیَشْتَرِیَ لَہٗ بِہٖ اُضْحِیَّۃً فَاشْتَرٰی کَبْشًا بِدِیْنَارٍ وَبَاعَہٗ بِدِیْنَارَیْنِ فَرَجَعَ فَاشْتَرٰی اُضْحِیَّۃً بِدِیْنَارٍ فَجَاءَ بِھَا وَبِالدِّیْنَارِ الَّذِیْ اِسْتَفْضَلَ مِنَ الْاُخْرٰی فَتَصَدَّقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالدِّیْنَارِ فَدَعَا لَہٗ اَنْ یُّبَارَکَ لَہٗ فِیْ تِجَارَتِہٖ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲۳۸/۱، کتاب البیوع، باب: ۳۴، حدیث نمبر: ۱۲۵۷، ابوداؤد شریف: ۴۸۰/۲، کتاب البیوع، باب المضارب یخالف، حدیث نمبر: ۳۳۸۶۔

ترجمہ: حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دینار دے کر بھیجا تا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قربانی کا جانور خرید لائیں، چنانچہ انہوں نے ایک دینار میں ایک دنبہ خرید لیا اور اس کو دو دینار میں فروخت کر دیا، پھر گئے اور ایک دینار میں قربانی کا جانور خرید کیا، پس وہ اس دنبہ اور جو دوسرے دنبہ سے ایک دینار منافع حاصل کیا تھا اس کو لے کر حاضر خدمت ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دینار صدقہ کر دیا اور ان کے لئے ان کی تجارت میں برکت کی دعا فرمائی۔

تشریح: حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جانور خریدنے کے لئے ایک دینار دے کر بھیجا، انہوں نے پہلے ایک دینار سے ایک جانور خریدا، یہاں تک تو کیل پوری ہوگئی، پھر انہوں نے یہ جانور دو دینار کا بیچ دیا اور ایک اور جانور ایک دینار کا خرید کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور ساتھ ہی ایک دینار بھی پیش کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی اور وہ دینار صدقہ کر دیا، پہلے ایک دینار سے جانور خریدنے کے بعد جب انہوں نے اس کو دو دینار کے بدلہ میں بیچا تو اس وقت وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وکیل بالبیع نہیں تھے، اور وہ جانور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل پر انکار نہیں فرمایا، بلکہ برکت کی دعاء فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ فضولی کی بیع باطل نہیں ہوتی، اسی قسم کا واقعہ فصل اول میں بحوالہ بخاری بھی آچکا ہے، فضولی اس کو کہتے ہیں جس کو عقد کا کسی نے وکیل نہ بنایا ہو، نہ وہ اس کی اپنی چیز ہو، ایسے شخص کی بیع

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک باطل ہوتی ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ بیع موقوف ہوتی ہے، مالک کی اجازت پر حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول قدیم بھی یہی ہے۔ زیر بحث حدیث حنفیہ اور جمہور کی دلیل ہے۔ (اعلاء السنن: ۱۵۲/ ۱۴، اشرف التوضیح: ۴۰۸/ ۳)

شرکت ووکالت کے کچھ مسائل

شرکت ووکالت کے بارہ میں کچھ اصولی باتیں باب کی ابتداء میں اور پھر کچھ مسائل اور احادیث کی تشریحات میں بیان ہو چکے ہیں، چونکہ باب ختم ہو رہا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس موضوع سے متعلق کچھ اور ضروری مسائل یکجا طور پر ذکر کر دیئے جائیں۔

شراکتی جماعت

کسی تجارتی کاروبار یا معاملہ میں جو لوگ شریک وحصہ دار ہوتے ہیں ان کی دو شکلیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کاروبار یا معاملہ کا ہر شریک مالک ومتصرف یا صرف متصرف ہوتا ہے، اس طرح اس کاروبار یا معاملہ میں جملہ شرکاء کے باہمی مشورے پر عمل درآمد ہوتا ہے، اسی شکل کی وہ چار قسمیں: شرک مفاوضہ، شرک عنان، شرک صنائع والتقبل اور شرکت وجوہ ہیں جن کا بیان باب کی ابتداء میں ہو چکا ہے۔

شرکاء کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ چند افراد کی ایک جماعت کسی تجارتی معاملہ میں شریک وحصہ دار ہو اور وہ تمام افراد کسی قانونی نظام اور مقررہ قواعد وضوابط کے پابند وماتحت ہوں اور ان میں سے ہر ایک شریک اپنے آپ کو مالکانہ حیثیت سے علیحدہ تصور کرے، اس شکل کو موجودہ دور کے مشترک تجارتی اداروں اور کمپنیوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ

(۱)......ایسے کسی بھی مشترک تجارتی ادارے یا کمپنی کا نظم ونسق چلانے، قانون پر عملدرآمد کرنے اور

اجرائے کار کے لئے شرکاء ہی میں سے یا ان کے علاوہ لوگوں میں سے ایک شخص یا کئی آدمیوں کو جملہ شرکاء کے مشورہ سے منتخب کیا جائے۔

(۲)......کوئی بھی شریک بانصرا اور تصرف کا حق نہیں رکھتا، البتہ حق ملک ہر شریک کو حاصل ہوتا ہے۔

(۳)......جملہ شرکاء کی جماعت بہیئت مجموعی مالک ومتصرف ہوگی اور یہ ہیئت مجموعی خواہ باتفاق کل حاصل ہو یا بکثرت آرائ۔

(۴)......کوئی بھی شریک اپنے مشترک تجارتی ادارہ کا اجیر وملازم بن سکتا ہے۔

(۵)......کوئی بھی شریک علیحدگی اختیار نہیں کرسکتا، البتہ اپنا حصہ بذریعہ ہبہ یا بذریعہ بیع منتقل کرسکتا ہے۔

(۶)......جب تعداد شرکاء محدود ومکمل ہوجائے اور کوئی شریک اپنا حصہ بیچے تو دوسرے شرکاء مقدم سمجھے جائیں گے۔

(۷)......اگر کوئی حصہ میراث یا بیع وغیرہ کے ذریعہ تقسیم ہوجائے تو کارکنان کمپنی اس بات پر مجبور ہوں گے کہ اس حصہ کے جملہ ورثہ یا حقداروں سے لین دین کرنے مین جو کچھ زحمت ہو اسے برداشت کریں، اس حصہ کے جملہ ورثاء یا شرکاء خواہ مل کر دادوستد (لین دین) کریں، یا کسی ایک کو وکیل بنادیں، ایسے حصہ کے جملہ شرکاء کا مجموعہ ایک ذات کے برابر سمجھا جائے گا۔

(۸)......شرکاء کمپنی کاروبار چلانے کے لئے جو قانون مرتب ونافذ کریں گے ان کی پابندی تمام شرکاء پر ضروری ہوگی البتہ خلافِ شرع قانون بنانا معصیت وگناہ اور اس کی پابندی ناجائز ہے۔

(۹)......ایسے جملہ قانون جو کسی نظم ونسق کی حالت کے لئے وضع کئے جائیں صرف مباحات سے متعلق رہیں گے، منصوصات شرعیہ میں اثر انداز نہیں ہوں گے۔

(۱۰)......یہ شرط کہ شرکاء ذاتی طور پر کسی دین اور نقصان کے ذمہ دار نہیں صرف اس صورت میں معتبر ہے جبکہ اس کا اعلان کیا جاچکا ہے۔

فسخ شراکت

جو تجارتی کاروبار یا کوئی معاملہ دو فریق کے زیر شرکت ہو اس کو فسخ کردینے یعنی شرکت کو ختم

کر دینے کی دوصورتیں ہیں:

اول:…… یہ کہ شرکت کو ختم کر دینے پر دونوں فریق راضی ہوں، مثلاً جس کام میں شرکت کی گئی تھی وہ کام ختم ہوگیا ہے، یا کوئی دوسری مصلحت درپیش ہے اوراس وجہ سے دونون فریق شرکت کے فسخ کر دینے پر راضی ہیں۔

دوم:…… یہ کہ ایک فریق علیحد گی چاہے جیسے وہ مرگیا یا مجنون ہوگیا یا کسی مطالبے میں مال دینا پڑا جس سے سرمایہ قائم نہیں رہ سکتا، یا علیحدگی کی کوئی اور وجہ ہو، ان تمام صورتوں میں شرکت ختم ہوکر تقسیم عمل میں آجائے گی اگر چہ میت کے ورثاء اور مجنوں کے اولیاء شراکت کو باقی رکھنا چاہیں۔

فسخ شراکت میں فقہی ہدایات یہ ہیں کہ:

(۱)…… پہلے تمام مطالبات ادا کر دئے جائیں۔

(۲)……ان معاہدوں کی تیکمیل کا انتظام بھی ہوجائے جو شراکت کے ذمہ تھے۔

(۳)……وہ تمام حقوق جو ”اصل وہم“ میں معتبر سمجھے گئے ہیں مثل اموال قیمتی کے تقسیم ہوں گے۔

(۴)……جو مطالبات دوسروں پر واجب ہیں اور جن کا وصول ہونا باقی ہے وہ بوقت وصول بقدر حصہ ملا کریں گے، اور ہر شریک دوسرے کا وکیل سمجھا جائے گا تا کہ تقاضہ اور وصول کرتا رہے۔

(۵)……فسخ شراکت کی دوسری صورت میں ان دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہے، اول یہ کہ شراکت سے علیحدگی اختیار کرنے والا فریق یا اس کے قائم مقام ذمہ داریوں کے بار سے سبکدوش نہیں ہوسکیں گے۔ دوم یہ کہ جملہ حقوق معتبرہ مثل دوکان ونام وغیرہ میں فریق خارج کو کوئی حق نہیں دیا جائے گا۔

(۶)……شراکتی جماعتوں یعنی مشترک تجارتی اداراں اور کمپنیوں پر اس ادارہ یا کمپنی کے مقررہ قانون کے حکم یا حاکم کے حکم کے بغیر ایسے انفساخ کا اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ کسی شریک کی موت وجنون اور افلاس وغیرہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

فسخ شراکت کی صورت میں تقسیم کی ترتیب

جب شراکت ختم ہوجائے اور فریقین کے درمیان سرمایہ واموال کی تقسیم ہونے لگے تو ان امور

کی ترتیب اوران کا لحاظ ضروری ہے۔

(۱)......جو مطالبات شراکت کے ذمہ ہوں ان کی ادائیگی یا جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی تکمیل کا انتظام پیش نظر رہے۔

(۲)......جملہ حقوق معتبرہ اوراموال قیمتی کی قیمت متعین کردی جائے اور درصورت اختلاف ونزاع قرعہ سے فیصلہ کرنا شرعاً جائز ہے۔

(۳)......فریق خارج کو کوئی حق آئندہ نہ دلایا جائے گو ذمہ داریوں کے بارے وہ سبک دوش نہیں ہے۔

(۴)......شراکت کے جو مطالبات دوسروں کے ذمہ ہوں ان میں حسب دستور وکالت رہے گی، وصول ہونے پر بقدر حصہ تقسیم کرنا چاہئے۔

وکالت کے احکام

(۱)......وکالت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ وکیل اور مؤکل، مجنون، نابالغ، غلام اور مجحور نہ ہوں۔

(۲)......کسی ایسی شئ میں وکیل بنانا جائز نہیں جو کسی کی مملوک نہ ہو، جیسے جنگل کی گھاس یا لکڑیاں جمع کرنا، دریا سے پانی لانا، غوطہ لگا کر موتی نکالنا، یا صدقہ لینے کے لئے وکیل بنانا۔

(۳)......جائز ہے کہ وکیل چاہے تو مفت خدمات انجام دے، چاہے اپنی اجرت وصول کرے اور چاہے نفع میں شریک ہو۔

(۴)...... ہر ایسے تصرف میں جس کی نسبت اپنی اور مؤکل دونوں کی طرف کرسکتا ہے، وکیل مثل اصل کے مدعی اور مدعا علیہ بن سکتا ہے۔ جیسے خرید وفروخت اور ہر ایسے امر میں جس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرسکتا وکیل کو حقوقِ عقد سے کوئی واسطہ نہیں جیسے نکاح وطلاق۔

(۵)......وکیل کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی ذات کے لئے مالکانہ تصرف کرے، کیونکہ وہ صرف امین ہے۔

(۶)......مؤکل اپنے وکیل کو تصرف سے پہلے معزول کرسکتا ہے، تصرف کے بعد اسے وکیل کے انجام

دیئے ہوئے کام کو قبول وتسلیم کر لینے کے علاوہ اور کوئی حق حاصل نہیں۔

(۷)......وکیل کو حق ہے کہ وہ مؤکل کے لئے جو مال لایا ہے اس کے دام وصول کئے بغیر اس کے حوالے نہ کرے، مگر دے کر واپس نہیں کرسکتا۔

(۸)......جب تک وکیل دام وصول کرنے کے لئے مال نہ روکے امین ہے اور روکنے کے بعد ضامن ہو جائے گا۔

(۹)......وکیل کو جائز نہیں کہ جس چیز کے لئے وکیل بنایا گیا ہے اس کا معاملہ اپنی ذات کے لئے کرے۔

مسئلہ نمبر (۱)......زید نے اپنے نوکر سے کسی دوکان سے کوئی چیز منگوائی اور نوکر وہ چیز دوکاندار سے ادھار لے آیا، تو وہ دوکاندار زید سے قیمت کا تقاضہ نہیں کرسکتا بلکہ اسی نوکر سے تقاضہ کرے، اور وہ نوکر زید سے تقاضہ کرے، بشرطیکہ زید نے قیمت اسے نہ دی ہو۔ اسی طرح اگر زید نے اپنی کوئی چیز اپنے نوکر سے بکوائی تو زید کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ خریدار سے تقاضہ کرے یا اس سے قیمت وصول کرے، کیونکہ خریدار نے جس شخص سے وہ چیز حاصل کی ہے اسی کو قیمت ادا کرے گا، ہاں اگر خریدار زید کو از خود قیمت دیدے تو یہ جائز ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر خریدار زید کو قیمت نہ دے تو زید زبردستی نہیں کرسکتا۔

مسئلہ نمبر (۲)......زید نے اپنے نوکر سے ایک من گیہوں منگوایا تھا، مگر وہ ڈیڑھ من اٹھالایا تو زید کو پورا ڈیڑھ من لینا واجب نہیں ہے، بلکہ اگر وہ نہ لے تو آدھ من نوکر کو لینا پڑے گا۔

مسئلہ نمبر (۳)......زید نے کسی سے کہا: کہ فلانی بکری جو فلاں کے یہاں ہے تم جا کر اس کو پندرہ روپئے میں لے آؤ تو اب وہ شخص وہی بکری خود اپنے لئے نہیں خرید سکتا، مطلب یہ ہے کہ جو چیز خاص کر کے وکیل کو بتادی جائے اس وقت وکیل کو خود اپنے لئے اس کو خریدنا جائز نہیں ہے، البتہ مؤکل نے جو دام بتائے ہیں اس سے زیادہ میں اگر وکیل اپنے لئے خریدے تو جائز ہے اور اگر مؤکل نے کچھ دام نہ بتائے ہوں صرف خریدنے کے لئے کہا ہو تو پھر کسی صورت میں بھی وہ چیز وکیل اپنے لئے نہیں خرید سکتا۔

مسئلہ نمبر (۴)……زید کے وکیل نے زید کے لئے ایک بکری خریدی پھر ابھی وکیل زید کو دینے نہیں پایا تھا کہ بکری مرگئی یا چوری ہوگئی تو اس بکری کے دام زید ہی کو دینا پڑیں گے، اگر زید وکیل سے یہ کہے کہ تم نے وہ بکری میرے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے خریدی تھی تو زید کی اس بات کا اعتبار نہیں ہوگا، بشرطیکہ زید نے اس بکری کے دام وکیل کو پہلے ہی دیدیئے ہوں، ہاں اگر اس نے دام پہلے نہیں دئے تھے، تو اس صورت میں اگر زید قسم کھا کر وکیل سے یہ کہے کہ تم نے وہ بکری اپنے لئے خریدی تھی تب اس کی بات کا اعتبار ہوگا اور اس بکری کا نقصان وکیل کو برداشت کرنا ہوگا، اور اگر زید قسم نہ کھا سکے تو پھر وکیل ہی کی بات کا اعتبار کرنا ہوگا۔

مسئلہ نمبر (۵)……زید کا نوکر اگر کوئی چیز گراں خرید لایا ہے کہ وہ چیز اتنی قیمت میں کوئی نہیں خرید سکتا تو اس کا لینا واجب نہیں ہے، اگر زید وہ چیز نہ لے تو خود نوکر اس چیز کا ذمہ دار ہوگا۔

مسئلہ نمبر (۶)……زید نے اپنی کوئی چیز بکر کو دی کہ وہ اسے فروخت کردے تو بکر کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس چیز کو خود لے لیوے اور اس کے دام زید کو دیدے، اسی طرح اگر زید نے بکر سے کہا: کہ فلاں چیز میرے لئے خرید لاؤ تو بکر کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اپنی چیز زید کو لا کر دیدے اور اس سے اس کی قیمت وصول کرلے، اگر بکر اپنی چیز دینا یا خود لینا چاہے تو زید سے صاف صاف کہدے کہ یہ چیز میں لیتا ہوں، مجھ کو دے دو، یا یوں کہہ دے کہ یہ میری چیز لے لو اور اتنی قیمت مجھے دیدو، بغیر بتلائے ہوئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر (۷)……زید نے اپنے نوکر سے بکری کا گوشت منگوایا اور وہ بھینس کا لے آیا تو زید کو اختیار ہوگا کہ چاہے لے چاہے نہ لے، اسی طرح زید نے نوکر سے آلو منگوائے اور وہ بھنڈی لے آیا تو اس کا لینا ضروری نہیں، اگر زید لینے سے انکار کردے تو نوکر کو خود لینا پڑے گا۔

مسئلہ نمبر (۸)……زید نے دو آدمیوں کو بھیجا کہ بازار جا کر فلاں چیز لے آؤ، تو اس چیز کی خریداری کے وقت ان دونوں آدمیوں کو موجود رہنا ضروری ہے۔ صرف ایک آدمی کو خریدنا جائز نہیں ہے، اگر ایک ہی آدمی خریداری کرے تو بیع موقوف رہے گی، اگر زید صرف ایک آدمی کی خریدار کو منظور کرلے گا تو صحیح ہو جائے گی۔

مسئلہ نمبر (۹)......زید نے کسی شخص سے کہا: کہ بازار سے فلاں چیز خرید لاؤ، مگر اس شخص نے وہ چیز خود نہیں خریدی، بلکہ کسی دوسرے سے خریدنے کے لئے کہہ دیا تو اب اس چیز کو لینا زید پر واجب نہیں رہے گا، چاہے وہ لے لے چاہے لینے سے انکار کر دے، دونوں اختیار ہیں، البتہ اگر وہ شخص خود خریدے تو پھر زید کو لینا پڑے گا۔

وکیل کی برطرفی

وکیل کو قبل تصرف برطرف کر دینے کا ہر وقت اختیار ہے، مثلاً زید نے کسی سے کہا تھا کہ مجھے ایک بکری کی ضرورت ہے کہیں مل جائے تو لے لینا، پھر منع کر دیا کہ میں نے تم سے جو بکری خریدنے کے لئے کہا تھا، اب نہ خریدنا، اس کے باوجود وہ شخص بکری خرید لے تو زید کے لئے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ وہ بکری لے لے، کیونکہ منع کرنے کے بعد اس شخص کو زید کے لئے بکری خریدنے کا اختیار نہیں رہا تھا، ہاں اگر اس نے بکری خرید لی اور پھر اس کے بعد زید نے منع کیا تو اس صورت میں زید پر واجب ہوگا کہ وہ بکری لے لے اور اس کی قیمت ادا کرے۔

اور اگر یہ صورت ہو کہ زید نے خود اس کو منع نہیں کیا بلکہ خط لکھ کر بھیجا یا آدمی بھیج کر اطلاع دی کہ اب میرے لئے بکری نہ خریدنا تب بھی وہ شخص وکالت سے برطرف ہوگیا، اور اگر زید نے برطرفی کی اطلاع نہیں دی بلکہ کسی اور آدمی نے اس سے کہہ دیا کہ زید نے تمہیں وکالت سے برطرف کر دیا ہے اب اس کے لئے خریدنا، تو اس صورت میں اگر اطلاع دینے والے دو آدمی ہوں یا ایک ہی آدمی نے اطلاع دی مگر وہ معتبر اور پابند شرع ہے تو اس اطلاع پر بھی برطرفی عمل میں آ جائے گی اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ شخص وکالت سے برطرف نہیں ہوگا اگر اس نے بکری خرید لی تو زید کو لینی پڑے گی۔

014 Babul Ghasab

باب الغصب والعاریۃ

رقم الحدیث: ۲۸۱۰ر تا ۲۸۳۱ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الغصب والعاریۃ

''غصب''لغت میں دوسرے کی چیز کو زبردستی چھین لینا۔اور اصطلاح شریعت میں مال متقوم محترم کو مالک کی اجازت کے بغیر زبردستی علانیہ چھیننا۔(ہدایہ:۳/۳۷۲)

جس کی حرمت کتاب وسنت اور اجماع تینوں سے ثابت ہے۔چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

''یَا اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ'' (النساء:۲۹)

[اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔]

اسی طرح حضور اقدس ﷺ نے اپنے تاریخی خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''اِنَّ دِمَائَکُمۡ وَاَمۡوَالَکُمۡ عَلَیۡکُمۡ حَرَامٌ کَحُرۡمَۃِ یَوۡمِکُمۡ ھٰذَا فِیۡ شَھۡرِکُمۡ ھٰذَا فِیۡ بَلَدِکُمۡ ھٰذَا'' (ابوداؤد شریف:۲/۱۸۳)

[بے شک تمہارا خون اور تمہارے اموال اسی طرح حرام ہیں جیسے تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں حرام ہے۔]

اور اسی پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ دوسرے کا مال بغیر حق کے چھیننا قطعاً جائز نہیں۔(اعلاء السنن:۱۶/۳۲۴)

جبکہ ''عاریۃ'' کے معنی ہیں:''اباحۃ الانتفاع من اعیان المال'' (اعلاء السنن:۱۶/۴۱) مال سے انتفاع کو مباح قرار دینا۔

''عاریت'' کا جواز بھی ادلہ اربعہ سے معلوم ہوتا ہے۔(المغنی:۵/۱۲۸)

چنانچہ فرمان الٰہی ہے: "وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" ماعون کے اصل لفظی معنیٰ شی قلیل وحقیر کے ہیں، اس لئے ماعون ایسی استعمالی اشیاء کو کہا جاتا ہے جو عادتاً ایک دوسرے کو عاریتاً دی جاتی ہے اور جن کا باہم لین دین انسانیت کا عام تقاضیٰ سمجھا جاتا ہے، جیسے کلہاڑی، پھاوڑا، یا کھانے پکانے کے برتن، جن کا ضرورت کے وقت پڑوسیوں سے مانگ لینا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا اور جو اس میں دینے سے بخل کرے وہ بڑا کنجوس، کمینہ سمجھا جاتا ہے۔ (معاف القرآن: ۸/۸۲۶)

ایک تفسیر کے مطابق یہاں "ماعون" سے مراد بھی یہی چیزیں ہیں۔

جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر "العواری" عاریت کی چیزیں "القدر والمیزان والدلو" کے ساتھ منقول ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۴/۵۴۴)

نیز خطبۃ الوداع کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "العاریۃ مؤداۃ والزعیم غارم" (ابوداؤد شریف: ۳/۲۹۶) عاریت کا ادا کرنا ضروری ہے اور ضامن ذمہ دار ہے۔

اسی طرح مغنی میں علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواز عاریت پر اجماع نقل کیا ہے اور یہی قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ جس طرح اعیان کا ہبہ جائز ہے، اسی طرح منافع کا ہبہ بھی جائز ہونا چاہئے، اسی وجہ سے وصیت منافع اور اعیان دونوں کی ہوسکتی ہے۔ (نفحات التنقیح: ۳/۴۸۱)

014 Babul Ghasab

الفصل الاوّل

غصب کی سزا

{۲۸۱۰} وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوِّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۴۵۳، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی سبع ارضین، حدیث نمبر: ۳۰۹۴،

مسلم شریف: ۲/۳۲، کتاب المساقاۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض، حدیث نمبر: ۱۶۱۰۔

ترجمہ: حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی شخص نے بطورِ ظلم کسی کی ایک بالشت زمین غصب کر لی تو بروزِ قیامت وہ بالشت بھر زمین سات زمینوں تک اس غاصب کے گلے میں طوق بنا کر ڈالی جائے گی۔

تشریح: اس ارشاد گرامی میں یہ بتایا گیا ہے کہ شریعت مطہرہ میں کسی کے مال کو زبردستی چھین لینے پر غاصب کو انتہائی سخت سزا اور عقوبت کا مستحق گردانا جاتا ہے، کیونکہ اسلام نے انسانی حقوق کے تحفظ کا اعلیٰ درجے میں اہتمام کیا ہے۔

اور یہ فرمان نبوی اس مقام کو بتانے کے لئے ایک نمونہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ظلم وستم سے زمین کا ایک بالشت حصہ بھی لیا جائے تو اس زیادتی کی یہ سزا دی جائے گی کہ قیامت کے دن صرف غصب کردہ زمین نہیں بلکہ ساتوں زمینوں میں سے اتنی ہی زمین لے کر اس کے گلے میں بطور طوق ڈالی جائے گی۔

علامی طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تطویق'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین میں دھنسا دے گا، چنانچہ زمین کا وہ حصہ جو اس نے غصب کیا ہو گا اس کے گلے کو طوق کی طرح جکڑ لے گا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ''طوق تکلیف'' ہے نہ کہ ''طوق تقلید'' گویا اس غاصب

014 Babul Ghasab

شخص کو اس زمین کے اٹھانے پر مجبور کیا جائے گا۔

چنانچہ حضرت سالم رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح ہے: "اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَیْئًا بِغَیْرِ حَقِّہٖ خُسِفَتْ بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِلٰی سَبْعِ اَرْضِیْنَ" (طیبی: ۱۲٦/٦، بخاری شریف: ۴۵۳/۱)

کہ اگر کسی نے دوسرے کی زمین پر بغیر حق کے قبضہ کیا تو قیامت کے دن سات زمینوں تک اس کو دھنسایا جائے گا اور ان کا بوجھ اس کے اوپر لاد دیا جائے گا۔

زمینوں کی تعداد

آسمانوں کی تعداد اور ان کے سات ہونے پر جس کثرت اور صراحت کے ساتھ نصوص ملتی ہیں زمینوں کے سات ہونے پر اگر چہ اس قدر نصوص نہیں ہیں، لیکن بعض آیات قرآنیہ کے ظاہر اور کئی معتبر اور صحیح احادیث سے آسمانوں کی طرح زمینوں کا سات ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور عقلاً بھی یہ محال نہیں، بلکہ ممکن ہے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ" (الطلاق: ۱۲) [اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور زمین بھی، ان ہی کی طرح۔]

آیت مذکورہ میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، بعض نے "مماثلة فی الشکل و الھیئة" مراد لی ہے۔ اور بعض نے "مماثلة فی الخلق" مراد لی ہے اور بعض نے بجائے سات زمینوں کے "اقالیم سبعة" مراد لئے ہیں، لیکن یہ سب اقوال اس پر مبنی ہیں کہ زمین کا سات ہونا عقلاً مستبعد اور محال ہے جبکہ اس میں عقلاً کوئی بعد اور استحالہ نہیں۔

لہٰذا مماثلت سے مراد "مماثلة فی العدد" ہے اور آسمان کی طرح زمینیں بھی سات ہیں، چنانچہ آیت مذکورہ کے تحت علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے زمین کے سات طبقے ہونے کو جمہور کا مسلک اور اصح الاقوال کہا ہے۔

اسی طرح حدیث مذکور سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ زمینیں بھی آسمانوں کی طرح متعدد ہیں، چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے: "قال العلماء ھذا تصریح بان

الارض سبع طباق" وھو موافق لقولہ تعالیٰ: ومن الارض مثلھن" (شرح النووی: ۲/۳۲)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سات اقالیم کا مراد لینا اس لئے صحیح نہیں کہ ایک بالشت غصب کرنے کی وجہ سے سات اقالیم کی ایک ایک بالشت زمین کو اس کے گلے میں طوق کے طور پر نہیں ڈالا جائے گا، بلکہ ایک بالشت زمین کے غصب کرنے سے اس کی محاذات میں جو سات طبقات ہیں وہی ساتوں اس کے گلے میں بطور طوق کے ڈالے جائیں گے۔

بلا اجازت دودھ نکالنا

{۲۸۱۱} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَحْلُبَنَّ اَحَدٌ مَاشِیَۃَ امْرِیءٍ بِغَیْرِ اِذْنِہٖ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یُؤْتٰی مَشْرَبَتُہٗ فَتُکْسَرَ خِزَانَتُہٗ فَیُنْتَقَلُ طَعَامُہٗ وَاِنَّمَا یَخْزُنُ لَھُمْ ضُرُوْعُ مَوَاشِیْھِمْ اَطْعِمَاتِھِمْ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۷۸، کتاب اللقطۃ، باب تحریم حلب الماشیۃ بغیر اذن مالکھا، حدیث نمبر: ۱۷۲۶۔

حل لغات: ماشیۃ، جانور، اس جگہ دودھ دینے والا جانور مراد ہے۔ امریٔ: بمعنی انسان، شخص، مشروبۃ، میم پر فتحہ اور "ش" ساکن، "ر" پر بھی فتحہ نیز ضمہ۔ بمعنی "الغرفۃ" یعنی وہ شی جس میں سامان رکھا جائے، مال کو محفوظ کیا جائے۔ الخزانۃ: بکسر الخاء، مکان اور مخزن ہے۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ کوئی شخص کسی کے جانور سے بغیر اجازت دودھ نہ دوہے، کیا کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے خزانہ کے پاس آیا جائے اور اس کو توڑا جائے اور (اس مخزن میں سے) اس کا غلہ لے جایا جائے، اور بلاشبہ ان کے جانور کے تھن اپنے مالکوں کے لئے ان کے طعاموں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (یعنی جانوروں کے تھن دودھ کی حفاظت کے لئے بمنزلہ ان خزائن کے ہیں جہاں غلہ بحفاظت رہتا ہے۔)

تشریح: جانوروں کے تھن کو غلہ وغیرہ کے گودام سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح تم اپنے غلوں کو گوداموں میں بھر کر محفوظ رکھتے ہو، اسی طرح دوسرے لوگوں کے جانور اپنے تھنوں میں اپنے مالک کی غذائی ضرورت یعنی دودھ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح تم اس بات کو کبھی بھی پسند وگوارا نہیں کرسکتے کہ کوئی دوسرا شخص تمہارے گوداموں اور تمہارے خزانوں کو غیر محفوظ بنا کر وہاں سے غلہ یا دوسری محفوظ اشیاء نکال لے اسی طرح تمہارا یہ فعل بھی جانوروں کے مالکوں کو کیسے گوارا ہوسکتا ہے کہ تم ان جانوروں کے تھنوں سے دودھ نکال لو۔

حاصل یہ ہے کہ تم دوسروں کے مال پر بری نگاہ نہ ڈالو اور دوسروں کے حقوق کو غصب نہ کرو، تاکہ کوئی دوسرا تمہارے مال کو غصب نہ کرے، اور جس طرح تم اپنا مال غصب کیا جانا گوارہ نہیں کرسکتے، اسی طرح کسی دوسرے کا مال خود غصب کرنا بھی گوارہ نہ کرو۔

ایک مسئلہ مختلف فیہ ہے، وہ یہ کہ ایک شخص جارہا ہے، زادِ راہ ختم ہوگیا، اب کھانے کی ضرورت پیش آئی تو راستہ کے اندر جو جانور دودھ والا ملے یا کوئی پھل والا باغ ملا تو آیا اس سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے یا نہیں؟ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی اصح الروایۃ اسحق بن راہویہ کے نزدیک مطلقاً اس کو لینا جائز ہے، خواہ اس کو حاجت ہو یا نہ ہو۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بغیر اجازت کے استعمال نہیں کرسکتا۔ اور حالت اضطرار کے اندر اس شرط پر لے سکتا ہے کہ پھر ادا کردے اور ان لوگوں نے اس حدیث شریف سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر اذن کے لینے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ص:۲۵۶، پر شروع صفحہ کے اندر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور اس کے بعد والی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً کھانے کی اجازت صراحۃً مرحمت فرمائی۔

اب ان دونوں حدیثوں اور اس متن والی حدیث کے اندر تعارض ہوگیا، اب دفعیہ کے لئے چند جوابات دئے گئے ہیں:

(۱)......یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت راجح ہے متفق علیہ ہونے کی وجہ سے۔

(۲)......یہ حدیث محرم ہے، لہٰذا مبیح پر راجح ہوگی۔

(۳)......ترجیح کی ضرورت نہیں بلکہ دونوں کے اندر جمع کیا جائے گا کہ بغیر اجازت کے کھانے والی حدیث مالک کی رضاء پر محمول ہے اور اجازت والی عدم رضا پر محمول ہے۔

(۴)......عدم اجازت کی حدیث عرب کے دستور پر محمول ہے اور اجازت کا امر جس حدیث کے اندر ہے وہ ان شہروں کے لئے ہے جہاں بغیر اجازت کے کام نہ چلے۔

(۵)......عدم اجازت کی حدیث حالت مخمصہ واضطرار پر محمول ہے اور امر اجازت عام حالات پر محمول ہے۔

(۶)......عدم اجازت والی حدیث متعارف ومعلوم شخص کے بارے میں ہے اور اجازت والی حدیث اجنبی اور غیر مانوس شخص کے بارے میں ہے، جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے وقت اپنے ایک قریشی متعارف وجان کار کی بکری کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر نکالا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرح السفر میں لکھا ہے کہ اس روایت پر اکثر اہل علم کا عمل ہے کہ کسی کے مویشی کا دودھ صرف حالت اضطرار میں تو بقدر ضرورت جائز ہے، اور اس کی قیمت دینا ضروری ہے، اگر فی الحال رقم ہو تو جتنا دودھ استعمال کیا ہے اس کا ضمان اسی وقت دے ورنہ جب میسر آئے اس وقت دے۔

نقصان کا بدلہ

{۲۸۱۲} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ بَعْضِ نِسَاءِهٖ فَأَرْسَلَتْ اِحْدٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِصَحْفَةٍ فِيْهَا طَعَامٌ فَضَرَبَتِ اللَّتِيْ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْتِهَا يَدَ الْخَادِمِ فَسَقَطَتِ الصَّحْفَةُ فَانْفَلَقَتْ فَجَمَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِلَقَ الصَّحْفَةِ ثُمَّ جَعَلَ يَجْمَعُ فِيْهَا الطَّعَامَ الَّذِيْ كَانَ فِي الصَّحْفَةِ وَيَقُوْلُ غَارَتْ اُمُّكُمْ ثُمَّ حَبَسَ الْخَادِمَ حَتّٰى اُتِيَ بِصَحْفَةٍ مِّنْ عِنْدِ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا فَدَفَعَ الصَّحْفَةَ الصَّحِيْحَةَ اِلَى الَّتِيْ كُسِرَتْ صَحْفَتُهَا وَاَمْسَكَ الْمَكْسُوْرَةَ فِيْ بَيْتِ الَّتِيْ كَسَرَتْ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۲/۷۸۶، کتاب النکاح، باب القبرۃ، حدیث نمبر: ۵۰۲۹،

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج میں سے کسی زوجہ کے پاس تشریف فرماتھے، امہات المؤمنین میں سے کسی ایک نے پیالہ جس میں کھانا تھا ارسالِ خدمت کیا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زوجۂ محترمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف فرماتھے، انہوں نے خادم کے ہاتھ پر مارا، جس سے کہ وہ پیالہ گر کر ٹوٹ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ کے ٹکڑوں کو جمع فرمایا اور پھر اس کھانے کو جمع کیا جو پیالہ میں تھا، اور فرمایا: کہ تمہاری اماں جان نے غیرت کی اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خادم کو روکا یہاں تک کہ جن زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے پیالہ لیا اور ثابت پیالہ ان کے پاس بھیج دیا، جن کا پیالہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور ٹوٹا ہوا پیالہ اس گھر میں رکھ دیا جس میں وہ پیالہ ٹوٹ گیا تھا۔

تشریح: بعض نسائه: اس سے ام المؤمنین حبیبۃ الرسول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔ (دیکھئے حاشیۃ البخاری: ۷۳۳/۱، حاشیہ: ۳)

احدی امہات المومنین: کے مصداق میں تین قول ہیں:

(۱)......حضرت زینب رضی اللہ عنہا (۲)......حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (۳) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

ید الخادم: علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ خادم کا اطلاق مذکر ومؤنث دونوں پر ہوتا ہے، لیکن یہاں پر مؤنث مراد ہے، یعنی پیالہ لانے والی کوئی لڑکی تھی اور دلیل اس کی دوسری روایت میں "فضربت بیدها" ضمیر تانیث ہے۔ کذافی العینی، (حاشیہ بخاری سابق)

اصح یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں اور جو طعام انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تھا وہ حلوہ تھا، جیسا کہ ابن حزم ظاہری کی روایت کے اندر تصریح ہے، لیکن جب وہ حلوہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچا تو ان کو غیرت اور حیاء آگئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر کے اندر ہوتے ہوئے دوسرے کے گھر کا کھانا تناول فرمائیں، یہی مطلب ہے "غارت امکم" کا اور یہ خطاب یا تو موجودین کو ہے، یا تمام امت کو ہے، اس لئے کہ وہ تمام امت کی ماں ہیں۔

آگے چل کر حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹوٹے ہوئے پیالہ کے بدلے

میں ایک دوسرا پیالہ بھیج دیا، اس سے عنبری نے حنابلہ میں سے اور داؤد ظاہری نے استدلال کیا کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی شی ہلاک ہو جائے تو اس کے مثل دینا واجب ہے، خواہ وہ کسی شی سے متعلق ہو، ذوات القیم ہوں یا ذوات الامثال ہوں، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ذوات الامثال کے اندر مثل اور ذوات القیم کے اندر قیمت دیجائے گی، یہی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے، دوسری روایت امام مالک کی یہ ہے کہ ہر شی کے اندر قیمت واجب ہوگی، ذوات الامثال سے ہو یا ذوات القیم سے، اور تیسری روایت یہ ہے کہ عوض اس کے بدلہ میں دیا جائے گا، اب یہ حدیث ائمہ اربعہ کے مذہب کے خلاف ہے، لہٰذا جواب کی ضرورت ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ وہ پیالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا اس لئے بھجوا دیا تاکہ دل شکنی نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اس پیالہ کے لینے پر راضی ہوگئی ہوں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ تمام پیالے بالکل ایک ہی نوع کے ہوں اور اس صورت میں وہ عددی متقارب کے اندر داخل ہوں گے۔

فائدہ: (۱)......ایک سوکن کا اپنی دوسری سوکن کے گھر ہدیہ بھیجنا درست ہے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔

(۲)......جب شوہر ایک بیوی کے پاس ہو تو دوسری بیوی شوہر کے پاس ہدیہ بھیج سکتی ہے۔

(۳)......غیرت پسندیدہ صفت ہے۔

(۴)......غیرت کی وجہ سے اس قسم کا فعل ناپسندیدہ نہیں بلکہ قابل تحمل ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کی ناراضگی کے اظہار کے بجائے "غارت امکم" فرما کر کچھ تحسین ہی فرمائی۔

(۵)......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال اخلاق کمالِ صبر و تحمل اور جانبین کی رعایت کا علم ہوا۔

لوٹ مار اور مثلہ کرنا

{۲۸۱۳} **وَعَنْ** عَبْدِاللّٰهِ بْنِ يَزِيْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ نَهٰى عَنِ النُّهْبَةِ وَالْمُثْلَةِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۸۲۹ / ۲، کتاب الذبائح، باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ، حدیث نمبر: ۵۳۰۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار کرنے اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: اسلام اپنے ماننے والوں کو کسی بھی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہی بھائیوں کے مال کو ناحق طور پر اور زور زبردستی سے لوٹ لیں کیونکہ اس کا تعلق صرف حقوق العباد کی پامالی ہی سے نہیں ہے بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی کے امن وسکون کی مکمل تباہی سے بھی ہے، لہٰذا امن وسلامتی کے سرچشمہ ''اسلام'' کا تابعدار ہونے کے ناطے ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاشرہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے نظام امن وامان کو درہم برہم ہونے اور لا قانونیت پھیلنے سے بچائے، جس کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ دوسرے کے مال، دوسرے کی جائیداد اور دوسرے کے حقوق کی پامالی اور لوٹ مار کو اسی طرح ناقابل برداشت سمجھا جائے جس طرح اپنے مال، اپنی جائیداد اور اپنے حقوق پر کسی کی دست درازی قطعاً برداشت نہیں ہوسکتی۔ ''مثلہ'' جسم کے کسی عضو مثلاً ناک اور کان وغیرہ کاٹ ڈالنے کو کہتے ہیں، اسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے، کیونکہ اس طرح خدا کی تخلیق میں بگاڑ اور بدنمائی پیدا کرنا لازم آتا ہے۔

چوری پر عبرتناک عذاب

{۲۸۱۴} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ مَاتَ اِبْرَاهِيْمُ ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ سِتَّ رَكَعَاتٍ بِاَرْبَعِ سَجَدَاتٍ فَانْصَرَفَ وَقَدْ اٰضَتِ الشَّمْسُ وَقَالَ: مَا مِنْ شَيْئٍ تُوْعَدُوْنَهٗ اِلَّا قَدْ رَأَيْتُهٗ فِيْ صَلَاتِيْ هٰذِهٖ لَقَدْ جِيْئَ بِالنَّارِ وَذٰلِكَ حِيْنَ رَأَيْتُمُوْنِيْ تَأَخَّرْتُ مَخَافَةَ اَنْ يُّصِيْبَنِيْ مِنْ لَفْحِهَا وَحَتّٰى رَأَيْتُ فِيْهَا صَاحِبَ الْمِحْجَنِ يَجُرُّ قُصْبَهٗ فِي النَّارِ

وَكَانَ يَسْرِقُ الْحَاجَّ بِمِحْجَنِهٖ فَاِنْ فُطِنَ لَهٗ قَالَ اِنَّمَا تَعَلَّقَ بِمِحْجَنِيْ وَاِنْ غُفِلَ عَنْهُ ذَهَبَ بِهٖ وَحَتّٰى رَاَيْتُ فِيْهَا صَاحِبَةَ الْهِرَّةِ الَّتِيْ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا ثُمَّ جِيْئَ بِالْجَنَّةِ وَذٰلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُوْنِيْ تَقَدَّمْتُ حَتّٰى قُمْتُ فِيْ مَقَامِيْ وَلَقَدْ مَدَدْتُّ يَدِيْ وَاَنَا اُرِيْدُ اَنْ اَتَنَاوَلَ مِنْ ثَمَرَتِهَا لِتَنْظُرُوْا اِلَيْهِ ثُمَّ بَدَا لِيْ اَنْ لَّا اَفْعَلَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲۹۵/۱، کتاب الکسوف، باب صلوۃ الکسوف رکنان، حدیث نمبر: ۹۰۴۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی، سورج گرہن ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے ساتھ چھ رکوع چار سجدوں سے نماز پڑھی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے درانحالیکہ سورج روشن ہو چکا (یعنی اپنی اول حالت پر لوٹ آیا) تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (بعد فراغتِ نماز) ارشاد فرمایا: کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، مگر میں نے اس کو یقیناً اپنی اس نماز میں دیکھ لی ہے، البتہ جہنم لائی گئی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ تم نے مجھ کو دیکھا تھا میں پیچھے کی طرف ہٹا تھا اس اندیشہ کی وجہ سے کہ اس کی لپٹ مجھ کو نہ لگ جائے اور یہاں تک کہ میں نے دوزخ کی آگ میں محجن والے کو دیکھا ہے جو کہ اپنی انتڑیاں دوزخ میں گھسیٹ رہا ہے، اور یہ وہ شخص ہے جو کہ اپنی اس محجن سے حجاج کے سامان کو چراتا تھا، سو اگر اس کے مالک کو علم ہو گیا تو یوں کہتا کہ محجن میں اٹک گیا ہے اور اگر وہ اس سے بے خبر رہتا تو وہ اس کو لے جاتا تھا اور یہاں تک کہ میں نے دوزخ کی آگ میں ایک بلی کی مالکہ کو دیکھا جس کو وہ باندھ کر رکھتی اور اس کو نہ تو کھلاتی تھی اور نہ اس کو آزاد چھوڑتی، تاکہ وہ زمین پر گری پڑی ہوئی چیز کھالے یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے مرگئی، پھر جنت لائی گئی، اور یہ بات اس وقت کی ہے جب کہ تم نے مجھ کو آگے بڑھتا ہوا دیکھا تھا، یہاں تک کہ میں اپنی جگہ پر آ کھڑا ہوا اور میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس کے پھل کو لے لوں تاکہ تم لوگ ان کو دیکھ لو پھر مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ میں ایسا نہ کروں۔

تشریح: نمازِ کسوف کا قصہ ہے، غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوت میں یہ کسوفِ شمس پہلی

014 Babul Ghasab

مرتبہ ہوا تھا، اور آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر نماز کا اہتمام فرمایا، نمازِ کسوف کی تفصیل اپنے مقام پر معلوم ہو چکی، اس روایت میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے اموال پر کس طرح غصباً قبضہ کرتا تھا، اور آنحضرت ﷺ پر منکشف ہوا کہ وہ دوزخ میں شدید عذاب میں جکڑا ہوا ہے۔ مقصدِ بیان یہی ہے کہ غصبِ اموال پر عذابِ دوزخ کی وعید ہے۔

فوائد: اس حدیث شریف سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱)......اول یہ کہ جنت اور دوزخ عالم وجود میں آچکی ہیں اور موجود ہیں، چنانچہ اہل سنت کا یہی مسلک ہے۔

(۲)......دوم یہ کہ عذاب اور ہلاکت کی جگہ سے ہٹ جانا سنت ہے۔

(۳)......سوم یہ کہ بعض لوگ اس وقت بھی دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

(۴)......اور چہارم یہ کہ عمل قلیل نماز کو باطل نہیں کرتا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نماز کے دوران جنت اور دوزخ کو دیکھ کر آگے بڑھے اور پیچھے ہٹے۔

کسی چیز کا عاریت پر لینا

{۲۸۱۵} **وَعَنْ** قَتَادَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَقُوْلُ كَانَ فَزَعٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَاسْتَعَارَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَسًا مِنْ اَبِيْ طَلْحَةَ يُقَالُ لَهُ الْمَنْدُوْبُ فَرَكِبَ فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ مَا رَأَيْنَا مِنْ شَيْءٍ وَاِنْ وَّجَدْنَاهُ لَبَحْرًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۴۰۱/۱، کتاب الجهاد، باب الركوب على الدابة صعبة، حدیث نمبر: ۲۷۷۷، مسلم شریف: ۲۵۲/۲، کتاب الفضائل، باب شجاعة النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر: ۲۳۰۷۔

ترجمہ: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنا وہ فرما رہے تھے: مدینہ طیبہ میں کچھ گھبراہٹ سی ہوئی حضرت رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے گھوڑا اعاریۃً لیا اس گھوڑے کو مندوب (کے نام سے موسوم) کیا ہوا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ اس پر سوار ہوئے اور جس وقت واپس تشریف لائے تو فرمایا: ہم کو تو کوئی چیز نظر نہیں آئی (جو باعث خطرہ ہو) اور

یہ کہ میں نے اس گھوڑے کو (تیز رفتاری میں) سمندر (کی طرح کشادہ قدم) پایا ہے۔

تشریح: حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا گھوڑا پہلے بہت سست رفتار تھا، اسی واسطے اس کا نام ہی ''مندوب''، یعنی سست رکھدیا گیا تھا، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سوار ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے وہی گھوڑا بڑا چاق و چوبند اور تیز رفتار ہوگیا۔

فائدہ: (۱)......اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ کسی جانور کو عاریۃً مانگنا اور اسے اپنے استعمال میں لانا جائز ہے۔

(۲)......نیز کسی جانور کو کسی نام سے موسوم کردینا بھی جائز ہے۔

(۳)......اسی طرح سامان جنگ کا نام رکھنا بھی جائز ہے۔

(۴)......یہ حدیث شریف جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت اور بہادری اور کمال جانبازی کو ظاہر کرتی ہے کہ جب دشمن کی فوج کے مدینہ طیبہ کے قریب آجانے کے خوف سے پورے مدینہ طیبہ میں اضطراب وگھبراہٹ کی ایک عام فضا پیدا ہوگئی تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالکل بے خوف ہوکر تحقیق حال کے لئے تن تنہا مدینہ طیبہ سے نکل کھڑے ہوئے۔

(۵)......وہیں یہ حدیث اس بات کی بھی غماز ہے کہ دشمنوں کی ٹوہ لینی اور ان کے حالات پر مطلع ہونے کے لئے سعی کرنا جائز ہے۔

(۶)......نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی خوف واضطراب کے موقع پر خوف کے خاتمہ کی خوشخبری لوگوں کو دینا مستحب ہے۔

(۷)......کسی خطرہ کے موقع پر ماتحتوں کو حکم دینے کے بجائے امیر کا خود پیش قدمی کرنا اعلیٰ ہے۔

014 Babul Ghasab

بنجر زمین کا حکم

{٢٨١٦} **وَعَنْ** سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهٗ وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداؤد) وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ عُرْوَةَ مُرْسَلًا وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

حوالہ: مسند احمد:٣/٣٨١، حدیث نمبر:١۵١۴٧، ترمذی شریف:١/٢۵٦، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی احیاء الارض الموات، حدیث نمبر:١٣٧٨، ابوداؤد شریف:٢/۴٣٧، کتاب الخراج والفی، باب فی احیاء الموات، حدیث نمبر:٣٠٧٣، مؤطا امام مالک:٣١١، کتاب الاقضیت، باب القضاء فی عمارۃ الموات،

ترجمہ: حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے مردہ (بنجر) زمین کو زندہ کیا تو وہ زمین اسی کی ہے اور ظالم کے پسینہ کا کوئی حق نہیں۔(احمد، ترمذی، ابوداؤد) اور امام مالکؒ نے بروایت حضرت عروہ مرسلاً یہ نقل کی ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: حدیث شریف کے پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی زمین ویران و بنجر پڑی ہوئی ہو اور کوئی شخص اپنی محنت و مشقت سے اس زمین کو قابل کاشت بنائے یا اس کو آباد کرے تو وہ زمین اسی شخص کی ملکیت ہو جاتی ہے، بشرطیکہ وہ پہلے سے کسی مسلمان کی ملکیت میں نہ ہو اور نہ شہر و گاؤں کی کسی ضرورت و مصلحت سے متعلق ہو، جیسے وہ جانوروں کے بیٹھنے کی جگہ ہو، کھلیان کے کام آتی ہو، یا دھوبی کپڑے دھو کر وہاں پھیلاتے ہوں اور یا اسی طرح کسی بھی

عوامی فائدہ کا تعلق ہو، حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بنجر و ویران زمین کو قابل کاشت یا قابل آبادی کر کے اپنی ملکیت بنانے کی ایک شرط، امام (یعنی حکومت وقت) کی اجازت بھی ہے کہ اگر اسے سرکار کی طرف سے اجازت مل جائے، تب وہ اس کا مالک ہوسکتا ہے، جبکہ حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہم اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں یہ اجازت شرط نہیں ہے۔ ان سب کی دلیلیں فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

اور ظالم کی رگ کا کوئی استحقاق نہیں ہے، کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی آباد کی ہوئی زمین میں کاشت کرے یا اس میں کوئی درخت لگالے تو وہ اس کی وجہ سے اس زمین کا مالک نہیں بن جائے گا۔

کسی کا مال طیب نفس کے ساتھ ہی حلال ہے

{٢٨١٧} **وَعَنْ** اَبِیْ حُرَّةَ الرَّقَاشِی عَنْ عَمِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ اِمْرِيٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان والدارقطنى فى المجتبىٰ)

حوالہ: بیہقی: ۳۸۷/۴، باب قبض الید من اموال المهرمة، حدیث نمبر: ۵۴۹۲، دارقطنی: ۲۲/۳، کتاب البیوع،

ترجمہ: حضرت ابوحرہ رقاشی رحمۃ اللہ علیہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خبردار! تم لوگ ظلم نہ کرو۔ خبردار! کہ انسان کا مال حلال نہیں مگر اس کی طرف سے خوش دلی کے ساتھ۔

تشریح: طیب نفس: قلبی رضامندی، مقصد بیان یہ ہے کہ محض زبانی اجازت بھی (بعض مرتبہ) کفایت نہیں کرتی، جب تک حقیقی رضامندی نہ ہو، بسا اوقات اکراہ اور جبراً کوئی شی اگر دی جائے اس وقت حقیقی رضامندی نہ ہوگی، حالات سے بھی اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ایضاً

{۲۸۱۸} **وَعَنْ** عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ: لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا شِغَارَ فِي الْإِسْلَامِ وَمَنِ انْتَهَبَ نُهْبَةً فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواہ الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲۱۳/۱، کتاب النکاح، باب النھی عن النکاح الشغار، حدیث نمبر: ۱۱۲۳۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسلام میں جلب، جنب اور شغار نہیں ہے اور جو شخص لوٹ مار کرے تو وہ ہم سے نہیں ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کے تین حصے ہیں، آخری حصہ تو واضح ہی ہے، پہلا حصہ ہے، ''لا جلب و لا جنب'' جلب اور جنب کا لفظ کتاب الزکوۃ کے اندر بھی ہوتا ہے، اور کتاب الجہاد باب السباق کے اندر بھی، دونوں جگہ اس کی تفسیر مختلف ہے، دونوں تفسیریں کتاب الزکوۃ میں گذر چکی ہیں۔

نکاح شغار اور اس کا حکم

حدیث شریف کا دوسرا جملہ ہے: ''لا شغار فی الاسلام''

شغار کا لغوی معنی: شغار کا لفظ یا تو شغر البلد سے ماخوذ ہے، یا شغر الکلب سے، شغر البلد کا معنی ہے شہر کا بادشاہ سے خالی ہونا، شغر الکلب کا معنی ہے کتے کا ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا۔

اصطلاحی معنی: یہاں شغار سے مراد نکاح کی ایک خاص قسم ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن وغیرہ کا نکاح دوسرے شخص کے ساتھ اس شرط پر کرتا ہے کہ وہ بھی اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح پہلے شخص کے ساتھ کرے اور دونوں طرف سے مہر بھی نہیں رکھا جاتا، بلکہ ایک نکاح ہی کو دوسرے کا بدل اور مہر قرار دے لیا جاتا ہے، اس کی لغوی معنی کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے، یعنی جس طرح شہر بادشاہ سے خالی ہوتا ہے اسی طرح یہ نکاح ایک اہم چیز یعنی مہر سے خالی ہوتا ہے۔

حدیث شریف کی وضاحت اور مذاہب ائمہ

حدیث شریف میں ”لا شغار فی الاسلام“ یہ نفی بمعنی نہی ہے، چنانچہ جامع ترمذی کی ایک روایت نہی کے صیغہ کے ساتھ بھی وارد ہوئی ہے، اس بات پر سب فقہاء متفق ہیں کہ نکاح شغار ناجائز اور منہی عنہ ہے، اس بات میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ نہی بطلان عقد کا تقاضا کرتی ہے یا نہیں؟ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اور امام احمد واسحاق رحمۃ اللہ علیہما کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ نہی بطلان عقد کا تقاضا کرتی ہے، ایسا نکاح باطل ہے، سرے سے ہوتا ہی نہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسا نکاح ہو تو جاتا ہے لیکن اس کا فسخ واجب ہے، قبل الدخول ہی فسخ واجب ہے، یا بعد الدخول بھی، اس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دو روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ اگر دخول کر چکا ہو تو فسخ واجب نہیں، اگر دخول نہ کیا ہو تو فسخ واجب ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ خواہ دخول کیا ہو یا نہ بہر صورت فسخ واجب ہے، حضرت امام ابوحنیفہ، زہری، لیث بن سعد، ابوثور، ابن جریر اور سلف رحمۃ اللہ علیہم کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ نکاح شغار منہی عنہ اور ممنوع تو ہے لیکن یہ نہی بطلانِ عقد کی مقتضی نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی نے اس طرح سے نکاح کر ہی لیا تو اگر چہ اس نے برا کیا لیکن نکاح منعقد ہو جائے گا اور دونوں طرف سے مہر مثل اداء کرنا ضروری ہوگا۔ امام احمد واسحق رحمۃ اللہ علیہما کی بھی ایک ایک روایت اسی طرح ہے۔ (حاشی الکوکب الدری: ۱/۳۳۶)

جواب: حنفیہ وغیرہ کے خلاف یہ بات کہی جاتی ہے کہ انہوں نے حدیث شریف کی مخالفت کی ہے، حدیث میں تو نکاحِ شغار سے نہی ہے اور یہ لوگ اسے منعقد کر رہے ہیں، حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ نہی کے مقتضاء پر تو حنفیہ نے بھی عمل کر لیا ہے ان کے نزدیک بھی اس طرح سے نکاح کرنا بری حرکت ہے، باقی آگے حنفیہ اس نہی کو بطلانِ عقد کے لئے نہیں مانتے اس لئے کہ حنفیہ کا یہ اصول ہے کہ افعال شرعیہ سے نہی ان کے بطلان کی مقتضی نہیں، جیسے ارض مغصوبہ میں نماز پڑھنا منہی عنہ ہے، لیکن اگر کسی نے نماز پڑھ لی تو نماز ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ نکاحِ شغار میں خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں مہر نہیں ہوتا ہم نے اس

خرابی کی اصلاح کر کے یعنی مہر مثل واجب قرار دیکر نکاح کو منعقد کہا ہے، جس نکاح کو ہم منعقد کہہ رہے ہیں، وہ درحقیقت شغار رہتا ہی نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو مہر مثل واجب ہے، جبکہ نکاح شغار مہر سے خالی ہوتا ہے۔(اشرف التوضیح:۴۰۹/۳)

ادنیٰ شی بھی غصب ہے

{۲۸۱۹} **وَعَنِ** السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَأْخُذُ اَحَدُكُمْ عَصَا اَخِيْهِ لَاعِبًا جَادًّا فَمَنْ اَخَذَ عَصَا اَخِيْهِ فَلْيَرُدَّهَا اِلَيْهِ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد) وَرِوَايَتُهُ اِلٰى قَوْلِهٖ جَادًّا۔

حوالہ: ترمذی شریف:۲/۳۹، ابواب الفتن، باب ماجاء لا یحل لمسلم ان یروع مسلما، حدیث نمبر:۲۱۶۰، ابوداؤد شریف:۲/۶۸۳، کتاب الادب، باب من یاخذ الشی من مزاح، حدیث نمبر:۵۰۰۳،

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید بروایت والد خود حضرت رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی مذاق کے انداز میں بنیت حقیقت نہ لے، اگر کسی شخص نے اپنے بھائی کی لاٹھی لی ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو واپس کر دے۔(ترمذی، ابوداؤد) اور ابوداؤد کی روایت جاداً تک ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے اس کی لاٹھی یا چھڑی بظاہر تو ہنسی مذاق میں لے مگر مقصد یہ ہو کہ اسے ہڑپ کر لونگا، جیسا کہ آج کل اس کا بہت رواج ہے کہ ایک دوسرے کی چیز ہنسی مذاق میں چھپا دی جاتی ہے، اگر مالک کو اس کا علم ہو گیا تو وہ چیز اسے واپس دیدی جاتی ہے، اور کہہ دیا جاتا ہے کہ میں تو مذاق کر رہا تھا، اگر اسے علم نہیں ہو پاتا تو پھر ہمیشہ کے لئے غائب کر دی جاتی ہے، اس سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

حدیث شریف میں بطور خاص عصا کا ذکر بطریق مبالغہ ہے، جس کا مقصد یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب اتنی حقیر اور کم تر چیز کا لینا منع ہے، تو اس سے زیادہ حیثیت کی چیز کا لینا بطریق اولی ممنوع ہوگا۔

غصب شدہ مال جس کے پاس ہو لے لے

{۲۸۲۰} **وَعَنْ** سَمُرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ وَجَدَ عَیْنَ مَالِهٖ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ وَیَتَّبِعُ الْبَیِّعُ مَنْ بَاعَهٗ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی)

حوالہ: مسند احمد:۵/۱۳، حدیث نمبر:۲۰۴۰۸، ابو داؤد شریف:۴۰۹۸، کتاب البیوع، باب فی الرجل یجد مالہ عند رجل، حدیث نمبر:۳۵۳۱، نسائی شریف:۲/۲۰۱، کتاب البیوع، باب الرجل یبیع ؟؟؟؟فیستحقھا مستحق، حدیث نمبر:۴۶۱،

ترجمہ: حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اپنا مال بعینہ کسی کے پاس موجود پایا تو وہ اس مال کا زیادہ حق دار ہے اور خریدار اس شخص کو پکڑے جس نے اس کو فروخت کیا ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کے مفہوم کا حاصل یہ ہے کہ مثلاً کسی شخص نے کسی کا کوئی مال غصب کیا، یا کسی کی کوئی چیز چوری کی یا کسی شخص کی کوئی گمشدہ چیز اس کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے وہ چیز کسی دوسرے شخص کو بیچ دی تو اب اگر مالک اپنی وہ چیز خریدنے والے کے پاس دیکھے تو اسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی چیز اس سے لے لے اور خریدنے والے نے وہ چیز جس سے خریدی ہے اس کا پیچھا کر کے اس سے اپنی قیمت واپس لے لے۔

لی ہوئی شی کو واپس کرنا ہوگا

{۲۸۲۱} **وَعَنْهُ** عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: عَلَی الْیَدِ مَا اَخَذَتْ حَتّٰی تُؤَدِّیَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۳۹، ابواب البیوع، باب ماجاء ان العاریۃ مؤداۃ، حدیث نمبر:۱۲۶۶، ابوداؤد شریف:۲/۵۰۱، کتاب البیوع، باب فی تضمین العاریۃ، حدیث نمبر:۱۵۶۱، ابن ماجہ:۲/۱۷۳،

ابواب الصدقات، باب العاریۃ، حدیث نمبر: ۲۴۰۰۔

ترجمہ: حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاتھ پر (لازم ہوتی ہے) وہ چیز جو اس نے لی ہے یہاں تک کہ وہ ادا کردے۔

تشریح: حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی سے کوئی چیز چھین لے، لینے والے پر اس کا واپس کرنا لازم ہے، خواہ اس نے وہ چیز غصب کے طریقے سے لی ہو یا چوری کے ذریعہ، اسی طرح اگر عاریت کے طور پر لے یا امانت کے طور پر رکھی جائے تو بھی لینے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوگی جب تک وہ مستعار اور امانت کی چیز واپس نہ کرے، اگرچہ غصب اور سرقہ کی صورت میں مطالبہ نہ بھی ہو تب بھی واپس کرنا واجب ہے۔ (مرقاۃ: ۶/۱۲۰)

رد کی صورت میں اگر مال مغصوب بعینہ باقی ہے تو اس کو رد کرنا ضروری ہے، کیونکہ مغصوب منہ ''صاحب مال'' کا حق عین مغصوب سے متعلق ہے، لہٰذا اس کا بعینہ رد کرنا ضروری ہے۔

اور اگر غاصب کے ہاتھ میں مال مغصوب ہلاک ہوگیا ہے تو اس کا مثل اور بدل دینا ضروری ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ" (البقرہ: ۱۹۴)

[سو جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔]

اور ظاہر ہے کہ جب عین مال کا رد کرنا ہلاک ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں تو اس کے قائم مقام کو واپس کیا جائے گا، لہٰذا اگر مغصوب ذوات الامثال کے قبیل سے ہے تو مثل واپس کیا جائے گا اور اگر ذوات القیم کے قبیل سے ہے تو قیمت کو واپس کرے گا۔ (اعلاء السنن: ۱۶/۳۲۴، نفحات التنقیح: ۳/۴۸۴)

اگر حیوان سے نقصان پہنچا ہو؟

{۲۸۲۲} **وَعَنْ** حَرَامِ بْنِ سَعْدِ بْنِ مُحَیِّصَةَ اَنَّ نَاقَةً لِلْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُ دَخَلَتْ حَائِطًا فَاَفْسَدَتْ فَقَضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ عَلٰی اَهْلِ الْحَوَائِطِ حِفْظَهَا بِالنَّهَارِ وَاِنَّ مَا اَفْسَدَتِ

الْمَوَاشِیْ بِاللَّیْلِ ضَامِنٌ عَلٰی اَھْلِھَا۔ (رواہ مالك وابوداؤد وابن ماجۃ)

حوالہ: مؤطا امام مالک: ۲/ ۳۱۲، کتاب الاقضیۃ، باب القضاء فی الضواری والحریسۃ، ابو داؤد شریف: ۲/ ۵۰۲، کتاب البیوع، باب المواشی تفسد زرع قوم، حدیث نمبر: ۳۵۶۹، ابن ماجہ: ۲/ ۱۶۸، ابواب الاحکام، باب الحکمۃ فیما افسدت المواشی، حدیث نمبر: ۲۳۳۲،

ترجمہ: حضرت حرام بن سعد بن محیصہ سے روایت ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی اونٹنی ایک باغ میں داخل ہوگئی اور اس نے (باغ کو) خراب کر دیا، پس حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ باغ کے مالکوں پر دن میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہے اور رات کے وقت چوپائے اگر باغ کو خراب کر دیں تو چوپایوں کے مالک پر ضمان لازم ہوگا جو انہوں نے خراب کیا ہے۔

مسئلۃ الباب میں مذاہب ائمہ

تشریح: اس حدیث شریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ اگر رات میں کسی کا مویشی کسی دوسرے شخص کا کھیت خراب کرے گا تو اس پر اس کا ضمان واجب ہوگا، اور اگر نقصان دن میں ہو تو پھر اہل مواشی پر کوئی ضمان نہیں، جمہور کا مذہب یہی ہے، حنفیہ کے نزدیک دن اور رات کا اس میں کوئی فرق نہیں۔ "لحدیث العجماء جرحھا جبار" یہ حدیث حدیث الباب سے زیادہ صحیح ہے، اور متفق علیہ یعنی صحیحین کی روایت ہے، اور حدیث بالباب سنن کی روایت ہے، البتہ ایک شرط ضمان کی اور ہے جو متفق علیہ ہے وہ یہ کہ اس ماشیہ کے ساتھ اس کا سائق نہ ہو، اگر سائق ہوگا تو اس صورت میں ضمان ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں وہ فعل دابہ (افساد وغیرہ) سائق کی طرف منسوب ہوگا، اور جس صورت میں ماشیہ کے ساتھ سائق نہیں ہوگا اس وقت فعل دابہ کی نسبت دابہ کی طرف ہوگی، اور حدیث شریف میں فعل دابہ ہی کو جبار اور عفو قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ضمان کے لئے یہ قید تو بالاتفاق معتبر ہے، لیکن یہ دن اور رات والے فرق کی بات یہ مختلف فیہ ہے۔

"عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال کانت لہ ناقۃ ضاریۃ" ناقہ ضاریہ وہ اونٹنی جو کھلی پھرنے کی وجہ سے لوگوں کے کھیت چرنے کی عادی ہو، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ خود بیان

کیا کہ ان کی ایک اونٹنی ایسی تھی اور پھر حضور اقدس ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا۔ (الدر المنضود: ۵/۴۳۹)

غیر اختیاری نقصان پر ضمان نہیں

{۲۸۲۳} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرِّجْلُ جُبَارٌ وَقَالَ النَّارُ جُبَارٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/ ۶۳۱، کتاب الدیات، باب الدیۃ تنفخ بر جلھا، حدیث نمبر: ۴۵۹۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جانوروں کے) پیروں (سے نقصان شدہ) معاف ہے اور فرمایا: آگ معاف ہے۔

تشریح: یعنی اگر کوئی جانور کسی کی چیز کو پاؤں سے روند کچل کر تلف وضائع کر دے تو اس کی وجہ سے اس جانور کے مالک پر تاوان واجب نہیں ہوگا، بشرطیکہ وہ مالک جانور کے ساتھ نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی برے مقصد مثلاً ایذارسانی وغیرہ کے بغیر محض اپنی ضرورت یا کسی اور وجہ سے آگ جلائی اور اس کی کوئی چنگاری ہوا میں اڑ کر کسی دوسرے کے سامان پر جا پڑی جس سے وہ سامان جل گیا تو اس صورت میں آگ جلانے والے پر نقصان کا تاوان واجب نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس نے جس وقت آگ جلائی ہو اس وقت ہوا ٹھہری ہوئی ہو اور آگ جلنے کے بعد چلی ہو، اور اگر اس نے ایسے وقت آگ جلائی جب کہ ہوا چل رہی تھی اور اس کی وجہ سے آگ سے نقصان پہنچ جانے کا احتمال تھا تو پھر اس پر تاوان واجب ہوگا۔

ضرورتِ شدیدہ کے وقت دوسرے کے جانور سے دودھ پینا

{۲۸۲۴} **وَعَنِ** الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَتٰی اَحَدُکُمْ عَلٰی مَاشِیَةٍ فَاِنْ کَانَ فِیْهَا صَاحِبُهَا فَلْیَسْتَاْذِنْهُ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْهَا فَلْیُصَوِّتْ ثَلَاثًا فَاِنْ اَجَابَهٗ اَحَدٌ فَلْیَسْتَاْذِنْهُ وَاِنْ لَمْ یُجِبْهُ اَحَدٌ فَلْیَحْتَلِبْ وَلْیَشْرَبْ وَلَا یَحْمِلْ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۱/۳۵۲، کتاب الجهاد، باب ابن السبیل یأکل من التمر۔

ترجمہ: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بروایت حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص کسی جانور کے پاس پہنچے (اور دودھ کی بوجہ شدت بھوک ضرورت ہے تو) اگر اس میں اس کا مالک موجود ہے تو پھر اجازت حاصل کرے اور اگر مالک اس میں موجود نہیں تو پھر تین مرتبہ آواز لگائے، اگر کوئی اس کو جواب دے تو پھر اس سے اجازت حاصل کرے اور کوئی جواب نہ دے تو پھر دودھ نکالے اور پی لے اور ساتھ نہ لے۔

تشریح: حدیث شریف کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جانوروں کے باڑے کے پاس سے گذرے اور کسی جانور کا دودھ دوہنا چاہے تو اگر مالک وہاں موجود ہو تو اس سے اجازت لے لے، اگر مالک نہ ملے تو تین مرتبہ آواز دے، اگر کسی طرف سے جواب آئے تو اس سے اجازت لے لے اور اگر کوئی جواب نہ آئے تو ان جانوروں کا دودھ پی سکتا ہے، لیکن ساتھ لانے کی اجازت نہیں، اسی طرح کا مضمون اس سے اگلی حدیث شریف میں آرہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی باغ میں جائے تو وہاں پھل کھا سکتا ہے، لیکن ساتھ نہیں لا سکتا۔ دو حدیثوں کے بعد رافع بن عمرو غفاری کی حدیث آرہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پھل خود گرے ہوئے ہوں ان کو اٹھا کر کھا سکتا ہے، خود درختوں سے اتارنے کی اجازت نہیں۔

یہ حدیثیں بظاہر ان نصوص سے متعارض ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مسلمان بھائی کا مال اس کی اجازت اور طیب نفس کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے بعض علماء نے اس کو جائع اور مضطر پر محمول کیا ہے، حالت اضطرار میں بغیر پوچھے بھی اس طرح دودھ پی سکتا ہے، اور پھل کھا سکتا ہے۔ لیکن اصل مالک کو اس کا ضمان دینا پڑے گا۔ (اوجز المسالک: ۵/۲۲۴)

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی عرف میں اس طرح گذرنے والے کو گرے ہوئے پھل کھانے کی اجازت ہو یعنی اس طرح اگر کوئی کھالے تو مالک اس کو برا نہ محسوس کرتے ہوں تو کھانے کی اجازت ہے، کیونکہ یہاں مالک کی طرف سے دلالۃً اذن موجود ہے، لہٰذا دوسری نصوص کے معارض نہ ہوا۔ انصار کے عرف میں یہ بات تھی کہ وہ گری ہوئی کھجوریں وغیرہ کھانے سے کسی کو نہیں روکتے تھے۔ اسی طرح جائع کو لگے ہوئے پھل اتار کر کھانے سے بھی نہیں روکتے تھے، اس

لئے حضرت نبی کریم ﷺ نے اس کی اجازت عنایت فرمادی، یہ اجازت انصار کے عرف پر محمول ہے، جس علاقہ کا جس طرح کا عرف ہو اسی کے مطابق حکم لگایا جائے گا، ضابطہ یہی ہے کہ کسی کا مال استعمال کرنے کے لئے اذن ضروری ہے، خواہ وہ اذن صراحۃً ہو یا دلالۃً، جس انداز سے عرف میں کھانے کا رواج ہو وہ دلالۃً اذن ہونے کا قرینہ ہوگا۔ (اشرف التوضیح: ۳/۴۱۰)

باغ سے پھل کھانے کا حکم

{۲۸۲۵} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ دَخَلَ حَائِطًا فَلْيَأْكُلْ وَلَا يَتَّخِذْ خُبْنَةً۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۴۱، ابواب البیوع، باب ماجاء من الرخصة فی اکل التمرة للمار بھا، حدیث نمبر: ۱۲۸۷، ابن ماجہ شریف: ۲/۱۶۶، ابواب التجارات، باب من مر علی ماشیة او حائط، حدیث نمبر: ۲۳۰۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص باغ میں داخل ہو تو وہ کھالے اور کپڑے کے اندر نہ لے۔

تشریح: اگر کسی علاقہ کا یہ عرف (اور معروف) ہے کہ باغ میں جو پھل درخت سے زمین پر گرا ہوا ہے، اس کو لے کر کھانے کی اجازت ہے تو اب یہ مباح ہوگا۔ "لا یتخذ خبنة" کپڑا وغیرہ میں نہ بھرے۔

اور اگر علی الاطلاق باغ والوں کی جانب سے اس کی بھی اجازت نہ ہو تب اٹھا کر باغ میں بھی کھانا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اصل حکم شرعی یہی ہے کہ اجازت کے بغیر کوئی شی لینا، کھانا حرام ہے، اگر چہ وہ قلیل مقدار ہی ہو، جیسا کہ قرآن وحدیث سے معلوم شدہ ہے۔

عاریۃ کا حکم

{۲۸۲۶} **وَعَنْ** اُمَيَّةَ بْنَ صَفْوَانَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ

تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اسْتَعَارَ مِنْهُ اَدْرَاعَهٗ یَوْمَ حُنَیْنٍ فَقَالَ اَغَصْبًا یَا مُحَمَّدُ! قَالَ بَلْ عَارِیَةً مَضْمُوْنَةً۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۲/۱ ۵۰، کتاب البیوع، باب تضمین العاریة، حدیث نمبر: ۳۵۶۲،

حل لغات: استعار، باب استفعال سے، عاریۃً طلب کیا۔ ادراعه: درع کی جمع ہے۔ ہمزہ برائے استفہام۔ غصبا: بصورتِ غصب۔ عاریة مضمونة: از روئے عاریت جس کی واپسی ہونے والی ہے۔

ترجمہ: حضرت امیہ بن صفوان رحمۃ اللہ علیہ بروایت والد خود نقل کرتے ہیں کہ بالیقین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے غزوۂ حنین کے دن چند زرہیں عاریۃً طلب فرمائیں، پس ان کے والد صفوان نے کہا: یا محمد! کیا تم مجھ سے چھین کر لینا چاہتے ہو؟ (ابھی تک یہ مسلمان نہیں ہوئے تھے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! بلکہ عاریۃً لیتا ہوں جو کہ واپس کر دی جائے گی۔

تشریح: غزوہ حنین کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سی بکریاں عنایت فرمائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت سے متاثر ہو کر اسلام ان کے دل میں گھر کر گیا اور پھر ہمیشہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غصباً نہیں، بلکہ عاریۃً، اور عاریۃ بھی ایسی جو ضمان والی ہوگی۔

مذاہب ائمہ

قاضی شریح، حسن بصری، نخعی، امام ثوری، اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ نے عاریت کو امانت قرار دیا ہے، اگر وہ عاریت لینے والے کے یہاں تلف ہو جائے تو اس کا بدلہ لازم نہ ہوگا، جب کہ اس نے خود مال پر تعدی نہ کی ہو، یعنی ضائع کرنے میں اسی کی کوشش کا دخل نہ ہو۔

حضرت ابن عباس، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم، امام شافعی و امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں عاریت کے تلف ہونے کی صورت میں بدلہ دینا لازم ہے۔ یعنی اس کی قیمت ادا کرنی پڑیگی، انہوں نے مضمون کے لفظ سے استدلال کیا ہے، اگر وہ چیز تلف ہو جائے تو اس کا ضمان دیا جائے گا۔

توجیہ الحدیث علی مسلک الحنفیۃ

اس حدیث شریف سے قائلین ضمان کی تائید ہورہی ہے، لیکن یہی حدیث دوسری جگہ ہے، اس میں اس طرح ہے، ''قلت یارسول اللہ! أعاریۃ مضمونۃ او عاریۃ مؤداۃ، قال: بل مؤداۃ'' لہٰذا ایسی صورت میں ضمان پر استدلال صحیح نہیں، اور حضرت نے بذل میں ''بل عاریۃ مضمونۃ'' کا جواب یہ دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد قاعدۂ کلیہ اور بطور بیان حکم شرعی کے نہیں ہے بلکہ چونکہ صفوان اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے اور ادھر مسلمانوں کو اسلحہ کی حاجت تھی، اس لئے خاص اس موقع کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ نہیں بلکہ یہ عاریۃ ضمان والی ہوگی، تاکہ صفوان عاریۃً دینے پر مطمئن ہوجائیں، اور وہ وقتی ضرورت مسلمانوں کی پوری ہوجائے، اور یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تمام عواری کا حکم یہی ہے۔ جس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک روایت میں یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو زرہیں صفوان سے عاریۃً لی تھیں تو جب ان کے واپس کرنے کا وقت آیا تو ان میں چند زرہیں تعداد میں کم تھیں، اس پر حضور اقدس ﷺ نے صفوان سے فرمایا: کہ تمہاری چند زرہیں مفقود ہوگئی ہیں۔ ''فھل نغرم لک؟ قال: لا یارسول اللہ! الخ'' یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ کیا ہم ان کا ضمان تمہیں دیں؟ اس نے عرض کیا کہ نہیں یارسول اللہ! اس لئے کہ میرے قلب میں آج وہ بات ہے جو اس وقت نہیں تھی۔ (الدر المنضود: ۵/۴۳۷)

کفیل ضامن ہے

{۲۸۲۷} وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْعَارِیَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَةٌ وَالدَّیْنُ مَقْضِیٌّ وَالزَّعِیْمُ غَارِمٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۳۲، ابواب الوصایا، باب ماجاء لاوصیۃ لوارث، حدیث نمبر: ۱۲۶۵، ابوداؤدشریف: ۲/۵۰۱، کتاب البیوع، باب تضمین العاریۃ، حدیث نمبر: ۳۵۶۵۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: جوشی عاریۃً لی گئی ہو وہ واپس کی جائے گی اور منحہ واپس کی جائے گی، اور قرضہ واجب الاداء ہے اور کفیل ضامن ہے۔

تشریح: یعنی عاریۃ کی شی کو اس کے مالک تک پہنچانا ضروری ہے، اسی طرح میںخہ کا مالک تک لوٹانا ضروری ہے، منحہ کا ذکر بارہا آچکا ہے، یعنی کوئی دودھ والا جانور، یا کوئی پھل دار درخت جو کسی کو چندروز کے لئے برائے انتفاع دیا جائے، اور دین کا ادا کرنا واجب ہے، اور کفیل ضامن ہوتا ہے۔

زعامة: بمعنی کفالت، اور غارم ماخوذ ہے غرم سے جس کے معنی شی لازم کا ادا کرنا۔

(الدر المنضود: ۵/۴۳۷)

درخت سے گرے ہوئے پھلوں کا حکم

{۲۸۲۸} **وَعَنْ** رَافِعِ بْنِ عَمْرٍو الْغِفَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنْتُ غُلَامًا اَرْمِيْ نَخْلَ الْاَنْصَارِ فَأُتِيَ بِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا غُلَامُ! لِمَ تَرْمِي النَّخْلَ قُلْتُ اٰكُلُ قَالَ فَلَا تَرْمِ وَكُلْ مِمَّا سَقَطَ فِيْ اَسْفَلِهَا ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهٗ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ اَشْبِعْ بَطْنَهٗ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجة) وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ فِيْ بَابِ اللُّقْطَةِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/۲۴۱، ابواب البیوع، باب ماجاء من الرخصة فی اکل التمرة للمار بها، حدیث نمبر: ۱۲۸۸، ابوداؤد شریف: ۲/۵۰۱، کتاب البیوع، باب تضمین العارية، حدیث نمبر: ۲۶۲۲، ابن ماجه: ۲/۱۶۶، ابواب التجارات، باب من مر علی ماشية او حائط، حدیث نمبر: ۲۲۹۹،

ترجمہ: حضرت رافع بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں بچہ تھا، انصار کے کھجور کے درخت پر پتھر مار رہا تھا (تاکہ درخت سے کھجوریں گریں) پس مجھ کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے بچہ! تو درخت پر پتھر کیوں مارتا ہے؟ میں نے

عرض کیا: کھانے کے لئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پتھر نہ مارو، اور جو کھجوریں درخت کے نیچے پڑی ہوئی ہوں اس کو کھالے، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ کو بھر دیجئے۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) اور عنقریب ہم حدیث عمرو بن شعیب باب اللقطہ میں بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تشریح: (۱)......اس روایت میں وضاحت اور صراحت ہے کہ درخت پر سے پھل توڑ کر کھانا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ مالک کی صراحت کے ساتھ اجازت ہو۔

(۲)......اگر درخت سے ٹوٹ کر زمین پر پھل گرا ہوا ہے تو اس کی اجازت اور اباحت فرمائی ہے، بہرحال یہ اباحت از روئے عرف تھی، اس وقت اس کی عام اجازت تھی، اگر کسی علاقہ میں آج بھی اس کی اجازت ہو تب کوئی حرج نہیں، ورنہ پھر اس کی بھی اباحت نہ رہے گی، کسی کا مال اگرچہ قلیل مقدار ہی میں ہو، طیب نفس کے ساتھ ہی حلال ہوگا۔

فائدہ: آنحضرت ﷺ کی تعلیم میں نرمی و شفقت کا بھی علم ہوا۔

الفصل الثالث

زمین غصب کرنے پر وعید

{۲۸۲۹} **وَعَنْ** سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى سَبْعِ اَرَضِيْنَ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۴۵۳/۱، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی سبع ارضین، حدیث نمبر: ۳۰۹۲۔

ترجمہ: حضرت سالم بروایت والد خود روایت کرتے ہیں ان کے والد نے فرمایا کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کسی شخص نے بلا حق کسی زمین کو غصب کر لیا تو وہ بروز قیامت اس زمین کے ساتھ ساتویں زمین تک دھنسا دیا جائے گا۔

تشریح: اس حدیث شریف کی تشریح باب الغصب والعاریۃ کی فصل اول کی پہلی حدیث کے تحت گذر گئی ہے۔

ایضاً

{۲۸۳۰} **وَعَنْ** يَعْلٰى بْنِ مُرَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِغَيْرِ حَقِّهَا كُلِّفَ اَنْ يَحْمِلَ تُرَابَهَا الْمَحْشَرَ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۱۴۲/۴، حدیث نمبر: ۱۷۷۱۴،

ترجمہ: حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے سنا آنحضرت ﷺ فرمار ہے تھے: جس شخص نے بلا استحقاق کسی کی زمین کو غصب کر لیا تو بروز محشر وہ

مکلف کیا جائے گا کہ اس کی مٹی کو اٹھائے۔

تشریح: از راہِ ظلم کسی کی زمین غصب کرنے والے کی مختلف سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، پہلی فصل میں تو یہ فرمایا گیا تھا کہ قیامت کے دن ایسے شخص کے گلے میں زمین کا وہ قطعہ طوق بنا کر ڈالا جائے گا جو اس نے کسی سے زبردستی ہتھیایا ہوگا، اوپر کی حدیث شریف میں یہ بیان کیا گیا کہ کسی کی زمین پر ناحق قبضہ کرنے والا قیامت کے دن زمین کے ساتویں طبقہ تک دھنسایا جائے گا۔ یہاں اس حدیث شریف میں یہ سزا ذکر کی گئی ہے کہ کسی کی زمین پر ناجائز طریقہ سے قبضہ کرنے والا حشر کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس زمین کی ساری مٹی اپنے سر پر اٹھائے۔ آنے والی حدیث اس بارے میں سزا کی ایک اور قسم کو بیان کر رہی ہے۔ گویا عذاب وسزا کی مختلف صورتیں اور قسمیں ہیں، چنانچہ کسی کو اس طرح عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور کسی کو اس طرح سزا دی جائے گی۔

زمین پر غاصبانہ قبضہ اگرچہ قلیل ہو

{۲۸۳۱} **وَعَنْهُ** قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ كَلَّفَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ يَحْفِرَهٗ حَتّٰى يَبْلُغَ اٰخِرَ سَبْعِ اَرْضِيْنَ ثُمَّ يُطَوِّقُهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۱۷۳/۴، حدیث نمبر: ۱۷۷۰۱،

ترجمہ: حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے سنا: آنحضرت ﷺ فرمارہے تھے: جس شخص نے ایک بالشت بھر زمین ظلماً لی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو حکم دے گا کہ اس کی کھدائی کرے، یہاں تک کہ ساتویں زمین کے آخری (حصہ) تک پہنچ جائے اور پھر قیامت کے دن کے آخر تک اس کے گلے میں ہار بنا کر ڈالی جائے گی یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

015 Babus Shuf'aa

باب الشفعة

رقم الحدیث: ۲۸۳۲ر تا ۲۸۴۱ر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

باب الشفعة

(حق شفعہ کا بیان)

شفعہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی کی تحقیق و تنقیح

شفعہ کے لغوی معنی ضم کے ہیں، ”قال القسطلانی وھی فی اللغة الضم علی الاشھر من شفعة الشی ضممته فھی ضم نصیب الی نصیب وفی الشرع حق تملک قھری یثبت للشریک القدیم علی الحادث فیما ملک بعوض“

اور فتح الباری میں ہے: ”وفی الشرع انتقال حصة شریک الی شریک کانت انتقلت الی اجنبی بمثل العوض المسمی ولم یختلف العلماء بمشروعیتها الا ما نقل عن ابی بکر الاصم من انکارها“

ان تعریفات میں جمہور کے مسلک کی رعایت کی گئی ہے، جن کے نزدیک شفعہ کا ثبوت صرف شریک کے لئے ہوتا ہے، بخلاف حنفیہ کے کہ ان کے نزدیک شفعہ کا انحصار شریک میں نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک شفعہ بحق جوار بھی ہوتا ہے، جیسا کہ آگے مفصلاً آ رہا ہے، حافظ نے جو تعریف کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ احد الشریکین کا حصہ جو بیع کی وجہ سے کسی اجنبی شخص کی طرف منتقل ہوگیا ہے، (یعنی مشتری) اس کا منتقل ہونا اس اجنبی سے شریک آخر کی طرف عوض مسمی کے بدلہ میں، اس سے مراد وہ ثمن ہے جو

مشتری نے ادا کیا ہے بائع کو، یہ احد الشریکین کے حصہ کا انتقال شریک آخر کی طرف جس کو شفعہ کہا جاتا ہے، اس کا حصول چونکہ شریک آخر کیلئے غیر اختیاری ہے، یعنی شرعی طور پر اس کو یہ حق پہنچتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے اس حق کو لے یا نہ لے۔ اسی لئے قسطلانی نے شفعہ کی تعریف میں "حق تملک قھری ای غیر اختیاری" کہا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے وراثت، کہ ایک وارث کو دوسرے وارث کے مال کا استحقاق غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے، اسی طرح شفعہ بھی ہے کہ شریعت نے احد الشریکین اور پڑوسی کیلئے شریک آخر اور جار کے حصہ میں حصہ رکھا ہے، اگر وہ شریک چاہے تو شریک آخر کا وہ حصہ جو شخص آخر اجنبی یعنی مشتری کے پاس پہنچ گیا ہے اس کو اس سے لے سکتا ہے، جتنے میں وہ چیز مشتری کو پڑی ہے، اسی لئے ہمارے فقہاء نے شفعہ کی تعریف اس طرح کی ہے: "تملک البقعة بما قام علی المشتری بسبب الشرکة والجوار" ہر معنی اصطلاحی میں معنی لغوی بھی ملحوظ ہوتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی شفعہ شرعی میں اسکے لغوی معنی یعنی "ضم حصةٍ الی حصة" پائے جاتے ہیں، یعنی ایک شریک دوسرے شریک کے حصہ کو اپنے حصہ کی طرف ملاتا ہے۔ "وھذا غایة توضیح لھٰذا المقام"

اسباب شفعہ عند الائمۃ

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اسباب شفعہ میں ائمہ کا اختلاف ہے، ہمارے یہاں اسباب شفعہ دو ہیں، شرکت اور جوار، پھر شرکت کی دو قسمیں ہیں، شرکت فی نفس المبیع، اور شرکت فی طریق المبیع، طریق کی کوئی تخصیص نہیں۔ بلکہ مقصود شرکت فی حق من حقوق المبیع ہے، کالطریق والشرب ونحوھما۔ اور عند الجمہور وائمہ ثلاثہ سببیت منحصر ہے شرکت فی نفس المبیع میں۔ لہٰذا اسباب شفعہ ہمارے یہاں تین ہیں، اور جمہور کے نزدیک صرف ایک یعنی شرکت فی نفس المبیع، باقی دو کے وہ قائل نہیں ہیں۔

"عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشُّفْعَةُ فِيْ كُلِّ شِرْكٍ رُبْعَةٍ اَوْ حَائِطٍ لَا يصلح اَنْ يَبِيْعَ حَتّٰى يُؤْذَنَ شَرِيْكُهٗ فَاِنْ بَاعَ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ حَتّٰى يُؤْذِنَهٗ"

آنحضرت ﷺ فرمارہے ہیں: کہ ہر مشترک چیز یعنی مکان یا باغ میں شفعہ ثابت ہے، شریکین میں سے کسی ایک کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنا حصہ کسی اجنبی شخص کو فروخت کرے، یہاں تک کہ

اپنے شریک کو مطلع نہ کردے، پس اگر اس نے اپنا حصہ قبل الایذان فروخت کر دیا تو اس کا شریک آخر اس کے حصہ کا زیادہ حقدار ہوگا، بہ نسبت مشتری کے۔

اس حدیث شریف میں دو مسئلے ہیں، ایک وہی اوپر والا اختلافی مسئلہ کہ حق شفعہ صرف شریک ہی کے لئے ہوتا ہے، شی مشترک میں یا غیر شریک یعنی پڑوسی کے لئے بھی ہوتا ہے، دوسرا مسئلہ یہ کہ شفعہ کن کن چیزوں میں ہوتا ہے، صرف مکان اور زمین ہی میں یا اس کے علاوہ میں بھی۔

شفعہ کن کن چیزوں میں ہوتا ہے؟

یہ دوسرا مسئلہ بھی اختلافی ہے، خطابی فرماتے ہیں: حدیث الباب میں دلیل ہے اس بات پر کہ شفعہ صرف مکان اور زمین میں واجب ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسری چیزیں سامان اور حیوان وغیرہ میں نہیں ہوتا، ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث مرفوعاً مروی ہے: "الشریک شفیع والشفعة فی کل شی" یہ روایت ترمذی شریف میں مرسلاً ومسنداً دونوں طرح مروی ہے، لیکن امام ترمذی نے روایت مرسلہ کو اصح قرار دیا ہے، اور پھر اس کے بعد فرماتے ہیں: "وقال اکثر اھل العلم انما تکون الشفعة فی الدور والارضین ولم یروا الشفعة فی کل شی و قال بعض اھل العلم الشفعة فی کل شی والاول اصح"

تحفۃ الاحوذی میں "الشفعة فی کل شی" پر لکھا ہے "وبه قال مالک فی روایة وھو قال عطاء" اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک شفعہ منقولات میں سے صرف حیوانات میں ہے، باقی منقولات میں نہیں۔ "کذا فی الفتح (تحفه) والحدیث اخرجه مسلم والنسائی قال المنذری"

"عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشُّفْعَةُ فِیْ كُلِّ مَالٍ لم یقسم فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ وَصُرِفَتْ الطرق فَلَا شُفْعَةَ"

یعنی شفعہ ہر اس مال مشترک میں ہے جس کو ابھی تک تقسیم نہیں کیا گیا اور پھر جب ہر شریک کے حصہ کی حدود متعین کر دی جائیں یعنی اس کی شرکت کو ختم کر کے ہر شریک کا حصہ ممیز اور جدا کر دیا جائے اور راستے بھی الگ الگ کر دئے جائیں پھر شفعہ نہیں رہتا۔

حنفیہ کی طرف سے توجیہ

جمہور علماء اور ائمہ ثلاثہ نے اپنے مسلک پر اسی حدیث شریف سے استدلال کیا ہے، ہمارے علماء نے اسکا جواب یہ دیا ہے کہ حق شفعہ کے مختلف اسباب ہیں، جن میں ایک شرکت بھی ہے، جب یہ بات ہے تو پھر اس حدیث شریف کا یہ مطلب لیا جائیگا کہ مکان مشترک یا ارض مشترک کی تقسیم کے بعد جو حق شفعہ شرکت کی وجہ سے حاصل تھا تقسیم کے بعد اب وہ نہیں رہا، اب اگر کسی حدیث شریف سے شرکت کے علاوہ کسی اور چیز کا سبب شفعہ ہونا ثابت ہوگا تو پھر یہ حدیث اسکے منافی نہ ہوگی، اور ہم کہتے ہیں دوسری احادیث سے شرکت فی الطریق اور اسی طرح جوار کا سبب شفعہ ہونا ثابت ہے، لہٰذا اسکی اس حدیث شریف میں نفی نہیں ہے۔

آگے اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی آرہی ہے: "اذا قسمت الارض وحدت فلا شفعة" (اخرجه النسائي و ابن ماجة مسندا و مرسلا قاله المنذري) [جب زمین تقسیم کر دی جائے اور اس کی حدود مقرر کر دی جائیں تو اس میں شفعہ نہیں۔]

"عن ابراهيم بن ميسرة سمع عمرو بن الشريد سمع ابا رافع رضي الله عنه سمع النبي صَلَّى اللهُ تَعَالَىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول الجار احق بسقبه"

سقب بمعنی قرب، یعنی آدمی کا پڑوسی اپنے پڑوسی کا اپنے قرب و جوار کی وجہ سے زیادہ مستحق ہے، یعنی بنسبت اس شخص اجنبی یعنی مشتری سے، جس نے کسی کا مکان خریدا ہے۔

دلیل حنفیہ اور اس پر اشکال و جواب

یہ حدیث شفعہ لاجل الجوار میں حنفیہ کی دلیل ہے۔ خطابی نے اس پر چند تعقب کئے ہیں، اول یہ کہ یہ حدیث تو اپنے مضمون میں مبہم ہے، محتاج کشف و بیان ہے، کیونکہ اس میں شفعہ کا کوئی ذکر نہیں، لہٰذا اس میں دونوں احتمال ہیں ہوسکتا ہے اس سے مراد شفعہ ہی ہو، اور ہوسکتا ہے اس سے مراد یہ ہو "انه احق بالبر و المعونة" یعنی آدمی کا پڑوسی پڑوس کی وجہ سے مستحق ہے، اس کا کہ اس کے ساتھ بھلائی اور ہمدردی اور اعانت کی جائے، اور ایک نقد یہ کیا ہے کہ لفظ جار کا اطلاق شریک پر بھی ہوتا ہے، جس طرح کہ زوجہ پر بھی جارہ کا اطلاق ہوتا ہے،

تیسرا نقد یہ کیا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے، اور وہ احادیث جن میں یہ ہے کہ شفعہ صرف شریک کیلئے ہوتا ہے "اسانیدھا خیار لیس فی شی منھا اضطراب"

خطابی کے پہلے نقد کا جواب یہ ہے کہ "الجار احق بسقبه" اس حدیث شریف میں کہا جا سکتا ہے شفعہ کا ذکر نہیں، لیکن اس کے بعد والی روایت میں شفعہ کی تصریح ہے، "جار الدار احق بدار الجار" دوسرے نقد کا جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں تصریح ہے، اس بات کی کہ جار سے مراد جار ہی ہے، شریک نہیں، جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے بیان کیا، "ثم قد روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اسبابه الشفعة بالجوار وتفسیر ذلک الجوار ما قد حدثنا... عن عمرو بن الشرید عن ابیه قال قلت یا رسول اللہ! ارض لیس لاحد فیھا قسم ولا شرک الا الجوار بیعت قال الجار احق بسقبه"

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف میں تصریح ہے اس بات کی کہ جس زمین کے بارے میں سائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا اس میں کسی قسم کی کوئی شرکت فی المبیع یا شرکت فی الطریق کچھ نہیں تھی، سوائے جوار کے اور اسکے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق شفعہ کو ثابت فرمایا۔

اور تیسرے نقد کا جواب یہ ہے کہ اضطراب صرف بعض احادیث کے بعض طرق میں ہے، اور بعض اس میں ایسی بھی ہیں جو ہر قسم کے اضطراب واختلاف سے محفوظ ہیں، جیسا کہ "حدیث الحسن عن سمرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جار الدار احق بالدار، قال ابو عیسی وفی الباب عن الشرید وابی رافع وانس قال ابو عیسی حدیث سمرة حدیث حسن صحیح"

اور پھر بعض رواۃ نے جو اس میں اختلاف کیا ہے اس کو امام ترمذی بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "والصحیح عند اهل العلم حدیث الحسن عن سمرة الی آخر ما ذکر الترمذی من اختلاف الروایات وترجیح بعضھا علی بعض وفی اخره سمعت محمدا یقول کلا الحدیثین عندی صحیح۔" (والحدیث اخرجه البخاری والنسائی وابن ماجة وقال المنذری) (الدر المنضود: ۵/۴۲۹)

﴿الفصل الاوّل﴾

حق شفعہ اور تقسیم

{۲۸۳۲} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ قَضَی النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالشُّفْعَۃِ فِیْ کُلِّ مَا لَمْ یُقْسَمْ فَاِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ وَصُرِفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَۃَ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/ ۳۳۹، کتاب الشرکۃ، باب اذا اقتسم الشرکاء الدور وغیرھا، حدیث نمبر: ۲۴۳۲،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شی میں جو تقسیم نہ کی گئی شفعہ کا فیصلہ فرمایا ہے (یعنی اس میں شفعہ جاری ہوسکتا ہے) اور جب حدود واقع ہوجائیں (کہ وہ تقسیم کرلی گئی) اور راستے پھیر لئے (اور ہر ایک نے خاص کرلیا) تو پھر ان میں شفعہ نہیں۔

تشریح: نفس مشروعیت شفعہ میں اختلاف نہیں بلکہ مشروعیت پر اتفاق ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ" (النساء:۳۶)

اس آیت میں پڑوسی کے حقوق بیان کئے ہیں اور شفعہ بھی جوار کے منجملہ حقوق میں سے ہے۔ البتہ شفعہ کی تفصیلات میں اختلاف ہوا ہے۔

اس بات پر جمہور کا اتفاق ہے کہ شفعہ صرف غیر منقول چیزوں میں ہوسکتا ہے، منقول چیزوں میں نہیں ہوسکتا، جب کہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کا کہنا یہ ہے کہ شفعہ ہر چیز میں ہوسکتا ہے خواہ منقول ہو یا غیر منقول، یہ حضرات حدیث مذکور کے عموم سے استدلال کرتے ہیں۔ چونکہ "فی کل مالم یقسم" میں عموم ہے، یعنی جس چیز کی تقسیم نہ ہوئی ہو خواہ منقول ہو یا غیر منقول اس میں شفعہ جائز ہے۔

حنفیہ کے نزدیک ان کے نمبر کی ترتیب کے مطابق ان کا حق مقرر ہے کہ پہلا سب پر مقدم ہوگا،

پھر دوسرے کا نمبر ہوگا اور اس کے آخر میں تیسرے کا حق ہوگا۔

حنفیہ کا استدلال ”خلیط فی حق المبیع“ (یعنی جو عین مبیع میں شریک نہیں بلکہ حقوق میں شریک ہے) کے لئے اثبات شفعہ پر خود اسی حدیث سے ہے کیونکہ حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ شرکت کی وجہ سے شفعہ کا استحقاق ہوتا ہے، اگر عین مبیع میں شرکت ہو پھر تو ظاہر ہے اور اگر حقوق مبیع راستہ پانی وغیرہ حقوق میں شرکت ہو تب بھی شفعہ کا استحقاق ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں تصریح ہے: ”وصرفت الطرق“ کیونکہ اگر حق مبیع میں شرکت شفعہ کے استحقاق کا سبب نہ ہوتا تو پھر ”صرفت الطرق“ کہنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔

لہٰذا شرکت فی المبیع کی صورت میں شفعہ عبارۃ النص سے ثابت ہوگا اور ”شرکت فی الشرب والمسیل“ کی صورت میں شفعہ دلالۃ النص سے ثابت ہوگا، کیونکہ اگر ”شرکۃ فی حق المبیع“ یعنی ”شرب و مسیل“ کی شرکت موجب شفعہ نہ ہوتی تو پھر ”وقعت الحدود وصرفت الطرق“ نہ فرمایا جاتا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۱/۶۶۶)

جہاں تک جار کے حق شفعہ کا تعلق ہے تو وہ متعدد احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ”قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجَارُ اَحَقُّ بِشُفْعَةِ جَارِهٖ الخ“ (ابوداؤد شریف: ۲/۲۸۶) [حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پڑوسی اپنے پڑوسی کے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے۔]

اسی طرح حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ”اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِهٖ اَيْ بِشُفْعَتِهٖ“ (بخاری شریف: ۱/۳۰۰)

[پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے۔]

نیز حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ”اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: جَارُ الدَّارِ اَحَقُّ بِدَارِ الْجَارِ اَوِ الْاَرْضِ“ (ابوداؤد شریف: ۲/۲۸۶)

[حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ مکان کا پڑوسی پڑوسی کے مکان اور زمین کا زیادہ حقدار ہے۔]

حنفیہ کی طرف سے ائمہ ثلاثہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ "**فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة**" کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم کے بعد شرکت فی نفس المبیع کی وجہ سے شفعہ ثابت نہیں ہوگا، لہٰذا یہ کسی اور سبب یا کسی اور وجہ سے شفعہ کے ثابت ہونے کے منافی نہیں، جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانی نے فرمایا۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشروعیت شفعہ کی علت دفع ضرر ہے اور ضرر جس طرح شریک سے لاحق ہوسکتا ہے، اسی طرح آدمی کو جار اور پڑوسی سے بھی ضرر لاحق ہوسکتا ہے، لہٰذا حنفیہ کی تاویل دوسرے ائمہ کی تاویل کے مقابلے میں زیادہ راجح ہے۔(اعلاء السنن: ۱۳، ۱۴/ ۱۷)

اسی طرح فصل ثانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال کرتے ہیں: "**الشفعة فی کل شی**" [شفعہ ہر چیز میں ہے۔] کہ یہاں بھی عموم ہے۔(المحلی: ۲۸/ ۹)

جمہور کی طرف سے پہلی حدیث شریف کا جواب یہ ہے کہ یہ تو جمہور ہی کا مستدل ہے، کیونکہ یہ حدیث شریف زمینوں اور مکانات کے حکم کو بیان کرنے کے لئے ہے، جیسا کہ خود حدیث شریف کا آخری حصہ اسی پر دال ہے: "**فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة**" کہ جب حدود مقرر ہو جائیں اور ہر ایک حصہ کا راستہ الگ الگ کر دیا جائے تو پھر شفعہ باقی نہیں رہتا۔

دوسری حدیث شریف کا جواب یہ ہے کہ یہاں "کل شئ" میں کل حقیقی مراد نہیں بلکہ اضافی مراد ہے، چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**کل شی ای من غیر المنقولات او فی کل شی یحتمل الشفعة والمعنی فی کل عقار مشترک**" (مرقاۃ: ۱۲۸/ ۶)

گویا کہ یہاں بھی حدیث شریف میں منقول نہیں بلکہ غیر منقول ہی مراد ہے اور وہ وہی چیز ہے جس میں شفعہ ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہ شفعہ کی اکثر روایات میں "ربع" (گھر، گھر کے ارد گرد) عقار، دار، اور حائط" کا ذکر ہے، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شفعہ منقول میں نہیں ہوتا غیر منقول میں ہوتا ہے۔

جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: "**لا شفعة الا فی ربع او حائط**" (اعلاء السنن، کتاب الشفعة، باب لا شفعة الا فی دار او عقار)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: "**لا شفعة الا فی دار او عقار**" وغیرہ۔(تلخیص الحبیر: ۵۵/ ۳)

اقسام شفعہ اور اس میں اختلاف

ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک حق شفعہ صرف ”شریک فی نفس المبیع“ کے لئے ہے، یعنی اس شخص کو حق شفعہ ملتا ہے جو بائع کے ساتھ فروخت ہونے والے مکان یا زمین کی ملکیت میں شریک ہو۔

اور ان کا استدلال حدیث مذکور سے ہے کہ شفعہ کا حق اس وقت شفیع کو ملتا ہے جب کہ وہ بائع کے ساتھ شریک ہو اور جب تقسیم ہو جائے اور شرکت نہ رہے تو اس صورت میں حق شفعہ نہیں رہتا۔

جبکہ امام ابوحنیفہ، ابن سیرین، سفیان ثوری، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک شفعہ کا حق تین قسم کے لوگوں کو ملتا ہے:

(۱)...... ”شریک فی نفس المبیع“ یعنی فروخت ہونے والی زمین یا مکان میں دونوں شریک ہوں، لہٰذا فروخت کرنے کی صورت میں ہر ایک کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

(۲)...... ”شریک فی حق المبیع“ اصل زمین اور مکان میں تو شرکت نہیں، البتہ راستہ اور دیگر حقوق میں شریک ہوں۔

(۳)...... ”الجار الملاصق“ یعنی وہ پڑوسی جس کی زمین یا مکان فروخت ہونے والی زمین یا مکان سے متصل ہو۔

ایضاً

{۲۸۳۳} **وَعَنْهُ** قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالشُّفْعَةِ فِيْ كُلِّ شِرْكَةٍ لَمْ تُقْسَمْ رَبْعَةٍ اَوْ حَائِطٍ لَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَّبِيْعَ حَتّٰى يُؤْذِنَ شَرِيْكَهٗ فَاِنْ شَاءَ اَخَذَ وَاِنْ شَاءَ تَرَكَ فَاِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/ ۳۲، کتاب المساقاة، باب الشفعة، حدیث نمبر: ۱۶۰۸،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ کا فیصلہ

فرمایا ہے ہر مشترکہ چیز ہے جو کہ تقسیم نہ ہوئی ہو، مکان ہو یا باغ، اس کے لئے جائز نہیں ہے فروخت کرنا یہاں تک کہ اپنے شریک سے اجازت لے، پھر اگر وہ شریک چاہے تو خرید کرے اور اگر چاہے چھوڑ دے (یعنی شفعہ کا مطالبہ نہ کرے) اور اگر فروخت کر دیا اور شریک سے اجازت نہ لی ہو تو پھر وہ اس کا زیادہ حق دار ہے (کہ بطورِ شفعہ لے لے)

تشریح: قضی الخ: آنحضرت ﷺ نے فیصلہ فرمایا۔

شرکة، یعنی شی مشترکہ، ربعة، (مکان) حائط (باغ)۔

لا یحل: مقصد بیان یہ ہے کہ اگر ایک شریک اپنا حصہ فروخت کرتا ہو تو وہ دوسرے شریک سے دریافت کرے اگر وہ خریداری سے انکار کرتا ہے اب دوسرے کو فروخت کر سکتا ہے۔ اطلاع اور اجازت سے قبل مناسب نہ ہوگا، کیونکہ وہ مقدم ہے خریدار کے لئے اور اسی وجہ سے حق شفعہ دیا گیا ہے۔

اس مسئلہ کے اندر اختلاف ہے کہ ایک آدمی نے اپنے شریک سے کہا کہ میں اپنا گھر فروخت کر رہا ہوں تو اگر شفعہ کا دعویٰ کرنا چاہے تو کر دے اس نے انکار کر دیا اور دوسرے کو بیع کی اجازت دیدی تو اب اجازت کے بعد اس کو حق شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟

حسن بصری، ابوعبید، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں کہ حق شفعہ نہیں ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں راویتیں ہیں۔

جمہور کے نزدیک حق شفعہ باقی ہے، کیونکہ یہ حق بیع کے وقت متوجہ ہوتا ہے، لہٰذا قبل البیع اجازت اور عدم اجازت سے فرق نہیں پڑتا بلکہ اصل شفعہ کا دعویٰ بیع کے وقت ہے۔

فائدہ: اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین اور جائیداد ہی میں یہ حکم ہے، اور جماہیر علماء کا مذہب بھی یہی ہے۔

حق شفعہ برائے پڑوس

{۲۸۳۴} **وَعَنْ** اَبِیْ رَافِعٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِہٖ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۰۰، کتاب الشفعة (السلم) باب عرض الشفعة علی صاحبھا قبل البیع، حدیث نمبر:۲۲۰۳،

ترجمہ: حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پڑوسی (شفعہ کا) زیادہ حق دار ہے اپنی قربت ونزدیکی کی وجہ سے۔

تشریح: اس روایت میں بصراحت بیان ہے کہ حق شفعہ پڑوس کے لئے بھی ہے اور احناف کی یہ دلیل ہے "بسقبه" سقب بمعنی القرب، پڑوس اور با برائے سببیت ہے۔

فائدہ: شریعت نے پڑوسی کے بہت حقوق بیان کئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے، اس لئے حق شفعہ بھی پڑوس کے لئے ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پڑوسی کا حق

{۲۸۳۵} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لاَ یَمْنَعُ جَارٌ جَارَهٗ اَنْ یَغْرِزَ خَشْبَةً فِیْ جِدَارِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۳۳، کتاب المظالم والقصاص، باب لایمنع جار جارہ ان یغرز فی جدارہ، حدیث نمبر: ۲۳۹۹، مسلم شریف: ۲/۳۲، کتاب المساقاة، باب الشفعة، حدیث نمبر: ۱۶۰۹،

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی پڑوسی منع نہ کرے اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں لکڑی گاڑنے سے۔ (کپڑا وغیرہ ڈالنے کے لئے)۔

تشریح: اگر کسی کی دیوار میں اس کا ہمسایہ کوئی لکڑی وغیرہ لگانا چاہے تو اس حدیث شریف میں ہے کہ اسکو منع نہیں کرنا چاہئے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ امر استحبابی ہے۔ حسن اخلاق اور مروت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو منع نہ کرے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم وجوبی ہے۔

(الکوکب الدری: ۱/۳۸۹، اشرف التوضیح: ۳/۴۱۴)

ھدایت: اگر کسی قسم کا ضرر اور حرج کا اندیشہ ہو اس وقت منع کیا جاسکتا ہے۔

اگر راستہ میں اختلاف ہو

{۲۸۳۶} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي الطَّرِيْقِ جُعِلَ عَرْضُهُ سَبْعَةَ أَذْرُعٍ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۳۳/۲، کتاب المساقاۃ، باب قدر الطریق اذا اختلفوا فیہ، حدیث نمبر: ۱۶۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم راستہ میں اختلاف کرنے لگو تو راستہ کی چوڑائی سات ذراع کر دی جائے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی افتادہ زمین پر راستہ بنا ہوا ہو اور وہاں کچھ لوگ عمارت بنانا چاہیں تو بہتر یہی ہے کہ آپس کے اتفاق و اتحاد سے مناسب راستہ کے لائق زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر اس کے ارد گرد عمارت بنالی جائے، لیکن اگر راستہ کے لئے زمین کی کسی مقدار پر اتفاق نہ ہو اور آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں واضح ہدایت یہ ہے کہ راستہ کے لئے چوڑائی میں سات ہاتھ زمین متعین کر دی جائے اور اس سات کے اندر کوئی کچھ نہ بنائے۔

مذکورہ بالا حدیث کی مراد تو یہ ہے لیکن اس بارے میں ایک یہ مسئلہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اگر کوئی چلتا ہوا راستہ سات ہاتھ سے زائد چوڑا ہو تو اس صورت میں کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے وہ اس پورے زائد حصہ یا اس میں سے کچھ پر قابض ہو جائے اور یہ کہے کہ راستہ کی سات ہاتھ چوڑائی کافی ہے۔

جائیداد کی فروختگی مناسب نہیں

{۲۸۳۷} **وَعَنْ** سَعِيْدِ بْنِ حُرَيْثٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ بَاعَ مِنْكُمْ دَارًا أَوْ

عَقَارًا قَمِنٌ اَنْ لَّا يُبَارَكَ لَهٗ اِلَّا اَنْ يَّجْعَلَهٗ فِیْ مِثْلِهٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ والدارمی)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۲/ ۱۷۹، ابواب الرھن، باب من باع عقارا ولم یجعل ثمنہ، فی مثلھا، حدیث نمبر: ۲۴۹۰، دارمی: ۲/ ۳۵۳، کتاب البیوع، باب من باع دارا فلم یجعل ثمنھا فی مثلھا، حدیث نمبر: ۲۶۲۵،

ترجمہ: حضرت سعید بن حریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے سنا: آنحضرت ﷺ فرمارہے تھے: تم میں سے جو شخص کوئی مکان یا زمین فروخت کرے تو وہ اس لائق ہے کہ اسکو برکت نہ دی جائے، مگر یہ کہ اس (کی قیمت) کو اسی طرح کی چیز میں لگادے (یعنی خرید لے)۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ غیر منقولہ جائیداد (مثلاً مکانات اور زمین کو بلا ضرورت بیچنا اور اس سے حاصل ہونے والی قیمت سے منقولہ اشیاء خریدنا غیر مستحب اور غیر مناسب ہے، کیونکہ غیر منقولہ جائیداد میں منافع بھی بہت ہیں اور اس کے اتلاف ونقصان کے خطرات بھی کم ہوتے ہیں، جیسے اسے کوئی چور چرا نہیں سکتا اور کوئی لٹیرا لوٹ کر نہیں لے جاسکتا، بخلاف اشیاء منقولہ کے کہ ان کی چوری کا ہر وقت خوف رہتا ہے، لہٰذا عقل و دانش کا تقاضہ یہی ہونا چاہئے کہ بلا ضرورت غیر منقولہ جائیداد کو فروخت نہ کیا جائے، اگر فروخت ہی کیا جائے تو اس کی قیمت کو دوسرے مکانات وزمین کی خریداری میں صرف کیا جائے۔

پڑوس بھی حق شفعہ کا سبب ہے

{۲۸۳۸} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْجَارُ اَحَقُّ بِشُفْعَتِهٖ یُنْتَظَرُ لَهَا وَاِنْ كَانَ غَائِبًا اِذَا كَانَ طَرِیْقُهُمَا وَاحِدًا۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

حوالہ: مسند احمد: ۳/ ۳۰۴، حدیث نمبر: ۱۴۳۰۳، ترمذی شریف: ۱/ ۲۵۳، ابواب الاحکام، حدیث نمبر: ۱۳۶۹، ابوداؤد شریف: ۲/ ۴۷۶، کتاب البیوع، باب الشفعۃ، حدیث نمبر: ۳۵۱۸، ابن ماجہ شریف: ۲/ ۱۷۹، ابواب الشفعۃ، باب الشفعۃ بالجوار، دارمی: ۲/ ۳۵۴، کتاب البیوع، باب فی الشفعۃ، حدیث نمبر: ۲۶۲۷،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ حق دار ہے اسی کی وجہ سے (فروخت کرنے کے وقت) انتظار کیا جائے گا اگر وہ موجود نہ ہو بشرطیکہ دونوں کا راستہ ایک ہی ہو۔

تشریح: اس روایت سے بھی صراحتاً معلوم ہوگیا کہ حق شفعہ پڑوس کے لئے بھی ہے، لہٰذا اگر وہ پڑوسی حاضر نہ ہو اور کسی کو فروخت کرنا ہے تو اس کی آمد تک انتظار کیا جائے گا۔

اس میں یہ تصریح ہے کہ پڑوس ہونے میں ''راستہ'' کا بھی اعتبار ہوا کرتا ہے۔

حق شفعہ کس شی میں ہے؟

{۲۸۳۹} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشَّرِيْكُ شَفِيْعٌ وَالشُّفْعَةُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ. (رواہ الترمذی) قَالَ وَقَدْ رُوِيَ عَنِ ابْنِ اَبِيْ مُلَيْكَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْسَلًا وَهُوَ اَصَحُّ.

حوالہ: ترمذی شریف: ۱/ ۲۵۵، ابواب الاحکام، باب: ۳۴، حدیث نمبر: ۱۳۷۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شریک شفعہ کا حقدار ہے اور شفعہ ہر (غیر منقول) چیز میں ہے۔ (ترمذی) اور ترمذیؒ نے فرمایا: کہ بروایت ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ مرسلاً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور وہ روایت زیادہ صحیح ہے۔

تشریح: فی کل شی: بعض علماء ظاہر نے اس جملہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حق شفعہ ''منقولہ'' اشیاء میں بھی ہے، فقط جائیداد کے ساتھ ہی مخصوص نہ ہوگا، لیکن دوسری روایات اور معمول بہ صورت کی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ مراد ہر شی ہے، جس میں حق شفعہ جاری ہوسکتا ہو۔ (یعنی وہ زمین وغیرہ ہے)۔ تفصیل ماقبل میں گذر چکی۔

مفادِ عامہ کو نقصان پہنچانا بھی حرام ہے

{۲۸۴۰} **وَعَنْ** عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حُبَيْشٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَطَعَ سِدْرَۃً صَوَّبَ اللّٰہُ رَأْسَہٗ فِی النَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد) وَقَالَ: ھٰذَا الْحَدِیْثُ مُخْتَصَرٌ یَعْنِیْ مَنْ قَطَعَ سِدْرَۃً فِیْ فَلَاۃٍ یَسْتَظِلُّ بِھَا ابْنُ السَّبِیْلِ وَالْبَھَائِمِ غَشْمًا وَظُلْمًا بِغَیْرِ حَقٍّ یَکُوْنُ لَہٗ فِیْھَا صَوَّبَ اللّٰہُ رَأْسَہٗ فِی النَّارِ۔

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۶۵۸/۲، کتاب الادب، باب قطع السدر، حدیث نمبر: ۵۲۳۹،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن حبیش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بیری کا درخت کاٹ دیا تو اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ میں اس کے سرکو الٹا کرے گا۔ (ابوداؤد) امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ یہ حدیث مختصر ہے، مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے جنگل کے بیری کے اس درخت کو کاٹ دیا جس سے مسافر اور چوپائے سایہ حاصل کرتے تھے بطورِ ظلم جس میں اس کا کوئی حق بھی نہ تھا تو اللہ تعالیٰ اس کے سر کو دوزخ کی آگ میں الٹا کر دے گا۔

تشریح: جملہ ”غشماً و ظلماً بغیر حق“ میں لفظ ”ظلم“ اور ”بغیر حق“ لفظ غشماً کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، یا پھر یہ کہ لفظ ”ظلم“ تو غشماً کی تاکید کے طور پر ہے، لیکن ”بغیر حق“ سے مراد شفعہ ہے۔

ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”مرقاۃ الصعود“ میں لکھا ہے کہ طبرانی نے اپنی کتاب ”اوسط“ میں یہ وضاحت کی ہے کہ جو شخص حدود حرم میں بیری کا درخت کاٹے گا اس کے لئے یہ وعید ہے، بعضوں نے کہا ہے کہ یہاں مدینہ طیبہ کی بیری کا درخت مراد ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جنگل کا وہ بیری کا درخت مراد ہے جس کے سائے میں مسافر اور جانور راحت پاتے ہیں، اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو کسی دوسرے شخص کا بیری کا درخت از راہِ ظلم و زیادتی کاٹ ڈالے۔

﴿الفصل الثالث﴾

حق شفعہ کس میں ہے؟

{۲۸۴۱} **وَعَنْ** عُثْمَانَ ابْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ إِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فِي الْأَرْضِ فَلَا شُفْعَةَ فِيْهَا وَلَا شُفْعَةَ فِيْ بِئْرٍ وَلَا فَحْلِ النَّخْلِ۔

(رواه مالك)

حوالہ: مؤطا امام مالک: ۲۹۸، حدیث نمبر: ۴، من كتاب الشفعة،

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب کہ زمین میں حدود قائم ہو جائیں تو پھر اس میں حق شفعہ نہیں ہے اور کنویں میں اور نہ کھجور کے درخت میں حق شفعہ ہے۔

تشریح: کنواں ایک ایسی چیز ہے جو تقسیم کا احتمال نہیں رکھتا، اور چونکہ شفعہ کا حق اسی زمین میں حاصل ہوتا ہے جو تقسیم کا احتمال رکھتی ہو، اس لئے کنویں میں شفعہ نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک شفعہ ہر زمین میں ثابت ہے، خواہ وہ تقسیم کا احتمال رکھے، جیسے مکانات اور باغات وغیرہ یا تقسیم کا احتمال نہ رکھے جیسے: کنواں، حمام اور چکی وغیرہ، حنفیہ کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد گرامی ہے کہ ''الشفعة في كل شيئ'' شفعہ ہر (غیر منقول) چیز میں ہے۔

ولا فحل النخل: اور نر کھجور کے درخت میں، یعنی مثلاً چند لوگوں کو کھجور کے کچھ درخت مشترک طور پر وراثت میں حاصل ہوئے، جنہیں انہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا لیکن ان میں ایک نر درخت بھی تھا، جس کے پھول لے کر سب ہی لوگ اپنے اپنے کھجور کے درختوں پر ڈالتے تھے، اب ان ہی میں کا ایک شخص اپنے حصہ کے کھجور کے درختوں کے ساتھ اس نر درخت کے اپنے حقوق بھی فروخت کرے تو شرکاء کو اس فروخت میں شفعہ کا حق حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ نہ تو وہ کوئی زمین ہے اور نہ اس کو تقسیم کر لینا ممکن ہے۔

باب المساقات والمزارعت

رقم الحدیث: ٢٨٤٢ر تا ٢٨٥٠ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب المساقات والمزارعت

(باغبانی اور کاشتکاری کابیان)

کتاب البیوع چل رہی ہے، اسی کے ضمن میں مصنف نے مزارعت کو بھی بیان کیا، اسلئے کہ جس طرح بیع وشراء اور تجارت طرق کسب میں سے ہیں، اسی طرح مزارعت بھی انواع کسب میں سے ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ۔ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا" (واقعہ: ۶۳،۶۴،۶۵) [بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی، یا ہم ہیں کھیتی کر دینے والے، اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا ہوا گھانس۔]

نیز ارشاد الٰہی ہے: "وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ وَجَنّٰتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقٰى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ" (الرعد: ۴) [اور زمین میں پاس پاس مختلف قطعے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں جن میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ ایک تنے سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعض میں دو تنے نہیں ہوتے، سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں، ان امور میں سمجھداروں کے واسطے (توحید) کے دلائل ہیں۔

مساقاۃ اور مزارعۃ دونوں باب مفاعلہ کے مصدر ہیں۔ اور دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، یعنی ''زمین بٹائی پر دینا'' البتہ مساقاۃ کا تعلق درختوں سے ہوتا ہے، چنانچہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''المساقاۃ ھی ان یعامل انسان علی شجرۃ لیعھدھا بالسقی والتربیۃ علی ان مارزق اللہ من

الثمرة یکون بینهما بجزء معین" [یعنی مساقاۃ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو درخت اور باغ سیراب کرنے اور دیکھ بھال کرنے کے لئے دے دے، اس شرط پر کہ جو پھل آئیں گے اس کا کوئی متعین حصہ "مثلاً نصف یا ثلث وغیرہ" اس کو دیا جائے گا۔]

اور مزارعت کا تعلق زمین سے ہے، چنانچہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں: "واما المزارعة وهي ان یسلم الارض الی زراع لیزرعه ببذر المالک علی ان یکون الربح بینهما مساهمة" [یعنی مزارعت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو زمین اس شرط پر دے کہ وہ اس میں کھیتی باڑی کرے اور بیج وتخم بھی مالک کا ہو اس شرط پر کہ جو پیداوار ہوگی وہ آپس میں تقسیم کریں گے۔ (شرح الطیبی: ۶/۱۴۸)

مزارعت کا دوسرا نام مخابرہ بھی ہے، البتہ مزارعۃ میں بیج مالک کی طرف سے ہوگا، جبکہ مخابرہ میں بیج عامل کی طرف سے ہوگا۔

الفصل الاوّل

ارضِ خیبر پر عقد ہونا برائے مزارعت

{۲۸۴۲} وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَفَعَ اِلٰى يَهُوْدِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَاَرْضَهَا اِلٰى اَنْ يَعْتَمِلُوْهَا مِنْ اَمْوَالِهِمْ وَلِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَطْرُ ثَمَرِهَا۔ (رواه مسلم) وَفِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى خَيْبَرَ الْيَهُوْدِ اَنْ يَّعْمَلُوْهَا وَيَزْرَعُوْهَا وَلَهُمْ شَطْرُ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا۔

حواله: بخاری شریف: ۳۱۲/۱، کتاب الحرث والمزارعة، باب المزارعة مع الیهود، حدیث نمبر: ۲۲۷۳، مسلم شریف: ۱۵/۲، کتاب المساقاة، حدیث نمبر: ۱۵۵۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بالیقین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

خیبر کے یہودیوں کو خیبر کے کھجوروں کے باغ اور وہاں کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اپنے اموال سے ان میں محنت کریں گے اور حضرت رسول کریم ﷺ کیلئے ان کے پھلوں (اور پیداوار) کا نصف حصہ ہوگا۔

مزارعت کی تفصیل

تشریح: ائمہ ثلاثہ، جمہور فقہاء اور صاحبین کا مسلک یہ ہے کہ مساقاۃ جائز ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ''مساقاۃ'' اور ''مزارعت'' دونوں فاسد اور ناجائز ہیں۔

''مزارعت'' کی تمام صورتوں میں اختلاف نہیں بلکہ ایک صورت میں اختلاف ہے اور کل تین صورتیں ہیں:

(۱)……زمین کسی کو کاشتکاری کے لئے ٹھیکہ کے طور پر دینا، یعنی ''کراء الارض بالنقد'' یہ صورت بالاتفاق جائز اور معمول بہ ہے۔

(۲)……دوسری صورت یہ ہے کہ زمین کسی کو کاشتکاری کے لئے دے، اس شرط پر کہ پوری زمین کی پیداوار نہیں بلکہ ایک متعین حصہ کی پیداوار کاشتکار کو دی جائے گی، یہ صورت بالاتفاق ناجائز ہے، اس لئے کہ پیداوار کی مقدار مجہول بھی ہے اور اس حصہ کی پیداوار کی ہلاکت کی صورت میں یہ معاملہ بلاعوض ہوگا۔

(۳)……تیسری صورت یہ ہے کہ زمین کاشت کے لئے دے اور پوری زمین کی پیداوار میں سے ثلث یا ربع وغیرہ کاشتکار کے لئے مقرر کی جائے۔ اس صورت میں اختلاف ہے کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟

چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ''مزارعت'' ''مستقلاً'' تو جائز نہیں، البتہ ''تبعاً'' کہ درخت مساقات کے طور پر کسی کے حوالہ کئے جائیں اور درختوں کے ساتھ زمین بطور مزارعت کے دی جائے تو یہ جائز ہوگا، جیسا کہ خیبر میں ہوا کہ درخت بطور مساقاۃ دیئے اور زمین بطور مزارعت کے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مزارعت نہ مستقلاً جائز ہے اور نہ تبعاً۔ مگر یہ کہ وہ زمین مزارعت کے لئے دی جائے، جو درختوں کے درمیان ہے تو وہ تابع ہوسکتی ہے۔

صاحبین، امام احمد اور اکثر اہل علم رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک مزارعت مستقلاً بھی جائز ہے اور تبعاً

بھی جائز ہے۔(التعلیق:۳۶۲/۳)

حدیث مذکور سے جمہور کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کہ مزارعت اور مساقاۃ دونوں مطلقاً جائز ہیں، اور یہ دعویٰ کرنا کہ خیبر میں مساقاۃ اصل اور مزارعت تابع تھی ایک بعید اور بلا دلیل دعویٰ ہے، کیونکہ جس ضرورت کی وجہ سے ''مساقاۃ'' کو جائز قرار دیا گیا ہے وہی علت مزارعت میں بھی پائی جاتی ہے، پھر یہ کہ مزارعت اور مساقاۃ دونوں پر تمام بلاد اور امصار کے مسلمانوں کا ایک مستمر تعامل رہا ہے، جس کی وجہ سے بھی ان کو جائز ہونا چاہئے۔

امام ابوحنیفہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہما یہود خیبر کو خراج مقاسمہ پر محمول کرتے ہیں، خراج دو قسم کا ہوتا ہے، ایک خراج مؤظف اور ایک خراج مقاسمہ۔

''خراج مؤظف'' یہ ہے کہ اہل ذمہ پر مال کی کوئی خاص مقدار متعین کی جائے کہ سالانہ فی کس اتنی مقدار بطور خراج دینی ہوگی۔

اور ''خراج مقاسمہ'' یہ ہے کہ کوئی مقدار متعین نہ کی جائے بلکہ ان سے یہ کہہ دیا جائے کہ تمہاری زمینوں کے پیداوار سے تمہیں اتنا حصہ دینا ہوگا۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ وہ زمین ان ہی کی ملک ہو۔(التعلیق:۳۶۲/۳)

یہود خیبر کے معاملہ کو امام صاحب اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہما نے ''خراج مقاسمہ'' پر اسلئے محمول کیا ہے کہ خیبر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قہراً اور عنوۃً فتح نہیں ہوا بلکہ صلحاً فتح ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ زمینیں ان کی ملک میں تھیں، لہٰذا ان سے جو معاملہ ہوگا وہ خراج مقاسمہ ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ مزارعت، کیونکہ مزارعت میں زمین کسی اور کی ہوتی ہے، کاشت کرنے والے کی نہیں ہوتی اور یہاں زمین یہود کی تھی، جبکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کی رائے میں خیبر قہراً اور عنوۃً فتح ہوا تھا، اس صورت میں فتح کے بعد مفتوحہ زمینیں کفار کے ہاتھ سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھیں، لہٰذا ان کے ساتھ جو معاملہ ہوگا وہ مزارعت ہی کا ہوگا۔(حوالہ بالا)

چنانچہ روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ خیبر کی اراضی مسلمانوں کی تھیں جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایات میں ارشاد ہے:

''وکانت الارض حین ظهر علیها لله ولرسوله وللمسلمین فأراد اخراج الیهود

منها فسألت الیھود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقرھم بھا علی ان یکفوا عملھا ولھم نصف الثمر، فقال لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نقرکم بھا علی ما شئنا فقروا بھا حتی أجلاھم عمر رضی اللہ عنہ الی تیماء واریحائ" (مسلم شریف:۱۵/۲)

[جب خیبر فتح ہوا تو یہ زمین اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہوگئی، آنحضرت ﷺ نے یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ فرمایا، یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں وہاں پر برقرار رکھا جائے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کے کام کاج کے ذمہ دار ہوں گے اور انہیں نصف پیداوار ملے گی، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تک ہم چاہیں اس شرط پر یہاں تمہیں ٹھہرنے کی اجازت دیتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ وہاں ٹھہر گئے یہاں تک کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر ان کو تیماء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کردیا۔]

مسئلہ مذکورہ میں حنفیہ کے ہاں حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے قول پر فتویٰ ہے، جو کہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا مسلک ہے اور عہد نبوی سے لے کر آج تک اس پر مستمر عمل ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قیس بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل فرمائی ہے، جس میں ارشاد ہے: **"ما بالمدینۃ اھل بیت ھجرۃ الا یزرعون علی الثلث والربع"** [مدینہ طیبہ میں اہل ہجرت کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی پر کھیتی نہ کرتے ہوں۔]

اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمہور امت کا عمل ذکر کیا ہے: **"قال: وزارع علی وسعد بن مالک وعبداللہ بن مسعود وعمر بن عبدالعزیز والقاسم وعروۃ وآل ابی بکر وآل علی وابن سیرین رضی اللہ عنھم اجمعین"** (بخاری شریف: ۱/۳۱۳) [حضرت علی، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ اور آل ابی بکر اور آل علی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے بٹائی پر کھیتی کی۔]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایات سے استدلال کیا ہے جن میں مزارعت سے نہی وارد ہے۔

ان کا جواب ایک تو یہ ہے کہ نہی مطلق نہیں بلکہ ایک خاص صورت پر محمول ہے کہ مزارعت کے ساتھ شرط فاسد ہو اور وہ یہی کہ زمین کے ایک متعین حصہ کی پیداوار کے بدلے میں مزارعت کا معاملہ کیا

016 Babul Musaqat

جائے، تمام پیداوار اور تمام زمین میں ربع یا ثلث یا نصف کے اندر اس کا حق نہ ہو اور ظاہر ہے کہ جب شرط فاسد کی موجودگی میں اس خاص حصہ کی ہلاکت کی صورت میں مابقی پیداوار میں اس کا حق نہیں ہوگا، تو یہ عمل بلاعوض ہوگا جو کہ ناجائز ہے، جیسا کہ مزارعت کی اقسام میں گذرا۔

اور اس بات پر دلیل فصل اول کی رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: ''وعن رافع بن خدیج رضی اللہ عنه قال: کنا اکثر اهل المدينة حقلا وكان احدنا يكرى ارضه فيقول: هذه القطعة لى، وهذه لک فربما أخرجت ذه، و لم تخرج ذه فنهاهم النبى صلى الله عليه وسلم'' (بخاری شریف: ۱/۳۱۳) [حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اہل مدینہ میں سب سے زیادہ کاشت کرنے والے تھے، اور ہم میں سے بعض لوگ اپنی زمین کو بٹائی پر کاشت کرنے کے لئے دیا کرتے تھے اور یہ کہہ دیتے تھے کہ زمین کا یہ قطعہ میرے لئے ہے، ''یعنی اس قطعہ کی پیداوار کرایہ کے عوض میں لوں گا'' اور یہ قطعہ تمہارے لئے ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک قطعہ میں پیداوار ہوتی تھی اور دوسرے قطعہ میں کچھ نہیں ہوتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔'' کیونکہ اس صورت میں ایک شخص کو تو پیداوار مل جاتی تھی دوسرا بالکل محروم ہو جاتا تھا'' دوسرے یہ کہ یہ نہی ارشادی اور تنزیہی ہے، حرمت پر محمول نہیں، چنانچہ فصل اول ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

''ان النبى صلى الله عليه وسلم لم ينه عنه ولكن قال: ان يمنح احدكم اخاه خير له من ان يأخذ عليه خرجا معلوما''

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''مزارعت'' سے منع نہیں فرمایا، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اپنے کسی بھائی کو اپنی زمین کاشت کیلئے بطور تبرع دے دینا اس سے بہتر ہے کہ اس سے اس زمین کا کوئی معاوضہ لیا جائے۔

گویا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مشورہ ارشاد فرمایا کہ مروت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی ضرورت سے زائد جو زمین ہے دوسرے کو بغیر معاوضہ کے وہ کاشت کرنے کے لئے دے دیا کرو۔

اس کے علاوہ بھی دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت ہے کہ یہاں نہی سے مراد نہی ارشادی اور تنزیہی ہے، نہ کہ تحریمی، جس میں مزید وضاحت سنن نسائی میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت سے

ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے: ”مر النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی أرض رجل من الانصار قد عرف انہ محتاج فقال لمن ھذہ الارض فقال لفلان اعطانیھا بالاجر فقال لو منحھا اخاہ“ چنانچہ اس روایت میں آنحضرت ﷺ نے بغیر معاوضہ کے زمین حوالہ کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے، حکم نہیں فرمایا اور اس کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جس میں ارشاد ہے: ”لان یمنحھا احدکم اخاہ ارضہ خیر من ان یاخذ علیھا خرا جامعلوما“ [البتہ تم میں ایک اپنے بھائی کو اپنی زمین بطور عطیہ دیدے، اس سے بہتر ہے کہ اس کے اوپر کوئی متعین خراج وصول کرے۔]

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”لان یمنحھا“ ”وان تصوموا خیر لکم“ کے قبیل سے ہے، یعنی جس طرح سفر میں روزہ رکھنا بہتر ہے، لازم نہیں، اسی طرح یہاں بھی بغیر معاوضہ کے زمین دینا بہتر ہے، لازم نہیں۔ (نفحات التنقیح: ۴۸۹/۳)

اہم اشکال اور اس کا جواب

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک خلجان رہتا تھا کہ فقہ حنفی کی کتب میں پہلے تو لکھا جاتا ہے کہ مزارعت صاحبین کے نزدیک جائز ہے، امام صاحب کے نزدیک جائز نہیں، لیکن جب مزارعت کی تفصیلات لکھتے ہیں جزئیات میں صاحبین کے ساتھ امام صاحب کے اقوال بھی لکھتے ہیں کہ فلاں صورت امام صاحب کے نزدیک جائز ہے، اور فلاں ناجائز، جب امام صاحب کے نزدیک اصل مزارعت ہی ناجائز ہے تو تفصیلات بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب عموماً یہ دیا جاتا ہے کہ امام صاحب کو چونکہ اندازہ تھا کہ لوگ باز نہیں آئیں گے، بلکہ کریں گے ہی اس لئے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جزئیات بیان فرمادیں، لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ پھر میں نے حادی قدسی میں ایک عبارت دیکھی جس سے یہ عقدہ حل ہوگیا، حادی قدسی میں لکھا ہے ”کرھھا ابو حنیفۃ ولم ینہ عنھا اشد النھی“

اس سے معلوم ہوا کہ مزارعت امام صاحب کے نزدیک جائز مع الکراہت ہے، نفس جواز کی وجہ سے آپ نے اس کے تفصیلی احکام بیان فرمادیئے۔ (اشرف التوضیح ۲١۶/۳)

مخابرہ درست نہیں

{۲۸۴۳} **وَعَنْهُ** قَالَ كُنَّا نُخَابِرُ وَلَا نَرٰى بِذٰلِكَ بَأْسًا حَتّٰى زَعَمَ رَافِعُ بْنُ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْهَا فَتَرَكْنَا مِنْ اَجَلِ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۱۲، کتاب البیوع، باب کراء الارض، حدیث نمبر: ۱۵۴۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: کہ ہم مزارعت کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، یہاں تک کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، تو ہم نے اس وجہ سے چھوڑ دیا۔

تشریح: اس روایت میں یہ تذکرہ ہے کہ ابتداءً حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عقد مخابرہ (مزارعہ) کرتے تھے، مگر حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عقد سے منع فرمایا ہے، اس لئے (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے) ازراہ احتیاط اس کو ترک کر دیا تھا۔

اجرت یا لگان پر زمین دینا

{۲۸۴۴} **وَعَنْ** حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَمَّايَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْرُوْنَ الْاَرْضَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا يَنْبُتُ عَلَى الْاَرْبَعَاءِ اَوْ شَيْءٍ يَسْتَثْنِيْهِ صَاحِبُ الْاَرْضِ فَنَهَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ فَقُلْتُ لِرَافِعٍ فَكَيْفَ هِيَ بِالدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيْرِ؟ فَقَالَ لَيْسَ بِهَا بَأْسٌ وَكَانَ الَّذِيْ نُهِيَ عَنْ ذٰلِكَ مَا لَوْ نَظَرَ فِيْهِ ذَوُوْ الْفَهْمِ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ لَمْ يُجِيْزُوْهُ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْمُخَاطَرَةِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۱۵، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب کراء الارض بالذھب

والفضۃ، حدیث نمبر:۲۲۸۸،مسلم شریف:۲/۱۳، کتاب البیوع، باب کراء الارض، حدیث نمبر:۱۵۴۵۔

ترجمہ: حضرت حنظلہ بن قیس بروایت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ مجھ کو میرے دو چچا نے خبر دی ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے، بعوض اس پیداوار کے جو کہ نالیوں پر ہو یا کچھ حصہ صاحب زمین مستثنیٰ کر دیا کرتا تھا (کہ جو اس حصہ پر پیدا ہوگا وہ زمین کی اجرت ہوگی) حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس سے منع فرما دیا، میں نے حضرت رافع رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: کہ زمین کو کرایہ پر دراہم اور دنانیر کے عوض دینا کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: کوئی مضائقہ نہیں، اور جس صورت سے منع کیا گیا ہے وہ ایسی صورت ہے کہ اگر اس میں کئی فہیم شخص حلال وحرام کے متعلق غور کریں تو اس کی اجرت جائز ہی قرار نہ دیں، کیونکہ اس صورت میں غرر اور دھوکہ ہے۔

تشریح: بما: ب برائے عوض، بمعنی الذی، الاربعاء: وہ پانی کی چھوٹی نالیاں جن سے کھیت میں پانی پہنچایا جائے۔ مقصدِ بیان یہ ہے کہ کسی خاص حصۂ زمین کی پیداوار کو زمین کا کرایہ مقرر کر دیا جائے، یہ صورت درست نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا ہے، اور اسی طرح مالک زمین نے ایک حصہ زمین کو مستثنیٰ کر دیا ہو کہ جو پیداوار اس جگہ ہوگی وہ زمین کا کرایہ ہوگا، یہ صورت بھی اول ہی کے مثل ہے، لہٰذا یہ بھی درست نہیں ہے۔

فائدہ: گذشتہ سطور میں بھی اس صورت کو بالاتفاق ناجائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ ان دونوں صورتوں میں ایک قسم کا غرر اور دھوکہ ہے، تیسری صورت یہ کہ نقد رقم طے کی جائے کرایہ کے لئے۔ ”فلیس بھا بأس“ [اس میں کوئی حرج نہیں] کیونکہ یہ صورت خوب واضح ہے، غرر وغیرہ نہیں۔ (تعلیق)

مزارعت کی ایک ممنوع صورت

{۲۸۴۵} **وَعَنْ** رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنَّا اَكْثَرُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ حَقْلًا وَكَانَ اَحَدُنَا يُكْرِيْ اَرْضَهٗ فَيَقُوْلُ هٰذِهِ الْقِطْعَةُ لِيْ وَهٰذِهٖ لَكَ فَرُبَّمَا اَخْرَجَتْ ذِهٖ وَلَمْ تُخْرِجْ ذِهٖ فَنَهَاهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/ ۳۱۳، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب مایکرہ من الشروط فی المزارعۃ، حدیث نمبر: ۲۲۷۴، مسلم شریف: ۲/ ۱۳، کتاب البیوع، باب کراء الارض، حدیث نمبر: ۱۵۴۷۔

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم اکثر اہل مدینہ کاشتکار لوگ تھے اور ہم میں سے کوئی ایک شخص اپنی زمین کرایہ دیتا اور (اس کی صورت یہ ہوتی کہ زمین کا مالک یوں) کہتا یہ زمین کا حصہ جو میرے لئے خاص ہے (لہٰذا اس پر جو پیداوار ہوگی وہ میری) اور یہ تیرے لئے، پس بعض مرتبہ اسی حصہ میں پیداوار ہوتی اور دوسرے حصے میں پیداوار نہ ہوتی تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ سے منع فرمادیا۔

تشریح: اخرجت: اس روایت میں اس وجہِ ممانعت کو بیان فرمایا ہے کہ یہ احتمال ہے کہ جس حصہ کو مالک زمین نے خارج کیا ہوا ہے، اسی حصہ پر پیداواری ہو اور باقی پر پیداوار نہ ہو۔ کرایہ دار کے لئے اس میں ضرر ہے۔

زمین کو عاریت پر دینا زیادہ بہتر ہے

{۲۸۴۶} **وَعَنْ** عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قُلْتُ لِطَاؤُسٍ لَوْ تَرَكْتَ الْمُخَابَرَةَ فَإِنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْهُ قَالَ: اَيْ عَمْرٍو اِنِّيْ أُعْطِيْهِمْ وَأُعِيْنُكُمْ وَإِنَّ اَعْلَمَهُمْ اَخْبَرَنِيْ يَعْنِيْ ابْنَ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَنْهَ عَنْهُ وَلٰكِنْ قَالَ اَنْ يَّمْنَحَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ اَنْ يَأْخُذَ عَلَيْهِ خَرْجًا مَعْلُوْمًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/ ۳۱۳، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب: ۱۰، حدیث نمبر: ۲۲۷۲، مسلم شریف: ۲/ ۱۳، کتاب البیوع، باب کراء الارض، حدیث نمبر: ۱۵۵۰۔

ترجمہ: حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت طاؤس سے کہا: اگر تم مزارعت کو چھوڑ دیتے تو بہتر تھا، کیونکہ اکثر لوگ یہ خیال کرتے (اور کہتے) ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس سے منع فرمایا ہے، حضرتِ طاؤس نے جواباً فرمایا: اے عمرو! میں ان کو زمین دیتا ہوں اور اعانت کرتا ہوں اور ان کے بڑے عالم نے مجھ کو خبر دی ہے یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا، لیکن (یہ) فرمایا ہے اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو زمین بطور عطیہ برائے کاشت عطا کر دے تو اس کے لئے اس سے بہتر ہوگا کہ اس پر معین کرایہ وصول کرے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مزارعت میں تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ دیا جاتا ہے اور کچھ لیا جاتا ہے، یعنی اپنی زمین دی جاتی ہے اور اس کے عوض اس کی پیداوار میں سے کچھ حصہ متعین کر کے لیا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر کسی کے ساتھ احسان کیا جائے بایں طور کہ اسے اپنی زمین بغیر کچھ لئے بطور عاریت دی جائے تو وہ اس سے فائدہ اٹھائے تو یہ بہتر ہے۔

زمین عاریت پر دینا

{۲۸۴۷} وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيَمْنَحْهَا أَخَاهُ فَإِنْ أَبىٰ فَلْيُمْسِكْ أَرْضَهُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۱/۳۱۵، کتاب الحرث والمزارعة، باب ماکان اصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم یواسی بعضهم بعضافی المزارعة، حدیث نمبر: ۲۳۸۲، مسلم شریف: ۲/۱۱، کتاب البیوع، باب کراء الارض، حدیث نمبر: ۱۵۳۶۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس کے پاس زمین ہو تو وہ اس میں (خود) کاشت کرے یا اپنے بھائی کو عطا کر دے اور اگر اس سے انکار کرے تو اپنی زمین کو رکھ لے۔ (یہ بطور تنبیہ فرمایا)۔

تشریح: شیخ مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی کے پیش نظر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے مال سے نفع حاصل کرے، لہٰذا جس شخص کے پاس زمین ہو، اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کھیتی باڑی کرے تا کہ اس سے پیداوار ہو اور اس کی وجہ سے اسے نفع ہو، اور اگر کسی وجہ سے وہ خود کاشت نہ کر سکتا

ہوتو پھر وہ اس زمین کو اپنے کسی مستحق مسلمان بھائی کو عاریۃً دیدے، تاکہ وہ اس میں محنت مشقت کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالے، اس صورت میں انسانی اخلاق وہمدردی کا ایک تقاضہ بھی پورا ہوگا اور اسے ثواب بھی ملے گا،لیکن اگر وہ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت پسند نہ کرے تو پھر اپنی زمین کو اپنے پاس رہنے دے، یہ آخری حکم گویا ان دونوں صورتوں کو ترک کرنے اور مزارعت کو اختیار کرنے پر از راہِ تنبیہ دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص نہ تو اپنی زمین سے مالی فائدہ حاصل کرے کہ اس پر خود کاشت کرے اور نہ کسی مسلمان بھائی کو عاریۃً دے کر اس سے روحانی نفع حاصل کرے تو پھر بہتر یہی ہے کہ وہ اس زمین کو یوں ہی چھوڑ دے کسی کو بطور مزارعت نہ دے، نیز اس میں ایسے لوگوں کے لئے بھی تنبیہ ہے جو اپنے مال سے نہ تو خود ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ دوسرے کو نفع پہنچاتے ہیں۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ”تو پھر چاہئے کہ اپنی زمین اپنے پاس رکھے“ کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص اس کی زمین عاریۃً قبول کرنے سے انکار کرے تو اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے، اس صورت میں یہ حکم اباحت کے طور پر ہوگا۔

اگر زراعت جہاد سے مانع ہوتو؟

{۲۸۴۸} وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ وَرَأَی سِكَّةً وَشَيْئًا وَمِنْ اٰلَةِ الْحَرْثِ فَقَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: لَا يَدْخُلُ هٰذَا بَيْتَ قَوْمٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ الذُّلَّ۔ (رواه البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/ ۳۱۲، کتاب الحرث والمزارعة، باب مایحذر من العواقب الاشتغال بالزراعت، حدیث نمبر: ۲۲۶۳،

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس حالت میں کہ انہوں نے ہل اور کاشتکاری کے آلات دیکھے تو فرمایا: کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: یہ چیز کسی قوم کے گھر میں داخل نہیں ہوتیں، مگر اللہ تعالیٰ اس میں ذلت داخل کردیتا ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

نزدیک زراعت کا پیشہ ناپسند یا معیوب تھا، یا اس سے آنحضرت ﷺ کا مقصد کھیتی باڑی کرنے والوں کی مذمت کرنا تھا، بلکہ درحقیقت اس ارشاد گرامی کا منشاء جہاد کی ترغیب دینا ہے، اور یہ آگاہ کرنا ہے کہ زراعت میں مشغول ہوکر جہاد کو ترک نہ کردیا جائے، اگر کوئی شخص اپنی معاشی ضروریات کی جائز وحلال تکمیل کے لئے زراعت کے پیشہ کو اختیار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی غیر پسندیدہ بات نہیں ہے اور نہ ایسا شخص اس وعید میں داخل ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس وعید کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو دشمنانِ دین کے قریب یا ان کے ملک کی سرحدوں سے متصل اقامت پذیر ہوں کہ اگر ایسے لوگ اپنی تمام تر زراعت کی طرف مبذول کر کے جہاد کی ضرورت واہمیت کو فراموش کردیں گے، تو دشمن ان پر غالب آجائیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے دشمن کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوجائیں گے۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ کھیتی کرنا ذلت ہے، علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ اصول المکاسب تین ہیں۔ زراعت، تجارت، صناعت، اور پھر ان کے اندر اولویت کے اعتبار سے اختلاف ہے۔ بعض نے زراعت کو اور بعض نے تجارت کو اولیٰ وافضل قرار دیا ہے، اب جن لوگوں کے نزدیک زراعت اولیٰ ہے ان کے یہ حدیث خلاف ہے۔ اب ان کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یہاں ذلت نفس زراعت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ خراج تاوان وغیرہ کے اعتبار سے ذلت کہہ دیا۔ یا اس اعتبار سے کہ اس میں مشغولی جہاد، طلب علم، اشاعت دین وغیرہ دینی تقاضوں سے غفلت کا ذریعہ بن جاتی ہے، جو باعث ذلت ہے۔

الفصل الثانی

غصب کردہ زمین پر کاشت کرنا

{٢٨۴٩} وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى

اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ زَرَعَ فِيْ اَرْضِ قَوْمٍ بِغَيْرِ اِذْنِهِمْ فَلَيْسَ لَهٗ مِنَ الزَّرْعِ شَيْءٌ وَلَهٗ نَفْقَتُهٗ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

حواله: ترمذی شریف: ۱/۲۵۷، ابواب الاحکام، باب المزارعة، حدیث نمبر:۱۳۶۶، ابوداؤدشریف:۲/۴۸۳، کتاب البیوع، باب من زرع الارض بغیر اذن صاحبها، حدیث نمبر:۳۴۰۳۔

ترجمه: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس شخص نے کسی قوم کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کاشت کی تو اس کاشت کرنے والے کے لئے (پیداوار میں سے) کچھ نہیں اور اس کو اپنا خرچہ کیا ہوا ملے گا، (اور تمام پیداوار مالک زمین کی ہوگی) (ترمذی، ابوداؤد) اور ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: یعنی جو شخص دوسرے کی زمین میں بغیر اس کی اجازت کے کھیتی کرے تو زارع کے لئے اس کھیتی میں سے کچھ نہیں ہے، یعنی ساری کھیتی صاحب ارض کی ہوگی۔ "وله نفقة" اور اس کھیتی کرنے والے کے لئے جو کچھ اس کا خرچہ اور محنت ہوئی ہے اس کے لئے وہ ہوگا۔

یہ حدیث مسلک جمہور کے خلاف ہے، اس لئے کہ اس حدیث شریف سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایسی صورت میں کھیتی مالک ارض کے لئے ہوگی اور مزارع کے لئے مطلقاً کچھ نہ ہوگا، حالانکہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ "الزرع لصاحب البذر مطلقاً وللاٰخر کراء الارض او اجر الخدمة" یعنی اس صورت میں کھیتی اس شخص کے لئے ہوگی جس کا بیج ہوگا، خواہ وہ مالک ارض ہو یا کاشتکار، اور دوسرے کے لئے اگر وہ مالک ارض ہے تو کراء الارض ہوگا اور اگر کاشتکار ہے تو اس کے لئے محنت مزدوری کی اجرت ہوگی، لیکن ظاہر یہ ہے کہ جب بغیر مالک کی اجازت کے کھیتی کر رہا ہے تو بیج وہ کاشتکار اپنے ہی پاس سے ڈالے گا اور ایسی صورت میں فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ کھیتی کاشتکار کے لئے ہوگی، حالانکہ اس حدیث شریف میں یہ ہے کہ مالک ارض کے لئے ہوگی، اس کا محدثانہ جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث عند المحدثین غیر ثابت ہے۔ کما قال الخطابی۔ اور یا پھر یہ تاویل کی جائے کہ حدیث شریف میں جو یہ حکم مذکور ہے اس صورت میں ہے جب بیج بھی مالک ارض کا ہو یعنی حدیث عام نہیں بلکہ ایک خاص صورت پر محمول ہے۔

الفصل الثالث

عقد مزارعت مباح ہے

{۲۸۵۰} **وَعَنْ** قَيْسِ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ مَا بِالْمَدِيْنَةِ أَهْلُ بَيْتِ هِجْرَةٍ إِلَّا يَزْرَعُوْنَ عَلَى الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَزَارَعَ عَلِيٌّ وَسَعْدُ بْنُ مَالِكٍ وَعَبْدُاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَعُمَرُبْنُ عَبْدِالْعَزِيْزِ وَالْقَاسِمُ وَعُرْوَةُ وَاٰلُ أَبِيْ بَكْرٍ وَاٰلُ عُمَرَ وَاٰلُ عَلِيٍّ وَابْنُ سِيْرِيْنَ وَقَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنِ الْأَسْوَدِ كُنْتُ أُشَارِكُ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنِ يَزِيْدَ فِي الزَّرْعِ وَعَامَلَ عُمَرُ النَّاسَ عَلٰى إِنْ جَاءَ عُمَرُ بِالْبَذْرِ مِنْ عِنْدِهٖ فَلَهُ الشَّطْرُ وَإِنْ جَاءُوْا بِالْبَذْرِ فَلَهُمْ كَذَا۔

(رواه البخاری)

حواله: بخاری شریف: ۳۱۳/۱، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ،

حدیث نمبر: ھذا تعلیق لامقعد لہ۔

ترجمه: حضرت قیس بن مسلمہ بروایت ابی جعفر نقل کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا: مدینہ طیبہ میں کوئی مہاجر کا مکان ایسا نہیں تھا، مگر وہ (اہل مکان) ایک تہائی اور ایک چوتھائی پر زراعت کرتے تھے۔ حضرتِ علی، حضرت سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرتِ قاسم وحضرت عروہ، حضرت اولادِ ابی بکر صدیق، آلِ عمر، آلِ علی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم (ان سب حضرات) نے زراعت کی ہے، اور حضرت عبدالرحمن بن اسود فرماتے ہیں کہ میں عبدالرحمن بن یزید رضی اللہ عنہ کو زراعت میں شریک کرتا تھا، اور حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے ساتھ باہم اس طرح معاملہ کیا کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ تو اپنے پاس سے بیج دیں گے اور کاشت کرنے والا نصف حصہ پیداوار کا حق دار ہوگا، اور اگر کاشتکار اپنا بیج دیں تو پھر ان کا اتنا حصہ ہوگا، مثلاً ایک تہائی، یا ایک چوتھائی۔

تشریح: اس روایت میں تقریباً حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور کبارِ تابعین کا عمل مزارعت پر اتفاق ہونا معلوم ہوا، اگر یہ کہا جائے کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے تو بھی درست ہوگا اور اس میں بعض شرائط کا بھی تذکرہ ہے۔

فائدہ: میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ خود بخاری شریف کی عبارت اور اس کی شرحوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت لفظ ''والربع'' پر ختم ہوگئی ہے، اس کے آگے وزارع سے آخر تک ساری عبارت خود بخاری شریف کی ہے، اور یہ سب آثار (یعنی صحابی یا تابعی کے اقوال) ہیں۔ جن کو بخاری شریف نے چونکہ بغیر اسناد کے نقل کیا ہے اس لئے متعلق ہیں، چنانچہ مؤلف مشکوۃ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ روایت کے آخر میں ''رواہ بخاری تعلیقاً'' [اس روایت کو بخاری نے بطریق تعلیق نقل کیا ہے]

017 Babul Ijarah

باب الاجارۃ

رقم الحدیث: ٢٨۵١ / تا ٢٨٦٠ /

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الاجارۃ

(اجارہ کا بیان)

کسب معاش کی ایک تدبیر بصورتِ اجارہ بھی ہے، ہر شخص تجارت نہیں کرسکتا، اور نہ ہر شخص زراعت و باغبانی کرسکتا ہے، اور اسباب معاش میں ضروری ہے کہ مختلف ضروریات کے لئے انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے والے اور انجام دینے والے بھی ہوں، باہم تعاون بھی ضروری ہے، اور ہر شخص دوسرے کی ضرورت اور اعانت کرے، تمدن ان تمام امور کا متقاضی ہے، بہر حال شریعت نے اجارہ کو بھی مباح قرار دیا ہے اور اس کی اصلاح کرتے ہوئے برائے اجارہ احکام ومسائل اور ہدایات کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

"اجارۃ" لغت میں اجرت کے معنی میں مستعمل ہے۔ چنانچہ "مغرب" میں ہے: "**الاجارۃ اسم للاجرۃ وھی کراء الاجیر**" (المغرب فی ترتیب المعرب:۱/۲۸)

اور اصطلاح شریعت میں "**تملیک المنافع بعوض**" کو اجارہ کہتے ہیں، یعنی اپنی کسی چیز کی منفعت کا کسی عوض کے بدلے دوسرے کو مالک بنانا۔ (طیبی:۶/۱۵۶)

بخلاف بیع اور عاریت کے، کیونکہ بیع میں عین کی تملیک ہوتی ہے اور عاریت میں تملیک تو منافع کی ہوتی ہے، لیکن بغیر کسی عوض کے۔

"اجارۃ" کا جواز کتاب وسنت، اجماع وقیاس چاروں سے ثابت ہے، چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

"فَإِنۡ أَرۡضَعۡنَ لَكُمۡ فَأٰتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ" (الطلاق:۶)

[پھر اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت ادا کرو۔]

وقال تعالیٰ: "یَا اَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ۔ قَالَ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هَاتَیْنِ عَلٰی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمَانِیَ حِجَجٍ"

[ابا جان! آپ اجرت پر ان کو کوئی کام دے دیجئے، آپ کسی سے اجرت پر کام لیں، تو اس کے لئے بہترین شخص وہ ہے جو طاقتور بھی ہو، امانت دار بھی، ان کے باپ نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دولڑکیوں میں سے ایک سے تمہارا نکاح کردوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال تک اجرت پر میرے پاس کام کرو۔]

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام علیہ السلام کے اس قصہ کے متعلق فرمایا: **"ان موسی علیه السلام اجر نفسه ثمانی حجج او عشرا علی عفة فرجه و طعام بطنه"** کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عفت اور شکم سیری کے واسطے اپنے آپ کو آٹھ یا دس سال ملازم رکھا۔

نیز سنت نبویہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قبیلہ بنی دیل کے ایک بہت ماہر رہنما کو اجرت پر لیا۔

اور صحیح مسلم میں روایت بھی ہے جو اس باب کے فصل اول کی پہلی روایت ہے: "اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الْمُزَارَعَةِ وَاَمَرَ بِالْمُوَاجَرَةِ" (مسلم شریف:۱۱۹)

[حضرت رسول پاک ﷺ نے بٹائی سے منع فرمایا اور اجرت پر کام کرانے کا حکم فرمایا۔]

اس کے علاوہ تمام اعصار اور تمام امصار کے علماء کا اجارہ کے جواز پر اجماع اور عمل متواتر ہے۔

عقل و قیاس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ "اجارہ" جائز ہونا چاہئے، کیونکہ جیسے لوگوں کو اعیان کی ضرورت ہے، ایسے ہی منافع کی بھی ضرورت ہے، لہٰذا جس طرح اعیان کا عقد جائز ہے اسی طرح منافع کا عقد بھی جائز ہوگا، بلکہ منافع کی طرح ضرورت زیادہ ہے کیونکہ ہر آدمی کے پاس مملوک گھر نہیں ہوتا اور نہ ہر ایک کے پاس اپنی سواری کے لئے کوئی اونٹ وغیرہ وہتا ہے اور نہ اصحاب مال پر یہ لازم ہے کہ عاریۃً ان کو کوئی چیز دیں بلکہ اگر دیں گے تو تطوع ہوگا، لہٰذا اجارہ ایک لابدی چیز ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ اپنے بندوں کے لئے رزق کا ایک راستہ کھولا ہے۔ (اعلاء السنن:۱۵۱/۱۶)

اور جیسا کہ بیع میں معقود علیہ "عین" ہوتا ہے، اسی طرح اجارہ میں معقود علیہ "منافع" ہوتے ہیں۔

اور اجارہ کے لوازمات میں سے یہ ہے کہ اگر اجارہ کسی مدت کے لئے ہو تو وہ مدت متعین کی جائے، مثلاً مہینہ، سال وغیرہ۔ قرآن کریم کی آیت "عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدت اجارہ متعین ہونی چاہئے۔ (نفحات التنقیح: ۴۹۲/ ۳)

ضروری وضاحت: بظاہر از روئے قیاس اس کا متقاضی ہے کہ عقد اجارہ درست نہ ہو، اس لئے کہ جس منفعت (کی شرط) پر عقد اجارہ ہوتا ہے وہ منفعت اس وقت معدوم ہوتی ہے اور معدوم شی پر عقد کیسے ہو؟ لیکن شریعت نے اس قیاس کی تقریر کا اعتبار نہ کرتے ہوئے انسانی ضرورت کے پیش نظر مباح قرار دیا ہے اور اگرچہ منفعت فی الحال معدوم ہے، لیکن شرائط کے ساتھ وہ اس انداز پر مقرر ہوتی ہے گویا کہ معلوم ہے۔ فافهم۔

الفصل الاوّل

اجارہ جائز ہے

{۲۸۵۱} وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ زَعَمَ ثَابِتُ بْنُ الضَّحَّاكِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الْمُزَارَعَةِ وَاَمَرَ بِالْمُوَاجَرَةِ وَقَالَ لَا بَأْسَ بِهَا۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۱۴/ ۲، کتاب البیوع، باب کراء الارض، حدیث نمبر: ۱۵۴۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (خیال کیا) کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت (یعنی بٹائی پر زمین دینے) سے منع فرمایا اور باہم اجرت پر معاملہ کرنے کی اجازت (اباحت) فرمائی اور ارشاد فرمایا: اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

تشریح: گذشتہ باب کے تحت تفصیل معلوم ہو چکی ہے کہ بعض صورتیں مزارعت کی شرعاً

درست نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہی کے تحت ہیں، اور جن شرائط اور ہدایات کے ساتھ شرعاً مباح ہے وہ اس نہی سے خارج ہوگی، لہٰذا "المزارعة" پر الف لام برائے عہد ہے۔ یعنی "ما علم عدم جوازہ" (تعلیق)

اور عقد اجارہ کی آنحضرت ﷺ نے اجازت ارشاد فرمائی ہے۔

پچھنہ لگانے کی اجرت کا جواز

{۲۸۵۲} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَمَ فَاَعْطَى الْحَجَّامَ اَجْرَهٗ وَاسْتَعَطَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۸۴۹/ ۲، کتاب الطب، باب السعوط، حدیث نمبر: ۵۴۷۳۱، مسلم شریف: ۲۲/ ۲، کتاب المساقاة، باب حل اجرة الحجامة، حدیث نمبر: ۱۲۰۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے سینگی لگوائی اور سینگی لگانے والے کو اجرت عنایت کی اور آنحضرت ﷺ نے ناک میں دوا ڈلوائی۔

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جب حجام کو اجرت عنایت فرمائی ہے تو معلوم ہوا کہ اجرت پر کام کرنا اور کرانا مباح ہے۔

نیز اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ سینگی کھینچنے کا پیشہ اور اجارہ مباح ہے اور اس سے علاج کرنا جائز ہے۔

ہر نبی نے بکری چرائی ہیں

{۲۸۵۳} **وَعَنْ** اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيًّا اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ فَقَالَ اَصْحَابُهٗ

وَاَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ! كُنْتُ اَرْعٰى عَلٰى قَرَارِيْطَ لِاَهْلِ مَكَّةَ۔ (رواه البخاری)

حوالہ: بخاری شریف:۱/۳۰۱، کتاب الاجارات، باب رعی الغنم علی قراریط، حدیث نمبر:۲۲۰۷،

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا: مگر بکریوں کو (ضرور) چرایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اور آپ نے بھی؟ ارشاد فرمایا: ہاں! میں بھی اہل مکہ کی بکریاں قیراطوں کے عوض چراتا تھا۔

تشریح: منصب نبوت اور رسالت خداوندی تعالیٰ کی طرف سے ایک موہوبی چیز ہے، کسبی نہیں، اگر بالفرض رسالت کا مدار کسب واکتساب پر ہوتا تو رسولوں کی بعثت کا مدار عبادت کی سرگرمی پر ہوتا کہ جتنی عبادت زیادہ ہوتی اسی کثرت سے رسولوں کی تشریف آوری بھی ہوتی، اسی طرح جانب سلب میں رسولوں کی فترت کا مدار عبادت کی سردمہری پر ہوتا کہ جتنی عبادت کم ہوتی اور گمراہی زیادہ ہوتی تو عدم اکتساب کی وجہ سے رسول بھی کم تشریف لاتے، حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے کہ جتنی عبادت زیادہ ہوئی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی اور ضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہوتا گیا، پھر جب خدا کا کوئی رسول آیا تو اس کی زیر قیادت عبادت کر کے ایک بھی رسول نہیں بنا، اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا، یا تعلق تو تھا لیکن نسخ کا تعلق تھا، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی ریاضت وعبادت سے نہیں بنتے، بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں، چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

"اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ" (الحج:۷۵)

[اللہ فرشتوں میں سے بھی اپنا پیغام پہنچانے والے منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔]

یعنی رسولوں کا انتخاب خداوند قدوس کرتے ہیں، از خود کوئی رسول یا نبی نہیں بن سکتا، بلکہ رسول لوگوں کے پاس اس طرح آتا ہے جیسا کہ حکومت کی طرف سے کوئی حاکم مقرر ہو کر آتا ہے۔

"يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ" (الاعراف:۳۵)

[اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے کچھ پیغمبر آئیں جو تمہیں میری آیتیں پڑھ کر سنائیں۔]

بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی جاسکتی ہیں، مگر حکومت کا کوئی عہدہ حکومت کے انتخاب کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

لیکن چونکہ رسالت ایک قسم کی سفارت ہے اور ہر سفیر کے لئے قابل ہونا ضروری ہے اور لیاقت واستعداد کے بعد یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ نظر حکومت اگر اسے انتخاب کرنا چاہے تو کرلے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہر قابل کو سفیر منتخب کیا جائے، اسی طرح رسالت ونبوت ایک وہبی منصب ہے، کسبی نہیں اور نہ ہی نبوت ورسالت ارتقائی کمالات میں سے کوئی ممکن الحصول کمال ہے اور حدیث شریف میں جو فرمایا:

"لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ" (ترمذی شریف:۶۱۹/۵)

[میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔]

اس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت میں اگر بلحاظ کمال دیکھا جائے تو عمر رضی اللہ عنہ میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے، مگر چونکہ منصب نبوت پر تقرری کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی، اس لئے نبی وہ نہیں ہیں۔

رسول ونبی خدا تعالیٰ کے فرستادہ اور پیغامبر ہوتے ہیں، اسی کی جانب سے وہ اصلاح کے لئے کھڑے کئے جاتے ہیں اور یہ مرتبہ کسب سے اگرچہ کسی کو حاصل نہیں ہوتا، لیکن وہبی طور پر بھی ہر کس وناکس کو یہ منصب سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ باکمال شخصیات کو اس پر فائز کیا جاتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (الانعام:۱۲۴)

[اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرے۔]

اور ان کی تربیت صفت اصطفاء اور اجتباء کے ماتحت ہوتی ہے، ان کی ہر نشست وبرخاست، ہر فعل وقول کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفت عصمت حاصل ہوتی ہے۔ (ترجمان السنۃ:۴۶۰/۱)

منصب نبوت کے فریضہ کی ادائیگی کی وجہ سے نبی کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو، کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں، احساس کی بھی ضرورت ہے، جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کرسکتا، جو بھوک سے آزاد ہو وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا اور جو

فطرت انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کرسکتا اور پھر مزید اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہونے کے لئے معاشرہ سے قریبی ربط اور تعلق رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے، تاکہ اصلاح اور تبلیغ کے کسی بھی موڑ پر پورے معاشرہ کے افراد اور نبی کے درمیان اجنبیت اور غیریت کی دیوار حائل نہ ہو، اس لئے نبی کو ابتداء میں ایسے آزمائشی دور سے گذارا جاتا ہے کہ جس کے بعض مرحلے تو بظاہر تو بہت نچلی سطح کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن نتائج واثرات کے اعتبار سے وہی مرحلے بہت ہی دوررس اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

علامہ مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسا ہی ایک مرحلہ بکریوں کے چرانے کا ہے، بظاہر اگرچہ بہت معمولی درجہ کی چیز معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی بکریوں کا چرانا محبت وشفقت، محنت ومشقت، باہمی ربط وتعلق اور عام خیرخواہی ونگہداشت کا ایک بہترین سبق ہے، جو کسی رہبر ومصلح کی حیات کا بنیادی وصف ہے۔

چنانچہ ہر نبی بکریوں کے چرانے اور ان کے اختلاط سے حلم وشفقت کا درس لیتا تھا، کیونکہ جب وہ حضرات بکریوں کو چرانے کی مشقت پر صبر کرتے اور ان سے مضر چیزوں کا دفاع کرتے اور ان کے اختلاف طبائع سے واقف ہوجاتے تھے اور باوجود انتشار کے ان کو کسی چراگاہ اور مشرب پر جمع کرتے تھے، اس سے ان کو بکریوں کے ضعف اور ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف منتقل کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی تھی، اور ساتھ ہی مختلف قسم کے لوگوں کے اختلاط سے ان کی عقول کا اندازہ بھی لگاتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی طرف سے مشقت برداشت کرنا اور ان کو دعوت دینا آسان ہوجاتا تھا، اور اس کی مشقت کو برداشت کرنے کی بدولت وہ اپنی امت کی دعوت سے اکتاتے تھے، جیسا کہ بادشاہ کا حال رعیت کے ساتھ ہوتا ہے، ایسے ہی نبی کا حال امتی کے ساتھ ہوتا ہے اور چرواہے کا حال بکریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (طیبی: ۶/۱۵۷، نفحات التنقیح: ۳/۴۹۳)

کنت ارعی علی قراریط الخ: ابراہیم حربی ابن ناصر کا اتباع کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے، ابن الجوزی نے اس حدیث کی تصویب کی ہے، لیکن جمہور کے نزدیک یہ قیراط کی جمع ہے، کیونکہ اہل عرب خود نہیں جانتے کہ قراریط عرب کے اندر کوئی جگہ ہے یا نہیں۔

اجرت نہ دیئے جانے پر وعید

{۲۸۵۴} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ثَلَاثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰى بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اِسْتَاجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۰۲، کتاب الاجارات، باب اثم من منع اجر الاجیر، حدیث نمبر: ۲۲۱۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: تین شخص ہیں بروزِ قیامت میں ان سے جھگڑوں گا: (۱) وہ شخص جس نے میرا واسطہ دیا اور پھر عہد شکنی کی۔ (۲) اور جس آدمی نے کسی آزاد کو فروخت کیا اور اس کی قیمت (وصول کی اور) کھائی۔ (۳) اور وہ شخص جس نے کسی مزدور کو اجرت پر لیا اور اس سے کام پورا لیا اور اس کی اجرت اس کو نہ دی۔

تشریح: اس حدیث شریف میں ایسے تین اشخاص کی نشان دہی کی گئی ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا خاص طور سے نشانہ ہوں گے، ان میں سے پہلا شخص تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام پر یعنی اس کی قسم کھا کر کوئی عہد و معاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کو توڑ ڈالتا ہے، یوں تو عہد و معاہدہ کی پاسداری بہرصورت ایک ضروری چیز ہے، کیونکہ انسان کی شرافت و انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ جو عہد و معاہدہ کی پاسداری بہرصورت ایک ضروری چیز ہے، کیونکہ انسان کی شرافت و انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ جو عہد و معاہدہ کرے اسے پورا کرے، کسی معاہدہ کو بلا عذر ختم کر دینا انسانی شرافت کے خلاف بھی ہے، اور انسانیت کی توہین بھی، لیکن اگر کوئی عہد و معاہدہ اللہ تعالیٰ کے نام پر کیا جاتا ہے تو پھر اس کی تکمیل کہیں زیادہ ضروری ہو جاتی ہے، اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے نام پر کئے ہوئے عہد و معاہدہ کو توڑتا ہے وہ بجا طور پر غضب خداوندی کا مستحق ہے۔

دوسرا شخص وہ ہے جو کسی آزاد انسان کو بیچ ڈالے، شرفِ انسانی کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہو

سکتی ہے کہ ایک انسان اپنے ہی جیسے ایک دوسرے آزاد انسان کو ایک بازاری مال بنادے اور اس کی خرید وفروخت کرے، چنانچہ ایسے شخص کو بھی قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

اس بارے میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں ''اس کی قیمت کھانے'' کی قید محض زیادتی تنبیہ کے لئے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آزاد انسان کو فروخت کرنا ہی ایک بڑے گناہ کی بات ہے، خواہ اس کی قیمت کھائے یا نہ کھائے، اگر اس کی قیمت نہیں کھائے گا تب بھی گنہگار ہوگا اور اس وعید میں داخل ہوگا۔

تیسرا وہ شخص ہے جو کسی مزدور کو اپنے کسی کام کی تکمیل کے لئے مزدوری پر لگائے اور اپنا وہ کام پورا کرانے کے بعد اس کی مزدوری نہ دے، یہ ایک انتہائی قابل نفرین فعل ہے، کسی شخص کی محنت اس کی زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ ہوتا ہے، جسے حاصل کر کے اس کی اجرت نہ دینا شیوۂ انسانیت کے خلاف ہے، یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ کوئی غریب اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر کے کسی کے یہاں محنت کرے مگر اس کی محنت کی اجرت اسے نہ دی جائے، چنانچہ ایسے شخص کے بارے میں بھی کہ جو مزدور کی مزدوری نہ دے اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی دی ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن اپنے اس انسانی ظلم کی ضرور سزا پائے گا۔ (مظاہر حق: ٣/۵٧٣)

جائز رقیہ پر اجرت لینا

{٢٨۵۵} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا اَنَّ نَفَرًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرُّوْا بِمَاءٍ فِيْهِمْ لَدِيْغٌ اَوْ سَلِيْمٌ فَعَرَضَ لَهُمْ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْمَاءِ فَقَالَ هَلْ فِيْكُمْ مِنْ رَّاقٍ اِنَّ فِي الْمَاءِ رَجُلًا لَدِيْغًا اَوْ سَلِيْمًا فَانْطَلَقَ رَجُلٌ مِّنْهُمْ فَقَرَاَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلىٰ شَاءٍ فَبَرَاَ فَجَاءَ بِالشَّاءِ اِلىٰ اَصْحَابِهٖ فَكَرِهُوْا ذٰلِكَ وَقَالُوْا اَخَذْتَ عَلىٰ كِتَابِ اللهِ اَجْرًا حَتّٰى قَدِمُوْا الْمَدِيْنَةَ فَقَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ! اَخَذَ عَلىٰ كِتَابِ اللهِ اَجْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللهِ۔ (رواہ البخاری)

وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَصَبْتُمْ اَقْسِمُوْا اَوْ اَضْرِبُوْا لِیْ مَعَکُمْ سَھْمًا۔

حوالہ: بخاری شریف: ۸۵۴/۲، کتاب الطب، باب الشروط فی الرقیۃ بقطع الغنم، حدیث نمبر: ۵۵۱۳،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک جماعت (ایک قبیلہ) کے پاس سے گذر ہوا (جو کہ) پانی (کے پاس نازل شدہ تھا یا ان کی بستی نہر وغیرہ کے قریب آباد تھی) ان لوگوں میں ایک شخص بچھو یا سانپ کا ڈسا ہوا تھا، اس بستی والوں میں سے ایک شخص حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس حاضر ہوا اور سوال کیا: کہ تم لوگوں میں کوئی شخص جھاڑنے والا ہے؟ یہاں بستی میں ایک شخص بچھو یا سانپ کا ڈسا ہوا ہے (اس میں راوی کو شک ہوا ہے) چنانچہ ان حضرات میں سے ایک صاحب (یعنی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ) گئے اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا، اس شرط پر کہ وہ چند بکریاں دیں، وہ آدمی تندرست ہوگیا، پس یہ صحابی رضی اللہ عنہ ان بکریوں کو لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا، اور انہوں نے یہ بات کہی کہ تم نے کتاب اللہ پر اجرت لی ہے، یہاں تک کہ وہ حضرات مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی کتاب پر اجرت لی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک جس چیز پر تم اجرت لو (ان میں) لائق ترین (چیز) کتاب اللہ ہے۔ (بخاری) اور ایک روایت میں ہے درست کیا تم نے (اور اس کو) تقسیم کرو، اور تم لوگ اپنے ساتھ میرا بھی حصہ تقسیم کرنا۔

تشریح: ان نفرا الخ: یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تیئیس نفر تھے۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مراد "ماءٔ" سے "اھل الماءٔ" ہیں، یعنی وہ قبیلہ جس کا پڑاؤ پانی کے ساتھ تھا اور "فیھم" کی ضمیر بھی اسی مضاف محذوف یعنی "اھل" کی طرف راجع ہے۔

الدیغ: فعیل کے وزن پر ہے، بمعنی "ملدوغ" اس کا اطلاق اکثر اس شخص پر ہوتا ہے جس کو بچھو کاٹ لے اور "سلیم" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جس کو سانپ ڈس لے اور سانپ کو "سلیم" بھی تفاولاً کہا جاتا ہے۔

یہ شخص لدیغ تھا، یہ ان اہل ماء کا سردار تھا۔

017 Babul Ijarah

فانطلق رجل: یہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تھے۔

فقرأ بفاتحة: یہ سورہ انہوں نے سات مرتبہ پڑھی تھی۔

علماء نے اس حدیث شریف سے قرآن کریم کی آیات اور ذکر اللہ کے ذریعہ دم کرنے کے جواز کا استنباط کیا ہے۔

چنانچہ دم کے جواز پر حضرت یزید بن ابی عبید رضی اللہ عنہ کی روایت بھی دلیل ہے:

"**رأیت اثر ضربة فی ساق سلمة بن الاکوع فقلت یا ابا مسلم ما هذه الضربة؟ قال ضربة اصابتنی یوم خیبر فقال الناس اصیب سلمة فاتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنفث فیہ ثلث نفثات فما اشتکیتها حتی الساعة**" (مشکوۃ شریف: ۲/۵۳۳)

اس روایت میں حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کے زخم کا ذکر ہے کہ وہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے زخم پر تین مرتبہ دم فرمایا تو زخم درست ہوگیا۔

اسی طرح دوسری روایت میں ارشاد ہے:

"**کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی الغداة جاء خدم المدینة بآنیتهم فیها الماء فما یأتون باناء الا غمس یده فیها فربما جائوا بالغداة الباردة فیغمس فیها**"

(مشکوۃ شریف: ۲/۵۱۹)

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی نماز سے فارغ ہوجاتے تو مدینہ منورہ کے خدام اپنے برتنوں کو لے کر آپہنچتے، جن میں پانی ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر برتن میں اپنا دست مبارک ڈال دیا کرتے تھے، بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سردی کی صبح ہوتی تھی پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دست مبارک ان میں ڈال دیتے تھے۔

نیز بخاری ومسلم ہی میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معوذتین پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کرتے تھے: "**عن عائشة رضی اللہ عنها ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اشتکی یقرأ علی نفسه بالمعوذات**"

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی آیات یا ادعیہ ماثورہ پڑھ کر بیچاروں پر دم کرنے اور اس سے شفاء حاصل ہونے

سے شفاء کا انکار کرنا سراسر جہالت وحماقت اور لاکھوں وکروڑوں انسانوں کے تجربات کو جھٹلانا ہے۔

اور تعویذ کا مسئلہ بھی اسی کے ضمن میں ثابت ہوتا ہے، چنانچہ روایات میں تصریح ہے کہ جو آدمی ان کلمات کو پڑھ نہ سکے تو وہ ان کلمات کو لکھ کر گلے میں ڈال لے۔

چنانچہ ابوداؤد جلد ثانی میں حضرت موسیٰ بن اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں دعائیہ کلمات کے بعد تصریح ہے: "**وکان عبداللہ بن عمرو یعلمھن من عقل من بنیہ و من لم یعقل کتبہ فأعلقہ علیہ**" (ابوداؤد شریف: ۲/۱۸۷)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان دعائیہ کلمات کو جو پڑھ سکتا تھا اس کو تو سکھا دیا کرتے تھے اور جو نہیں پڑھ سکتا تھا اس کے لئے لکھ کر اس کے گلے میں لٹکا دیا کرتے تھے۔

اور بذل المجہود میں اسی مقام پر حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "**فیہ دلیل علی جواز کتابۃ التعاویذ والرقی وتعالیقھا**" (بذل المجہود: ۱۶/۲۲۳)

دوسری بات اس حدیث شریف سے یہ ثابت ہوئی کہ دم کرکے اجرت لینا جائز ہے، اور تعویذ بھی اس کے حکم میں ہے، چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجرت میں بکریاں لینے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمائی، بلکہ مزید ان کی دلجوئی کے لئے ارشاد فرمایا: کہ میرے لئے بھی حصہ مقرر کرو۔

اسی طرح ابن ماجہ کی روایت میں ارشاد ہے: "**خیر الدواء القرآن**" (ابن ماجہ شریف: ۲/۱۵۸)

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث شریف کو زاد المعاد میں ذکر کرکے اس سے استدلال کیا ہے۔ (زاد المعاد: ۴/۱۷۶)

اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اجرت لینا ثابت ہے، اور ان ہی احادیث کی روشنی میں علماء وفقہاء کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ اس طرح دم کرنے یا تعویذ لکھنے پر معاوضہ لینا جائز ہے، جس طرح طبیبوں اور ڈاکٹروں کے لئے علاج کی فیس لینا جائز ہے۔ ہاں اگر بغیر معاوضہ فی سبیل اللہ بندگان خدا کی خدمت کی جائے تو وہ بلند درجہ کی بات ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام سے نیابت کی نسبت رکھنے والوں کا طریقہ یہی ہے۔ (نفحات التنقیح: ۳/۴۹۶، معارف الحدیث: ۷/۱۵۸)

ناجائز رقیہ

{۲۸۵۶} **وَعَنْ** خَارِجَةَ بْنِ الصَّلْتِ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ اَقْبَلْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَيْنَا عَلٰى حَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ فَقَالُوْا اِنَّا اُنْبِئْنَا اَنَّكُمْ قَدْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِ هٰذَا الرَّجُلِ بِخَيْرٍ فَهَلْ عِنْدَ كُمْ مِنْ دَوَاءٍ اَوْ رُقْيَةٍ فَاِنَّ عِنْدَنَا مَعْتُوْهًا فِي الْقُيُوْدِ فَقُلْنَا: نَعَمْ! فَجَاءُ وْا بِمَعْتُوْهٍ فِي الْقُيُوْدِ فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ غُدْوَةً وَعَشِيَّةً اَجْمَعُ بُزَاقِيْ ثُمَّ اَتْفُلُ قَالَ: فَكَاَنَّمَا اُنْشِطَ مِنْ عِقَالٍ فَاَعْطَوْنِيْ جُعْلًا فَقُلْتُ لَا حَتّٰى اَسْاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: كُلْ فَلَعَمْرِيْ لِمَنْ اَكَلَ بِرُقْيَةِ بَاطِلٍ لَقَدْ اَكَلْتَ بِرُقِيَةِ حَقٍّ۔ (رواه احمد وابوداؤد)

حوالہ: مسند احمد: ۲۰۱/ ۵، ابو داؤد: ۲/ ۵۴۲، کتاب الطب، باب فی الرقی، حدیث نمبر: ۳۴۲۰،

ترجمہ: حضرت خارجہ بن صلت بروایت عم خود نقل کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا: کہ ہم لوگ حضرت رسول اکرم ﷺ کے پاس سے اپنے شہر کو روانہ ہوئے، دورانِ سفر عرب کے ایک قبیلہ پر ہمارا گذر ہوا تو اس قبیلہ کے لوگوں نے کہا: کہ ہم لوگوں کو خبر ملی ہے کہ تم اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے پاس سے خیر (یعنی قرآنِ کریم کی تعلیم) لے کر آرہے ہو، کیا تم لوگوں کے پاس کوئی علاج یا کوئی جھاڑ ہے؟ چونکہ ہمارے یہاں ایک پاگل (اور دیوانہ) زنجیروں میں بندھا ہوا ہے، ہم لوگوں نے کہا: ہاں! چنانچہ وہ لوگ ایک پاگل شخص کو زنجیروں میں جکڑا ہوا لے کر آئے، پس میں نے اس پر سورۂ فاتحہ تین دن تک صبح اور شام (اس طرح) پڑھی (کہ) تھوک منہ میں (بوقت قراءت) جمع کرتا اور پھر اس پر تھتکارتا (ہوا دم کرتا)۔ راوی بیان کرتے ہیں: گویا کہ وہ رسی سے کھولا گیا

017 Babul Ijarah

(یعنی اس قدر جلد تندرست ہوگیا گویا کہ بندھی ہوئی رسی سے کھول دیا گیا) پھر ان لوگوں نے مجھ کو مزدوری دی، میں نے کہا: نہیں (لوں گا) یہاں تک کہ میں حضرت نبی کریم ﷺ سے سوال کرلوں، (چنانچہ میں نے حاضر خدمت ہوکر سوال کیا تو) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھاؤ! مجھ کو اپنی زندگی کی قسم! بعض وہ لوگ ہیں جو کہ باطل منتر (جھاڑ) کے ساتھ کھاتے ہیں (تو یقیناً وہ برا ہے) بالیقین تونے تو حق جھاڑ کے ساتھ کھایا (اور اجرت لی) ہے۔

تشریح: "فاعطوہ شیئا" یعنی ان لوگوں نے ان صحابی رضی اللہ عنہ کو ہدیۃً کچھ پیش کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو بکریاں تھیں، جیسا کہ ابوداؤد شریف میں یہ حدیث پاک کتاب الاطعمہ کے اخیر میں ہے، وہاں پر اس عدد کی تصریح ہے، وہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا، آنحضرت ﷺ نے ان کو قبول کرنے کی اجازت دیدی۔ اور فرمایا: "کل فلعمری لمن اکل برقیۃ باطل" (اس کی جزا محذوف ہے فعلیہ وبالہ) یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ تو اس کو کھا سکتا ہے اور قسم ہے میری جان کی جو شخص باطل رقیہ کے ذریعہ سے کھائے اس پر وبال ہے، تو تو یہ برحق رقیہ کے ذریعہ سے کھا رہا ہے، اس میں کیا حرج ہے۔

"باطل منتر" ایسی جھاڑ پھونک کو کہتے ہیں جس میں ستاروں اور ارواح خبیثہ، جنات اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر ہو، اور ان میں سے مدد مانگی جاتی ہو، چنانچہ ایسے عملیات جو غیر اللہ کے ذکر یا غیر اللہ سے مدد مانگنے کی وجہ سے غیر شرعی ہوں، جس طرح ان کو اختیار کرنا ناجائز ہے، اسی طرح ان کی اجرت کھانا بھی حرام ہے۔

"حق منتر" ایسی جھاڑ پھونک اور عملیات کو کہتے ہیں جن میں ذکر اللہ اور قرآن کریم کی آیتیں ہوں، خواہ ان کا تعلق پڑھ کر دم کرنے سے ہو یا تعویذ وغیرہ لکھ کر دینے سے ہو۔

حدیث شریف کے الفاظ "فلعمری" (یعنی قسم اپنی زندگی کی) سے یہ اشکال واقع ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری چیزوں کی قسم کھانا منع ہے، پھر آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی کی قسم کس طرح کھائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ "فلعمری" سے قسم مراد نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ اہل عرب

کے کلام کا ایک خاص لفظ ہے، جو اکثر و بیشتر دوران گفتگو ان کی زبان پر جاری ہوتا ہے، یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔

اجرت وقت پر دی جائے

{۲۸۵۷} **وَعَنْ** عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَجِفَّ عَرَقُهٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۲/۱۷۶، ابواب الرھون، باب اجر الاجرائ، حدیث نمبر: ۲۴۴۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مزدور کو اس کی اجرت اس کا پسینہ سوکھنے سے قبل دو۔

تشریح: ان یجف عرقہ: جب انسان محنت اور بھاری کام کرتا ہے تو بالضرور پسینہ بدن سے برآمد ہوتا ہے، مقصد بیان یہ ہے کہ کام سے فراغت پر فوراً بلا تاخیر مزدور کی اجرت دی جائے، اس ہدایت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑی حکمت ہے۔

ایضاً

{۲۸۵۸} **وَعَنِ** الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَاِنْ جَاءَ عَلٰی فَرَسٍ۔ (رواہ احمد وابوداؤد) وَفِی الْمَصَابِيْحِ مُرْسَلٌ۔

حوالہ: مسند احمد: ۱/۲۰۱، حدیث نمبر: ؟؟؟، ابوداؤد: ۱/۲۳۵، کتاب الزکوۃ، باب حق السائل، حدیث نمبر: ۱۶۶۵۔

ترجمہ: حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سائل کا حق ہے (کہ اس کو ضرور دیا جائے) اگرچہ وہ گھوڑے پر ہو۔

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد یہ تعلیم دینا ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرنا چاہئے، اگر چہ وہ گھوڑے پر چڑھ کر بھی مانگنے آئے، تو اس کا سوال پورا کیا جائے، چنانچہ قاضی نے کہا ہے کہ سائل کو خالی نہ پھیرو، اگر چہ ایسی حالت میں تمہارے پاس مانگنے آئے جو اس کے مستغنی ہونے پر دلالت کرے، کیونکہ تمہیں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر اسے سوال کرنے کی حاجت نہ ہوتی تو وہ اپنا دست سوال دراز کر کے تمہارے آگے اپنے آپ کو ذلیل وخوار کیوں کرتا۔

یہ حدیث شریف بظاہر اس باب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ سائل کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ گویا اس کے سوال کی اجرت ہے، لہٰذا اس مناسبت سے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا گیا ہے۔

اس حدیث شریف کی اسناد میں علماء نے نقل کیا ہے، چنانچہ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے اور کہا ہے کہ یہ بازار میں گشت کرتی ہے۔ امام ابو داؤد نے البتہ اس بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث قابل استدلال ہے، مصابیح میں اس حدیث شریف کو مرسل کہا گیا ہے، لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ مسند ہے، چنانچہ مصابیح کے بعض نسخوں میں لفظ مرسل مذکور بھی نہیں ہے۔ (مظاہر حق: ۳/۵۷۴)

الفصل الثالث

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اجرت پر کام کرنا

{۲۸۵۹} وَعَنْ عُتْبَةَ بْنِ النُّدَرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَأَ طٰسٓمٓ حَتّٰى بَلَغَ قِصَّةَ مُوْسٰى قَالَ: إِنَّ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ أَجَرَ نَفْسَهٗ ثَمَانَ سِنِيْنَ أَوْ عَشْرًا عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهٖ وَطَعَامِ بَطْنِهٖ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

حوالہ: مسند احمد: لم اجد فی مسند احمد، ابن ماجہ: ۱۷۶/۲، ابواب الرھون، باب اجارۃ الاجیر علی طعام بطنہ، حدیث نمبر: ۲۴۴۴۔

ترجمہ: حضرت عتبہ ابن ندر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طٰسٓمٓ کی تلاوت کی، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ تک پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بالیقین حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نفس کو آٹھ یا دس سال اجرت (یعنی نوکری) پر دیا، اپنی فرج کی محافظت اور اپنے پیٹ کے کھانے کی بناء پر۔

تشریح: طٰسٓمٓ: یعنی سورۂ قصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین پہنچے وہاں حضرت شعیب علیہ السلام سے ان کی ملاقات ہوئی، پھر ان کی صاحبزادی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نکاح ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے عوض میں اپنے آپ کو حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری میں دیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کی تلاوت کے وقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تذکرہ پر پہنچتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا کلام ارشاد فرمایا۔

''شرمگاہ بچانے'' سے مراد نکاح ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے اس معاہدہ پر نکاح کیا کہ میں آٹھ یا دس سال تک تمہاری بکریاں چراؤں گا، گویا اتنی مدت تک بکریاں چرانے کو انہوں نے اپنی بیوی کا مہر قرار دیا۔ چنانچہ ان کی شریعت میں یہ جائز تھا کہ آزاد شخص کی خدمت کو اس کی بیوی کا مہر قرار دیا جاسکتا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معاملہ میں یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا مہر تو کچھ اور مقرر کیا ہوگا اور بکریاں چرانے کی یہ خدمت بطریق احسان قبول کی ہوگی۔

خاوند کی خدمت بیوی کا مہر ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اس بارے میں علماء کا فقہی اختلاف ہے، چنانچہ حنفی علماء تو یہ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی عورت کا نکاح اس چیز کے عوض میں کیا جائے کہ اس کا آزاد خاوند مثلاً ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔ ہاں یہ جائز ہے کہ عورت کا نکاح اس چیز کے عوض میں کیا جائے کہ اس کے خاوند کا غلام مثلاً ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔ شافعی علماء کے نزدیک بعض کاموں کی مزدوری وخدمت کے عوض کا نکاح کرنا درست ہے، جبکہ متاجرلہ (وہ کام جو اجیر ومزدور انجام دے) اور مخدوم فیہ (وہ خدمت جو انجام دی جائے) معلوم ومتعین چیز ہو۔

کیا تعلیم القرآن پر اجرت مباح ہے؟

{۲۸۶۰} وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! رَجُلٌ اَهْدٰى اِلَيَّ قَوْسًا مِمَّنْ كُنْتُ اُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْقُرْآنَ وَلَيْسَتْ بِمَالٍ فَاَرْمِيْ عَلَيْهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ قَالَ اِنْ كُنْتَ تُحِبُّ اَنْ تُطَوَّقَ طَوْقًا مِنْ نَارٍ فَاقْبَلْهَا۔ (رواه ابوداؤد وابن ماجة)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۴۸۴، کتاب البیوع، باب کسب المعلم، حدیث نمبر: ۳۴۱۶، ابن ماجہ شریف: ۱/۱۵۶، ابواب التجارات، باب الاجر علی تعلیم القرآن، حدیث نمبر: ۲۱۵۷۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک شخص نے جن کو میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور قرآن کی تعلیم دیتا ہوں، مجھ کو ایک کمان ہدیہ دی ہے، اور کہا: مال (بھی) نہیں ہے، اور میں اس کمان سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں تیر اندازی کروں گا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم پسند کرتے ہو کہ آگ کا طوق بنا کر گلے میں ڈال دیا جائے تو پھر اس کو قبول کرلو۔

تشریح: حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے چند اہل صفہ کو قرآن کریم سکھلایا اور کتابت یعنی لکھنا، تو ان میں سے ایک شخص مجھ کو ایک کمان ہدیہ کرنے لگا تو میں نے اپنے دل میں کہا: کہ یہ کوئی ایسا مال تو ہے نہیں یعنی جس کو اجرت کہا جاسکے، دوسرے یہ کہ میں اس کو جہاد ہی میں استعمال کروں گا، (کسی اپنی ذاتی ضرورت میں نہیں) لیکن پھر بھی میں نے یہ ارادہ کیا کہ بغیر حضور اقدس ﷺ سے دریافت کئے نہیں لوں گا، چنانچہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گیا اور اس کمان کے بارے میں سوال کیا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان کنت تحب ان تطوق طوقا من نار فاقبلھا'' کہ اگر تو اس کی وجہ سے آگ کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا پسند کرتا ہو تو یہ ہدیہ قبول کرلے۔

اس حدیث شریف کے ذیل میں امام خطابی نے اخذ الاجرۃ علی تعلیم القرآن میں علماء کے تین مذہب لکھے ہیں، ایک مطلقاً عدم جواز کا۔ وقال الیہ ذھب الزھری وابو حنیفۃ واسحاق بن راھویہ۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ اگر بغیر شرط کے کوئی معاوضہ دے تو اس کے قبول میں کچھ حرج نہیں۔ ''وھو قول الحسن البصری وابن سیرین والشعبی۔''

اور تیسرا مذہب مطلقاً جواز کا۔ وھو مذھب عطاء ومالک والشافعی۔ اور شافعیہ کی دلیل ''زوجتکھا بما معک من القرآن'' بیان کی۔

توجیہ الحدیث عن الشافعیۃ

اور حدیث الباب کا جواب شافعیہ کی طرف سے انہوں نے یہ دیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عبادہ نے تعلیم کی ابتداء کے وقت تبرع اور احتساب کی نیت کی تھی اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس نیت احتساب کے بعد اجرت لینے سے منع کیا، ابطال اجر سے بچنے کے لئے، اور اس کی مثال ایسی ہے کہ

اگر کوئی شخص کسی کا گم شدہ مال تلاش کر کے دے یا اگر کسی کا مال جو دریا میں غرق ہوگیا تھا اس کو حسبۃً وتبرعاً دریا سے نکال کر دے تو اس نیت کے بعد اس کا اجرت لینا جائز نہیں لیکن اگر وہ عمل سے پہلے اس کام پر اجرت مقرر کرے تب لینا جائز ہے۔ الی آخر ما ذکر۔

اور حضرت گنگوہی کی تقریر میں یہ ہے کہ اس حدیث شریف میں اس قدر شدید وعید کا منشاء شاید یہ ہو کہ یہاں معلم اور متعلم نے آپس میں اجرت کی شرط لگائی ہو یا یہ کہ اجرت لینا منوی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے اس کو پسند نہیں فرمایا، اگر چہ مجرد نیت حرام نہ تھی۔ الی آخر ما بسط۔ (من البذل مختصراً) (الدر المنضود: ۵/۳۷۴)

باب احیاء الموات والشرب

رقم الحدیث: ۲۸۶۱/ تا ۲۸۷۶/

018 Babu Ahyail Mawat

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب احیاء الموات والشرب

(بنجر زمین کو زندہ کرنے اور پانی کی تقسیم کا بیان)

''موات'' بفتح المیم اور ''شرب'' بکسر الشین ہے، ''موات'' کے معنی ہیں غیر آباد زمین، اس کے مقابلہ میں آباد زمین کو ''عامر'' کہا جاتا ہے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''موات'' اس غیر آباد زمین کو کہتے ہیں جو کسی کی مملوک نہ ہو اور نہ شہر کے متعلقات میں سے ہو بلکہ شہر سے خارج ہو، چاہے قریب ہو یا بعید۔

اور ''شرب'' پانی کے حصہ کو کہا جاتا ہے اور اصطلاح شریعت میں پانی سے انتفاع کا وہ حق ہے جو اپنی کھیتی اور باغ کو سیراب کرنے اور جانوروں کو پلانے کیلئے ہر انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ (طیبی: ۶/۱۶۳)

احادیث کی روشنی میں اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ ویران زمین آباد کرنے سے ملکیت میں آجاتی ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسی پر فیصلہ ہوا، البتہ آباد کرنے کی شرائط میں اختلاف ہے۔ (المغنی: ۵/۳۲۸)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آباد کرنا اس وقت معتبر ہوگا جب کہ امام یعنی وقت کی حکومت کی اجازت سے آباد کیا جائے، بغیر اجازت کے احیاء معتبر نہیں۔

جبکہ امام شافعی اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اجازت شرط نہیں، ان حضرات کا استدلال حدیث مذکور اور دیگر احادیث کے عموم سے ہے، جن میں اذن امام کی کوئی قید نہیں، چنانچہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ منطوق حدیث اس بات پر دال ہے کہ ''ارض موات'' کی تملیک کے

لئے تعمیر اور آبادی کافی ہے، حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

اور مفہوم حدیث اس بات پر دال ہے کہ صرف پتھروں کا رکھنا اور نشان لگانا تملیک کے لئے کافی نہیں، بلکہ تعمیر ضروری ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "لیس للمرء الا ما طابت به نفس اما مه" [کسی شخص کے لئے بس وہی ہے جو اس کا امام اس کے لئے خوشی سے چاہے۔]

لہٰذا جہاں امام کے اذن کا ذکر نہیں اور مطلق ہے اس کو مقید پر حمل کریں گے، کیونکہ اصول یہی ہے: "المطلق یحمل علی المقید و الساکت علی الناطق اذا کان فی حادثة" (مرقاۃ: ۶/۱۴۰)

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تشریع عام نہیں، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بحیثیت امام کے اعلان اذن تھا۔ (اعلاء السنن: ۱۸/۱)

اور حدیث شریف کے الفاظ "احیا اور عمر" سے مراد مطلق احیاء اور تعمیر نہیں بلکہ وہ احیاء اور تعمیر مراد ہے جو شرائط کے مطابق ہو اور احیاء کی شرط میں سے ایک شرط "اذن امام" ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہے: "لا حمی الا للہ و لرسو له" اور مطلب یہ ہے کہ مباح زمین کے تصرف کا حق اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اور ان کے نائبین ائمہ کو حاصل ہے، کسی عام آدمی کو مباح زمین میں تصرف کا حق ازخود حاصل نہیں، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں سردار لوگ سرسبز اور شاداب علاقے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کیلئے بطور چراگاہ کے مخصوص کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ عمل باطل قرار دیا اور اس عمل سے روکا۔ (طیبی: ۶/۱۶۴)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ مباح زمینوں کا معاملہ امام کے اختیار میں ہوتا ہے اور اس کے اذن کے بغیر کسی کا کوئی تصرف معتبر نہیں۔

شرب کے لغوی معنی ہیں "پینے کا پانی، پانی کا حصہ، گھاٹ اور پینے کا وقت" اصطلاح شریعت میں اس لفظ کا مفہوم ہے: "پانی سے فائدہ اٹھانے کا وہ حق جو پینے، برتنے، اپنی کھیتی اور باغ کو سیراب کرنے اور جانوروں کو پلانے کے لئے ہر انسان کو حاصل ہوتا ہے۔"

چنانچہ پانی جب تک اپنے معدن (یعنی دریا اور تالاب وغیرہ) میں ہے کسی کی ذاتی ملکیت

نہیں ہوتا، اس سے بلاتخصیص ہر انسان کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، جس سے منع کرنا اور روکنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں دریا، نہروں، نالوں کے پانی اور اس پانی میں کہ جو برتنوں میں بھر لیا گیا ہو، فرق ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اس موقع پر تو صرف اس قدر جان لیجئے کہ حنفی مسلک کے مطابق دریا کے پانی پر تمام انسانوں کا یکساں حق ہے چاہے کوئی اس کا پانی پینے پلانے کے استعمال میں لائے، چاہے کوئی اس سے پانی زمین سیراب کرے اور چاہے کوئی نہروں اور نالیوں کے ذریعہ اس کا پانی اپنے کھیتی و باغات میں لے جائے، کسی کو بھی اور کسی صورت میں بھی دریا کے پانی کے استعمال سے نہیں روکا جاسکتا، اور نہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی کو روکے، یا منع کرے، چنانچہ دریا کے پانی سے فائدہ اٹھانا، چاند سورج اور ہوا سے فائدہ اٹھانے کی طرف ہے کہ خدا نے ان نعمتوں کو بلاتخصیص کائنات کے ہر فرد کے لئے عام کیا ہے، ان کا نفع و فائدہ کسی خاص شخص یا کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے میں سب یکساں شریک ہیں، اسی طرح کنویں اور نہروں کے پانی پر بھی سب کا حق ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی کنویں یا کسی نہر کے پانی سے موات کا احیاء کرے، یعنی افتادہ زمین میں زراعت کرے تو اس صورت میں ان لوگوں کو کہ جن کے علاقہ میں وہ کنواں اور نہر ہے منع کر دینے کا حق حاصل ہے خواہ اس شخص کے افتادہ زمین میں پانی لے جانے سے اس کنویں اور نہر کے پانی میں کمی اور نقصان واقع ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، کیونکہ ان کے علاقہ میں اس کنویں یا اس نہر کے ہونے کی وجہ سے ان کے پانی پر انہیں بہر حال ایک خاص حق حاصل ہے، اور جو پانی کسی برتن یا ٹنکی وغیرہ میں بھر لیا جاتا ہے وہ اس برتن و ٹنکی والے کی ملکیت ہو جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پانی پر ہر شخص کا حق ہوتا ہے کہ جو چاہے مار لے، لیکن جب اسے کوئی شکاری پکڑ لیتا ہے تو اس کے قبضہ میں آتے ہی وہ اس شکاری کی ملکیت ہو جاتا ہے، اور اس پر سے بقیہ سب کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔

اور کوئی کنواں یا نہر اور چشمہ کسی ایسی زمین میں ہو جس کسی خاص شخص کی ملکیت ہو تو اس شخص کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی حدود ملکیت میں پانی کے طلب گار کسی غیر شخص کے داخلہ پر پابندی عائد کر دے، بشرطیکہ وہ پانی کا حصول اس کے لئے ممکن نہ ہو تو پھر اسی مالک سے کہا جائے گا کہ یا تو وہ خود

اس نہر یا کنویں سے پانی لا کر دیدے یا اسے اجازت دے دے کہ وہ وہاں آ کر پانی لے سکے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ کنویں یا نہر کے کنارے کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

اگر موات زمین میں کوئی کنواں کھدوایا گیا ہو تو اس زمین کو آباد کرنے والے کو یہ حق نہیں پہنچے گا کہ وہ اس کنویں سے پانی لینے سے لوگوں کو منع کرے، کیونکہ آباد کرنے کی وجہ سے جس طرح وہ زمین اس ملکیت میں آ گئی ہے اس طرح اس کنویں کا پانی اس کی ملکیت میں نہیں آیا ہے، اگر وہ کسی ایسے شخص کو منع کرے گا جو اس کنویں سے خود پانی پینا چاہتا ہے یا اپنے جانور کو پلانا چاہتا ہے اور پانی نہ ملنے کی صورت میں خود اس کی یا اس کے جانور کی ہلاکت کا خدشہ ہے تو اسے اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ زبردستی اس کنویں سے پانی حاصل کرے، چاہے اس مقصد کے لئے اس کو لڑنا ہی کیوں نہ پڑے اور اس لڑائی میں ہتھیار استعمال کرنے کی نوبت کیوں نہ آ جائے۔

کنواں بے شک کسی کی ذاتی ملکیت ہوسکتا ہے، مگر اس کنویں کا پانی کنویں والے کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر شخص کے لئے مباح ہوتا ہے، بخلاف اس پانی کے جو کسی نے اپنے برتن وغیرہ میں بھر لیا ہو کہ وہ ذاتی ملکیت ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص پیاس کی شدت سے بے حال ہوا جا رہا ہو اور اس شخص سے وہ پانی مانگے جو اس نے اپنے برتن میں بھر رکھا ہو اور وہ پانی دینے سے انکار کر دے تو اس پیاسے کو یہ حق ہوگا کہ وہ لڑ جھگڑ کر اس سے پانی حاصل کر لے، بشرطیکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں جان چلی جانے کا خدشہ ہو اور وہ لڑائی میں کسی ہتھیار وغیرہ کا استعمال نہ کرے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے مرا جا رہا ہو اور کسی کھانے والے سے کھانا مانگے اور وہ کھانا نہ دے تو اسے حق ہوتا ہے کہ اپنی جان بچانے کیلئے اس سے لڑ جھگڑ کر کھانا حاصل کرے، مگر اس کو لڑائی میں ہتھیار وغیرہ استعمال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے کنویں سے پانی نہ لینے دے تو اس بارے میں زبردستی پانی حاصل کرنے کا ادنی درجہ یہ ہے کہ وہ کنویں والے سے بغیر ہتھیار استعمال کئے لڑے جھگڑے اور اس کی اجازت بھی اس لئے ہے کہ کسی کو پانی جیسی خدا کی عام نعمت سے روکنا گناہ کا ارتکاب کرنا ہے اور یہ لڑ جھگڑ کر پانی حاصل کرنا اس کے حق میں تعزیر (سزا) کے قائم مقام ہوگا۔

﴿الفصل الاوّل﴾

احیاء اس وقت معتبر ہے

{۲۸۶۱} **وَعَنْ** عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهَا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَیْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ قَالَ عُرْوَةُ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَضٰی بِهٖ عُمَرُ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ فِیْ خِلَافَتِهٖ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف:۳۱۴/۱،ابواب الحرث والمزارعة، باب من احیا ارضا مواتا، حدیث نمبر:۲۳۳۵۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی (بنجر) زمین کو آباد کرے کہ وہ زمین کسی کی مملوک نہیں ہے تو وہ شخص زیادہ مستحق ہے (اس زمین کا) حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا۔

تشریح: حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث شریف منسوخ نہیں ہے۔ باقی تفصیل ما قبل میں گذر چکی۔

کسی چراگاہ کو اپنے لئے مخصوص کرنا منع ہے

{۲۸۶۲} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا اَنَّ الصَّعْبَ بْنَ جَثَّامَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: لَا حِمٰی اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف:۳۱۹/۱، کتاب المساقاۃ، باب لا حمی الا للہ ولرسولہ، حدیث نمبر:۲۳۷۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔

تشریح: حِمٰی: لفظاً مصدر ہے، جس کے معنی حفظ کے ہیں، یہاں اسم مفعول یعنی محمی کے معنی میں ہے، زمانۂ جاہلیت میں رؤساء قوم کی یہ عادت تھی کہ ایسی جگہ کو جو گھاس سے ہری بھری ہو اپنے لئے اس کو رکوالیتے تھے، رعایا میں سے کسی کو اجازت نہ ہوتی تھی اپنے جانوروں میں سے کسی کو وہاں چرانے کی، اسلام نے آکر اس عادت کا ابطال کیا لیکن اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استثناء کیا گیا، اللہ تعالیٰ کا نام تو برکت کے لئے ہے، چنانچہ یہ مسئلہ علماء کے مابین اتفاقی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی امام کے لئے بھی حمی کا جواز نہیں یعنی اپنی ذات کے لئے اور اگر مصلحت عامہ کے لئے ہو ''**کخیل الجهاد و ابل الصدقة**'' اس کے جواز میں اختلاف ہے، اور گو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حمی کے جواز کی خود اس حدیث شریف میں تصریح ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی حمی کا انتخاب نہیں کیا اور آگے جو روایت میں آرہا ہے کہ نقیع کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمی کیا وہ اپنے لئے نہ تھا۔

حمی اور احیاء میں فرق

یہ احیاء الموات کی کتاب چل رہی ہے، جس میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے حمی کو ذکر کیا، احیاء الموات کی تو شریعت نے اجازت دی ہے اور حمی سے منع کیا ہے اگر چہ دونوں کا تعلق ارض مباحہ غیر مملوکہ سے ہے، لیکن وہ موات جس کے لئے احیاء کی اجازت ہے، اس سے مراد بیکار اور بنجر زمین ہے اور حمی کا تعلق اس موات سے ہے جو سبزہ زار ہو، لوگوں کی منفعت جس سے وابستہ ہو، اسی لئے اس سے منع کیا گیا ہے کہ اس میں عوام کا ضرر و نقصان ہے، یہ نقیع نون کے ساتھ ہے، ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ طیبہ سے بیس فرسخ پر واقع ہے، ایک نقیع وہ بھی ہے جس کا ذکر باب الجمعہ فی القریٰ میں آیا ہے یعنی نقیع الخضمات وہ دوسری جگہ ہے۔ (بذل) (الدر المنضود: ۱۹۹/۵)

پانی کی تقسیم

{٢٨٦٣} **وَعَنْ** عُرْوَةَ قَالَ: خَاصَمَ الزُّبَيْرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فِيْ شِرَاجٍ مِنَ الْحَرَّةِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْقِ يَا زُبَيْرُ! ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ اِلٰى جَارِكَ فَقَالَ الْاَنْصَارِيُّ اِنْ كَانَ ابْنَ عَمَّتِكَ فَتَلَوَّنَ وَجْهُهُ ثُمَّ قَالَ: اَسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ احْبِسِ الْمَاءَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَى الْجَدْرِ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ اِلٰى جَارِكَ فَاسْتَوْعَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلزُّبَيْرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ حَقَّهُ فِيْ صَرِيْحِ الْحُكْمِ حِيْنَ اَحْفَظَهُ الْاَنْصَارِيُّ وَكَانَ اَشَارَ عَلَيْهِمَا بِاَمْرٍ لَهُمَا فِيْهِ سَعَةٌ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حواله: بخاری شریف: ٢/ ٦٦٠، كتاب التفسير، باب قوله فلا وربک لا یؤمنون الأية، سورة النساء، حدیث نمبر: ؟؟؟، مسلم شریف: ٢/ ٢٦١، كتاب الفضائل، باب وجوب اتباعه صلى الله عليه وسلم، حدیث نمبر: ٢٣٥٧،

ترجمه: حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا ایک انصاری شخص سے مقام حرہ میں پانی کے بہنے کی جگہ کے سلسلہ میں جھگڑا ہوگیا۔ (جب یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے زبیر! تم اپنی زمین کو سیراب کرلو اور پھر اپنے پڑوسی کی طرف پانی کو چھوڑ دو، اس انصاری شخص نے کہا: (یہ فیصلہ ان کے حق میں اس وجہ سے کیا ہے کہ) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کا لڑکا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوگیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے زبیر! زمین کو سیراب کر اور پھر پانی کو روک لے یہاں تک کہ پانی (زمین کی) ڈولوں (کے کناروں) تک پہنچ جائے اور اس کے بعد اپنے پڑوسی کی طرف پانی چھوڑ دے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر کے حق کو مکمل کردیا۔ (اور محفوظ فرمادیا) حکم صریح میں جس وقت کہ اس انصاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ دلایا حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو اس قسم کا مشورہ دیا تھا کہ جس میں گنجائش تھی۔

تشریح: قال خاصم الزبیر رجلا الخ: اس رجل کے مصداق میں مختلف قول ہیں:
(۱) حمید۔(۲) حاتم ابن بلتعہ۔(۳) ثعلبہ بن حاطب۔اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔

ثم ارسل الماء: بعض کے نزدیک فاضل ماءکو اور بعض کے نزدیک دونوں پانی کو چھوڑ دیا جائے گا، سیراب کرنے کے اندر حق سب سے پہلے اعلیٰ پھر اسفل پھر اسفل ثم الاسفل الخ۔ چلتا ہے، ایسے ہی حدیث شریف کے اندر وارد ہوا ہے، اب یہ کہ اعلیٰ اور اسفل کا مطلب کیا ہے، بعض نے کہا: اعلیٰ کا مطلب یہ ہے کہ جس نے سب سے پہلے احیاء موات کیا اور پھر اس کے بعد جس نے کیا وہ اسفل ہے، لیکن یہ مطلب صحیح نہیں ہے، بلکہ الاقرب ثم الاقرب مراد ہے، آگے وارد ہوا الی الجدر بعض روایات کے اندر الی التعیین وارد ہوا ہے۔اول سے مراد دیوار کی جڑیں ہیں، تو جب پانی دیوار کی جڑوں کے اندر پہنچتا ہے تو عام طور سے کعبین تک پہنچ جاتا ہے، اب یہ کہ یہ رجل کون تھا، اس نے یہ حرکت کیسے کی، بعض نے کہا کہ یہ منافق تھا اور بعض کے نزدیک یہودی تھا لیکن علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اپنی جہالت کی وجہ سے بتقاضاء بشریہ اسنے کہہ دیا ورنہ مسلمان تھا، بعض نے کہا: کہ حاتم بن بلتعہ کے ساتھ۔ تفسیر صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ انصار میں سے نہیں ہیں، لیکن ممکن ہے کہ محلہ انصار کے اندر رہتے ہوں اس لئے ان کو انصاری سے تعبیر کر دیا۔

پانی کی تقسیم کا ضابطہ یہ ہے کہ جس طرف سے پانی آ رہا ہے، اس طرف سے پانی کی تقسیم شروع کرتے ہیں، اعلیٰ یعنی جس کی زمین پہلے ہے، پہلے اس کا حق ہوتا ہے، وہ اپنے کھیت وغیرہ منڈیر تک بھرلے تو پھر پانی اسفل کے لئے چھوڑا جاتا ہے، اس حدیث شریف میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی جس مخاصمت کا ذکر ہے اس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی زمین اعلیٰ تھی، یعنی پہلے تھی اور انصاری کی اسفل تھی، قاعدہ کی رو سے تو یہ فیصلہ ہونا چاہئے تھا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پہلے اپنی زمین جدر تک بھرلیں، پھر اس آدمی کے لئے پانی چھوڑیں، لیکن یہ انصاری چاہتا تھا کہ زبیر رضی اللہ عنہ بالکل پانی نہ لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درمیانہ سا راستہ نکالا کہ زبیر رضی اللہ عنہ اپنے کھیت منڈیر تک تو نہ بھریں، بلکہ اتنا پانی دے لیں کہ خشک نہ ہونے پائیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنا حق چھوڑنے پر آمادہ کیا تھا، اس کے باوجود اس شخص نے یہ بات کہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ دار اور پھوپھی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس

کے حق میں فیصلہ کیا ہے، اس پر آنحضرت ﷺ ناراض ہو کر اس کو جو رعایت دی تھی وہ واپس لے لی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا: کہ تم اپنا حق پورا وصول کرو، آنحضرت ﷺ نے ناراضگی کی وجہ سے اس شخص کا حق دبایا نہیں بلکہ اس کو جو رعایت دی تھی وہ واپس لے لی، کیونکہ اس کی بات سے پتا چلتا تھا کہ یہ اس رعایت کا مستحق نہیں ہے، شاید یہ شخص منافق ہو، انصار کے قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے اس کو انصاری کہہ دیا گیا ہو۔

حضرت عروہ ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر اور بڑے اونچے درجہ کے تابعین میں سے ہیں، اس وقت مدینہ میں جو سات فقیہ تھے اور جن کا علم و فضل سب پر حاوی تھا، ان میں سے ایک حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، ان کی والدہ محترمہ مشہور صحابیہ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما ہیں، اور ان کے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مشہور صحابی اور آنحضرت ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے تھے۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ قدیم الاسلام ہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کی دعوت کے بالکل ابتدائی دور ہی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے، جبکہ ان کی عمر صرف ۱۶؍سال کی تھی، ایک طرف تو یہ ان کی سعادت تھی کہ انہوں نے اتنی چھوٹی سی عمر ہی میں اسلام قبول کرلیا تھا، دوسری طرف ان کے ظالم چچا کی شقاوت تھی، کہ اس نے ان کو اسلام لانے کے ''جرم'' میں طرح طرح کی سزا اور اذیتوں میں مبتلا کیا، یہاں تک کہ وہ بدبخت ان کو راہِ مستقیم سے ہٹانے کے لئے دھویں میں ڈال دیا کرتا تھا، مگر یہ نوخیز جان ساری اذیتیں برداشت کرتی، تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو انگیز کرتی، مگر اسلام کی راہ میں جو قدم اٹھ چکا تھا وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے ہی بڑھتا رہا۔ انہوں نے حضرت نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تمام غزوات (جنگوں) میں شرکت کی اور اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے، رسول کریم ﷺ نے جن دس خوش نصیب صحابہ رضی اللہ عنہم کو دنیا ہی میں بشارت دیدی تھی، اور جنہیں ''عشرۂ مبشرہ'' کہا جاتا ہے، ان میں سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔

پانی کے متعلق ہدایت

{۲۸۶۴} وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

اللہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوْا فَضْلَ الْمَاءِ لِتَمْنَعُوْا بِہٖ فَضْلَ الْکَلَاءِ۔
(مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۱۷/۱، کتاب المساقاۃ، باب من قال ان صاحب المائ، احق بالماء، حدیث نمبر: ۲۳۵۴، مسلم شریف: ۱۹/۲، کتاب المساقاۃ، والمزارعۃ، باب تحریم بیع فضل الماء الذی یکون، حدیث نمبر: ۱۵۶۶،

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: زائد پانی کو نہ روکو جس سے کہ (پھر) تم روک لو زائد گھاس کو (چونکہ) زائد پانی کے روکنے سے گھاس کا روکنا لازم ہوتا ہے)۔

تشریح: مقصد یہ ہے کہ جو پانی آدمی کی اپنی ضرورت سے زائد ہو اس کے دینے سے انکار نہیں کرنا چاہئے، یہ نہی فی نفسہ عام ہے، لیکن یہاں اس حدیث شریف میں اس کو ایک خاص صورت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، "یعنی لیمنع بہ الکلا" یعنی پانی دینے سے اس لئے انکار کرتا ہے تاکہ اس کو ذریعہ بنائے گھاس سے روکنے کا، جس کی مثال شراح نے یہ لکھی ہے کہ ایک شخص نے ارض موات کے اندر اس کا احیاء کر کے اس میں کنواں کھودا، جس کی وجہ سے اس کنویں کا مالک ہو گیا اور صورت حال یہ ہے کہ اس کے آس پڑوس جو اور موات کی قسم کی زمینیں پڑی ہوئی ہیں جن میں اتفاق سے گھاس وغیرہ بھی اگتا ہے تو چونکہ اس شخص نے ان زمینوں کا احیاء نہیں کیا، اس لئے ان کا مالک بھی نہیں ہوا، اس لئے اصولاً ان زمینوں کی گھاس سے اس کو حق نہیں کہ کسی کو روکے، بلکہ دوسرے لوگ اپنے جانوروں کو لا کر وہاں چرا سکتے ہیں، لیکن جب جانور وہاں چرنے کے لئے آئیں گے تو ان کو گھاس کے ساتھ پانی کی بھی ضرورت پیش آئے گی، اب یہ شخص یعنی صاحب الماء ان جانوروں کو اپنے کنویں کا پانی پلانے سے روکتا ہے تاکہ لوگ اپنے جانوروں کو یہاں چرانے کے لئے لانا ہی چھوڑ دیں، تو اس طور پر صاحب الماء کے لئے یہ گھاس محفوظ ہو جائے گی، اس حدیث شریف میں اسی سے منع کیا جا رہا ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد پانی کو نہ روکا جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو گھاس سے روکا جائے۔ (الدر المنضود: ۴۰۱/۵)

تین عمل پر وعید شدید

{٢٨٦٥} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ رَجُلٌ حَلَفَ عَلىٰ سِلْعَةٍ لَقَدْ اُعْطِيَ بِهَا اَكْثَرَ مِمَّا اُعْطِيَ وَهُوَ كَاذِبٌ وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلىٰ يَمِيْنٍ كَاذِبَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ رَجُلٍ مُسْلِمٍ وَرَجُلٌ مَنَعَ فَضْلَ مَاءٍ فَيَقُوْلُ اللهُ: اَلْيَوْمَ اَمْنَعُكَ فَضْلِيْ كَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ مَاءٍ مَالَمْ تَعْمَلْ يَدَاكَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ فِيْ بَابِ الْمَنْهِيِّ عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ۔

حواله: بخاری شریف: ١/٣١٩، کتاب المساقاة، باب من رای ان صاحب الحوض والقربة احق بمائه، حدیث نمبر: ٢٣٦٩، مسلم شریف: ١/٧١، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار والمن بالعطية، حدیث نمبر: ١٠٨۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین شخص ہیں جن سے بروزِ قیامت اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف (رحمت کی) نظر فرمائیں گے: (١) وہ شخص جس نے قسم کھائی کہ اس کو اس کے سامان کی قیمت اس سے زائد دی جارہی تھی جو (فی الوقت) دی گئی ہے، حالانکہ وہ جھوٹا ہے۔ (٢) اور وہ شخص جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے تاکہ وہ اس قسم کے ذریعہ ایک مسلمان کا مال لے۔ (٣) اور ایک وہ شخص جو زائد پانی کو روک دے (اور انکار کردے) پس اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت فرمائیں گے: میں اپنے فضل کو آج تجھ سے روکتا ہوں جس طرح تو نے زائد پانی کو روکا تھا حالانکہ تیرے ہاتھوں نے اس کو نہیں بنایا تھا۔

تشریح: "عصر کے بعد" کی تخصیص یا تو اس لئے ہے کہ مغلظہ قسمیں اسی وقت کھائی جاتی ہیں، یا یہ تخصیص اس لئے ہے کہ عصر کے بعد کا وقت چونکہ بہت ہی بافضیلت اور بابرکت ہے، اس لئے اس وقت جھوٹی قسم کھانا بہت ہی زیادہ گناہ کی بات ہے۔

باوجودیکہ وہ پانی تو نے اپنے ہاتھ سے نہیں نکالا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص پر طعن کرے گا کہ

اگر وہ پانی تیری قدرت کا رہین منت ہوتا اور تو اسے پیدا کرتا تو ایک طرح سے تیرا یہ عمل موزوں بھی ہوتا، مگر اس صورت میں جب کہ وہ پانی محض میری قدرت سے پیدا ہوا تھا، اور اسے میں نے ایک عام نعمت کے طور پر تمام مخلوق کے لئے مباح کر دیا تھا، تو پھر تیری یہ مجال کیسے ہوئی کہ تو نے مخلوقِ خدا کو میری اس نعمت سے باز رکھا۔

اگرچہ کنواں اور نہر وغیرہ انسان کی مشقت و محنت سے وجود میں آتے ہیں، مگر اس کی اصل چیز یعنی پانی صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کنواں بنوائے، نہر کھدوائے، یا ہینڈ پمپ وغیرہ لگوائے اور اس میں پانی نہ آئے تو اس کنویں یا نہر وغیرہ کی کیا حقیقت رہ جائے گی، اس لئے محض کنواں بنو دینا یا ہینڈ پمپ وغیرہ لگوا دینا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ اس شخص کو دوسروں پر پانی استعمال کرنے کی پابندی عائد کر دینے کا حق مل گیا ہے۔

"وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ فِيْ بَابِ الْمَنْهِي عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ" [اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث "بَابُ الْمَنْهِي عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ" میں ذکر کی جا چکی ہے۔]

یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت "نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ" [حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ضرورت سے زائد پانی کو بیچنے سے منع فرمایا ہے] صاحب مصابیح نے یہاں نقل کی تھی، لیکن صاحب مشکوۃ نے اسے "بَابُ الْمَنْهِي عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ" میں نقل کیا ہے، جو پیچھے گذر چکا ہے۔

احاطہ کرنے کا حکم

{۲۸۶۶} وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سُمْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَحَاطَ حَائِطًا عَلَی الْاَرْضِ فَھُوَ لَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۴۳۸/۲، کتاب الخراج والفیٔ والامارۃ، باب احیاء الموات، حدیث نمبر: ۳۰۷۷،

ترجمہ: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بروایت حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے (غیر آباد) زمین پر دیوار بنائی (اور) گھیر لیا تو وہ زمین اسی کی ہے۔

تشریح: اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی ارض موات پر دیوار وغیرہ کے ذریعہ سے احاطہ کرلے تو وہ اس کا مالک ہوجاتا ہے، اس حدیث شریف سے معلوم ہورہا ہے کہ ارض موات کے نفس احاطہ سے احیاء کا تحقق ہوجاتا ہے، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے کہ ان کے نزدیک نفس احاطہ اور تحجیر کافی ہے، اور عند الجمہور نفس تحجیر (چاروں طرف پتھر رکھدینے) سے احیاء کا تحقق نہیں ہوتا، جب تک کہ زمین کی کمائی اور خدمت اور سکنیٰ اختیار نہ کیا جائے، لہٰذا جمہور کے نزدیک اس حدیث شریف کو اسی پر محمول کیا جائے گا، یعنی "من احاط حائطا للسکنی" (الدر المنضود: ۱۹۵/۵)

خطۂ ارض کا عطیہ

{۲۸۶۷} وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا اَنَّ

رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِلزُّبَیْرِ نَخِیْلًا ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۴۳۷، کتاب الخراج والفئ والامارۃ، باب فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر: ۳۰۶۹،

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو کھجور کے درخت کی زمین (بطورِ) جاگیر عنایت فرمائی۔

اقطاع اور احیاء کی تعریف اور دونوں میں فرق

تشریح: احیاء بالاتفاق ارض موات ہی کا ہوتا ہے، موات یعنی ارض مباحہ غیر مملوکہ اور وہ بنجر زمین جو کسی کی ملک نہ ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ موات وہ زمین ہے جو کسی کی ملک نہ ہو، خارج بلد ہو، نیز مرافق بلد سے نہ ہو، یعنی اہل شہر کی کوئی ضرورت ومنفعت اس سے وابستہ نہ ہو، بخلاف اقطاع کے کہ وہ اکثر تو ارض موات ہی کا ہوتا ہے، اور کبھی ارض مملوکہ کا بھی، یعنی امام اپنی مملوکہ زمین میں سے اقطاع کرے، یا مملوکہ للغیر ہو اور اس کی اجازت سے امام اقطاع کرے، یہ حنفیہ کا مسلک ہے، امام شافعی کے نزدیک امام کے لئے ارض مملوکہ لبیت المال کا اقطاع بھی جائز ہے۔ (صرح بہ النووی)

اقطاع کہتے ہیں خلیفہ وقت کی جانب سے زمین کا ایک رقبہ کسی کے لئے نامزد کردینا۔ قطیعہ بمعنی جاگیر جس کی جمع قطائع آتی ہے، کتاب القطیعۃ یعنی جاگیر نامہ، جو کسی کے لئے امام لکھ کردے۔

بدائع الصنائع میں زمینوں کے اقسام اور احکام کے ضمن میں لکھا ہے کہ امام کو اقطاعِ موات کا حق اس لئے ہے کہ یہ سبب ہے عمارت بلاد کا، کیونکہ اقطاع کے بعد جب وہ زمین رعایا میں سے کسی ایک کی ملک ہوجاتی ہے تو وہ اس کی خدمت کرکے اس کو آباد اور کارآمد بناتا ہے، اسی لئے اگر کوئی شخص اقطاع کے بعد اس زمین کی خدمت کرکے اس کو کارآمد نہ بنائے، تو تین سال تک اس سے تعرض نہ کیا جائے، تین سال کے بعد بھی کچھ نہ کرے تو اس سے واپس لے لی جائے گی، وہ زمین پھر سے موات بن جاتی ہے، لہٰذا اب امام اس کا اقطاع کسی کو بھی کرسکتا ہے۔ (بذل)

اقطاع اور احیاء میں فرق واضح ہے، اس لئے کہ اقطاع فعل امام کا نام ہے، وہ کسی اور چیز پر

موقوف نہیں، بخلاف احیاء کے کہ وہ خدمت ارض کا نام ہے، پس جو شخص کسی ارض مباحہ غیر مملوکہ کی خدمت کر کے اس کو آباد کرے گا وہ اس کا مالک ہو جائے گا، اس میں اختلاف ہے کہ احیاء میں اذن امام شرط ہے یا نہیں؟

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ضروری ہے۔

امام شافعی واحمد اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک غیر ضروری ہے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک موات قریب میں اذن شرط ہے، بعید میں نہیں۔ یعنی جو آبادی سے زیادہ دور ہو، جیسا کہ تفصیل ما قبل میں گذر چکی۔ (الدر المنضود: ۱۸۴/۵)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کے شوہر) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے لئے کھجوروں کے ایک باغ کا اقطاع فرمایا۔

بحیثیت فقہ حدیث پر کلام

شافعیہ کے مسلک پر تو اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اقطاع ارض مملوکہ کا بھی جائز ہے، حنفیہ کے یہاں جائز نہیں، جیسا کہ پہلے گذر چکا اقطاع اور احیاء کی تعریف میں۔

بذل میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ نخل چونکہ ایسا مال ہے جو ظاہر العین اور حاضر النفع ہے، جس کا اقطاع جائز نہیں، لہذا یہ کہا جائے گا کہ اس کا اقطاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حصہ خمس میں سے کیا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک تھا، فلا اشکال فیہ۔ اور دوسرا احتمال یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ نخیل از قبیل موات ہو، جس کا کوئی مالک نہ ہو۔ (الدر المنضود: ۱۹۱/۵)

زمین اور پلاٹ کا عطیہ

{۲۸۶۸} وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِلزُّبَيْرِ حُضْرَ فَرَسِهٖ فَاَجْرٰى فَرَسَهٗ حَتّٰى قَامَ ثُمَّ رَمٰى بِسَوْطِهٖ فَقَالَ: اَعْطُوْهُ مِنْ حَيْثُ بَلَغَ السَّوْطُ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف:۲/۴۳۷، کتاب الخراج والفئ والامارۃ، باب اقطاع الارضین، حدیث نمبر:۳۰۷۲،

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو (بطورِ جاگیر) زمین کا قطعہ ان کے گھوڑے دوڑنے کی بقدر عنایت فرمایا، چنانچہ انہوں نے گھوڑے کو دوڑایا، یہاں تک کہ وہ کھڑا ہوا اور پھر حضرتِ زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنا کوڑا پھینکا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: جس جگہ تک کوڑا پہنچا ہے زبیر رضی اللہ عنہ کو دے دو۔

تشریح: یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے لئے ایک رقبہ کا اقطاع فرمایا اور مقدار قطیعہ حضر فرس کو قرار دیا، یعنی گھوڑے کی ایک مرتبہ کی دوڑ کو، چنانچہ انہوں نے اپنے گھوڑے کو دوڑایا پھر اس ایک دوڑ میں وہ جہاں جا کر رکا اس جگہ سے انہوں نے اپنا کوڑا اور آگے پھینکا، اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ان کو یہاں سے جہاں سے گھوڑا دوڑایا تھا وہاں تک جہاں تک کوڑا پہنچایا، دیدیا جائے، یعنی دونوں مقداروں کا مجموعہ، یہ روایت اقطاع زبیر والی ابھی اور قریب میں گذر چکی۔ (الدر المنضود:۵/۱۹۳)

اقطاع زمین

{۲۸۶۹} وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْطَعَهُ أَرْضًا بِحَضْرَ مَوْتَ قَالَ: فَأَرْسَلَ مَعِيْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ: أَعْطِهَا إِيَّاهُ۔ (رواه الترمذی والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف:۱/۲۵۷، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی انقطائع، حدیث نمبر:۱۳۸۱، دارمی:۲/۳۴۷، باب:۶۶، کتاب البیوع، باب فی القطائع، حدیث نمبر:۲۶۰۹،

ترجمہ: حضرت علقمہ بن وائل بروایت والد خود نقل کرتے ہیں کہ بالیقین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (کے والد) کو (شہر) حضر موت میں ایک زمین کا قطعہ (بطورِ جاگیر) عنایت فرمایا، ان کے والد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرے ساتھ حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا اور ارشاد

فرمایا: وہ زمین کا قطعہ ان کو دے دو۔

تشریح: موجودہ جغرافیائی نقشہ کے مطابق جبل السراۃ کا ایک سلسلہ یمن سے گذر کر جزیرۃ العرب کے جنوب مغربی گوشے سے مشرق کی طرف مڑ گیا ہے، پھر جنوبی ساحل کے قریب قریب دور تک چلا گیا ہے، جبل السراۃ کا یہی سلسلہ جن علاقون پر مشتمل ہے انہیں "حضرموت" کہا جاتا ہے، یوں تو حضرموت کا پورا علاقہ عموماً بنجر اور غیر شاداب پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے، جو نہ زیادہ بلند ہیں اور بارش کم ہونے کی وجہ سے نہ قابل زراعت ہیں، لیکن ان سلسلوں میں کچھ وادیاں ہیں جو نسبتاً شاداب ہیں، ان میں سے ایک وادی کا نام وادی حضرت موت ہے۔

حضرت وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ اسی علاقہ کے قدیم شاہی خاندان کے ایک فرد تھے، ان کے والد وہاں کے بادشاہ تھے، یہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سن کر اپنے ملک کے ایک وفد کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کے لئے حضرموت سے روانہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ان کی آمد سے پیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مطلع کر دیا تھا، اور "وھو بقیہ ابناء الملوک" [اور وہ شاہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں] کے ذریعہ تعارف کرایا تھا، پھر جب وہ مدینہ پہنچے اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حیثیت کے مطابق ان کا استقبال کیا، انہیں اپنے قریب بٹھایا، اور ان کے لئے اپنی مبارک چادر بچھادی، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرموت کے علاقہ کا حکم مقرر فرمایا، اور وہاں کی کچھ زمین انہیں بطور جاگیر عطا فرمائی۔

حضرموت میں اقطاع سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خاص شہر میں ہو، اس لئے شہر میں اقطاع ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ (الدر المنضود: ۵/۱۸۵)

ایضاً

{۲۸۷۰} **وَعَنْ** اَبْيَضَ بْنِ حَمَّالٍ الْمَارِبِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهٗ وَفَدَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَقْطَعَهُ الْمِلْحَ الَّذِيْ بِمَارِبَ فَاَقْطَعَهٗ اِيَّاهُ فَلَمَّا وَلّٰى قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّمَا اَقْطَعْتَ لَهُ الْمَاءَ

الْعِدَّ قَالَ فَرَجَعَهُ مِنْهُ قَالَ وَسَأَلَهُ مَاذَا يُحْمٰى مِنَ الْاَرَاكِ مَالَمْ تَنَلْهُ اَخْفَافُ الْاِبِلِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف:۲۵۶/۱، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی القطائع، حدیث نمبر:۱۳۸۰، دارمی:۲/۳۴۷، کتاب البیوع، باب:۶۶، باب فی القطائع، حدیث نمبر:۲۶۰۸،

ترجمہ: حضرت ابیض بن حمال مار بی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کہ بمقامِ مارب جو نمک کی کان ہے بطورِ جاگیر دے دی جائے؟ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منقطع نہ ہونے والا پانی (یعنی پانی کا مخزن) دے دیا۔ راوی نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اس سے واپس لے لیا، راوی نے بیان کیا: کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کہ پیلو کے درختوں والی زمین کس قدر زندہ بنا کر گھیری جاسکتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں تک اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچیں۔ (اس لئے کہ پھر وہ چراگاہ ہوگی جو عامۃ المسلمین کا حق ہے جسے مخصوص جاگیر نہیں بنایا جاسکتا)

تشریح: ''مارب'' یمن کے ایک شہر کا نام ہے، جو صنعاء سے ۶۰ رمیل مشرق میں تقریباً چار ہزار فٹ بلند سطح زمین پر واقع ہے، یمن میں پہلی صدی عیسوی تک سبا نامی نسل کے اقتدار کے زمانہ میں ''مارب'' یمن کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے نہ صرف ایک بڑا شہر تھا، بلکہ ایک عظیم تجارتی مرکز بھی تھا، حضرت ابیض رضی اللہ عنہ اسی شہر کے رہنے والے تھے، اسی لئے انہیں ''ماربی'' کہا جاتا ہے۔

الماء العد: یعنی تیار پانی کا مطلب ہے، بالکل تیار، ہمیشہ رہنے والا کہ اس کا مادہ منقطع نہ ہو، اس سے کان میں نمک کی بالکل تیار حالت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں تو سمجھا تھا کہ حضرت ابیض رضی اللہ عنہ نے نمک کی جس کان کی فرمائش کی ہے وہ بالکل ابتدائی حالت میں ہے، جس سے محنت ومشقت اور سخت جد وجہد کے بعد نمک نکلے گا، مگر جب حضرت اقرع رضی اللہ عنہ کی توجہ دلانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ وہ کان ابتدائی حالت میں نہیں ہے، بلکہ اس میں نمک تیار ہو چکا ہے، جو بغیر کسی محنت ومشقت کے تیار پانی اور گھاس کی طرح حاصل کیا جاسکتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کان واپس لے لی، کیونکہ اس صورت میں اس کان اور اس میں تیار شدہ نمک پر سب لوگوں کا حق

تھا، اسے کسی فرد واحد کی ملکیت بنا دینا مناسب نہیں تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے تمام لوگوں کے حقوق کی رعایت کے پیش نظر اس کان کو واپس لے لینا ہی بہتر سمجھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام (یعنی حکومت وقت) کی طرف سے کوئی کان کسی شخص کو بطور جاگیر عطا ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ کان زیر زمین پوشیدہ ہو اور اس سے محنت ومشقت اور جدو جہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ ہاں جو کانیں برآمد ہو چکی ہوں اور ان سے نکلنے والا مال کسی محنت ومشقت اور جدو جہد کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو تو انہیں کسی فرد واحد کی جاگیر بنا دینا جائز نہیں ہے، بلکہ گھاس اور پانی کی طرح ان کی منفعت میں بھی تمام لوگ شریک ہوں گے اور ان پر سب کا استحقاق ہوگا، اس حدیث شریف سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوا کہ اگر حاکم کسی معاملہ میں کوئی حکم وفیصلہ صادر کرے اور پھر اس پر یہ ظاہر ہو کہ یہ حکم وفیصلہ حقیقت کے منافی ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس فیصلہ وحکم کو منسوخ کر دے اور اس سے رجوع کر لے۔

''وہ زمین جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچیں'' سے مراد وہ زمین ہے جو چراگاہ اور عمارات سے الگ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اس موات (افتادہ) زمین کا احیاء (یعنی اسے آباد کرنا) جائز نہیں ہے، جو عمارات کے قریب ہو کیونکہ وہ جانوروں کو چرانے اور اہل بستی کی دیگر ضرورت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ (مظاہر حق: ۵۸٦/ ۳)

عامۃ الناس کے لئے

{ ۲۸۷۱ } **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/ ۴۹۲، کتاب البیوع، باب فی منع الماء، حدیث نمبر: ۳۴۷۷، ابن ماجہ شریف: ۱۷۸، ابواب الرھون، باب المسلمون شرکاء فی ثلث، حدیث نمبر: ۲۴۷۲،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمام مسلمان تین اشیاء میں شریک ہیں: پانی، گھاس اور آگ میں۔ (لہٰذا آگ جلانے اور

روشنی کرنے سے اور گھاس چرانے اور پانی بھرنے سے منع نہیں کیا جاسکتا)۔

تشریح: اس حدیث شریف کا مطلب سمجھنے کے لئے پانی کے اقسام سمجھنے کی ضرورت ہے، تو پانی کے متعدد اقسام ہیں۔ پہلی قسم ماء البحار، اس میں تمام لوگ شریک ہیں خواہ کافر ہوں یا مسلمان، اس میں پینے جانوروں کو پلانے زمین، باغات سیراب کرنے میں سب کو برابر کا حق ہے، دوم بڑے بڑے نہروں کا پانی جیسا دجلہ، فرات، جیجون، ان کے پانی کا حکم بھی ماء البحار کے مانند ہے، تیسرا مملوک کنواں وچشمہ کا پانی تو اس میں بھی عام لوگوں کا حق ہے، البتہ اگر اس کے قریب دوسرا غیر مملوک پانی ہے تو پینے والوں کو مالک اپنے مملوک زمین میں دخول سے منع کرسکتا ہے، اور اگر دوسرا پانی موجود نہ ہو تو صاحب البئر کو مجبور کیا جائے گا کہ تم یا اس کو پانی لے کر پلاؤ، یا اس کو پینے کی اجازت دو، چوتھی قسم جو پانی اپنے برتن یا مٹکے میں حفاظت سے رکھ دیا، اس پانی میں دوسرے کسی کا حق نہیں، وہ اس کا مالک ہے، البتہ ضرورت کے وقت اخلاقاً دینا چاہئے، تو حدیث مذکور میں جو شرکت کہا گیا ہے وہ پہلی تینوں قسم میں سے اور وہ بھی شرکت فی الاباحت ہے، شرکت ملک مراد نہیں ہے، اسی طرح جو گھاس غیر مملوک زمین میں اگے، اس میں بھی سب شریک ہیں۔ اور جو زمین مملوک ہے اور خود بخود گھاس اے، اس میں بھی سب شریک ہیں، البتہ صاحب ارض دخول سے منع کرسکتا ہے، اگر دوسری جگہ گھاس ہو، اگر دوسری جگہ گھاس نہ ہو تو اس کو کہا جائے گا تم گھاس دو ورنہ ان کو لینے دو۔ اسی طرح جو آگ میدان میں جلائی گئی، اس میں سب شریک ہیں، اگر کوئی روشنی حاصل کرنا چاہے یا اپنی بتی جلانا چاہے تو منع نہیں کرسکتا، البتہ اس سے جمرہ لینا چاہئے تو منع کرسکتا ہے، کیونکہ وہ اس کا مملوک ہے، نیز آگ بجھ جانے کا اندیشہ ہے۔ (درس مشکوۃ: ۲/۲۸۳)

مباح اشیاء کا حکم

{۲۸۷۲} **وَعَنْ** اَسْمَرَ بْنِ مُضَرِّسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَایَعْتُہٗ فَقَالَ مَنْ سَبَقَ اِلٰی مَاءٍ لَمْ یَسْبِقْہُ اِلَیْہِ مُسْلِمٌ فَھُوَ لَہٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۴۳۷، کتاب الخراج والفئ والامارۃ، باب فی اقطاع الارضین،

حدیث نمبر: ۳۰۷۱۔

ترجمہ: حضرت اسمر بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کا ہاتھ اس پانی کی طرف سبقت (اور پہل) کر جائے کہ اس کی طرف (اب تک) کسی مسلمان ہاتھ نے سبقت نہیں کی ہے تو وہ پانی اس کا حق ہے۔

تشریح: اسمر بن مضرس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ اسمر بن مضرس طائی رضی اللہ عنہ ہیں، طے ایک معروف قبیلہ کا نام ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ اپنے وطن بلاد طے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے رجوع کے وقت جب یہ اپنے وطن واپس جانے لگے، فرمایا: کہ ہماری طرف سے جا کر وہاں یہ خوشخبری سنا دینا کہ تم میں سے جو شخص بھی جس غیر آباد چشمہ پر جو پہلے سے کسی کی ملک نہ ہو پہنچ کر اس کو اختیار کرلے گا تو وہ اسی کے لئے ہے، چنانچہ جب انہوں نے یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہاں پہنچائی تو سب لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے اس قسم کے چشموں پر پہنچے اور جس کو جو چشمہ پسند تھا اس پر اس نے اپنا خط اور نشان کھینچ لیا۔

یہ بھی اقطاع کی ایک صورت ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی۔ (الدر المنضود: ۵/۱۹۳)

حقوق کی حفاظت ضروری ہے

{۲۸۷۳} **وَعَنْ** طَاؤُسٍ مُرْسَلًا ان رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اَحْيٰ مَوَاتًا مِنَ الْاَرْضِ فَهُوَ لَهٗ وَعَادِيُّ الْاَرْضِ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ مِنِّيْ۔ (رواه الشافعي) وَرُوِيَ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ الدُّوْرَ بِالْمَدِيْنَةِ وَهِيَ بَيْنَ ظَهْرَ انِيْ عِمَارَةِ الْاَنْصَارِ مِنَ الْمَنَازِلِ وَالنَّخْلِ فَقَالَ بَنُوْ عَبْدِ بْنِ زُهْرَةَ نَكِّبْ عَنَّا ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلِمَ ابْعَثَنِيَ اللهُ اِذًا اِنَّ اللهَ لَا يُقَدِّسُ اُمَّةً لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهِمْ حَقُّهُ۔

حوالہ: مسند شافعی: کتاب الشفعة، باب عمارة مالیس معمولا، شرح السنہ: ۲۰۲/۵، کتاب البیوع، باب الحمی، حدیث نمبر: ۲۱۹۰،

ترجمہ: حضرت طاؤس مرسلاً نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کیا تو وہ زمین اسی کی ہے اور قدیم زمین (جو معروف بالملک نہ ہو، اور یہ نسبت قوم عاد کی طرف ہے) اللہ اور اس کے رسول کی ہے اور پھر وہ میری طرف سے تم لوگوں کے لئے ہے، جس کو میں دے دوں۔(مسند شافعی) اور شرح السنہ میں مروی ہے کہ بے شک حضرت نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ میں چند مکان (بطورِ) جاگیر عنایت فرمائے تھے جو کہ حضرات انصار کے مکانات اور کھجور کے درختوں کے درمیان تھے، عبد بن زہرہ کی اولاد نے کہا: کہ عبداللہ بن ام عبد کو ہم سے دور رکھا جائے، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پھر رسول بنا کر کیوں مبعوث کیا ہے؟ بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کو مقدس نہیں کرتا جن میں کمزور اور ضعیف کو اس کا حق نہ دیا جائے۔

تشریح: عادی الارض: (قدیم زمین) سے مراد وہ افتادہ و بنجر زمین ہے جس کے مالک کا کوئی علم نہ ہو، اس میں زمین کی لفظ نسبت ''عاد'' یعنی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کی طرف محض ایسی زمین کی قدامت کے اظہار میں مبالغہ کے لئے ہے، کیونکہ حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کی مدت قدامت بہت زیادہ ہے۔

''اور اس کے رسول کے لئے ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ ایسی تمام افتادہ و بنجر زمینیں جن کا کوئی مالک نہیں ہے، میرے تسلط میں ہیں، اپنی مرضی و مصلحت کے مطابق ان میں تصرف کرتا ہوں کہ جسے چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں اور اس کو آباد کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''ثم ھی لک منی'' (اور پھر وہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے) سے معلوم ہوا کہ اس جملہ ''اور قدیم زمین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہے'' میں ''اللہ'' کا

ذکر حضرت رسول اکرم ﷺ کی عظمت شان کے پیش نظر آنحضرت ﷺ کے ذکر کی تمہید کے طور پر ہے، ورنہ بظاہر "اللہ" کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اللہ کا حکم وفیصلہ گویا اللہ تعالیٰ کا حکم وفیصلہ ہے۔

عبد بن زہرہ کے بیٹوں نے اپنے مکانات اور کھجوروں کے درختوں کے درمیان حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مکان دیئے جانے کی جو مخالفت کی اس کا ایک جذباتی پس منظر تھا اور وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے والد مسعود زمانہ جاہلیت میں عبد بن زہرہ کے بیٹوں کے حریف (مقابل) تھے، نیز حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی والدہ یعنی ام عبد ان کے خدمتگاروں میں سے تھیں، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایسی جگہ مکانات دیئے جو عبد بن زہرہ کے بیٹوں کے مکانات اور ان کے کھجوروں کے باغات کے درمیان واقع تھی، تو یہ ان کو گوارا ہوا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مکان ان کے مکانات کے درمیان وقع ہو، گویا اس طرح انہوں نے اپنے ان جذبات حقارت کا اظہار کیا جو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تئیں رکھتے تھے۔

لہٰذا آنحضرت ﷺ نے ان کے غلط جذبات پر برہمی کا اظہار کیا اور فرمایا: کہ اگر حقوق العباد اس قسم کے احساسات سے متعلق ہوتے اور کمزور انسانوں کے تئیں یہ جذبات وحقارت جائز ہوتے تو میں اللہ کا رسول بن کر اس دنیا میں کیوں آتا؟ اگر میں کمزور وناتوانوں اور مسکینوں کی تقویت کا باعث اور ان کا مددگار نہ بنوں تو میری بعثت کا ایک بڑا مقصد کیسے پورا ہوگا، اور میری بعثت میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت رہ جائے گی؟ تمہیں نہ بھولنا چاہئے کہ میرے بنیادی مقاصد میں یہ بات داخل ہے کہ میں انسانوں کے درمیان اونچ نیچ اور معاشرتی فرق وامتیاز کی خود ساختہ دیواروں کو ڈھادوں، جو لوگ اپنے آپ کو طاقتور بڑا سمجھتے ہوں انہیں راہِ اعتدال پر لاؤں اور جو کمزور وناتواں ہوں انہیں اپنی مدد ونصرت سے طاقت بخشوں، پھر آنحضرت ﷺ نے قوموں کے کریکٹر وکردار کے ایک برے نازک گوشے کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو قوم اپنے کمزور افراد کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی اور جس قوم میں کمزور انسانوں کی کوئی اہمیت ووقعت نہیں ہوتی وہ قوم نہ صرف یہ کہ کائنات انسانی کا ایک بدترین حصہ ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو گناہوں اور برائیوں سے پاکیزگی عطا نہیں کرتا، جس قوم کے طاقتور لوگ کمزور لوگوں کے حقوق کو پامال کرتے ہیں

ان کی سماجی و معاشرتی زندگی پر بدعنوانیوں اور گناہ و معصیت کی دبیز تہیں جم جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم نہ تو معاشرہ میں کوئی باوقار اور صالح کردار انجام دیتی ہے اور نہ خدا کی طرف سے ان پر رحمت و برکت نازل ہوتی ہے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے عبد بن زہرہ کے بیٹوں کو آگاہ فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ چونکہ دنیاوی طور پر تم سے کمتر ہیں اور وہ ایک کمزور انسان ہیں۔ اس لئے تم ان کا یہ جائز حق کہ وہ جس موزوں جگہ پر چاہیں اپنی سکونت اختیار کریں، غصب کرلو گے، میں ان کا مددگار و معین ہوں اور مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں ان کی حمایت کروں۔ (مظاہر حق: ۵۸۷/ ۳)

پانی کا ایک حکم

{۲۸۷۴} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى فِي السَّيْلِ الْمَهْزُوْرِ أَنْ يُّمْسَكَ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ يُرْسِلَ الْأَعْلٰى عَلَى الْأَسْفَلِ. (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۵۱۲/۲، کتاب القضاء، باب من القضائ، حدیث نمبر: ۳۶۳۹، ابن ماجہ شریف: ۱۷۹، کتاب الرھون، باب الشرب من الاودیۃ ومقدار حبس المائ، حدیث نمبر: ۲۴۸۲،

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد خود از جد روایت کرتے ہیں کہ بالیقین حضرت رسول اکرم ﷺ نے فیصلہ کردیا کہ مہزور (بنو قریضہ کی وادی کے پانی کی نالی) کے سلسلہ میں کہ وہ روک دی جائے (یعنی اس کا پانی اس وقت تک آگے نہ جانے دیا جائے) جب تک کہ وہ ٹخنوں تک پہنچ جائے اور اس کے بعد اوپر کی جانب والا نیچے کی طرف جانے کے لئے چھوڑ دے۔

تشریح: ''مہزور'' مدینہ طیبہ کی ایک وادی کا نام ہے جو بنی قریظہ کے علاقہ میں واقع تھی، بنی قریظہ کے کھیتوں اور باغوں میں اسی وادی سے پانی آتا تھا، اسی کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ اس وادی سے پانی لانے والی نالی کے قریب جس شخص کی زمین ہو اس کا حق مقدم ہے کہ پہلے وہ اپنی زمین میں پانی لے جائے، جب اس کی زمین میں ٹخنوں تک پانی پہنچ جائے، یعنی پوری طرح سیراب ہو جائے تب وہ اس پانی کو چھوڑ دے تا کہ اس کے بعد وہ اس زمین میں جائے جو

اس کی زمین سے نیچے ہے۔

چنانچہ ہر اس نہر کے بارہ میں یہی ضابطہ ہے جو کسی شخص کی ذاتی محنت و مشقت کے بغیر از خود جاری ہو کہ جس شخص کی زمین اس نہر کے قریب اور بلندی پر ہو، پہلے وہ اپنی زمین میں پانی لا کر روکے رکھے، یہاں تک کہ اس کی زمین میں ٹخنوں تک پانی بھر جائے، پھر وہ پانی کا رخ اپنی زمین سے موڑ دے تا کہ وہ اس زمین میں چلا جائے جو اس کی زمین سے متصل اور اس سے نیچے ہو۔

اگر کوئی نقصان پہنچایا جائے

{۲۸۷۵} **وَعَنْ** سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّهٗ کَانَتْ لَهٗ عَضُدٌ مِنْ نَخْلٍ فِیْ حَائِطِ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَمَعَ الرَّجُلِ اَهْلُهٗ فَکَانَ سَمُرَةُ یَدْخُلُ عَلَیْهِ فَیَتَاَذّٰی بِهٖ فَاَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَطَلَبَ اِلَیْهِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِیَبِیْعَهٗ فَاَبٰی فَطَلَبَ اَنْ یُّنَاقِلَهٗ فَاَبٰی قَالَ: فَهَبْهُ لَهٗ وَلَكَ کَذَا اَمْرًا رَغَّبَهٗ فِیْهِ فَاَبٰی فَقَالَ اَنْتَ مُضَارٌّ فَقَالَ: لِلْاَنْصَارِیِّ اِذْهَبْ فَاقْطَعْ نَخْلَهٗ۔ (رواه ابوداؤد) وَذُکِرَ حَدِیْثُ جَابِرٍ مَنْ اَحْیٰی اَرْضًا فِیْ بَابِ الْغَصْبِ بِرِوَایَةِ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ اَبِیْ صِرْمَةَ "مَنْ ضَارَّ اَضَرَّ اللّٰهُ بِهٖ" فِیْ بَابِ مَا یُنْهٰی مِنَ التَّهَاجُرِ۔

حواله: ابو داؤد شریف: ۲/ ۵۱۲، کتاب القجاءٔ، باب من القضاءٔ، حدیث نمبر: ۳۶۳۶۔

ترجمه: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے باغ میں چند کھجور کے درخت تھے اور اس انصاری شخص رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس کے اہل خانہ (بھی) رہتے تھے اور حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ باغ میں اس شخص پر داخل ہوتے تھے (یعنی آمد و رفت رہتی تھی) جس کی وجہ سے اس انصاری شخص رضی اللہ عنہ کو اذیت پہنچتی، چنانچہ وہ انصاری صحابی رضی اللہ عنہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ فرمایا، پس حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی مجلس میں طلب فرمایا تا کہ وہ درخت

آنحضرت ﷺ کو فروخت کر دیں، انہوں نے انکار کر دیا، آنحضرت ﷺ نے پھر ان کے تبادلہ کو طلب فرمایا، انہوں نے اس کا بھی انکار کر دیا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو پھر تم مجھ کو ہبہ کر دو اور تمہارے لئے اس کے بدلہ میں (جنت میں) اس قدر رہو گا جس کی آنحضرت ﷺ نے ان کو ترغیب دی، پھر بھی انکار کر دیا تو پھر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو نقصان پہنچانے والا شخص ہے، پھر آنحضرت ﷺ نے انصاری شخص رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: جاؤ اور اس کے درختوں کو کاٹ دو۔ (ابوداؤد) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث **"من احیٰ ارجا" باب الغضب** میں گذر چکی ہے، بروایت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور حدیث ابی سرمہ **"من ضارّ اضر اللہ بہ" باب ماینھی من التھاجر** میں عنقریب بیان کریں گے۔

تشریح: حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا یہ واقعہ جس میں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی پائی جا رہی ہے اس کو وہ خود ہی بیان فرما رہے ہیں، گویا اپنا عیب اور کمی خود ہی بیان کر رہے ہیں، یہ ان حضرات کے غایت اخلاص اور دیانت داری کی بات ہے تا کہ جو حدیث جس طرح حضور اقدس ﷺ سے سنی ہے اس کو بعینہٖ اسی طرح نقل کیا جائے، چاہے اپنے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ (الدر المنضود: ۴۶۶/۵)

﴿الفصل الثالث﴾

نمک اور آگ کا حکم

{۲۸۷۶} **وَعَنْ** عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! مَا الشَّیْئُ الَّذِیْ لَا یَحِلُّ مَنْعُهٗ؟ قَالَ: اَلْمَاءُ وَالْمِلْحُ وَالنَّارُ، قَالَتْ: قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! هٰذَا الْمَاءُ قَدْ عَرَفْنَاهُ فَمَا بَالُ الْمِلْحِ وَالنَّارِ؟ قَالَ: یَا حُمَیْرَاءُ! مَنْ اَعْطٰی نَارًا فَکَاَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیْعِ مَا اَنْضَجَتْ تِلْكَ النَّارُ وَمَنْ اَعْطٰی مِلْحًا فَکَاَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیْعِ مَا طَیَّبَتْ تِلْكَ الْمِلْحُ وَمَنْ سَقٰی مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَّاءٍ حَیْثُ یُوْجَدُ الْمَاءُ فَکَاَنَّمَا اَعْتَقَ رَقَبَةً وَمَنْ سَقٰی مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَّاءٍ حَیْثُ لَا یُوْجَدُ الْمَاءُ فَکَاَنَّمَا اَحْیَاهَا۔ (رواہ بن ماجۃ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۷۸، ابواب الرھون، باب المسلمون شرکاء فی ثلث، حدیث نمبر: ۲۴۷۴،

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کون سی چیز ہے جس کو منع کرنا حلال (اور درست) نہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پانی، نمک اور آگ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ پانی جس کی (حقیقت تو) ہم کو معلوم ہوگئی اور نمک اور آگ کی کیا نوعیت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یا حمیرائ! جس شخص نے کسی کو آگ دی پس گویا کہ اس نے اس تمام چیز کا صدقہ کر دیا جو اس آگ سے پکائی گئی ہو۔ اور جس نے نمک دیا ہو تو گویا کہ اس نے اس تمام چیز کا صدقہ کیا ہے جو اس نمک سے کھانا عمدہ ہوا ہے، اور جس شخص نے کسی مسلمان کو ایک گھونٹ پانی پلا دیا اس جگہ میں جہاں پانی ملتا ہو تو گویا کہ اس نے ایک غلام آزاد کر دیا۔ (یعنی اس قدر ثواب حاصل ہوگا) اور جس شخص نے پانی کا ایک گھونٹ ایسی جگہ پلایا جہاں پانی ملتا نہ ہو تو گویا کہ اس نے نفس مسلم کو زندگی دے دی۔

تشریح: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے چونکہ پانی کی اہمیت اور اس کی کیفیت حال کو جاننے کا دعویٰ کیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دعویٰ کو روکنے کے لئے آخر میں پانی دینے اور پلانے کا ثواب اور اس کی فضیلت کو ذکر کرتے ہوئے گویا یہ ظاہر فرمایا کہ تمہیں صرف یہ تو معلوم تھا کہ پانی ایک عام ضرورت کی چیز ہونے کی وجہ سے ایک بڑی اہم نعمت ہے، لیکن اس کے بارے میں یہ تفصیل کہ پانی دینے والے کا کیا درجہ ہوتا ہے اور اسے کتنا زیادہ ثواب ملتا ہے، تم نہیں جانتی تھیں۔ باقی تفصیل ماقبل میں گذر چکی۔

باب العطایا

رقم الحدیث: ۲۸۷۷ر تا ۲۹۰۱ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب العطایا

(عطیات اور ہدایا کا بیان)

عطایا: عطیہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں اپنی کوئی مملوک چیز دوسرے کو بخشش کرنا۔ اور اس کی مختلف صورتیں ہیں: ہبہ، وقف، عمریٰ، رقبیٰ وغیرہ۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں عطایا سے مراد بادشاہ اور امراء کی بخشش اور ان کے انعامات ہیں۔ (مرقاۃ: ۶/۱۴۸)

''منہاج العابدین'' میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس زمانہ کے امراء کے عطیات قبول کرنے کے متعلق اختلاف نقل کیا ہے، چنانچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جس چیز کے متعلق حرمت کا یقین نہ ہو اس کا لینا جائز ہے، فقیر کے لئے بھی اور غنی کے لئے بھی، البتہ گناہ معطی پر ہوگا، اگر اس مال میں کوئی خرابی ہے جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکندریہ کے بادشاہ دمقوقس کا ہدیہ قبول فرمایا تھا، اسی طرح یہود سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض لیا تھا، جبکہ یہود کے بارے میں قرآن کریم کا فیصلہ ہے

''اَکّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ''

[جی بھر بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔]

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک یہ یقین نہ ہو کہ یہ مال حرام ہے محض شک وشبہ کی بنیاد پر لینے سے منع نہیں کیا جائے گا۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ امراء اور سلاطین کے اموال کا حلال ہونا جب تک

یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو نہیں لینا چاہئے، کیونکہ آج کے دور میں حرام غالب ہوتا ہے اور حلال مفقود ہوتا ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس چیز کی حرمت کے متعلق یقین نہ ہو وہ فقیر کے لئے حلال ہے، غنی کے لئے نہیں، البتہ اگر حرمت یقینی ہے تو پھر کسی کے لئے حلال نہیں اور فقیر کے لئے تو بادشاہ کا مال ویسے بھی جائز ہے، کیونکہ اگر بادشاہ کا اپنا ہوگا اور فقیر کو دیدیا تو ظاہر ہے کہ وہ درست ہے، اور اگر مال فی یا خراج یا عشر ہوگا تو بھی فقیر کا اس میں حق ہے۔

اور حکم اہل علم کا بھی ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

"من دخل فی الاسلام طائعا وقرأ القرآن ظاهرا فله فی بيت المال كل سنة مائتا درهم وروی مائتا دينار ان لم يأخذها فی الدنيا أخذها فی العقبیٰ" کہ جو شخص برضاء ورغبت اسلام میں داخل ہوا اور اس نے قرآن کریم یاد کیا تو وہ بیت المال سے ہر سال دوسو درہم یا دوسو دینار لینے کا حقدار ہے، اگر وہ اپنا یہ حق دنیا میں وصول نہیں کرے گا تو وہ "یعنی اس کا اجر" اسے عقبیٰ میں مل جائے گا۔ (مرقاۃ: ۶/۱۴۸، نفحات التنقیح: ۳/۴۹۹)

019 Babul Ataya

﴿الفصل الاوّل﴾

وقف اور اس کا حکم

{۲۸۷۷} وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا اَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ اَصَابَ اَرْضًا بِخَيْبَرَ فَاَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنِّيْ اَصَبْتُ اَرْضًا بِخَيْبَرَ لَمْ اُصِبْ مَالًا قَطُّ اَنْفَسَ عِنْدِيْ مِنْهُ فَمَا تَأْمُرُنِيْ بِهٖ قَالَ: اِنْ شِئْتَ حَبَّسْتَ اَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ اَنَّهٗ لَا يُبَاعُ اَصْلُهَا وَلَا يُوْهَبُ وَلَا يُوْرَثُ وَتُصُدِّقُ بِهَا فِي الْفُقَرَاءِ وَفِي الْقُرْبٰى وَفِي الرِّقَابِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَالضَّيْفِ لَا جُنَاحَ عَلٰى مَنْ وَلِيَهَا اَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اَوْ يُطْعِمَ غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ غَيْرُ مُتَاَثِّلٍ مَالًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۸۲، کتاب الشروط، باب الشروط فی الوقف، حدیث نمبر: ۲۶۵۶، مسلم شریف: ۲/۴۱، کتاب الهبات، باب الوقف، حدیث نمبر: ۱۶۳۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں زمین حاصل ہوئی وہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! خیبر میں مجھ کو زمین ملی ہے، میرے نزدیک اس سے زیادہ نفیس اور عمدہ مال مجھ کو کبھی حاصل نہیں ہوا، لہٰذا آپ اس کے متعلق مجھ کو کیا حکم فرماتے ہیں؟ (کہ میں کیا کروں؟) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہو تو اس کی اصل کو محبوس (یعنی وقف) کر دو اور اس کے منافع (اور فوائد) کو صدقہ کر دو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے منافع کو صدقہ کر دیا، اس شرط پر کہ اس کی اصل کو فروخت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ وارث بنایا جا سکتا ہے اور اس کے منافع کو فقراء اور قرابت داروں اور غلاموں

کے آزاد کرنے اور مجاہدین اور مسافرین اور مہمانوں کے مصارف میں خرچ کیا جائے اور جو شخص اس پر نگراں، محافظ (یعنی متولی) ہو تو اگر وہ معروف طریقہ پر اس میں سے کھائے یا (اپنے اہل وعیال کو) کھلائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے (جب کہ) جمع کرنے کا قصد نہ ہو۔ حضرت ابن سیرین نے اس کے معنی بیان فرمائے کہ مال جمع کرنا مقصود نہ ہو۔

تشریح: یہ حدیث شریف وقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، چنانچہ تمام مسلمانوں کا بالاتفاق یہ مسلک ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی پوری جائداد مثلاً زمین ومکان وغیرہ کسی نیک مقصد اور اچھے کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی راہ میں وقف کر دیتا ہے تو یہ جائز ہے اور وہ وقف کرنے والا بے شمار اجر اور ثواب سے نوازا جاتا ہے، نیز یہ حدیث شریف اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف جائداد نہ فروخت کی جاسکتی ہے نہ ہبہ ہوسکتی ہے اور نہ کسی کی میراث بن سکتی ہے، یہ حدیث وقف کی فضیلت کو بھی ظاہر کرتی ہے کیونکہ وقف ایک صدقہ جاریہ ہے، جس کا ثواب وقف کرنے والے کو برابر ملتا رہتا ہے۔

''خیبر'' ایک بستی کا نام ہے، جو مدینہ طیبہ سے تقریباً ۶۰ ر میل شمال میں واقع ہے، اس کے علاقہ میں کھجور وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اس بستی پر مسلمانوں نے ''عنوۃ'' یعنی بزور طاقت فتح اور غلبہ حاصل کیا تھا، اسی موقع پر غانمین (یعنی مال غنیمت لینے والے) اس کی زمین وباغات کے مالک قرار پائے اور انہوں نے اسے آپس میں تقسیم کیا، جس کا ایک حصہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی ملا، اپنے اسی حصہ کی زمین کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف کرنے والے کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اس وقف سے بقدر ضرورت نفع حاصل کرے، بایں طور کہ اس آمدنی کا کچھ حصہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات زندگی پر خرچ کرے، یا اس سے فائدہ اٹھائے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ وقف نامہ کی شرائط کی گویا توثیق فرما کر وقف کی آمدنی میں سے بقدر ضرورت حصہ اس شخص کیلئے مباح قرار دیا جو اس کا متولی ہو اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ وقف کرنے والا اپنے وقف کا متولی ہوتا ہے۔

نیز اس بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (ایک موقع پر) یہ فرمایا: کہ ایسا

کوئی شخص ہے جو بیر رومہ (مدینہ طیبہ کا ایک کنواں جو ایک یہودی کی ملکیت تھا) خریدے؟ (جو شخص اس کنویں کو خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیگا تو) اس کنویں میں اس شخص کا ڈول مسلمانوں کے ڈول کی طرح ہوگا، (یعنی جس طرح عام مسلمان اس کنویں سے پانی حاصل کریں گے، اسی طرح وہ شخص بھی اس سے پانی حاصل کرتا رہے گا) چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کنویں کو خرید لیا اور عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔

عمریٰ اور اس کے احکام

{۲۸۷۸} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْعُمْرٰی جَائِزَةٌ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۵۷، کتاب الهبة، باب ما قیل فی العمری الرقبی، حدیث نمبر: ۲۵۵۲، مسلم شریف: ۲/۳۸، باب العمری، حدیث نمبر: ۱۶۲۶۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عمری جائز ہے۔

تشریح: آپس کا لین دین معاشرہ انسان کے باہمی ربط و تعلق کے استحکام کا ذریعہ ہے، آپس کے تعلقات، ایک دوسرے سے محبت اور باہمی ارتباط کی خوشگواری و پائیداری آپس کے ہدایا وتحائف پر بھی منحصر ہوتی ہے، کیونکہ اس ذریعہ فطرتِ انسانی ایک خاص قسم کی محبت ومسرت اور جذبہ ممنونیت سے سرشار ہوتی ہے، یہ آپس کا لین دین کئی طریقوں سے ہوتا ہے، ہدیہ وتحفہ اور ہبہ کے ساتھ ساتھ ایک صورت ''عمریٰ'' بھی ہے، جو بظاہر ہبہ کی ایک شاخ ہے، چنانچہ حدیث بالا اسی کی طرف مشہور ہے۔

عمریٰ کی تعریف اور اس کا حکم

''عمریٰ'' کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں نے اپنا یہ مکان تمہیں عمر بھر کیلئے دیدیا۔ تو ''عمری'' بمعنی اعطاء الدار اور معمر بمعنی معطی اور معمر لہ بمعنی معطی لہ کے ہے، اختلاف مذاہب

کے اعتبار سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عمری کی تین صورتیں ذکر فرمائی ہیں۔

(۱)...... پہلی صورت یہ ہے معمر یوں کہے: ”اعمرتک هذه الدار فاذا مت فهي لورثتک او لعقبک“ [یہ گھر میں نے تجھ کو عمر بھر کے لئے دیا، پس جب میں مرجاؤں تو وہ تیرے ورثہ اور تیرے بعد والوں کے لئے ہے۔] یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور یہ ہبہ وتملیک العین ہے، گھر معمر لہ کا ہوگا اس کے بعد اس کے ورثہ کا ہوگا، اگر ورثہ نہیں ہوں گے تو بیت المال کا ہوگا، معمر اور واہب کے پاس کسی صورت میں نہیں لوٹ سکتا۔

(۲)...... معمر کہتا ہے: ”جعلتها لک عمرک یا أعمرتک هذه الدار“ [میں نے یہ گھر تجھ کو عمر بھر کے لئے دیا۔] مزید کوئی قید ذکر نہیں کرتا، حنفیہ اور اصح قول میں شافعیہ کے نزدیک یہ صورت پہلی صورت پر محمول ہے اور گھر ہمیشہ کے لئے واہب کے ہاتھ سے نکل گیا اور معمر لہ کا ہوگیا۔

(۳)...... معمر یوں کہے: ”جعلتها لک عمرک فاذا مت عادت الی او الی ورثتي“ [میں نے اس کو تجھ کو عمر بھر تک کے لئے دیا، پس جب میں مرجاؤں تو وہ میری طرف یا میرے ورثہ کی طرف لوٹ جائے۔] معمر نے یہاں شرط لگائی کہ تیرے مرنے کے بعد یہ گھر دوبارہ میرا ہوگا، اس صورت کے بارے میں بھی حنفیہ اور شافعیہ کا اصح قول یہی ہے کہ اس کا حکم وہی ہے جو پہلی صورت کا ہے اور حنفیہ کے نزدیک یہ ہبہ اور تملیک العین ہے، جس کے ساتھ شرط فاسد لگ گئی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ ہبہ کے ساتھ جب شرط فاسد لگ جائے تو ہبہ صحیح ہوجاتا ہے اور شرط باطل ہوجاتی ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ”عمری مطلقہ“ تو صحیح ہے، ”موقتہ“ یعنی تیسری صورت صحیح نہیں اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ”عمری“ تمام صورتوں میں ”تملیک المنافع“ کا نام ہے، ”تملیک العین“ کا نام نہیں، لہٰذا ”عمری“ سے عین کی ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔

احادیث مبارکہ سے حنفیہ اور جمہور کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ارشاد ہے: ”ان العمری میراث

لاھلھا'' (طیبی:۱۷۶/۶،نووی شرح المسلم:۳۸/۲)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال: لا عمری و لا رقبی فمن اعمر شیئا او ارقبہ فھو لہ حیاتہ و مماتہ'' [یقیناً رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ نہ عمریٰ ہے نہ رقبیٰ، پس جو کسی کو عمریٰ دے یا رقبیٰ، تو وہ اسی کے لئے اس کی حیات میں بھی اور موت کے بعد بھی۔] یہاں ''لا عمری لا رقبی'' سے اس طرف اشارہ ہے کہ عمری اور رقبی واپسی کی امید کے ساتھ تمہارے لئے مناسب نہیں، چونکہ وہ واپس تمہیں نہیں ملے گی۔ ایسی ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے: ''من اعمر عمری فھی اعمر حیا و میتا و لعقبہ'' جو اس باب کی فصل ثالث میں مذکور ہے۔ (نفحات التنقیح:۵۰۰/۳)

دفع تعارض

زیر بحث حدیث شریف میں العمری جائزۃ اور فصل ثانی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث شریف آرہی ہے۔

''لاتعمروا'' اس میں عمری سے نہی ہے، بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض ہوا، اس کا حل یہ ہے کہ جائزۃ سے مراد ہے ''نافذۃ'' اور جس حدیث شریف میں نہی ہے وہاں نہی ارشادی ہے، مطلب یہ ہوا کہ عمری کرنا تو نہیں چاہئے، کیونکہ تمہاری مصلحت کے خلاف ہے، لیکن اگر کوئی کرلے تو نافذ ہوجائے گا۔ (اشرف التوضیح:۴۲۰/۳)

عمریٰ کی حقیقت

دراصل یہ اختلاف حقیقت عمری پر متفرع ہے، عند الجمہور عمری کی حقیقت تملیک الرقبہ ہے، یعنی عین دار کا مالک بنادینا، اور امام مالک کے نزدیک اس کی حقیقت تملیک المنفعۃ ہے، اسی لئے ان کے نزدیک معمر لہ اصل مکان کا مالک نہیں ہوتا، اور نہ ان کے نزدیک اس میں میراث جاری ہوتی ہے، یعنی من حیث الملک، اور اگر ہبہ کے وقت میں اس نے ''لک و لعقبک بعد'' کہا ہو تو اس صورت

میں ان کے نزدیک اس کے اندر میراث جاری ہوگی، یعنی وہی منفعت کے لحاظ سے۔ لا من حیث الملک۔ (الدر المنضود:۵/۴۳۵)

عمری میں میراث

{۲۸۷۹} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْعُمْرٰی مِیْرَاثٌ لِاَهْلِهَا۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۳۸/۲، کتاب الھبات، باب العمری، حدیث نمبر: ۱۶۲۵۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک عمری اس کے وارث کی میراث ہے۔

تشریح: اس روایت میں صراحت ہے کہ معمرلہ کی میراث ہوگی، اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء کا حق ہے۔ کما قال الفقہاء و جماھیر العلماء۔

فائدہ: جس کو وہ ہبہ اور عطیہ دیا گیا ہے اس کو معمرلہ کہا جائے گا۔

عطیہ خاص کی میراث

{۲۸۸۰} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا رَجُلٍ اُعْمِرَ عُمْرٰی لَهٗ وَلِعَقِبِهٖ فَاِنَّهَا لِلَّذِیْ اُعْطِیَهَا لَا یَرْجِعُ اِلَی الَّذِیْ اَعْطَاهَا لِاَنَّهٗ اَعْطٰی عَطَاءً وَقَعَتْ فِیْهِ الْمَوَارِیْثُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: لیس فیه، بلکه ابو داؤد شریف میں موجود ھے، حوالہ: ۵۰۰/۲، کتاب البیوع، باب من قال فیه و لعقبه، حدیث نمبر: ۳۵۵۳، مسلم شریف: ۳۸/۲، باب العمری، کتاب الجھاد، حدیث نمبر: ۱۶۲۵۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کہ اس کے اور اس کی اولاد کے لئے عمری کیا گیا ہو تو وہ اس شخص کے لئے ہے جس کو دیا گیا ہے

واپس نہیں ہوگا، اس شخص کی جانب جس نے وہ دیا ہے، کیونکہ اس نے دی ہے ایسی چیز جس میں میراث جاری ہوگی۔

تشریح: ''معمرلہ'' اس شخص کو کہتے ہیں جسے بطور عمری کوئی چیز دی جاتی ہے، چنانچہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو مثلاً کوئی مکان بطور عمری دیا جاتا ہے، وہ مکان اس کی زندگی تک تو اس کی ملکیت رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء کی ملکیت بن جاتا ہے، گویا یہ حدیث شریف اپنے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے جمہور علماء کے مسلک کی دلیل ہے۔

اگر تاحیات ہی دیا جائے تو

{۲۸۸۱} **وَعَنْهُ** قَالَ اِنَّمَا الْعُمْرٰی الَّتِیْ اَجَازَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّقُوْلُ هِیَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ فَاَمَّا اِذَا قَالَ: هِیَ لَكَ مَا عِشْتَ فَاِنَّهَا تَرْجِعُ اِلٰی صَاحِبِهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: هذا الحدیث لیس بموجود فیه، مسلم شریف: ۳۸/۲، الهبات، باب العمری، حدیث نمبر: ۱۶۲۵۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عمری کو جائز قرار دیا (اس کی صورت یہ ہے کہ دینے والا یوں) کہے: یہ تیرے لئے اور تیرے ورثاء کے لئے ہے اور اگر یوں کہا: یہ تیرے لئے ہے جب تک تو زندہ ہے تو پھر وہ اس کے مالک کی طرف واپس لوٹ جائے گی۔ (مرنے کے بعد)۔

تشریح: یہ حدیث شریف بظاہر جمہور علماء کے مسلک کے خلاف ہے اور جمہور علماء کا مسلک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی تشریح میں ذکر کیا جا چکا ہے، لہٰذا جمہور علماء اس حدیث شریف کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، یعنی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے بلکہ خود حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے، جو ان کی اپنی رائے اور اپنے اجتہاد پر مبنی ہے، اس صورت میں اس قول کا جمہور علماء کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

عمریٰ اور رقبیٰ کی ممانعت

{۲۸۸۲} وَعَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُرْقِبُوْا وَلَا تُعْمِرُوْا فَمَنْ اُرْقِبَ شَیْئًا اَوْ اُعْمِرَ فَهِیَ لِوَرَثَتِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/ ۵۰۱، باب من قال فیہ ولعقبہ، حدیث نمبر: ۳۵۵۷۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہ رقبیٰ کرو اور نہ عمریٰ سو جو شخص رقبی یا عمری کیا گیا پس وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے، یعنی وہ ہبہ ہو چکا ہے، لہٰذا موہوب لہ کے وارث ہی حقدار ہوں گے۔

تشریح: اس روایت میں دو امر ہیں:

(۱)......اولاً تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ ارشاد فرمایا: کہ عمری اور رقبی نہ کرو۔

(۲)......اور اگر کسی نے کیا ہے تو وہ واہب کی ملکیت سے جب نکل چکا ہے تو موہوب لہ کی ملکیت ہوگئی اور وہ بعدہ اس کے ورثاء کا حق ہوگا۔

دورِ جاہلیت میں (شاید) اس کو ملک نہ جانتے ہوں گے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمادی کہ شرعاً ملک ختم ہوجاتی ہے۔

فائدہ: رقبیٰ بھی عمری ہی کے حکم میں ہے اور وہ ماخوذ ہے۔

''ارقاب'' سے بمعنیٰ انتظار اور نگاہ برموت۔

بہرحال عمریٰ اور رقبیٰ فی نفسہٖ جائز ہیں، چنانچہ اس کے بعد کی روایت میں اس کی صراحت موجود ہے۔

ایضاً

{۲۸۸۳} **وَعَنْهُ** عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْعُمْرٰى جَائِزَةٌ لِاَهْلِهَا وَالرُّقْبٰى جَائِزَةٌ لِاَهْلِهَا۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

حوالہ: مسند احمد: ۳/۳۰۳، حدیث نمبر: ۱۴۳۰۴، ترمذی شریف: ۱/۲۵۱، باب ماجاء فی الرقبیٰ، حدیث نمبر: ۱۳۵۱، ابوداؤد شریف: ۲/۵۰۱، باب فی الرقبیٰ، حدیث نمبر: ۳۵۵۸،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عمریٰ جائز ہے اس کے مالکوں کے لئے اور رقبیٰ جائز ہے اس کے مالکوں کے لئے۔

تشریح: "رقبیٰ" فعلیٰ کا وزن ہے، مراقبت اور رقوب سے ماخوذ ہے اور چونکہ اس میں ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر ہوتا ہے، اس لئے اس کو رقبیٰ کہا گیا ہے، اور یہ بھی ہبہ کی ایک شاخ ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ واہب کہے: "وهبت داری لک فان مت قبلی رجعت الی وان مت قبلک فهی لک"

کہ میں اپنا مکان تمہیں اس شرط کے ساتھ دیتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو یہ مکان واپس میری ملکیت میں آجائے گا اور اگر میں تم سے پہلے مر گیا تو یہ تمہاری ملکیت میں رہے گا۔ (مرقاۃ: ۶/۱۵۱)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نصوص اس بات میں صریح ہیں کہ رقبیٰ عمریٰ کی طرح جائز ہے اور یہی امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے، البتہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ روایت منسوب ہے کہ رقبیٰ باطل ہے، تو اس کی توجیہ دو طریقے سے ہوسکتی ہے:

اوّل:…… یہ کہ رقبیٰ کی صورت میں ہبہ صحیح اور مطلقاً نافذ ہے، بغیر کسی شرط کے اور موہوب لہ کی موت کے بعد واہب کی طرف یا اس کے وارث کی طرف اس چیز کا واپس ہونا باطل ہے، بلکہ عمریٰ کی طرح رقبیٰ میں بھی تملیک العین ہے، لہٰذا موہوب لہ اس کا مالک ہے۔

دوسرے:…… یہ کہ جو رقبیٰ اور ہبہ کو باطل غیر نافذ کہا جائے تو پھر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس صورت پر محمول ہوگا جبکہ موہوب لہ کی ملک کو واہب کی موت پر معلق کیا جائے اور ظاہر ہے

کہ جب ملکیت ایک ایسی چیز کے ساتھ معلق کی جائے جس کا وقوع خطرے میں ہو تو ملکیت اور ہبہ باطل غیر نافذ ہوں گے اور بطلان کا یہ حکم جواز کے حکم کے منافی نہیں، کیونکہ جواز تو اس صورت میں ہے جب کہ موہوب لہ کی ملک "منجز" فوراً ہو، معلق نہ ہو، البتہ صرف یہ شرط لگائی گئی ہو کہ موہوب لہ کی موت کے بعد وہ مکان واہب کو ملے گا اور ظاہر ہے کہ یہ شرط فاسد ہے، جس سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا۔ (اعلاء السنن: ۱۲۴/۱۶)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ رقبیٰ کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ رقبیٰ کی تفسیر میں اختلاف پر مبنی ہے۔

اگر رقبیٰ سے ہبہ حقیقی اور تملیک العین مراد ہے تب تو ہبہ اور رقبی جائز ہوگا اور جو شرط فاسد لگائی جائے گی وہ باطل ہوگی۔

اور اگر رقبیٰ سے مراد یہ ہے کہ فی الحال موہوب لہ اس کا مالک نہیں بلکہ بطور عاریت اس کو استعمال کر رہا ہے تو واہب اگر پہلے مر جائے تو موہوب لہ اس کا مالک ہوگا، گویا کہ فی الحال عاریت ہے اور ہبہ کی وصیت مال کے اعتبار سے ہے تو چونکہ فی الحال ملکیت نہیں بلکہ ملکیت کو ایک ایسی چیز کے ساتھ معلق کیا گیا ہے جس کا وقوع خطرے میں ہے، تو اس لئے یہ باطل اور غیر نافذ ہے، لہٰذا اقوال ائمہ میں کوئی تعارض نہیں، جواز اور عدم جواز کا محل ایک نہیں اور نہ ہی احادیث میں کوئی تعارض ہے، لہٰذا عادات اور عرف کی تبدیلی کی بنیاد پر جہاں جو تفسیر مراد ہوگی وہاں وہی حکم ہوگا۔ (الکوکب الدری: ۳۸۹)

دفع تعارض

اور جن روایات میں مطلقاً ممانعت آئی ہے، جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت جو اس روایت سے پہلے ہے: "لا ترقبوا ولا تعمروا" اس نہی کو حضرات علماء کرام نے نہی ارشاد پر حمل کیا ہے نہ کہ تحریم پر، یعنی عمری اور رقبیٰ کرنا تمہاری مصلحت کے خلاف ہے کہ تم کوئی چیز ہبہ میں دیتے ہو اور پھر واپس لینے کی امید رکھتے ہو جب کہ وہ چیز تمہاری ملک سے نکل گئی، چاہے ہبہ کے لفظ سے ہو یا عمری اور رقبیٰ کے لفظ سے۔ (مرقاۃ: ۱۵۱/۶)

چنانچہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں نہی کی علت اور سبب یہ بتایا ہے کہ:

"فمن ارقب شیئا او اعمر فلورثته" کہ اس دھوکہ اور گمان کی وجہ سے "عمریٰ" اور "رقبیٰ" نہیں کرنا کہ وہ چیز تمہاری ملکیت سے نہیں نکلے گی اور واپس تمہارے پاس آئے گی، بلکہ وہ چیز مکمل طور پر معمرلہ اور موہوب لہ کی ملکیت ہو جائے گی، جس میں وہ ہر قسم کا تصرف کرسکتا ہے اور تمہیں اس میں کسی قسم کا حق نہیں۔ (طیبی: ۱۷۸/۶، نفحات التنقیح: ۵۰۱/۳)

الفصل الثالث

مال کی حفاظت کی جائے

{۲۸۸۴} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمْسِکُوْا اَمْوَالَکُمْ عَلَیْکُمْ لَا تُفْسِدُوْھَا فَاِنَّہٗ مَنْ اَعْمَرَ عُمْرٰی فَھِیَ لِلَّذِیْ اُعْمِرَ حَیًّا وَمَیِّتًا وَلِعَقِبِہٖ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۳۸/۲، باب العمری، حدیث نمبر: ۱۶۲۵۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ اپنے اموال کو اپنے پاس بحفاظت رکھو، ان کو ضائع نہ کرو، جو شخص کسی کو عمری دیتا ہے وہ اسی شخص کیلئے ہے کہ جس کیلئے عمری کیا گیا زندگی میں (بھی) اور مرنے کے بعد بھی اور اس کے بعد ورثاء کیلئے ہے۔

تشریح: امسکوا الخ: سے (بھی) یہی امر معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورۃً یہ ہدایت فرمائی ہے کہ "اپنے اموال" کو اپنے ہی قبضہ میں رکھا جائے، اس لئے کہ اگر صاحب مکان نے "بصورتِ عمریٰ" ہبہ کر دیا ہے اور جب ہبہ کر دیا گیا ہے تو زندگی اور مرنے کے بعد بھی موہوب لہ ہی کی ملکیت رہے گی اور وراثت جاری ہوگی، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مبارک ارشاد سے امت کو باخبر فرمایا ہے کہ عمرۃً عطیہ کرنا دراصل ہبہ ہے اور موہوب لہ اس کا مالک ہو جائے گا اور وہ ملک تام اور ملک صحیح ہوگی، لہٰذا اب کسی بھی وقت واہب کی جانب واپس نہیں ہوگی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تصریح اور وضاحت سے اس امر کو بھی بیان فرما دیا کہ یہ عمری اور رقبی عاریت نہیں ہے۔ (تعلیق: ۳۷۹)

باب

اگرچہ اس باب کا کوئی عنوان نہیں ہے، لیکن یہ گذشتہ ہی باب کا ایک حصہ اور اس کا تکملہ ہے۔

خوشبو کا عطیہ

{۲۸۸۵} وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عُرِضَ عَلَيْهِ رَيْحَانٌ فَلَا يَرُدُّهٗ فَاِنَّهٗ خَفِيْفُ الْمَحْمِلِ طَيِّبُ الرِّيْحِ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲۳۹/۲، کتاب الالفاظ، باب استعمال المسک وانہ اطیب الطیب، حدیث نمبر: ۲۲۵۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو ریحان پیش کیا جائے تو وہ اس کو واپس نہ کرے، کیونکہ وہ اٹھائے جانے میں ہلکا ہے (اور) خوشبودار ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ریحان پھول جس کی خوشبو بہت عمدہ ہے، ہدیہ اور عطیہ ہے اس کو قبول ہی کرلیا جائے، اس لئے کہ اس کے ہدیہ دینے ولاے پر بھی اس کا ہدیہ دینے میں کسی قسم کا کوئی بوجھ اور کوئی بار نہیں، اس لئے کہ اس کی کوئی زیادہ قیمت نہیں اور اس کے قبول کرنے والے پر بھی کوئی (احسان کا) بڑا بوجھ نہ ہوگا۔

یہی حکم کہ اسے واپس نہ کیا جائے، ہر اس تحفہ کا ہے جو بظاہر کم قیمت ہونے کی وجہ سے زیادہ

احسان نہ رکھتا ہو، مگر نفع وخوشگواری کے اعتبار سے بہت مفید اور نافع ہو، تاکہ جس شخص نے وہ تحفہ دیا ہے اس کی دلشکنی نہ ہو۔ اور اس کا دل خوش ہو جائے کہ ہمارا تحفہ قبول کرلیا، اور ہدیہ وتحفہ کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ ہدیہ کے بدلہ میں کوئی چیز ہدیہ دینے والے کو دیجائے اور کم قیمت چیز کا بدلہ آسان ہوتا ہے۔

خوشبو کے عطیہ کو واپس نہ کیا جائے

{۲۸۸۶} **وَعَنْ** اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَایَرُدُّ الطِّیْبَ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۸۷۸/۲، باب من لم یرد الطیب، حدیث نمبر: ۲۵۹۶،

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو واپس نہیں فرماتے تھے۔

تشریح: اس کی حکمت اوپر والی حدیث پاک کے ذیل میں بیان کی جاچکی ہے۔

ہدیہ دے کر واپس لینا

{۲۸۸۷} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْعَائِدُ فِیْ ہِبَتِہٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِہٖ لَیْسَ لَنَا مِثْلُ السَّوْءِ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۱۰۳۲/۲، باب فی الھبۃ والشفعۃ، حدیث نمبر: ۶۲۰۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے ہدیہ کو واپس لینے والا کتے کے مانند ہے کہ جو اپنی قے کو چاٹتا ہے، ہم مسلمانوں کے لئے اس طرح کی برائی اختیار کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

تشریح: حدیث شریف کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ملت اور ہماری قوم جس عزت وشرف کی حامل ہے اور اسے انسانیت کے جن اعلیٰ اصول اور شرافت وتہذیب کے جس بلند معیار

سے نوازا گیا ہے اس کے پیش نظر ہماری ملت وقوم کے کسی بھی فرد کے لئے یہ بات قطعاً مناسب نہیں ہے کہ وہ کوئی بھی ایسا کام کرے جو اس کے ملی شرف اور اس کی قومی عظمت کے منافی ہو اور اس کی وجہ سے اس پر کوئی بری مثال چسپاں کی جائے۔

اس سے گویا آنحضرت ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ کسی کو کوئی چیز بطورِ ہدیہ وتحفہ دے کر واپس لینا چونکہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کتا اپنی قے چاٹ لیتا ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنی کوئی چیز ہدیہ کرے اور پھر اسے واپس لے لے اور اس طرح اس پر یہ بری مثال چسپاں کی جانے لگے۔

یہ تو حدیث شریف کی وضاحت اور اس سے پیدا ہونے والا ایک اخلاقی اور نفسیاتی پہلو تھا، لیکن اس کا فقہی اور شرعی پہلو یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز بطور ہبہ دے کر واپس لینے کے بارے میں اختلاف ہے کہ جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک "رجوع فی الھبہ" حرام اور ناجائز ہے، نہ دیانۃً رجوع کر سکتا ہے اور نہ قضاءً، البتہ والد اگر اپنے ولد کو کوئی چیز دے تو رجوع کر سکتا ہے۔

جبکہ حنفیہ کے نزدیک واہب نے جب تک کوئی عوض حاصل نہ کیا ہو تو اس وقت تک وہ رجوع کر سکتا ہے، البتہ کراہت کے ساتھ، گویا کہ حنفیہ کے نزدیک قضاءً رجوع کا مستحق ہے اور دیانۃً نہیں۔ (عمدۃ القاری: ۱۳/۱۴۸)

لیکن یہ حکم اجنبی کیلئے ہے، اپنے محرم کو اگر کوئی چیز ہبہ میں دے تو رجوع نہیں کرسکتا۔ (ہدایہ: ۳/۲۹۰)

ائمہ ثلاثہ کا استدلال ایک تو ان روایات سے ہے جن میں "لایحل" کے الفاظ آئے ہیں۔ (ابوداؤد: ۳/۲۹۱)

دوسری روایت مذکورہ سے ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے ہبہ سے رجوع کرنے والے کو اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو قے کر کے چاٹ لیتا ہے، اس تشنیع کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز ہبہ کر کے واپس لینا جائز نہیں۔ (مرقاۃ: ۶/۱۵۳)

حنفیہ کا استدلال ایک تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، جس میں ارشاد ہے:

"الواهب احق بهبته مالم يثب منها" (دارقطنی: ۳/۴۴)

دوسرے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے وہ فرماتے ہیں: "عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من وھب فھو احق بھا مالم یثب منھا" (دارقطنی: ۴۳/ ۳) [واہب اپنے ہبہ کا زیادہ حقدار ہے جب تک اس نے اس کا بدلہ وصول نہیں کیا۔]

ان کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ جن روایات میں "لایحل" وارد ہے تو "حل" کی دو قسمیں ہیں، ایک "حل کامل"، جس میں نہ کوئی حرمت ہو اور نہ کوئی کراہت، دوسری قسم ہے "حل ناقص"، جس میں حرمت تو نہیں البتہ کراہت ہے۔

حدیث شریف میں "حل کامل" کی نفی ہے، جس میں کوئی کراہت نہ ہو، مطلق حل کی نفی نہیں اور اس بات کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہبہ کرنے کے بعد رجوع کرنا کامل طور پر حلال نہیں بلکہ مکروہ ہے، گویا کہ "لایحل" کے معنی "لاینبغی" کے ہیں۔ (اعلاء السنن: ۱۰۰/ ۱۶، بیہقی: ۱۸۱/ ۶)

اسی طرح حدیث شریف میں جو تشنیع بیان کی گئی ہے وہ اسی کراہت پر محمول ہے، حرمت پر محمول نہیں اور مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لے لینا بے مروتی اور غیر پسندیدہ بات ہے، یہ مطلب نہیں کہ رجوع کرنا حرام ہے، چنانچہ ذوق سلیم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث سے رجوع ثابت ہو رہا ہے، گو کراہت کے ساتھ اور اسی لئے تو رجوع کی صورت میں تشبیہ دی جا رہی ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱۴۹/ ۱۳)

کتے کے فعل کے ساتھ تشبیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چونکہ اس کا فعل حلت اور حرمت کی صفت کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا اس کو ناپسندیدہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

مذہب حنفی کے اثبات کیلئے مختلف آثار موقوفہ بھی ہیں۔ (بیہقی: ۱۸۱/ ۶، شرح معانی الآثار للطحاوی: ۲۶۶/ ۲)

تمام روایات میں تطبیق کی صورت بھی یہی ہے کہ روایات نفی کو کراہت پر محمول کیا جائے نہ کہ حرمت پر، تاکہ تعارض نہ ہو، لیکن یہ یاد رہے کہ کراہت تحریمی مراد ہے تنزیہی نہیں۔ (البحر الرائق: ۲۹۱/ ۷)

البتہ مذہب حنفی میں بھی اگر مانع موجود ہو تو رجوع نہیں ہو سکتا اور موانع کل سات ہیں، جن کی طرف "دمع خزقة" کے حروف سے یادداشت کی آسانی کے لئے اشارہ کیا گیا ہے، امام نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے ان حروف کا ایک شعر میں ذکر فرمایا ہے:

یمنع الرجوع فی فصل الھبة
یا صاحبی حروف دمع خزقة

چنانچہ:

(۱)...... دال سے زیادتی متصلہ کی طرف اشارہ ہے کہ موہوب لہ نے موہوب چیز پر اپنی طرف سے اضافہ کیا جس سے قیمت بڑھ جاتی ہے اور اس کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، مثلاً موہوب بہ زمین پر تعمیر کر لی۔

(۲)...... میم سے موت کی طرف اشارہ ہے کہ واہب یا موہوب لہ مر جائے۔

(۳)...... عین سے عوض کی طرف اشارہ ہے کہ واہب نے موہوب چیز کا عوض لے لیا۔

(۴)...... خاء سے خروج ملک مراد ہے کہ موہوب موہوب لہ کی ملک سے نکل جائے۔

(۵)...... زاء سے زوجیت مراد ہے کہ اگر خاوند بیوی یا بیوی خاوند کو کوئی چیز ہبہ کرے تو رجوع نہیں ہو سکتا۔

(۶)...... قاف سے قرابت محرمہ مراد ہے، یعنی موہوب لہ اور واہب ایک دوسرے کے ذی رحم محرم ہوں تو رجوع نہیں ہو سکتا۔

(۷)...... اور ہاء سے مراد ہلاکت ہے کہ موہوب چیز موہوب لہ کے پاس ہلاک ہو جائے۔(البحر الرائق:۲۹۱/۷)

لیس لنا مثل السوء: اس جملہ میں ایک اخلاقی پہلو کی طرف اشارہ ہے، لفظ ''مثل'' کبھی صفت غریبہ عجیبہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے خواہ صفت مدح ہو یا ذم، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: «لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْأَعْلٰى» (النحل:۶۰)

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین ہیں: ''ای لا ینبغی لنا یرید بہ نفسہ والمؤمنین'' (طیبی:۱۸۰/۶)

''رجوع فی الہبہ'' کی کراہت کے باوجود والد کو ہبہ کرنے کے بعد رجوع کا حق ہے، چنانچہ فصل ثانی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: ''قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرجع احد فی ہبتہ الا الوالد من ولدہ'' [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنے ہبہ

میں رجوع نہ کرے مگر والد اپنے بیٹے سے (رجوع کرسکتا ہے۔)]

حالانکہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے جس میں ارشاد ہے: "**اذا کانت الھبة للذی رحم محرم لم یرجع فیھا**" [اگر ہبہ کسی ذی رحم محرم کے لئے ہو تو اس سے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔] ان دونوں روایتوں کے درمیان بظاہر تعارض ہے کہ پہلی سے جواز رجوع اور دوسری سے عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ذی رحم محرم کو کوئی چیز ہبہ کرنے میں مقصود صلہ رحمی ہوتی ہے اور وہ ہبہ کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے، لہٰذا ہبہ کر کے واپس لینے کا کیا مطلب؟ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت میں اسی کا ذکر ہے۔ جبکہ اجنبی شخص کو کوئی چیز ہبہ کر کے دینے میں مقصود عرفاً عوض حاصل کرنا ہوتا ہے اور چونکہ عوض حاصل نہیں ہوا اس وجہ سے واہب کو رجوع فی الہبہ کی نہی علاقہ ابوت کی وجہ سے ہے اور "**انت و مالک لابیک**" [تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے۔] کے اصول کے ماتحت ہے، کیونکہ والد تو بیٹے کا اپنا ذاتی مال ضرورت کی وجہ سے یا اس کی اجازت سے استعمال کرسکتا ہے، چہ جائے کہ وہ مال جو اس نے اپنے بیٹے کو ہبہ کے طور پر دیا ہے۔

اور "**الا الوالد من ولدہ**" میں استثناء منقطع ہے، اس استثناء منقطع کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ چونکہ ذی رحم محرم کو کوئی چیز دے کر واپس لینا ممنوع ہے، جس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ والد اگر کوئی چیز اپنے بیٹے کو دے تو پھر اس کا لینا مکروہ اور ممنوع ہوگا، چنانچہ شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا: "**الا الوالد من ولدہ**" فرما کر بتا دیا گیا کہ یہ رجوع فی الہبہ کے قبیل سے نہیں بلکہ "**انت و مالک لابیک**" کی وجہ سے باپ ہونے کی بنا پر ہے۔ (نفحات التنقیح: ۳/۵۰۳)

اولاد سب برابر ہے

{۲۸۸۸} **وَعَنِ** النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ اَبَاهُ اَتٰى بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ نَحَلْتُ اِبْنِيْ هٰذَا غُلَامًا فَقَالَ: اَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَ مِثْلَهٗ قَالَ: لَا قَالَ: فَارْجِعْهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ:

اَیَسُرُّكَ اَنْ یَّكُوْنُوْا اِلَیْكَ فِی الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ: بَلٰی قَالَ: فَلَا اِذًا وَفِیْ رِوَایَةٍ اَنَّهٗ قَالَ: اَعْطَانِیْ اَبِیْ عَطِیَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضٰی حَتّٰی تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنِّیْ اَعْطَیْتُ اِبْنِیْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِیَّةً فَاَمَرَتْنِیْ اَنْ اُشْهِدَكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: اَعْطَیْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا قَالَ: لَا قَالَ: فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَیْنَ اَوْلَادِكُمْ قَالَ: فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِیَّتَهٗ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَنَّهٗ قَالَ: لَا اَشْهَدُ عَلٰی جَوْرٍ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/ ۳۵۲، باب الهبة للولد، حدیث نمبر: ۲۵۱۴، مسلم شریف: ۲/ ۳۶، باب کراهة تفضیل بعض الاولاد، حدیث نمبر: ۱۶۲۳،

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک ان کے والد ان کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: کہ بے شک میں نے اپنے اس لڑکے کو تحفہ دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنے سب لڑکوں کو اس طرح تحفہ دیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو پھر اس کو واپس لو۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تم کو یہ بات پسند ہے کہ تمام اولاد تمہارے ساتھ بھلائی کرنے میں برابر ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو (یہ صورت ٹھیک) نہیں۔ (کہ تم ایک کو تحفہ دو)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کہ مجھ کو میرے والد نے ایک عطیہ عنایت فرمایا: تو عمرہ بن رواحہ (والدۂ نعمان) نے کہا: میں خوش نہیں ہوں۔ تاوقتیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنا دیا جائے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: کہ میں نے عمرۃ بن رواحہ کی (اولاد) سے اپنے لڑکے کو ایک تحفہ دیا ہے اور اس نے مجھ سے یہ کہا: کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اس پر) گواہ بناؤں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو اسی طرح دیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اپنی اولاد کے درمیان انصاف (اور

برابری) کرو۔ حضرت نعمان بن رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کہ پس وہ واپس آئے اور انہوں نے اپنا تحفہ واپس لے لیا۔ اور ایک روایت میں ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا۔

تشریح: نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے والد ان کو غلام ہبہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانا چاہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کہ اپنی دوسری اولاد کو بھی یہ دے رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا اشهد علی جور" [میں کسی ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا۔]

اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اولاد کو کوئی چیز دیتے ہوئے برابری کرنا مستحسن ہے، ایسے نہیں کرنا چاہئے کہ بعض اولاد کو تو کوئی چیز دی جائے اور بعض کو نہ دی، لیکن کیا ایسا کرنا حرام ہے یا مکروہ؟

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔

حنفیہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ تسویہ مستحب ہے، ضروری نہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ استدلال کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے "لا اشهد علی جور" اس میں اس قسم کے ہبہ کو جور یعنی ظلم کہا گیا ہے۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اشهد علیه غیری" [اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنالو۔] اگر یہ معاملہ بالکل حرام ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ میرے علاوہ کسی اور کو اس کا گواہ بنالو۔ "لا اشهد علی جور" سے استدلال کا امام نووی نے یہ جواب دیا ہے کہ جور کا معنی ہے خروج عن الاعتدال یہ مکروہ اور حرام سب کو شامل ہے۔ (اشرف التوضیح: ۴۲۲/۳)

فائدہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دوسری اولاد کے بمقابلہ زائد عطیہ عنایت فرمایا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کو بھی زائد اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بھی "ولد ام کلثوم" کو زائد عطیہ فرمایا ہے، اور اس پر کوئی اعتراض واشکال ثابت نہیں۔ فیکون اجماعا۔ (تعلیق)

الفصل الثانی

ہبہ کرنے کے بعد

{۲۸۸۹} وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْجِعُ اَحَدٌ فِيْ هِبَتِهٖ اِلَّا الْوَالِدَ مِنْ وَّلَدِهٖ۔ (رواه النسائی وابن ماجة)

حواله: ابن ماجه شریف: ۱۷۲، من اعطى والده ثم رجع فيه، حديث نمبر: ۲۳۷۷۔
نسائی شریف: ۱۱۸/۲، باب رجوع الوالد فیما یعطی ولده، حدیث نمبر: ۳۷۲۰۔

ھدایت: ابن ماجہ شریف میں یہ حدیث شریف لفظاً ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نہیں، بلکہ ”عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ“ کے طریق سے ہے، حدیث نمبر: ۲۳۷۸ ہے۔ اگرچہ معناً ابن عمر و ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص ہبہ کو واپس نہ لے مگر والد اپنے ولد سے واپس لے سکتا ہے۔

تشریح: یہ حدیث شریف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے، کیونکہ ان کے ہاں ہبہ واپس لے لینا جائز نہیں ہے، لیکن باپ اپنے بیٹے سے اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”باپ اپنے بیٹے سے اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی باپ ضرورت وحاجت کے وقت اپنی اولاد کے مال وزر میں سے کچھ لے کر اپنے اوپر صرف کرسکتا ہے، اسی طرح جو چیز اس نے اپنے بیٹے کو بطور ہبہ دی ہے بوقت ضرورت اس کو لے کر اپنے مصرف میں لاسکتا ہے۔ (تفصیل ماقبل میں گذر چکی۔)

واپسی کسی طرح مناسب نہیں

{٢٨٩٠} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ يُّعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْهَا اِلَّا الْوَالِدُ فِيْمَا يُعْطِيْ وَلَدَهٗ وَمِثْلُ الَّذِيْ يُعْطِي الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْهَا كَمِثْلِ الْكَلْبِ اَكَلَ حَتّٰى اِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فِيْ قَيْئِهٖ. (رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجة) وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حواله: ابوداؤد شریف: ٢/٤٩٩، باب الرجوع فی الهبة، حدیث نمبر: ٣٥٣٩، ترمذی شریف: ٢/٣٤، باب کراهة الرجوع فی الهبة، حدیث نمبر: ٢١٣١، نسائی شریف: ٢/١١٨، باب رجوع الوالد فیما یعطی ولده، حدیث نمبر: ٣٧٢٠، ابن ماجه شریف: ١٧٢، باب من اعطی ولده ثم رجع فیه، حدیث نمبر: ٢٣٧٧،

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کے لئے یہ بات حلال نہیں کہ وہ (کسی کو) کوئی ہدیہ دے اور پھر اس کو واپس لے، مگر والد اس شی میں رجوع کرسکتا ہے، جو اس نے اپنے ولد کو دیا ہے اور اس کی مثال جو کہ ہدیہ دیئے ہوئے کو پھر واپس کرے کتے کے مثل ہے کہ اس نے کھایا یہاں تک کہ جس وقت پیٹ بھر گیا تو قے کر دی اور پھر اپنی قے کو چاٹ لیا۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) امام ترمذی نے اس حدیث شریف کو صحیح فرمایا ہے۔

تشریح: تفصیل اوپر گذر چکی۔

ہدیہ کا بدلہ دینا بھی مندوب ہے

{٢٨٩١} **وَعَنْ** اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ اَعْرَابِيًّا اَهْدٰى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكْرَةً فَعَوَّضَهٗ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ

فَتَسَخَّطَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اِنَّ فُلَانًا اَهْدٰى اِلَيَّ نَاقَةً فَعَوَّضْتُهُ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ فَظَلَّ سَاخِطًا لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَّا اَقْبَلَ هَدِيَّةً اِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ اَوْ اَنْصَارِيٍّ اَوْ ثَقَفِيٍّ اَوْ دَوْسِيٍّ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

حواله: ابوداؤد شریف: ۲/۴۹۸، باب قبول الهدایا، حدیث نمبر: ۳۵۳۷، نسائی شریف: ۲/۱۲۳، باب عطیة المرأة بغیر اذن زوجها، حدیث نمبر: ۳۷۹۰، ترمذی شریف: ۲/۲۳۱، کتاب المناقب، باب فی الثقیف، حدیث نمبر: ۲۹۴۵،

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جوان اونٹنی ہدیہ کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمائی اور پھر فرمایا: کہ فلاں شخص نے مجھ کو ہدیۃً ایک اونٹنی دی تھی، میں نے اس کو ایک اونٹنی کے عوض چھ اونٹنیاں دیں تو وہ خوش نہ ہوا۔ میں نے ارادہ کیا ہے ہدیہ قبول نہ کروں گا، مگر قریش یا انصاری یا ثقفی یا دوسی سے۔

تشریح: اگر آپ کسی کو اپنی کوئی چیز بطور ہدیہ وتحفہ دیں تو اس کے عوض و بدلہ کی توقع رکھنا آپ کے خلوص کے منافی ہوگا، لیکن اگر آپ کو کوئی شخص اپنی کوئی چیز بطور تحفہ وہدیہ دے تو کسی بھی صورت میں آپ کی طرف سے اس کے بدلہ کی ادائیگی آپ کی عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور آپ کے احساس مروت ومحبت کے عین مطابق ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی صحابی رضی اللہ عنہ اپنی کوئی چیز بطور ہدیہ دیتے تھے تو اس کا بدلہ ملنے کی ہلکی سی خواہش بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کا ہدیہ سراپا خلوص اور ہمہ تن نیازمندی کا ایک اظہار محبت ہوتا تھا، جو اپنے دامن میں کسی مادی خواہش کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی چیز بطور ہدیہ پیش کرتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی نہ کسی صورت میں اس کو اس کا بدلہ اس سے کہیں زیادہ عطا فرماتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبۂ سخاوت وفیاضی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی ہمتی نیز باہمی ربط

وتعلق کے ایک عظیم جذبہ کا مظہر ہوتا تھا۔

چنانچہ جب ایک دیہاتی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بطور ہدیہ ایک اونٹنی لے کر آیا، تو آنحضرت ﷺ نے حسب معمول اس کے ہدیہ سے کئی گنا زیادہ بدلہ یعنی چھ جوان اونٹنیاں اسے دیں، مگر اس پر بھی وہ خوش نہیں ہوا، یہ بات یقیناً بڑی عجیب تھی، ایک تو اس وجہ سے کہ بظاہر وہ اپنے ہدیہ میں گویا مخلص نہیں تھا، اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اونٹنی اس لئے لے کر آیا تھا کہ آنحضرت ﷺ اسے بدلہ دیں اور بدلہ بھی ایسا جو اس کی خواہش کے مطابق ہو، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے اسے چھ اونٹنیاں دیں تو وہ اس پر خوش نہیں ہوا اور اس طرح اس نے دنیاوی مال میں اپنے جذبہ حرص کا اظہار کیا، چنانچہ اس کی یہ بات آنحضرت ﷺ کو اتنی ناگوار ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ میں نے قریش، انصاری، ثقفی اور دوسی کے علاوہ اور کسی کا ہدیہ قبول نہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔

قریشی ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کا تعلق قبیلہ قریش سے ہے۔ اور انصاری سے مراد انصار مدینہ ہیں۔ ثقفی اور دوسی دو قبیلوں کے نام ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان قبیلوں کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا اور ان کا استثناء کیا کہ یہ قبیلے عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور سخاوت وفیاضی میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

ہدیہ پر دعا

{۲۸۹۲} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ اُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ فَاِنَّ مَنْ اَثْنٰى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۲۳، باب المتشبع بما لم یعطه، حدیث نمبر: ۲۰۳۴، ابوداؤد شریف: ۲/۶۶۳،

کتاب الادب، باب فی شعر المعروف، حدیث نمبر: ۴۸۱۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کو کوئی ہدیہ دیا گیا ہو تو اگر وہ گنجائش رکھتا ہے تو اس کا بدلہ دیدے اور اگر موقع نہ پائے تو پھر وہ ہدیہ دینے والے کی تعریف (یعنی شکریہ ادا) کردے، کیونکہ جس شخص نے تعریف کی اس نے شکریہ ادا کیا اور جس شخص نے کسی کے احسان کو چھپایا تو اس نے کفرانِ نعمت کیا اور جس نے آراستگی کی ایسی چیز کے ساتھ جو کہ اس کو نہیں دی گئی۔ (یعنی خلافِ حقیقت ظاہر کرتا ہے) تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے شخص کے مانند ہے۔

تشریح: محسن کی تعریف کرنے کو اس کا شکر ادا کرنے کا قائم مقام اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ تعریف دراصل شکر ہی کی ایک شاخ ہے، کیونکہ شکر کا مفہوم ہے ''دل میں محبت رکھنا، زبان سے تعریف کرنا اور ہاتھ پاؤں سے خدمت کرنا''

حدیث شریف کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اندر کسی ایسے دینی یا دنیاوی کمال وصفت کا اظہار کرے جو درحقیقت اس میں نہیں ہے، تو وہ جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے، جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے سے مراد وہ شخص ہے جو علماء اور صلحاء کا لباس پہن کر اپنے آپ کو عالم وصالح ظاہر کرے حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے نہ وہ عالم ہو اور نہ صالح ہو۔

اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو کوئی ایسا پیراہن پہنے جس کی آستینوں کے نیچے مزید دو آستینیں لگائے تا کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اس نے دو پیراہن پہن رکھے ہیں۔

اور بعضوں نے یہ کہا ہے کہ عرب میں ایک شخص تھا جو انتہائی نفیس قسم کے دو کپڑے پہنتا تھا، تا کہ لوگ اسے عزت دار اور باحیثیت سمجھیں اور جب وہ کوئی جھوٹی گواہی دے تو اس کی اس ظاہری پوشاک کو دیکھ کر اسے جھوٹا نہ سمجھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اسی شخص کے ساتھ اس شخص کو تشبیہ دی جو اپنے آپ کو کسی ایسے کمال کا حامل ظاہر کرے جو اس کے اندر موجود نہ ہو۔

احسان کرنے والے کیلئے دعا کرنا

{۲۸۹۳} **وَعَنْ** اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صُنِعَ اِلَيْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهٖ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ اَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ. (رواہ الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/ ۲۳، باب فی الثنا بالمعروف، حدیث نمبر: ۲۰۳۵،

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی بھلائی کی گئی ہو تو (اگر) اس بھلائی کرنے والے کو اس نے جزاک اللہ خیراً کہہ دیا تو اس نے ثناء کرنے (اور شکریہ ادا کرنے کا مکمل حق ادا کر دیا)۔

تشریح: ''کامل تعریف کی'' یعنی اس نے اپنے محسن کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ کہہ کر گویا اس کے تئیں ادائیگی شکر کا حق ادا کر دیا، کیونکہ اس نے اپنے محسن کا بدلہ اتارنے اور اس کی تعریف کرنے میں اپنے قصور کوتاہی کا اعتراف اور اپنے عاجز ہونے کا اقرار کر کے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دیا کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں پورا پورا اجر عطا فرمائے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے اجر سے بہتر اجر کون دے سکتا ہے۔

راہِ استقامت کا سنگ میل

جلیل القدر بزرگ اور شیخ باکمال حضرت عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ صوفی کو چاہئے کہ وہ مخلوقِ خدا کے دینے یا نہ دینے دونوں ہی صورتوں میں دائرہ استقامت سے نہ نکلے اور نہ راہِ حق سے قدم کو بھٹکنے دے، اگر کوئی فاسق و نااہل شخص اسے کچھ (بطور ہدیہ) دے تو وہ اس کی اتنی تعریف نہ کرے کہ اسے صالح اور ولی کی صف میں کھڑا کر دے، بلکہ اس کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ کہے کہ ''اللہ تعالیٰ اسے جزاءِ خیر عطا کرے۔'' اور اگر اسے کسی صالح و متقی شخص سے کوئی رنج و تکلیف پہنچے تو محض اس کی وجہ سے اس کے صلاح و تقویٰ کی نفی نہ کرے اور اسے برا بھلا نہ کہے، بلکہ اس کے حق میں یہ دعائیہ الفاظ کہے کہ

"غفر اللہ لہ و لنا" یعنی اللہ تعالیٰ اسے اور ہمیں مغفرت و بخشش سے نوازے۔ اہل استقامت کا یہی طریقہ ہے اور یہی ان کی راہِ عمل ہے۔ (مظاہر حق: ۶۰۳/ ۳)

انسان کا ناشکرا اللہ کا بھی ناشکرا ہے

{۲۸۹۴} وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰهَ۔

(رواہ احمد والترمذی)

حوالہ: مسند احمد: ؟؟، ترمذی شریف: ۲/ ۱۷، باب الشکر لمن احسن الیک، حدیث نمبر: ۱۹۵۴،

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکتا۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کی ادائیگی کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے، بایں طور اس نے ان انسانوں کا جو کہ اس تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے پہنچنے کا ظاہری واسطہ اور وسیلہ بنے ہیں، شکر ادا کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی پیروی کی جائے، لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی تابعداری نہیں کی اور اس کے حکم کی پیروی نہیں کی بایں معنی کہ اس نے ان لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا جن کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اسے دی ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔

یا پھر اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے محسن کا شکر ادا نہیں کرتا اور اپنے ساتھ کئے گئے احسان اور اچھے سلوک کا اقرار نہیں کرتا وہ کفرانِ نعمت کی اپنی اس عادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

حضرات مہاجرین کا ایثار

{۲۸۹۵} وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ

اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ اَتَاهُ الْمُهَاجِرُوْنَ فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَا رَاَيْنَا قَوْمًا اَبْذَلَ مِنْ كَثِيْرٍ وَلَا اَحْسَنَ مُوَاسَاةً مِنْ قَلِيْلٍ مِنْ قَوْمٍ نَزَلْنَا بَيْنَ اَظْهُرِهِمْ لَقَدْ كَفَوْنَا الْمُؤْنَةَ وَاَشْرَكُوْنَا فِي الْمَهْنَا حَتّٰى لَقَدْ خِفْنَا اَنْ يَّذْهَبُوْا بِالْاَجْرِ كُلِّهِ فَقَالَ: لَا مَادَعَوْتُمُ اللهَ لَهُمْ وَاَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ۔ (رواہ الترمذی) وَصَحَّحَهٗ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۷۵، ابو اب القیامۃ، حدیث نمبر: ۲۴۸۷،

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس وقت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مہاجرین حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہم نے کسی قوم کو ان سے زیادہ خرچ کرنے والی نہیں دیکھی اور نہ تھوڑے مال سے معاونت وبھلائی کرنے میں اس قوم سے کسی کو بہتر دیکھا کہ جس قوم کے درمیان ہم لوگ مقیم ہوئے (یعنی ہجرت کے بعد قومِ انصار کے پاس قیام پذیر ہوئے) ان لوگوں نے محنت ومشقت سے ہم لوگوں کو کفایت کیا اور منفعت میں شریک بنایا، یہاں تک کہ ہم نے اندیشہ کیا کہ وہ تو تمام اجروثواب حاصل کرلیں گے (یعنی ہم اس درجہ ثواب حاصل نہ کر سکیں گے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! جب تک تم لوگ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو گے، اور ان کی تعریف (اور شکریہ) کرو گے۔ (ترمذی) اور ترمذیؒ نے تصحیح کی ہے۔

تشریح: جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں اقامت اختیار فرمائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مدینہ طیبہ میں اقامت گزیں ہوئی تو مدینہ طیبہ کے رہنے والوں یعنی انصار نے ان کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اور ایثار وسخاوت نیز اخوت ومحبت کی جو عظیم روایت قائم کی، بلا مبالغہ تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کے لئے اپنے دیدہ ودل ہی فرشِ راہ نہیں کئے بلکہ اپنے خون پسینہ کی گاڑھی کمائی بھی ان کے لئے وقف کردی، انہوں نے اپنی زمین، اپنے باغات اور اپنے مکانات آدھوں آدھ ان میں تقسیم کردیئے، ان کی خدمت گذاری اور خاطر تواضع میں شرافت انسانی کی ساری بلندیوں کو پیچھے چھوڑ دیا، چنانچہ ان کے

اسی طرزِ عمل اور ان کے بے پایاں احسانات نے مہاجرین کو اتنا متاثر کیا کہ وہ باقاعدہ بارگاہِ رسالت میں اپنا یہ اندیشہ لے کر حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ! یہ انصار کہیں سارا ثواب ہی نہ لے بیٹھیں، کیونکہ ہم نے تو آج تک ان سے زیادہ ایثار پسند، مخیر وسخی اور احسان کرنے والی کوئی قوم نہیں دیکھی ہے، انہوں نے مال وزر کی کمی بیشی سے بے نیاز ہو کر ہماری خاطر داری کی ہے، جس کے پاس زیادہ مال تھا اس نے ہم پر اتنا ہی زیادہ خرچ کیا، جس کے پاس کم مال تھا اس نے اسی کے مطابق ہماری اعانت کی، گویا جس کی جتنی استطاعت تھی اس نے اسی حیثیت سے ہماری مہمانداری وغم خواری کی، یہاں تک کہ انہوں نے حصولِ معاش میں ہمیں محنت ومشقت سے بھی باز رکھا، بایں طور کہ کھیتی باڑی کی محنت، باغات اور درختوں کی دیکھ بھال کی صعوبت اور مکانات بنانے کی مشقت انہوں نے خود اپنے ذمہ لی، مگر منفعت وپیداوار میں ہمیں برابر کا شریک رکھا ہے کہ وہ اپنی زمین اور اپنے باغات میں اپنی محنت سے جو کچھ کرتے ہیں آدھا ہمیں تقسیم کر دیتے ہیں، چنانچہ اب تو ہم ڈرنے لگے ہیں کہ یہ ہمارا سارا ثواب خود ہی حاصل نہ کریں اور یہ اندیشہ ہے کہ ہماری ہجرت اور ہماری عبادتوں کا اجر اللہ تعالیٰ کہیں ان کی اعانات کی بے پناہ زیادتی کی وجہ سے ان کے نامۂ اعمال میں نہ لکھ دے؟

لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں بتایا کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بہت وسیع ہے، اس کے یہاں اجر کی کمی نہیں ہے، تمہیں تمہاری عبادت کا ثواب ملے گا اور انصار کو ان کی مددگاری اور ان کے ایثار وسخاوت کا اجر دیا جائے گا۔ تاوقتیکہ تم ان کے لئے بھلائی کی دعا کرتے رہو، کیونکہ ان کے حق میں تمہاری یہی دعا ان کے احسان کا بدلہ ہوجائے گی اور تمہاری عبادتوں کا ثواب تمہیں ہی ملتا رہے گا۔

ہدیہ کی برکت

{۲۸۹۶} وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: تَهَادُوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تَذْهَبُ الضَّغَائِنَ۔ (رواه...)

حواله: دراصل نسخہ میں اس جگہ بیاض ہے، حسب ضابطۂ مصنفؒ اسلئے کہ مصنفؒ اس روایت کے

مخرج کو معلوم نہ کر پائے تھے، قال الشیخ الجزری علیہ الرحمہ، رواہ الترمذی۔ (ماخوذ از حاشیہ مشکوۃ۔ اسعدی)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ باہم ہدیہ کا لین دین کرو، کیونکہ ہدیہ کینہ کو نکالتا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپس میں تحفہ کے لین دین سے باہمی بغض وعداوت کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے بجائے آپس کی الفت ومحبت پیدا ہو جاتی ہے۔

کوئی ہدیہ حقیر نہیں

{۲۸۹۷} وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: تَهَادُوْا فَاِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ وَلَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ شِقَّ فِرْسَنِ شَاةٍ۔ (رواہ الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۳۴، باب ما جا فی حث النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الهدیة، حدیث نمبر: ۲۱۳۰،

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: باہم ہدیہ کا لین دین کرو، کیونکہ ہدیہ سینہ کے غیض وغضب کو دور کرتا ہے اور نہ حقیر جانے کوئی پڑوسی عورت اپنی پڑوسن کو دعوت کے لئے بکری کے گھر کے ٹکڑے کو۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنے ہمسایہ کو کسی کمتر اور تھوڑی سی چیز کے بطور تحفہ بھیجنے کو اس ہمسایہ کے حق میں حقیر نہ سمجھے، بلکہ جو بھیجنا چاہے اسے بھیجدے، خواہ وہ کتنی ہی کمتر اور تھوڑی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح جس ہمسایہ کو تحفہ بھیجا گیا ہو اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے ہمسایہ کے کسی تحفہ کو حقیر سمجھے بلکہ اس کے پاس جو بھی تحفہ آئے اسے رغبت وبشاشت کے ساتھ قبول کرلے اگرچہ وہ کتنی ہی تھوڑی اور کیسی ہی خراب چیز کیوں نہ ہو۔

فرسن: کھریا کھر کے نیچے والا گوشت جو بظاہر بہت کمتر شی ہے، لیکن جذبۂ محبت میں دی ہوئی قلیل شی بھی بڑی شی ہے، اور بعض اہل علم نے ''جارۃ'' سے سوکن بھی مراد لیا ہے۔

تین چیزوں کو واپس نہیں کرنا چاہئے

{٢٨٩٨} وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ لَا تُرَدُّ الْوَسَائِدُ وَالدُّهْنُ وَاللَّبَنُ۔ (رواہ الترمذی) وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ قِیْلَ اَرَادَ بِالدُّهْنِ الطِّیْبَ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ٢/١٠٧، الادب، باب کراھة رد الطیب، حدیث نمبر: ٢٧٩٠،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ہیں (جو) واپس نہ کی جائیں۔ ایک تکیہ اور دوسری تیل اور تیسری چیز دودھ۔ (ترمذی) اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا: دہن سے مراد خوشبو ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مہمان کو تواضع کے طور پر تکیہ دے یا تیل دے اور یا پینے کے لئے دودھ دے تو اس مہمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اسے قبول کرنے سے انکار کردے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ”دُهْن“ یعنی تیل سے مراد خوشبو ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ ”دھن“ سے مراد تیل ہی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں بھی اہل عرب اپنے سروں میں عمومیت کے ساتھ تیل لگایا کرتے تھے۔

پھول بھی بڑا تحفہ ہے

{٢٨٩٩} وَعَنْ اَبِیْ عُثْمَانَ النَّهْدِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُعْطِیَ اَحَدُكُمُ الرَّیْحَانَ فَلَا یَرُدُّهٗ فَاِنَّهٗ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ۔ (رواہ الترمذی مرسلا)

حوالہ: ترمذی شریف: ٢/١٠٧، الادب، باب کراھة رد الطیب، حدیث نمبر: ٢٧٩١،

ترجمہ: حضرت ابوعثمان نہدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: جب تم کو پھول (خوشبو) پیش کیا جائے تو اس کو رد نہ کرو، کیونکہ وہ جنت سے سے نکلا (اور نازل) ہوا ہے۔

تشریح: ''وہ پھول جنت سے آیا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ خوشبودار پھول کی ایک فضیلت وخصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑ جنت سے آئی ہے۔اس طرح اس میں سے جو خوشبو آتی ہے وہ گویا جنت کی خوشبو ہے، پھر یہ کہ پھول کا تحفہ بہت سبکساری یعنی بہت کم احسان رکھتا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس کی وضاحت بیان کی جا چکی ہے۔لہٰذا جب کسی کو خوشبودار پھول دیا جائے تو اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

019 Babul Ataya

الفصل الثالث

ناحق پر شہادت ناجائز ہے

{۲۹۰۰} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَتْ اِمْرَأَةُ بَشِیْرٍ: اِنْحَلْ اِبْنِیْ غُلَامَكَ وَاشْهِدْ لِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنَّ ابْنَةَ فُلَانٍ سَأَلَتْنِیْ اَنْ اَنْحَلَ اِبْنَهَا غُلَامِیْ وَقَالَتْ: اَشْهِدْ لِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَلَهٗ اِخْوَةٌ قَالَ: نَعَمْ! قَالَ اَفَكُلَّهُمْ اَعْطَیْتَهُمْ مِثْلَ مَا اَعْطَیْتَهٗ قَالَ: لَا قَالَ: فَلَیْسَ یَصْلُحُ هٰذَا وَاِنِّیْ لَا اَشْهَدُ اِلَّا عَلٰی حَقٍّ. (رواہ مسلم)

حواله: مسلم شریف: ۲/۳۷، باب کراھة تفضیل بعض الاولاد فی الھبة، حدیث نمبر: ۱۶۲۴۔

حل لغات: انحل: ہمزہ وصل کے ساتھ، نون ساکن اور حاء پر فتحہ، ماضی کا صیغہ ہے، عطیه: ہدیہ یعنی عطیہ اور ہدیہ دیا ہے۔ الا حق: اور ایک روایت میں اس کی ضد ”جور“ ہے، مطلب یہ ہے کہ جو حق ہو اور ظلم نہ ہو۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بشیر کی زوجہ نے کہا: کہ میرے بیٹے اپنے لڑکے (نعمان بن بشیر) کو عطیہ دے دو اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (اس پر) میرے حق میں گواہ بناؤ۔ چنانچہ وہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: فلانیہ کی بیٹی (یعنی میری زوجہ) نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میں اپنے لڑکے (یعنی) اس کے بیٹے کو تحفہ دوں اور اس نے یہ بھی کہا ہے: کہ میرے حق میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناؤں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دریافت فرمایا: کیا اس کے اور بھی بھائی ہیں؟ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو اس کے مثل دیا ہے، جو تم نے اس کو دیا، انہوں نے جواباً عرض کیا:

نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر تو یہ درست نہیں اور میں تو حق (خالص جس میں کسی قسم کی کراہت بھی نہ ہو) کے علاوہ پرگواہ نہیں بنوں گا۔

تشریح: ما قبل میں بعینہ یہ حدیث شریف اور اس کا مطلب گذر چکا ہے۔

آنحضرت ﷺ کیلئے نئے پھل کا ہدیہ

{۲۹۰۱} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِبَاكُوْرَةِ الْفَاكِهَةِ وَضَعَهَا عَلٰی عَيْنَيْهِ وَعَلٰی شَفَتَيْهِ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ كَمَا اَرَيْتَنَا اَوَّلَهٗ فَاَرِنَا اٰخِرَهٗ ثُمَّ يُعْطِيْهَا مَنْ يَّكُوْنُ عِنْدَهٗ مِنَ الصِّبْيَانِ۔ (رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر)

حوالہ: بیہقی:؟؟۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس نیا پھل (کہ درختوں پر آنے پر اول اور پہلا پھل) لایا جاتا تو میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ اس کو اپنی آنکھوں اور اپنے لبوں پر رکھتے (نعمت الٰہی کی تعظیم کرتے ہوئے) اور کلماتِ دعائیہ ارشاد فرماتے: یا اللہ! جس طرح آپ نے ہم کو اس پھل کی ابتداء دکھلائی ہے، اسی طرح اس کی انتہاء بھی دکھلا اور پھر وہ پھل ان بچوں کو عنایت فرما دیتے جو کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ہوتے۔

تشریح: باکورۃ: ہر اول شی کو باکورہ کہتے ہیں، اور اس جگہ پھلوں کا اول اور نیا پھل مراد ہے۔ برکت اور برائے دعا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باغات کے اول پھلوں کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ ان کے حق میں دعا فرماتے تھے۔

سنت نبوی ﷺ

اور پھر آنحضرت ﷺ وہ پھل بچوں کو عنایت فرماتے، جس طرح یہ پھل باکورہ ہیں اسی طرح

بچے بھی ثمرۃ الفواد اور باکورۃ الانسان ہیں، لہٰذا ان پھلوں کو ان بچوں کے ساتھ پھل کے باکورہ ہونے میں مناسبت ظاہر ہے، اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ وہ پھول بچوں کو عنایت فرماتے اور بچوں کو رغبت اور میلان زیادہ ہوتا ہے، اس لئے بھی آنحضرت ﷺ اس کی رعایت فرماتے تھے۔ (تعلیق: ۳۸۳)

فائدہ: ابتدائی پھل، ابتدائی پیداوار، ابتدائی آمدنی کا کچھ حصہ اپنے اساتذہ، اپنے مشائخ، اپنے والدین کی خدمت میں بطور تبرک پیش کرنے کا جواز بلکہ استحباب معلوم ہوا۔

باب اللقطة

رقم الحدیث: ۲۹۰۲ر تا ۲۹۰۹ر

020 Babul Luqta

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب اللقطة

(لقطہ کا بیان)

حسب عادت ومعمول ہم یہاں لقطہ کے شروع میں چند امور اور مفید بحثیں ذکر کرتے ہیں، تاکہ احادیث الباب کے سمجھنے میں مفید اور موجب بصیرت ہو۔ واللہ الموفق۔

لقطہ سے متعلق مباحث تسعہ

(۱)......تحقیق اللقطة لغةً

(۲)......حکم الالتقاط۔

(۳)......الفرق بین لقطة الحیوان وغیر الحیوان۔

(۴)......مدة التعریف۔

(۵)......التملک بعد التعریف۔

(۶)......وجوب الضمان عند مجئ المالک۔

(۷)......ھل یدفع الی الناشد بمجرد بیان العلامات۔

(۸)......الاشہاد عند الالتقاط۔

(۹)......لقطة الحاج ماذا حکمہ۔

البحث الاوّل:......لقطہ ضم لام اور فتح قاف کے ساتھ ہے، اگرچہ عوام الناس اس کو سکون قاف کے

ساتھ پڑھتے ہیں۔(زمخشری) ومعناه لغةً الشيء الملقوط۔ [وہ پڑی ہوئی چیز جس کو اٹھالیا گیا ہو۔] حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مشھور عند اھل اللغة والمحدثین تو یہی ہے،لیکن خلیل یہ کہتا ہے کہ لقطہ سکون قاف کے ساتھ ہے،اور لقطہ بالفتح وہ بمعنی لاقط آتا ہے،حافظ کہتے ہیں خلیل جو کہہ رہے ہیں ھو القیاس مسموع من العرب یہی ہے۔(جو مشہور ہے) بلکہ اسی پر اجماع ہے "واما شرعاً ھو مال یوجد ولا یعرف مالکه" یعنی وہ مال جو غیر محفوظ جگہ پڑا ہوا ملے اور اس کے مالک کا پتہ نہ ہو۔

البحث الثانی:......حنفیہ کے نزدیک التقاط اولیٰ ہے،بشرطیکہ لاقط کو اپنے نفس پر اطمینان ہو اور اگر خیانت کا اندیشہ ہو فالترک اولیٰ۔(درمختار) اور صاحب بدائع فرماتے ہیں: اپنی نیت سے اٹھانا تو حرام ہے،مثل غصب کے اور خوفِ ضیاع کے وقت التقاط واجب ہے،اس لئے کہ جس طرح شخص مسلم کی جان کے لئے حرمت ہے اسی طرح مال کے لئے بھی،دونوں کی حفاظت واجب ہے،ورنہ اگر وہ شی ضائع ہوگئی تو گناہگار ہوگا۔اور یہی مذہب شافعیہ ومالکیہ اور جمہور کا ہے،البتہ "مغنی" میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ترک التقاط اولیٰ ہے اور دوسرا قول حنابلہ کے یہاں وہی ہے جو جمہور کا ہے۔

البحث الثالث:......لقطہ کی دو قسمیں ہیں۔(۱) لقطۃ الحیوان (۲) وغیر الحیوان۔اوّل کو ضالہ کہتے ہیں اور ثانی کو لقطہ،حنفیہ کے نزدیک تو دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے،جو حکم لقطۂ غیر حیوان کا ہے وہی لقطۃ الحیوان کا ہے۔ان کے نزدیک اس میں ابل اور غنم سب برابر ہیں،لیکن جمہور علماء ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دونوں میں فرق ہے اور ما قبل یعنی بحث ثانی میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ عند الجمہور غیر حیوان کا ہے اور لقطۃ الحیوان میں ان کے یہاں تفصیل ہے،وہ یہ کہ حیوان دو قسم کے ہیں: (۱)......وہ جانور جو اپنی قوت کی وجہ سے صغارِ سباع (چھوٹے موٹے درندوں) سے اپنی حفاظت اور بچاؤ خود کر سکتے ہیں اور ان کے ضیاع کا اندیشہ نہیں ہے،کالابل والخیل والبغال والحمیر اس قسم کے جانوروں کا حکم ائمہ ثلاثہ میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر وہ صحراء میں پائے جائیں تب تو ان کا حکم یہ ہے کہ ان کا التقاط للحفظ جائز ہے،لہٰذا وہ

حیوان اس کے پاس ہمیشہ کے لئے امانت رہے گا، جب بھی اس کا مالک آئے اس کو دیا جائے گا اور للتملک التقاط جائز نہیں، یعنی اس نیت سے کہ ایک سال تک تعریف کریں گے اگر مالک آ گیا تو اس کو دیدیں گے ورنہ خود مالک ہو جائیں گے، اس طور پر التقاط جائز نہیں ہے، اور اگر اس قسم کے جانور آبادی میں پائے جائیں تو شافعیہ کا ایک قول تو یہ ہے کہ وہاں بھی التقاط للتملک جائز نہیں، کما فی الصحراء۔ لیکن ان کا اصح قول یہ ہے کہ آبادی میں ان کا التقاط للتملک جائز ہے، کیونکہ آبادی میں خیانت کرنے والے بہت ہوتے ہیں اور وہاں ضیاع کا اندیشہ ہے، بخلاف جنگل کے، یہ مسلک تو ہوا شافعیہ کا اور حنابلہ کے نزدیک اس قسم کے جانوروں کا التقاط مطلقاً جائز نہیں، خواہ وہ مفازہ میں ملیں یا قریہ (آبادی) میں، جیسا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے، پس ظاہر حدیث پر عمل صرف حنابلہ کا ہوا، حنفیہ کے علاوہ دوسرے ائمہ کا بھی نہ ہوا، حنفیہ کے بارے میں تو سب نے لکھ دیا ہے کہ حدیث ان کے خلاف ہے۔

اور مالکیہ سے مختلف روایات ہیں، ایک روایت ان کی یہ ہے یجوز الالتقاط فی القریہ لا فی الصحراء، اس لئے کہ ضائع ہونے کا خطرہ صرف آبادی میں ہے (کوئی شخص اپنے گھر میں لے جا کر باندھ لے اور اس کو چھپا لے) صحراء میں خطرہ نہیں ہے، یہ تمام تفصیل واختلافات تو ان جانوروں کے بارے میں تھے جن کے ضیاع کا اندیشہ نہیں اور وہ اپنا بچاؤ خود کر سکتے ہیں، اور جو جانور ایسے ہیں کہ وہ صغارِ سباع (وہی الثعلب والذئب وولد الاسد) سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے مثل الغنم وفصلان الابل وعجاجیل البقر وافلاء الخیل (اولاد الخیل) والدجاج ونحوہا ان کا التقاط جمہور علماء کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، خواہ قریہ میں ہوں یا صحراء میں، اس میں امام مالک کا اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بکری وغیرہ جانور اگر صحرا میں ملے تب تو ان کا التقاط جائز ہے اور تملک بھی لیکن اگر قریہ اور آبادی میں ملے تو التقاط تو ان کا جائز ہے، لیکن تملک بعد التعریف جائز نہیں، بلکہ ہمیشہ اس کی حفاظت کی جائے گی، یہاں تک کہ اس کا مالک آ جائے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں یہ فرمایا ہے: "لک او لاخیک او لذئب" لہٰذا یہ حکم صحراء کا ہوا، مصر کا نہیں، کیونکہ ذئب مصر میں نہیں ہوتا صحراء ہی میں ہوتا ہے، جمہور نے اس کا جواب یہ دیا کہ شہر میں

دوسرے قسم کے ہوتے ہیں اور یعنی چور، ڈاکو، لٹیرے وغیرہ۔

اور بعض تقاریر میں اس طرح ہے: "التقاط الابل" حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ضالۃ الابل اور ضالۃ الغنم الگ الگ دو مستقل باب باندھے ہیں، ابل اور جو جانور اس جیسے ہیں قوت وجسامت میں جو صغار سباع (چھوٹے موٹے درندوں) سے خود بچ سکتے ہوں مثلاً بقر وفرس وحمار وغیرہ۔ حنابلہ کے نزدیک ان کا التقاط جائز نہیں، جیسا کہ ظاہر حدیث الباب سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے (کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضالۃ الابل کے بارے میں سوال کیا گیا) ابن قدامہ نے امام احمد وشافعی رحمۃ اللہ علیہما دونوں کا مسلک یہی لکھا ہے لیکن یہ شافعیہ کا ایک قول ہے، اصح قول انکا کما قال النووی فی روضۃ الطالبین وکذا الحافظ العسقلانی والقسطلانی فی شرح البخاری یہ ہے کہ صحراء اور قریہ (آبادی) میں فرق ہے، اس قسم کے جانوروں کا التقاط صحرا میں جائز نہیں۔ **الا للحفظ فقط لا للتملک بعد الۃ عریف** اور اگر آبادی یا اس کے قریب میں پائے جائیں تو اس صورت میں بے شک ان کا التقاط للتملک جائز ہوگا، ایک سال تک تعریف کرے پھر اگر مالک نہ آئے تو خود مالک بن سکتا ہے، اور یہی مسلک تقریباً مالکیہ کا ہے۔ (**کما فی الکافی لابن عبدالبر والمغنی**) اور جو جانور ایسے ہیں کہ وہ صغار سباع سے اپنا بچاؤ خود نہیں کر سکتے، جیسے: بکری وغیرہ تو ان کا التقاط شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، آبادی میں ہوں یا صحراء میں، اس میں امام مالک کا اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں: بکری اگر صحراء میں ملے تب تو اس کا التقاط اور تملک جائز ہے، بلکہ تعریف اور ضمان کچھ بھی واجب نہیں لیکن اگر آبادی میں ملے یا اس کے آس پاس ملے تو پھر اس کی تعریف ضروری ہے، اور تملک بعد التعریف بھی جائز نہیں، بلکہ ہمیشہ اس کی حفاظت کی جائے گی، یہاں تک کہ اس کا مالک آ سکے، یہ تفصیل تو تھی جمہور کے مسلک میں اور حنفیہ کے نزدیک ابل و بقر اور غنم سب کا حکم یکساں ہے، التقاط جائز ہے، ایسے ہی صحراء اور قریہ کا بھی کوئی فرق نہیں، صاحب بدائع نے حنفیہ کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک شخص نے ابل کا التقاط کیا تھا اور اس کی تعریف بھی کی، جب اس کا مالک نہ آیا تو وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ان سے عرض کیا انہوں نے فرمایا: مزید تعریف کر،

اس نے کہا: اجی میرا تو اس میں بڑا حرج ہو چکا ہے، انہوں نے فرمایا: پھر اس کو وہیں چھوڑ جہاں سے اٹھایا ہے، الحاصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں فرمایا: کہ تو نے اس کا التقاط کیوں کیا ہے، اور حدیث شریف کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ یہ منع اس صورت میں ہے جب قرائن سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ اس کا مالک کہیں آس پاس ہی ہے، وہ خود اس کو آ کر لے جائیگا، یشیر الیہ قولہ فی الحدیث حتی یاتیھا ربھا۔ (بذل) اور علامہ سرخسی نے مبسوط میں اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حدیث صلاح کے زمانہ پر محمول ہے، جس وقت اہل صلاح کا غلبہ اور ان کی کثرت تھی اس صورت میں ضیاع کا اندیشہ نہیں تھا اور اب یہ بات ہے نہیں، لکثرۃ الخائنین فی ہذا الزمان، پس اصل چیز اس میں خوف ضیاع ہے، اسی لئے شافعیہ و مالکیہ نے بھی مفازہ اور قریہ کا فرق کیا ہے، کیونکہ آبادی میں خیانت کا اندیشہ ہے، کوئی اپنے گھر لے جا کر باندھ لے گا، مالک کو پتہ لگانا مشکل ہو جائے گا، بخلاف صحراء کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

البحث الرابع:......عند الجمہور ومنہم الائمۃ الثلاثۃ مدۃ تعریف ایک سال ہے اور ہمارے یہاں اس میں تین روایات ہیں: (۱) ظاہر الروایۃ ایک سال ہے مثل جمہور۔ (۲) لقطہ کی حیثیت کے مطابق اگر لقطہ دس درہم سے کم ہے تب تو مدۃ تعریف چند ایام ہیں، اور اگر دس درہم یا اس سے زائد ہے تو ایک سال۔ (۳) علی رأی المبتلی بہ جب تک اس کا گمان یہ ہو کہ تلاش کرنے والا آ سکتا ہے، تعریف کرتا رہے اور جب ظن غالب یہ ہو کہ اب نہیں آ سکے گا کافی دن ہو چکے ہیں تعریف ختم۔

البحث الخامس:......حنفیہ کے نزدیک مدۃ تعریف پورا ہونے تک اگر اس کا مالک نہ آئے لاقط اگر غنی ہو اس کے لئے لقطہ سے خود منتفع ہونا جائز نہیں بلکہ اس کو صدقہ کر دے اور اگر وہ فقیر ہے تو اس کے لئے انتفاع جائز ہے، وہ خود اس کا مالک بن سکتا ہے، مالکیہ کا مسلک بھی اسی کے قریب ہے، ان کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک غنی کے لئے تملک جائز تو ہے، لیکن علی کراہۃ، اور شافعیہ و حنابلہ کے نزدیک تملک مطلقاً جائز ہے، لاقط فقیر ہو یا غنی۔

البحث السادس:......لقطہ کی تعریف کے بعد اگر لاقط نے لقطہ میں تصرف کر لیا تھا پھر بعد میں مالک

بھی آ گیا تو جمہور علماء وائمہ اربعہ کے نزدیک ضمان واجب ہے، اس میں کرابیسی صاحب الشافعی اور امام بخاری وداؤد ظاہری کا اختلاف ہے، ان کے نزدیک ضمان واجب نہیں ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک اس حکم سے ضالۃ الغنم مستثنیٰ ہے، ان کے نزدیک ضمان واجب نہیں ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک اس حکم سے ضالۃ الغنم مستثنیٰ ہے، ان کے نزدیک التقاط کے بعد نہ اس میں تعریف واجب ہے اور نہ ضمان بلکہ اس کو اختیار ہے چاہے تو اس کو صدقہ کردے چاہے خود کھالے۔

واستدل بقولہ علیہ الصلوۃ والسلام فی الحدیث: "فانما ھی لک اولاخیک اوللذئب" یعنی آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ضالۃ الغنم کا التقاط کر لینا چاہئے، اس لئے کہ وہ تیرے لئے ہے اور اگر تو نہیں لے گا تو وہ تیرے کسی بھائی کے لئے ہے اور اگر کسی نے بھی نہ لیا تو پھر بھیڑئیے کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ ذئب پر ضمان نہیں ہے، اسی طرح لاقط پر بھی نہ ہوگا۔

البحث السابع: ...... یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل باب باندھا ہے: "باب اذا اخبرہ رب اللقطة بالعلامة دفع اليه" حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ لامع میں لکھا ہے کہ امام مالک واحمد رحمۃ اللہ علیہما کا مسلک یہی ہے کہ جو شخص عفاص اور وکاء کو پہنچان لے (علامات بتادے) اس کو دیدیا جائے، اور امام ابوحنیفہ وامام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کا مسلک یہ ہے کہ ناشد کے علامات بتانے کے بعد اگر لاقط کا دل گواہی دے تو دے سکتا ہے ورنہ اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا بغیر بینہ کے۔

البحث الثامن: ...... حنفیہ کے نزدیک عند التقاط اشہاد واجب ہے، امام شافعی کی بھی ایک روایۃ یہی ہے، لحديث عياض بن حمار قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من وجد لقطة فليشهد ذا عدل۔ الحديث۔ اور امام مالک واحمد والشافعی فی روایۃ اشہاد واجب نہیں، صرف مستحب ہے، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ نے زید ابن خالد رضی اللہ عنہ کی حدیث شریف میں اس کو بیان نہیں فرمایا، اگر واجب ہوتا تو بیان فرماتے۔

البحث التاسع: ...... حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل باب باندھا ہے، "باب

کیف تعرف لقطة اهل مکة" کتاب اللقطہ کے اخیر میں ایک حدیث مرفوع آرہی ہے، "**نهی عن لقطة الحاج**" اور ایک حدیث شریف میں ہے "**ولا تحل لقطتها الا لمعرف وفی روایة الا لمنشد**" اس حدیث شریف کی بناء پر امام شافعی واحمد فی روایۃ یہ فرماتے ہیں کہ **لقطة الحرم** یعنی مکہ کا التقاط صرف تحفظ اور تعریف کے لئے ہوسکتا ہے اور یہ دیگر عام لقطوں کی طرح نہیں ہے کہ تعریف کے بعد تملک جائز ہوجائے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مکہ کے لقطہ کو اس کے مالک تک پہنچانا ممکن اور سہل ہے، اس لئے کہ وہ لقطہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو مکی کا ہوگا یا کسی آفاقی کا، اگر مکی کا ہے تب تو ظاہر ہے اور اگر آفاقی کا ہے تو چونکہ مکہ مکرمہ میں ہر سال ہر ملک اور ہر شہر سے لوگ آتے ہیں اس لئے جب ہر سال تعریف کیجائے گی تو مالک کا پتہ چل ہی جائے گا اور ان آنے والوں کے ذریعہ اس کو مالک تک پہنچانا آسان ہوگا۔

اور حنفیہ بلکہ جمہور ائمہ کے نزدیک لقطۃ الحل والحرم میں کوئی فرق نہیں ہے اور حدیث شریف کا جواب ان کی طرف سے یہ ہے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ اس کا لقطہ منشد اور معرف ہی کے لئے جائز ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ وہاں کے لقطہ میں مبالغہ فی التعریف کرنی چاہئے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ وہ کسی حاجی کا ہو اور معلوم نہیں اس کا دوبارہ یہاں آنا ہو یا نہ ہو، لہٰذا تعریف میں پوری کوشش کیجائے، اور یا مکہ مکرمہ کی تخصیص تعریف میں اس لئے کی گئی ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ اس لقطہ کو اس کے مالک تک پہنچانا بہت مشکل ہے، خبر نہیں کہ کس مسافر کا ہوگا، دنیا بھر کے آدمی وہاں آتے ہیں، بھیڑ ہوتی ہے، مالک اس کو کہاں تلاش کرتا پھریگا، لہٰذا بغیر تعریف ہی کے وہ اس کا مالک بن بیٹھے، اس خیال کی تردید کے لئے حدیث شریف میں مبالغۃً فرمایا گیا کہ اس کا التقاط صرف تعریف کے لئے کیا جائے ورنہ فی الحقیقت جو حکم دوسرے لقطوں کا ہے وہی لقطۃ الحاج کا ہے۔ **یعنی تعریف ثم التملک ان کان فقیرا او التصدق ان کان غنیا واللہ تعالیٰ اعلم۔ وقدتم بتوفیقه سبحانه وتعالیٰ بیان المباحث التسعة فله الحمد والمنة۔** (الدر المنضود: ۳/۱۴۴)

020 Babul Luqta

﴿الفصل الاوّل﴾

لقطہ کے بعض احکام

{۲۹۰۲} **وَعَنْ** زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلىٰ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ عَنِ اللُّقْطَةِ فَقَالَ اَعْرِفْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَ هَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَاِلَّا فَشَأنُكَ بِهَا قَالَ فَضَالَّةُ الْغَنَمِ قَالَ: هِيَ لَكَ اَوْ لِاَخِيْكَ اَوْ لِلذِّئْبِ قَالَ: فَضَالَّةُ الْاِبِلِ قَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاءُهَا وَحِذَاءُ هَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ فَقَالَ: عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ اَعْرِفْ وِكَاءَ هَا وَعِفَاصَهَا ثُمَّ اسْتَنْفِقْ بِهَا فَاِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا اِلَيْهِ۔

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۳۲۸، کتاب اللقطة، باب اذا لم یوجد بعد سنة، حدیث نمبر: ۲۳۶۵، مسلم شریف: ۲/۷۸، کتاب اللقطة، حدیث نمبر: ۱۷۲۲،

ترجمہ: حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ سے متعلق سوال کیا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (اولاً خود) اس کے برتن اور اس کے تسمہ کو پہچان اور پھر ایک سال تک اس کی تشہیر کر۔ اگر اس کا مالک آجائے (تو اس کو دیدو) ورنہ تو اس کے متعلق با اختیار ہے (جو مناسب خیال کرلے اس پر عمل کر) اس شخص نے سوال کیا گم شدہ بکری کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ بکری تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی یا بھیڑیئے کے لئے، اس شخص نے سوال کیا گم شدہ اونٹ کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھ کو (اونٹ سے متعلق) کیا؟ اس کے ساتھ تو اس کی مشک ہے (پانی کی) اور اس کے موزے (کہ زمین پر چلتا پھرتا ہے) پانی پر وارد ہوتا ہے (کہ از خود پی لے گا) اور درخت

کے پتوں کو کھاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو پکڑ لے گا (لہٰذا اس کو تیری ضرورت ہی نہ پڑے گی۔(بخاری، مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ایک سال تک اس کا اعلان کرو اور پھر اس کا تسمہ اور اس کا برتن پہچان لو اور پھر اس کو خرچ کرلو، بعد میں اگر اس کا مالک آجائے تو پھر اس کو ادا کردینا۔

تشریح: جاء رجل: اس کے مصداق میں تین قول ہیں: (۱) حضرت بلال۔(۲) حضرت عمر بن مالک۔(۳) حضرت سوید جہنی۔ رضی اللہ عنہم

''لقطہ'' ملتقط یعنی اٹھانے والے شخص کے پاس بطور امانت رہتا ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ اس بات پر کسی کو گواہ بنالے کہ میں اس چیز کو حفاظت سے رکھنے اور اس کے مالک کے پاس پہنچانے کے لئے اٹھاتا ہوں اور ''اشہاد'' یعنی گواہ مقرر کرنے میں یہ بھی کافی ہے کہ کہے: **''من سمعتموہ ینشد لقطۃ فدلوہ علی''** (ہدایہ: ۲/۶۱۴)

اور ''لقطہ'' کا اٹھانا مستحب ہے، اگر اس کو اپنے آپ پر یہ اعتماد ہو کہ تشہیر کرکے مالک کے حوالے کردے گا اور اگر یہ اعتماد نہ ہو تو پھر ترک کرنا ہی اولیٰ ہے، لیکن اگر اس نے اس ارادہ سے اٹھایا ہے کہ خود اپنے پاس رکھے گا تو یہ حرام ہے، چنانچہ ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ پھر تو یہ غصب کی طرح ہوگا اور غصب حرام ہے۔(بدائع الصنائع: ۶/۲۰۰)

البتہ اگر یہ خوف ہو کہ چھوڑنے کی صورت میں وہ چیز ضائع ہوجائے گی تو پھر اٹھانا واجب ہے، کیونکہ مسلمان کے مال کی ایسی ہی حرمت ہے جیسے اس کے نفس کی۔(ہدایہ: ۲/۶۱۳) لیکن شرط یہی ہے کہ مالک تک پہنچانے کا ارادہ ہو۔

لقطہ کا اعلان کرنا

''أعرف عفاصها و وکاءها'' جمہور کے نزدیک ''لقطہ'' کی تعریف اور تشہیر کرنا واجب ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے تعریف اور تشہیر کا حکم دیا ہے اور پھر ''التقاط'' یعنی لقطہ اٹھانا جائز، اسی لئے ہے کہ مال اپنے مالک تک پہنچ جائے، لہٰذا اگر لقطہ ملتقط کے ہاتھ میں تشہیر کے بغیر اور مالک تک پہنچنے

کے بغیر رہ جائے تو یہ ہلاک ہونے کے مترادف ہے، جبکہ لقطہ اٹھانے کا جواز ہلاکت سے بچانا تھا، جس کے لئے تعریف اور تشہیر ضروری ہے۔

لقطہ جہاں سے اٹھایا ہے اس جگہ بھی اور ان مقامات پر بھی جہاں لوگوں کا اجتماع رہتا ہے، اس کی تشہیر کی جائے، تشہیر میں ان آلات اور صفات کا ذکر کرے جن سے لقطہ کی پہچان ہو سکے، مثلاً وہ آلات جن سے لقطہ کی شناخت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ''عفاص'' اور ''وکاء'' وغیرہ ہیں۔

(ہدایہ: ۶۱۴/ ۲، بدائع: ۲۰۲/ ۶، البحر الرائق: ۱۵۲/ ۵، فتح الباری: ۸۲/ ۵)

''عفاص'' بکسر العین اس ظرف کا نام ہے جس میں توشہ ہوتا ہے، خواہ وہ چمڑے کا ہو یا کپڑے کا، یا کسی اور چیز کا، چنانچہ علامہ ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **"العفاص الوعاء الذی تکون فیہ النفقة جلدا کان او خرقة او غیر ذلک"** (نہایہ: ۲۶۳/ ۳)

اور وکاء اس ڈوری کو کہتے ہیں جس سے تھیلی اور مشکیزہ وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے، علامہ ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **"وھو الخیط الذی یشد بہ رأس الکیس والبجراب والتربة ونحو ذلک"**

(نہایہ: ۲۲۲/ ۵)

حدیث شریف میں ''عفاص'' اور ''وکائی'' کا ذکر بطور علامت کے ہے کہ جو آدمی اس قسم کی علامت بتا کر مطالبہ کرے تو ''لقطہ'' اس کے حوالہ کیا جائے۔

لہٰذا ''ملتقط'' لقطہ اٹھانے والے کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ لقطہ کی پہچان کی علامت تشہیر کرے، جنس، صفت، مقدار، کیلی چیزوں میں کیل اور وزنی چیزوں میں وزن اسی طرح کپڑوں وغیرہ میں گز اور عددی چیزوں میں تعداد کی تشہیر کرے۔ (فتح الباری: ۸۱/ ۵)

مدت تعریف

مدت تعریف اور تشہیر میں حضرات ائمہ کا اختلاف ہے۔ مشہور اقوال یہ ہیں:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''لقطہ'' خواہ نفیس شی ہو یا خسیس ہو، ہر صورت میں ایک سال تک تشہیر کرنا ضروری ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ (المغنی: ۴/ ۶)

شافعیہ اور مالکیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر "لقطہ" کوئی حقیر چیز ہو تو ایک سال تک تشہیر کرنا ضروری نہیں بلکہ "ملتقط" کی رائے اور ظن پر ہے، جتنی مدت میں اس کے گمان کے مطابق تشہیر ہوسکتی ہے وہی مدت کافی ہے، مثلاً ایک دانق (دانق کی مقدار دراصل چار قیراط ہیں اور ایک قیراط پونے دو رتی ہیں، تو ایک دانق کی مقدار سات رتی کی ہے) چاندی کے لئے ایک دن اور ایک دانق سونے کے لئے دو یا تین دن کافی ہیں۔ اور اگر "لقطہ" قیمتی چیز ہے تو پھر مکمل ایک سال تشہیر کرنا ضروری ہے۔

"حقیر" بے قیمت اور "خطیر" قیمتی چیزوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے کوئی خاص معیار متعین نہیں، بلکہ ملتقط نے جس چیز کے بارے میں یہ گمان کیا کہ اس چیز کے مالک کو اس کے گم ہونے پر زیادہ افسوس نہیں ہوگا، اور نہ وہ زیادہ ڈھونڈے گا، تو یہ چیز حقیر ہے ورنہ پھر حقیر نہیں، بلکہ "خطیر"، قیمتی ہے، بعض حضرات نے حقیر کا اندازہ ایک درہم یا ایک دینار کا لگایا ہے۔ (تکملہ فتح الملہم: ٢/٦٠٧)

حنفیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر لقطہ کی قیمت دس درہم سے کم ہے تو اس کی تشہیر و تعریف چند دن ہوگی اور اگر دس درہم یا اس سے زیادہ ہے تو ایک سال تک ہوگی۔ (ہدایہ: ٢/٦١٤، اور ایام کی مزید تفصیل کے لئے اسی صفحہ پر حاشیہ: ٩/ دیکھئے۔)

جبکہ راجح قول حنفیہ کے نزدیک جس کو شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ لقطہ کی تعریف و تشہیر کے لئے شرعاً کوئی مدت متعینہ مقرر نہیں، بلکہ مدت کا دارومدار ملتقط کے ظن غالب پر ہے، جب تک اس کے گمان میں مالک اس کا طلب گار رہے گا اس وقت تک ملتقط پر تعریف و تشہیر لازم ہے، البتہ جب اس کے گمان میں مالک مزید طلب نہیں کرتا تو تشہیر کی ذمہ داری بھی اس سے ساقط ہو جائے گی۔

تو گویا کہ مدت کا اختلاف اشیاء اور ان کی قیمت کے اختلاف پر مبنی ہے، کبھی تو لقطہ ایسا ہوگا کہ ملتقط کے گمان میں اس کی تعریف ایک دو دن میں ہو جائے گی اور کبھی اتنا قیمتی ہوگا کہ ایک سال بھی اس کی تشہیر کے لئے کافی نہیں ہوگا، لہٰذا کسی خاص مدت کی تعیین نہیں ہوسکتی۔ (المبسوط: ١١/٣)

صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کا میلان بھی ادھر ہی ہے، چنانچہ انہوں نے اس قول کو سب سے آخری میں ذکر کیا۔ (ہدایہ: ٢/٦١٤) اور صاحب فتح القدیر نے بھی امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کر کے اس کو راجح

020 Babul Luqta

قرار دیا ہے۔(فتح القدیر:۳۵۱/۵)

فان جاء صاحبها و الا فشانک: اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدت تشہیر گذر جانے کے بعد اگر مالک نہ آئے تو ملتقط اس لقطہ کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے، خواہ ملتقط ”لقطہ اٹھانے والا“ مالدار ہو یا فقیر اور یہی مسلک شافعیہ اور حنابلہ کا ہے۔

جبکہ حنفیہ کے نزدیک ملتقط لقطہ کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے، بشرطیکہ مفلس ہو، اگر غنی اور مالدار ہے تو اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا، بلکہ اس کو صدقہ کر دے گا، پھر اگر مالک آ گیا تو اس کو اختیار ہوگا چاہے تو وہ اس صدقہ کو برقرار رکھے اور اس کے ثواب کا حقدار بن جائے اور چاہے تو ملتقط یا اس فقیر سے جس کو لقطہ بطور صدقہ دیا گیا ہے تاوان وصول کرے، البتہ اگر لقطہ ہلاک وضائع نہ ہوا ہو بلکہ جوں کا توں موجود ہو تو وہی لے گا تاوان نہیں لے گا۔(المغنی:۶/۷)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں مذہبوں کی طرح روایات منقول ہیں۔شافعیہ اور حنابلہ کا استدلال حدیث مذکور سے ہے، جس میں ارشاد ہے: ”**و الا فشانک بها**“ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مالک نہ آئے تو ”**علیک به**“ تو تم خود اس کو استعمال کر سکتے ہو، چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک تھیلی ملی، جس میں سو درہم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اس کی تشہیر کرائی اور مالک نہ ملنے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے وہ درہم اپنے استعمال میں لائے، حالانکہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ مالدار صحابہ میں سے تھے، فقیر نہیں تھے۔(عمدۃ القاری:۱۲/۲۶۷، بخاری شریف:۱/۳۲۷)

حنفیہ کا استدلال ایک تو ابو داؤد شریف کی روایت سے ہے جس میں ارشاد ہے: ”**فان وجد صاحبها فلیردها علیه و الا فهو مال اللّٰہ یؤتیه من یشاء**“ (ابوداؤد شریف:۱/۲۳۶) [پس اگر اس کا مالک مل جائے تو اس کو اس پر لوٹا دے ورنہ تو وہ اللہ تعالیٰ کا مال ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دے۔]

اس روایت میں لقطہ کو ”مال اللہ“ سے تعبیر کیا ہے اور ”مال اللہ“ عموماً اس مال کو کہا جاتا ہے جس کے حقدار فقراء ہوتے ہیں نہ کہ اغنیاء، لیکن علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس طرح تو تمام اشیاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، خلقاً بھی اور ملکاً بھی، چنانچہ ارشاد ہے: ”وَاٰتُوْهُمْ مِنْ

مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ" (النور:٣٣) (المغنی:٨/٦) [اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال دے رکھا ہے اس اس میں سے ایسے غلام باندیوں کو بھی دیا کرو۔]

دوسرے یہ کہ دیگر روایات اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم بکثرت منقول ہیں جن میں "ملتقط" کو انتفاع باللقطہ کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ لقطہ کو صدقہ کر دے۔(عمدۃ القاری:٢٦٧/١٢) اور یا اپنے پاس مالک کے آنے تک رکھ دے، البتہ جن روایات اور آثار میں لقطہ کے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو وہ اس صورت پر محمول ہیں جبکہ ملتقط فقیر اور مستحق ہو۔(تکملۃ فتح الملہم:٦١٤/٢)

باقی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا جواب علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ ایک تو یہ خاص واقعہ جزئیہ ہے، اس میں عموم نہیں، دوسرے یہ ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے فقیر ہونے کا علم ہو گیا ہو، کیونکہ ایک زمانے میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فقیر تھے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ کے واقعہ میں "اجعلہ الفقراء اقاربک" میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ذکر موجود ہے۔(بخاری شریف:٥٥٧) یا وہ قرض دار ہوں اس وجہ سے ان کو اجازت دی ہو، یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو کہ حربی کافر کا مال ہے، جس سے استمتاع جائز ہے، یا امام کی طرف سے پیشکش ہے جو کہ ہمارے نزدیک بھی جائز ہے۔(عمدۃ القاری:١٢)

قال فضالۃ الغنم قال ھی لک او لاخیک او للذئب: گم شدہ چیز اگر حیوانات کے قبیل سے ہو تو اس کو "ضالہ" اور اگر حیوانات کے قبیل سے نہ ہو تو "لقطہ" کہا جاتا ہے۔(فتح الباری:٨٢/٥)

اس ارشاد کا مقصد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ بکری چونکہ ایک کمزور جانور ہے جو کہ نگہبان نہ ہونے کی صورت میں بھیڑیئے وغیرہ کی گرفت میں جانے سے محفوظ نہیں رہ سکتی اور ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اس لئے بکری کو پکڑنا جائز ہے، بلکہ اسماعیل بن جعفر کی روایت میں تصریح ہے "قال خذھا فانما ھی لک" کہ مالک نہ ہونے کی صورت میں بکری کو پکڑ لو اور بکری کے حکم میں ہر وہ جانور داخل ہے جو اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا، کمزور ہے۔(بخاری شریف:٣٢٩/١، مسلم شریف:٧٨/٢)

اور فقیر ہونے کی صورت میں جب مالک نہ ملے تو وہ تمہاری ہوگی۔ "لاخیک" بھائی کا لقطہ عام ہے یا تو مالک مراد ہے کہ اگر تم نے یہ نہ پکڑی اور مال کے ہاتھ لگ گئی تو وہ لے گا، یا تم نے

پکڑ لی اور مالک آیا تب بھی وہی لے گا، یا بھائی سے مراد "ملتقط اخر" ہے کہ اگر تم نے نہ پکڑی تو تمہارے بجائے کوئی اور مسلمان بھائی اسے پکڑ لے گا، یا وہ مسکین مراد ہے جسے مالک نہ ملنے کی صورت میں صدقے کے طور پر دی جائے۔

اور "ذئب" سے مراد عام سباع اور درندے ہیں جو بکری کو کھاجاتے ہیں۔(فتح الباری: ۸۲/۵)

قال فضالة الابل قال مالک ولها معها سقائها وحذائها: "سقاء" بکسر السین سے مراد اونٹ کا پیٹ ہے، گویا کہ اونٹ کا پیٹ مشک کی طرح ہے، اتنا پانی پی سکتا ہے جس سے وہ کافی دنوں تک گذارہ کر سکے اور "حذائ" سے مراد اونٹ کے گھر ہیں۔

بظاہر "**معها حذاءها و سقاءها**" جملہ متانفہ ہے اور علت کا بیان ہے کہ اونٹ کے اٹھانے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وہ ایک مضبوط اور حفاظت سے مستغنی جانور ہے، پیاس برداشت کر سکتا ہے، گردن کے لمبے ہونے کی وجہ سے سہولت سے کچھ کھا سکتا ہے، اور بدن کی مضبوطی کی وجہ سے نگہبان کی عدم موجودگی میں ضائع و ہلاک نہیں ہوتا۔

اور بعض حضرات نے اس کو جملہ حالیہ بنایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں اونٹ سے کیا مطلب ہے؟ حالانکہ وہ ایسا جانور ہے کہ اس کے پاس زندگی کا سامان موجود ہے، جس کی وجہ سے اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔(مرقاۃ: ۱۶۱/۶)

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں اونٹ کو اس مسافر سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنے ساتھ سامان سفر رکھتا ہے جس کی موجودگی میں اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

اور اس معاملہ میں ہر وہ جانور اونٹ کے حکم میں ہے جو خود اپنی نگہبانی کر سکتا ہے اور خود کچھ کھا پی سکتا ہے، جیسے گدھا گائے وغیرہ۔

علامہ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ اور امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مذہب حنفی میں بکری اور اونٹ کے اٹھانے کی فضیلت میں کوئی فرق نہیں، اگر ضائع ہونے کا خطرہ ہے تو دونوں کا اٹھانا افضل ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کی حدیث شریف خیر القرون کے زمانہ پر محمول ہے، جس میں امانت دار اور اہل صلاح زیادہ تھے، کسی خیانت کا تصور نہیں تھا، اور اس زمانہ میں چونکہ امانت داری نہیں، لہٰذا حفاظت کی

خاطر اٹھانا ہی افضل ہے۔(مرقاۃ: ۶/۱۶۲، نفحات التنقیح: ۳/۵۰۶)

نیز اس زمانہ میں اونٹ کا چھپانا آسان نہیں تھا، سخت مشکل تھا، برخلاف اس زمانہ کے کہ اس زمانہ میں بالخصوص گوشت کی فیکٹریوں کے قریب اس کو ذبح وغیرہ کے ذریعہ چھپانا انتہائی آسان ہے۔

تشہیر کے بغیر لقطہ

{۲۹۰۳} **وَعَنْهُ** قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰوٰى ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَالَمْ يُعَرِّفْهَا۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۷۸، کتاب اللقطۃ، حدیث نمبر: ۱۷۲۵،

ترجمہ: حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی گم شدہ کو جگہ دی تو وہ (خود) گمراہ ہے جب تک اس کا اعلان نہ کرے۔

تشریح: اگر اعلان اور تشہیر کو ترک کر دیا ہے تو یہ اخذ ضلالت، گمراہی اور ناجائز ہوگی، بہرحال تشہیر اور اعلان ضروری ہے اور واجب ہے، نیز بلا اعلان والی صورت میں اس پر تہمت اور الزام آسکتا ہے۔

حرم شریف کا لقطہ

{۲۹۰۴} **وَعَنْ** عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ لُقَطَةِ الْحَاجِّ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۷۸، کتاب اللقطۃ، حدیث نمبر: ۱۷۲۴،

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن عثمان تیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاج کے لقطوں سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: گویا حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے کہ حرم مکہ کی حدود میں پائے جانے والے لقطہ کا تشہیر و اعلان کے بعد بھی مالک ہونا جائز نہیں ہے، بلکہ اٹھانے والے کے لئے واجب ہے کہ وہ اسے

اپنے پاس اس وقت تک جوں کا توں رہنے دے، جب تک کہ اس کا مالک لینے نہ آئے، خواہ کتنی ہی مدت گذر جائے، چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے، لیکن حنفیہ کے مسلک میں زمین حل اور زمین حرم کا لقطہ برابر ہے، چنانچہ اس کا بیان "باب حرم مکہ" میں گذر چکا ہے۔ (باقی تفصیل شروع مباحث میں گذر چکی۔)

الفصل الثانی

درخت پر پھل کا حکم؟

{۲۹۰۵} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الثَّمَرِ الْمُعَلَّقِ فَقَالَ: مَنْ اَصَابَ مِنْهُ مِنْ ذِيْ حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً فَلَا شَيْئَ عَلَيْهِ وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْئٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ غَرَامَةُ مِثْلَيْهِ وَالْعُقُوْبَةُ وَمَنْ سَرَقَ مِنْهُ شَيْئًا بَعْدَ اَنْ يُّؤْوِيَهِ الْجَرِيْنُ فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ وَذَكَرَ فِيْ ضَالَّةِ الْاِبِلِ وَالْغَنَمِ كَمَا ذَكَرَ غَيْرُهٗ قَالَ: وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ فَقَالَ مَا كَانَ مِنْهَا فِي الطَّرِيْقِ الْمَيْتَاءِ وَالْقَرْيَةِ الْجَامِعَةِ فَعَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا فَادْفَعْهَا اِلَيْهِ وَاِنْ لَّمْ يَأْتِ فَهُوَ لَكَ وَمَا كَانَ فِي الْخَرَابِ الْعَادِيْ فَفِيْهِ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ۔ (رواه النسائی) وَرَوٰى اَبُوْدَاوُدَ عَنْهُ مِنْ قَوْلِهٖ وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ اِلٰى اٰخِرِهٖ۔

حوالہ: نسائی شریف: ۲/ ۲۲۶، کتاب قطع ؟؟؟، التمر یسوق بعد ان یورید الجرین، حدیث نمبر: ۴۹۵۸، ابو داؤد شریف: ۱/ ۲۴۰، کتاب اللقطة، حدیث نمبر: ۱۷۱۰،

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد خود از جد خود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (درختوں یا اور جگہ پر) معلق پھلوں سے متعلق سوال کیا گیا (کہ انکا

حکم کیا ہے؟) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کسی ضرورت مند شخص نے اس میں سے کچھ لیا ہے درانحالیکہ باندھ کر لیجانے والا نہ ہو تو اس پر کوئی تاوان نہیں اور جو شخص اس میں ساتھ لے گیا تو پھر اس پر اس کا دوگنا ضمان ہوگا اور سزا (بھی) اور جس شخص نے ان پھلوں میں سے کھلیان میں جگہ پالینے کے بعد چوری کرلی اور وہ پھر ایک ڈھال کی قیمت کے برابر پہنچ گئی تو اس پر ہاتھ کے کاٹنے کی سزا ہوگی اور گم شدہ اونٹ اور بکریوں سے متعلق (بھی) راوی نے بیان کیا: جس کو دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے۔

حدیث شریف کے راوی حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے جدامجد نے نقل کیا: اور آنحضرت ﷺ سے لقطہ سے متعلق سوال کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لقطہ عام راستہ یا آبادی بستی میں پایا جائے، تو اس کا اعلان ایک سال تک کیا جائے، پھر اگر اس کا مالک آجائے تو اس کو دیدیا جائے اور اگر مالک نہ آئے تو وہ تیرے لئے ہے (یعنی جس نے اس کو اٹھایا ہے) اور جو لقطہ غیر آباد جگہ سے ملا ہو تو اس لقطہ اور کان میں پانچواں حصہ ہے۔ (نسائی) اور امام ابوداوؒد نے بروایت عمرو بن شعیب "وسئل عن اللقطة" سے آخر حدیث تک روایت نقل کی ہے۔

تشریح: آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا ان پھلوں کے متعلق جو درختوں پر لگے ہوئے ہوں (یعنی یہ کہ ان کو راہ گیر توڑ کر کھا سکتا ہے یا نہیں) تو آنحضرت ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کہ جو شخص ضرورت مند ان کو توڑ کر منہ میں رکھ لے (اور وہیں کھالے) اور توڑ کر اپنے ازار کے نیفہ میں نہ رکھے تو کچھ حرج نہیں ہے اور جو شخص توڑ کر اپنے ساتھ لے جائے تو اس صورت میں اس پر ڈبل جرمانہ (ضمان) ہوگا اور سزا بھی یعنی ضمان کے علاوہ اس کو تعزیر بھی کی جائے گی۔ (پٹائی کی جائے گی۔)

حدیث سے ثابت شدہ مسئلہ اور اختلاف ائمہ

مسئلہ کی بات یہ ہے کہ جو پھل درخت سے ہوا وغیرہ کی وجہ سے نیچے گر جائے تو راستہ چلنے والا اس کو اٹھا سکتا ہے، اس کے مالکوں کی طرف سے عام طور پر اجازت ہوتی ہے، لیکن کسی کے درخت سے پھل توڑ کر لینا بغیر اس کی اجازت کے یہ بالاتفاق ناجائز ہے، لیکن اس حدیث شریف میں اس کی اجازت مذکور ہے البتہ یہ ہے کہ اسی جگہ حسب ضرورت وحاجت کھا سکتا ہے، اپنے ساتھ نہ لیجائے، اس کو یا تو اس پر

محمول کیا جائے کہ یہ ابتداء اسلام میں تھا، بعد میں منسوخ ہوگیا، اور یا یہ کہا جائے کہ "فلا شیء علیه" کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت اور مجبوری کی حالت میں توڑ کر کھا سکتا ہے، اس میں گناہ نہیں ہے، اگرچہ ضمان دینا ہوگا صرف گناہ کی نفی مراد ہے۔ مزید وضاحت اس مسئلہ کی گذر چکی ہے۔

ایک اور اختلافی مسئلہ

پھر اس کے بعد جو فرمایا گیا جو ساتھ لے جائے گا اس پر دوگنا ضمان ہوگا، یہ بات قاعدۂ شرعیہ کے خلاف ہے، شی متلف کی غرامۃ اس کی قیمت کے برابر ہوتی ہے، اس سے زائد نہیں۔

قال اللہ تعالی: "وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ" (سورۃ النحل)

[اور اگر تم لوگ (کسی کے ظلم کا) بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے۔]

اس حدیث شریف کے ظاہر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عمل تھا اور ائمہ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی، جمہور علماء اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ یا تو منسوخ ہے یا زجر و توبیخ پر محمول ہے۔

ومن سرق منه شيئا بعد ان يؤويه الجرين: یہ کتاب الحدود کا مسئلہ ہے۔ (حد سرقہ) جو یہاں اس حدیث شریف میں آ گیا، جرین وہ جگہ جہاں کھجوروں کو خشک کرتے ہیں، وہ جگہ عام طور سے محفوظ ہوتی ہے، وہاں حرز پایا جاتا ہے، بخلاف ثمر معلق کے کہ وہ غیر محرز (غیر محفوظ) ہوتے ہیں اور سرقہ کے لئے حرز یعنی مال محرز ہونا ضروری ہے، بغیر اس کے سرقہ کی تعریف نہیں پائی جاتی، اسی لئے وہاں قطع ید نہیں ہوتا، یعنی جو شخص جرین میں سے پھلوں (تمور) کی چوری کرے گا بشرطیکہ نصاب سرقہ پایا جائے جو کہ ثمن المجن ہے (ڈھال کی قیمت کے برابر) جس کا مصداق جمہور کے نزدیک ربع دینار (تین درہم) ہے اور حنفیہ کے نزدیک ایک دینار (دس درہم) ہے تو اس کا قطع ید ہوگا۔ (الدر المنضود: ۱۵۱/۳)

فقال ما كان فيها في الطريق الميتاء الخ: الطریق المیتاء چالو راستہ، جس پر لوگوں کی چلت پھرت ہو، "المیتائ" اتیان سے ماخوذ ہے، مطلب حدیث یہ ہے کہ جو شی ایسی جگہ میں سے ملے جو آباد ہو تو ظاہر ہے کہ وہ کسی آنے جانے والے کی گری ہوگی، لہٰذا اس کو لقطہ قرار دیا جائے گا اور لقطہ کا حکم اس پر

جاری ہوگا، یعنی تعریف سنة اور جوشی ویران جگہ میں سے ملے جہاں لوگوں کا آنا جانا نہ ہوتو ظاہر یہ ہے کہ وہ رکاز (دفینہ) ہوگا، جس پر کی مٹی بارشوں اور ہواؤں سے ہٹ کر وہ اوپر آ گیا، لہٰذا اس میں رکاز کا حکم جاری ہوگا، یعنی تخمیس۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لقطہ پانے کا قصہ

{۲۹۰۶} **وَعَنْ** اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ وَجَدَ دِیْنَارًا فَاَتٰی بِهٖ فَاطِمَةَ فَسَأَلَ عَنْهُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا رِزْقُ اللهِ فَاَكَلَ مِنْهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَكَلَ عَلِیٌّ وَفَاطِمَةُ فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَتَتْ اِمْرَأَةٌ تَنْشُدُ الدِّیْنَارَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَلِیُّ! اَدِّ الدِّیْنَارَ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤدشریف: ۱/۲۴۰، کتاب اللقطة، حدیث نمبر: ۱۷۱۴،

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ایک دینار ملا، اس کو حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس لائے، اور اس کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا (عطاء فرمودہ) رزق ہے، چنانچہ اس سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کھایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی کھایا، پھر جب ایک عورت اس دینار کو تلاش کرتی ہوئی آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے علی! وہ دینار تم ادا کرو۔

تشریح: مضمون حدیث یہ ہے کہ ایک مرتبہ کی بات ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر تشریف لے گئے، وہاں دیکھا کہ حضرات حسنین (دونوں بیٹے) رو رہے ہیں، انہوں نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ کیوں رو رہے ہیں، انہوں نے فرمایا: بھوک کی شدت کی وجہ سے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پریشانی میں گھر سے نکلے، راستہ میں ایک دینار پڑا ہوا ملا، انہوں نے اس کو اٹھا لیا اور اس کو لے کر

پاس آئے، انہوں نے فرمایا: اس میں سے کچھ کا آٹا لے آؤ، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک یہودی دوکاندار کے پاس گئے اور اس سے آٹا خریدا، یہودی نے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کے داماد ہو جو اپنے کو نبی کہتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، اس پر یہودی نے کہا: لو اپنا دینار اور یہ آٹا ویسے ہی لے جاؤ (تم کو ہدیہ ہے)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ آٹا لے کر گھر آئے، اہلیہ محترمہ سے یہودی کی بات بیان کی، پھر انہوں نے فرمایا: اچھا ان میں سے ایک درہم کا گوشت لے آؤ، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاب کے پاس تشریف لے گئے اور ایک درہم کا گوشت خریدا، اور اس ایک درہم کے بدلہ میں یہ دینار رہن رکھوا دیا، اور گوشت لے آئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آٹا گوندھا، اور گوشت ہانڈی میں ڈال کر چولہے پر رکھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بلایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لے آئے، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قصہ کو سن لیجئے، اس کے بعد اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دیں گے تو کھائیں گے ورنہ نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا قصہ سن کر فرمایا: ”کلو باسم اللہ“ [اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کھاؤ۔] چنانچہ سب نے بیٹھ کر کھانا کھایا، اسی اثناء میں ایک غلام (لڑکا) اللہ تعالیٰ اور اسلام کا واسطہ دیکر سوال کرتا ہوا آیا کہ اگر کسی نے میرا دینار اٹھایا ہو تو دیدے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے کو بلایا اور اس سے دینار کی بابت دریافت فرمایا، اس کی بات سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: اے علی! جزّار کے پاس جا کر کہو کہ وہ دینار جو تیرے پاس بطور رہن رکھا ہوا ہے وہ دیدے اور تیرا وہ درہم میرے ذمہ میں ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ دینار لے آئے اور اس لڑکے کو دیدیا، اس قصہ کے ایک دوسرے طریق میں اس طرح ہے کہ کچھ روز بعد ایک عورت اپنا دینار تلاش کرتی ہوئی آئی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہہ کر اس کو دینار دیدیا۔

اس قصہ پر فقہی کلام

اس قصہ میں ایک اشکال تو عام ہے جملہ مذاہب کے اعتبار سے وہ یہ کہ یہاں اس لقطہ کی تعریف کیوں نہیں کی گئی؟ دوسرا اشکال حنفیہ کے مسلک کے لحاظ سے ہے وہ یہ کہ حنفیہ کے نزدیک لقطہ کا حکم

تصدق ہے، غنی کے لئے اس سے تمتع جائز نہیں، نیز ہاشمی کے لئے بھی جائز نہیں، حالانکہ اس لقطہ کو ہاشمی (حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہم) بلکہ سید الہاشمین ﷺ نے نوش فرمایا۔

اس اشکال کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں۔ حضرت نے محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ بذل المجہود میں اس پر تفصیلی کلام فرمایا ہے، ہم اس کا خلاصہ یہاں پر لکھتے ہیں:

(۱)……حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس لقطہ کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کو جا کر آپ کی مجلس میں کی۔ یہ فی الجملہ تعریف ہوگئی، تعریف کے لئے الفاظ معین نہیں ہیں جن کے بغیر تعریف معتبر نہ ہوتی ہو۔

(۲)……علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ روایۃ مصنف عبدالرزاق میں بھی ہے اس میں تعریف مذکور ہے، چنانچہ وہاں اس طرح ہے: **"فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال عرفہ ثلثۃ ایام قال فعرفہ ثلاثۃ ایام فلم یجد من یعرفہ الخ"**

(۳)……امام بیہقی فرماتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے، بعض راوی اس کے ضعیف اور بعض مجہول، نیز اس میں اضطراب ہے، کسی روایت میں ہے کہ "ناشد (تلاش کرنیوالا) ایک غلام تھا، اور کہیں یہ ہے کہ وہ ایک عورت تھی، نیز ایک طریق میں اس طرح ہے کہ چند روز بعد ناشد آیا، اور بعض میں ہے اسی روز جس روز کا یہ واقعہ ہے آیا، نیز یہ حدیث احادیث صحیح کے معارض ہے، جن میں تعریف لقطہ کا حکم ہے، لہٰذا اس حدیث شریف کا اعتبار نہ ہوگا، یا پھر یوں کہا جائے کہ یہ اضطرار پر محمول ہے اضطرار کی وجہ سے وقتی طور پر تعریف ساقط ہوگئی۔

(۴)……علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ ایک اور ہی ہے، وہ یہ کہ یہ ملقیٰ الملک تھا، (فرشتہ اس کو ڈال گیا تھا) اہل بیت کی اعانت کے لئے۔

(۵)……حضرت اقدس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ یہ ہے کہ لقطہ کا التقاط کبھی تو للتحفظ ہوتا ہے، اس صورت میں ید لاقط ید امانت ہوتا ہے، وہاں فوراً اس کی تعریف ضروری ہوتی ہے اور اس میں تصرف ناجائز ہوتا ہے، اور کبھی لقطہ کا التقاط للانفاق ہوتا ہے لاجل الاضطرار۔ وہاں لاقط کا قبضہ لقطہ پر قبض ضمان ہوتا ہے، یعنی ناشد کے ان پر اس کا ضمان دینا واجب ہوتا ہے اور بوجہ اضطرار کے

020 Babul Luqta

سر دست اس لقطہ کا انفاق جائز ہوتا ہے، حضرت فرماتے ہیں یہاں اس قصہ میں یہی دوسری صورت تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۶)……حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے بذل المجہود میں اپنی رائے یہ لکھی ہے کہ میرے نزدیک یہ واقعہ شروع زمانہ کا ہے، جس وقت تعریف لقطہ کا حکم ہی نہیں ہوا تھا، لہٰذا تعریف تو اس لئے نہیں ہوئی باقی یہ ہے کہ بنو ہاشم کے لئے اس کا کھانا کیسے جائز ہوا اس کا تو صدقہ ہونا چاہئے تھا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ ایسا لاجل الاضطرار ہوا۔ (ملخصا من البذل) (الدر المنضود: ۳/۱۵۱)

اگر نیت میں فساد ہے

{۲۹۰۷} **وَعَنِ** الْجَارُوْدِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ضَالَّۃُ الْمُسْلِمِ حَرَقُ النَّارِ۔ (رواہ الدارمی)

حوالہ: دارمی: ۲/۳۴۴، باب فی الضالۃ، حدیث نمبر: ۲۶۰۱،

ترجمہ: حضرت جارود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کی گم شدہ چیز آگ کا شعلہ ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی لقطہ کو اس بدنیتی کے ساتھ اٹھائے کہ میں اس کا مالک ہوجاؤں گا، نیز وہ ان احکام کو پورا نہ کرے، جو لقطہ کے سلسلہ میں از قسم تشہیر وغیرہ شریعت نے نافذ کئے ہیں تو وہ لقطہ اس شخص کو دوزخ کی آگ کے حوالہ کردے گا۔

لقطہ پر گواہ ہونا ضروری ہے

{۲۹۰۸} **وَعَنْ** عَیَاضِ ابْنِ حِمَارٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدَ لُقْطَۃً فَلْیُشْھِدْ ذَا عَدْلٍ اَوْ ذَوَیْ عَدْلٍ وَلَا یَکْتُمْ وَلَا یُغَیِّبْ فَاِنْ وَجَدَ صَاحِبَھَا فَلْیَرُدَّھَا عَلَیْہِ وَاِلَّا فَھُوَ مَالُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والدارمی)

حوالہ: مسند احمد: ۴/ ۱۶۲، ابوداؤد شریف: ۱/ ۲۴۰، کتاب اللقطة، حدیث نمبر: ۱۷۰۹، دارمی: ۲/ ۳۴۵، باب فی الضالة، حدیث نمبر: ۲۶۰۲۔

ترجمہ: حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس شخص کوکوئی لقطہ ملا ہوتو وہ (اس پر) ایک عادل یادو ذی عدالت کوگواہ بنالے اوراس کو چھپائے نہیں (کہ اس کااعلان نہ کرے) اورنہ غائب کرے، پھر اگراس کا مالک مل جائے تواس کو دے دے اوراگر مالک نہ آئے تو یہ اللہ تعالیٰ کا مال ہے، جس کو چاہتا ہے وہ عنایت کرتا ہے۔

تشریح: جب کوئی شخص لقطہ اٹھائے تو وہ اس وقت کسی کواس بات پرگواہ بنالے کہ مجھے یہ چیز بطورلقطہ ملی ہے، تاکہ کوئی دوسرا شخص (مثلاً مالک) نہ تواس پر چوری وغیرہ کی تہمت لگاسکے اورنہ کمی بیشی کادعویٰ کرسکے، گواہ بنالینے میں ایک مصلحت وفائدہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں اس کا نفس حرص وطمع میں مبتلا نہیں ہوگا، کیونکہ بغیرگواہ کے یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ نفس بدنیتی میں مبتلا ہوجائے، اور یہ سوچ کرکہ جب کوئی گواہ نہیں ہے تو یہ چیز مالک کو دینے کے بجائے خود کیوں نہ رکھ لوں، جبکہ گواہ بنالینے سے نہ صرف یہ کہ یہ طمع نہیں ہوتی بلکہ وہ لقطہ مالک کے حوالہ کرنا یوں بھی ضروری ہوجاتا ہے، پھر اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اٹھانے والے کی ناگہانی موت کے بعداس کے ورثاء اس لقطہ کو اپنی میراث اورترکہ میں داخل نہیں کرسکتے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ گواہ بنالینے کا یہ حکم بطریق استحباب ہے، جبکہ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم بطریق وجوب ہے۔ اس حدیث شریف میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ ’’وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال ہے‘‘ جبکہ اوپر کی حدیث شریف میں اسے ’’اللہ کا دیا ہوا رزق ہے‘‘ کہا گیا ہے، لہٰذا ان دونوں سے مراد ’’حلال‘‘ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مالک کے نہ آنے کی صورت میں وہ لقطہ ایک ایسا حلال مال ہے جس سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، جسے خدا نے غیب سے دیا ہے، ہاں اگر بعد میں مالک آجائے تو پھر اس کا بدل دینا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔ تفصیل ماقبل میں گذرچکی۔

اگر وہ شیٔ حقیر ہو؟

{۲۹۰۹} وَعَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ رَخَّصَ لَنَا رَسُوْلُ

اللہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْعَصَا وَالسَّوْطِ وَالْحَبْلِ وَاَشْبَاھِہٖ یَلْتَقِطُہُ الرَّجُلُ یَنْتَفِعُ بِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد) وَذُکِرَ حَدِیْثُ مِقْدَامِ ابْنِ مَعْدِیْکَرِبَ اَلَا لَا یَحِلُّ فِیْ بَابِ الْاِعْتِصَامِ۔

حوالہ: ابو داؤد شریف: ۱/۲۴۱، کتاب اللقطة، حدیث نمبر: ۱۷۱۷،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عصاء اور کوڑا اور رسی اور جو اس کے مثل (کم قیمتی چیزیں ہوں ان) کی اجازت دی ہے کہ آدمی اس کو اٹھالے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔(ابوداؤد) اور مقدام بن معدیکرب کی حدیث "الا لا یحل فی باب الاعتصام" میں مذکور ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ محقرات اشیاء (معمولی چیزیں) جن کے بارے میں یہ ظن غالب ہو کہ ان کو کوئی تلاش نہیں کرے گا ایسی اشیاء کا التقاط جائز ہے اور تعریف کی حاجت نہیں بلکہ ان سے انتفاع جائز ہے۔(بذل عن مبسوط السرخسی) (الدر المنضود: ۳/۱۵۳)

021 Babul Faraiz

باب الفرائض

رقم الحدیث: ۲۹۱۰ر تا ۲۹۳۷ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الفرائض

(فرائض کا بیان)

"فرائض" فریضة کی جمع ہے، جیسے "حدائق" حدیقة کی جمع ہے، اور فریضة بروزن فعیلة مفروضہ کے معنی میں ہے، جو کہ ماخوذ ہے فرض سے، جس کے معنی قطع کے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "فرضت لفلان کذا ای قطعت له من المال شیئا"

شریعۃ مطہرہ کی اصطلاح

"المقدرات الشرعیة فی المتروکات المالیـة" کو فرائض کہا جاتا ہے اور چونکہ یہ حصے خداوند قدوس کی طرف سے متعین ہیں، اس لئے ان کو فرائض کہا گیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "نصیبا مفروضا" ای مقدارا معلوما۔ (فتح الباری: ۱۲/ ۳، مرقاۃ: ۱۶۶/ ۶)

فرائض کا علم اہم ترین دینی علوم میں سے ہے اور انسانی معاشرت اور معاش کا ایک بہت بڑا باب اس سے متعلق ہے، شریعت مطہرہ نے اسی وجہ سے فرائض کا زبردست اہتمام کیا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے اس کے جو احکام بیان کئے ہیں وہ عام مسائل کی طرح کلیات کی شکل میں نہیں، بلکہ جزئیات سے بحث کی ہے اور ایک ایک رشتہ دار کا حصہ مستقل طور پر بتایا ہے، اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے بھی فرائض کی تعلیم وتعلم کی خاص طور پر ترغیب دی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ فَإِنَّهُ نِصْفُ الْعِلْمِ وَهُوَ أَوَّلُ شَيْءٍ يُنْسٰى وَأَوَّلُ شَيْءٍ يُنْتَزَعُ مِنْ أُمَّتِي" (ابن ماجہ: ۹۰۸/ ۲) یعنی علم فرائض سیکھو اور لوگوں کو

سکھاؤ، کیونکہ یہ نصف علم ہے اور یہ سب سے پہلی چیز ہوگی جو بھلا دی جائے گی اور سب سے پہلی چیز ہوگی جو میری امت سے اٹھالی جائے گی۔

اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ فَإِنِّي امرؤ مقبوض" (مستدرک حاکم: ۴/۳۳۳) [حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فرائض سیکھ لو اور لوگوں کو سکھاؤ، اس لئے کہ بے شک میں قبض کیا جانے والا (وفات دیا جانے والا) ہوں۔]

میراث کے نازل ہونے کا بیان

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے جو غایۃ درجہ کے شرک وکفر اور ناشائستگی کا زمانہ لوگوں پر گذرا ہے اس کو جاہلیت کہتے ہیں، جاہلیت میں جہاں طرح طرح کی ظالمانہ رسمیں اور جاہلانہ خیالات مثلاً لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینا، غلاموں کے ساتھ سختی اور تشدد کرنا، یتیموں کا مال کھانا وغیرہ شائع اور رائج تھے، وہاں ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ مرنے والے کا مال صرف وہی آدمی لیتے تھے جو پورے مرد، جوان، میدان جنگ میں جانے کے قابل ہوں، عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کو میراث نہیں ملتی تھی، مفلس و بے کس بیوہ اور معصوم ویتیم، مستحق رحم لڑکے لڑکیاں روتے چلاتے رہتے تھے اور جوان، قوی، مالدار چچا اور بھائی آکر آنکھوں کے سامنے سب مال پر قبضہ کر لیتے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں وراثت کے اسباب

(۱)......علاقہ نسب کی وجہ سے یعنی میت کی اولاد میں یا آباء واجداد میں داخل ہونا۔

(۲)......عہد معاہدہ اور مواخات کے سبب سے، یعنی دو شخصوں کا باہمی اقرار کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے رنج وراحت، موت وحیات میں شریک رہیں گے، ایک پر کسی قسم کا تاوان لازم ہوگا تو دوسرا ادا کرے گا جو زندہ رہے گا وہ مرنے والے کی میراث پائے گا۔

(۳)......کسی کو متبنّٰی بنالینے کی بنا پر، یعنی جو شخص کسی کی اولاد کو بیٹا بنالیتا تو وہ دونوں باہم حقیقی باپ بیٹے کی

مانند سمجھے جاتے تھے اور ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔

ابتداء اسلام میں بھی ان ہی علاقوں کی وجہ سے میراث ملتی رہی، پھر جب اسلام کا نور پھیلنا شروع ہوا، یتیموں کے اور عورتوں کے حقوق اور دیگر معاملات کی بتدریج اصلاح ہو رہی تھی تو میراث کا بھی نمبر آیا اور اس سلسلے کی اصلاحات وارد ہوئیں۔

چنانچہ پہلے مرحلے میں یہ لازم ہوگیا کہ ہر شخص بوقت وفات اپنے والدین اور اقرباء کے لئے اپنی رائے سے مناسب سمجھ کر وصیت کر جائے اور اپنے مال میں ان کا حصہ مقرر کر جائے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ" (البقرہ:۱۸۰) فرض کر دیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں سے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال وصیت کرنا ماں باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ۔

اس رحمن ورحیم کی مہربانی اور کرم فرمائی دیکھو کہ اس مسافر آخرت کی پسماندہ چیزیں ابتداء ہی سے بطور خود تقسیم نہیں کیں، بلکہ کچھ عرصہ تک اسی رخصت ہونے والے مسافر کو یہ اختیار دیا کہ جس طرح مناسب سمجھے اپنے والدین اور رشتہ داروں پر اپنا مال تقسیم کر جائے، یعنی دین محمدی کے ابتدائی زمانہ میں مال چھوڑنے والے شخص پر واجب تھا کہ موت کے قریب اپنے والدین اور اقرباء کے لئے اپنی مرضی سے مناسب طریقہ پر وصیت کر جائے کہ اس قدر فلاں کو دیا جائے اور اس قدر فلاں کو۔

لیکن اس درمیانی عرصہ کے تجربہ سے جب خدا تعالیٰ نے لوگوں کو دکھلایا اور یقین کرا دیا کہ پورا عدل وانصاف انسانی طاقت سے باہر ہے، رواداری ولحاظ ومروت کی خاطر کچھ نہ کچھ بے انصافی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ سے یہ اختیار نکال لیا اور اس کام کو خود ہی انجام دیا اور اس قدر اہتمام کیا کہ بلا واسطہ فرشتہ مقرب اور بلا تشریح نبی مرسل مسافر آخرت کے مال کے بارے میں وارثوں کے لئے وصیت کرنے کا حکم منسوخ فرما کر صاف صاف حصے وارثوں کے لئے قرآن مجید میں تجویز فرما دیئے۔

میراث کی ابتداء کا قصہ اس طرح ہے کہ حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، انہوں نے ایک زوجہ مسماۃ ام کجّہ چھوڑی اور تین بیٹیاں، حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے جن دو شخصوں کو اپنے مال کا وصی بنایا تھا انہوں نے حسب رواج جاہلیت کل مال اوس کے چچازاد بھائیوں خالد اور

عرفجہ کو دے دیا اور زوجہ اور بیٹیاں روتی رہ گئیں، ایسی بے کسی اور غریب خواتین کا چارہ گر اور مددگار ذات بابرکات رسول اللہ ﷺ کے سوا کون ہوسکتا تھا، یہ روتی ہوئی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ شوہر کے وصیوں نے نہ مجھے کچھ دیا نہ میری بیٹیوں کو۔

آنحضرت ﷺ نے یہ حال سن کر انتہائی افسوس کا اظہار فرمایا لیکن آنحضرت ﷺ خود مختار حاکم نہ تھے اور اپنی طرف سے فیصلہ نہیں فرما سکتے تھے، اس لئے احکم الحاکمین کے حکم کا انتظار فرمایا اور حضرت اوس رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کو تسلی دے کر فرمایا: اپنے مکان کو لوٹ جاؤ اور جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ نہ ہو صبر کرو، چنانچہ ارشاد ربانی نازل ہوا: "لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ، وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ" (النساء:۷) [مردوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو چاہے وہ (ترکہ) تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مقرر ہے۔]

اس ارشاد سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ترکہ اور میراث صرف مردوں ہی کا حق نہیں، بلکہ مردوں کی طرح عورتوں کا بھی اس میں حق مقرر ہے۔

اس حکم کو سن کر آنحضرت ﷺ نے حضرت اوس رضی اللہ عنہ کے وصیوں کے پاس پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا حق بھی میراث میں مقرر فرمادیا ہے، لیکن ابھی تک مقدار اور حصہ مقرر نہیں فرمایا، لہذا تم اوس رضی اللہ عنہ کے مال کو بجنسہٖ حفاظت سے رکھنا اور اس میں سے کچھ خرچ نہ کرنا، عنقریب کوئی حکم نازل ہوجائے گا۔

اس قصہ کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا اور ابھی تک کوئی خاص حصہ متعین نہیں فرمایا گیا تھا کہ دوسرا واقعہ پیش آیا۔

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے قبیلہ "قبیلہ خزرج" کے ایک جلیل القدر انصاری صحابی رضی اللہ عنہ شوال ۳ھ میں احد کے مشہور غزوہ میں بارہ زخم کھا کر شہید ہوگئے، ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے حسب دستور قدیم کل مال پر قبضہ کرلیا، زوجہ اور دو بیٹیاں محروم رہ گئیں۔

بیکسوں کے فریاد رس آنحضرت ﷺ ہی تھے، تو ان کی زوجہ بھی لڑکیوں کو ہمراہ لے کر

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں فریاد کرنے آئیں اور عرض کیا: کہ حضرت! میرے شوہر سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی یہ دولڑکیاں ہیں، ان کے والد نے غزوہ احد میں آنحضرت ﷺ کے قدموں میں جان نثار کردی، جو کچھ ان کا ترکہ اور مال تھا وہ سب ان لڑکیوں کے چچا نے لے لیا اور ان کے لئے کچھ نہ چھوڑا، اب ان کے نکاح کی فکر ہے اور جب تک کسی قدر مال نہ ہو عزت کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا، آنحضرت ﷺ نے ان کے تصفیہ کو بھی خدا تعالیٰ کے حکم کے انتظار میں ملتوی رکھا اور حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی زوجہ سے یہ ارشاد فرما کر رخصت کردیا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ فرمادیں گے، یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ عورتوں کا بھی حق ہے، البتہ یہ بات معلوم نہیں تھی کہ کونسی عورت حقدار ہے اور اس کو کتنا حصہ ملے گا، چنانچہ اس انتظار کے دوران سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی زوجہ کچھ عرصہ تک صبر کرنے کے بعد پھر روتی ہوئی خدمت مبارک میں آئیں۔

ان کا رونا رحمت الٰہی کے لئے بہانہ بن گیا اور میراث کا سب سے آخری اور قطعی صاف اور واضح حکم "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" (النساء:۱۱) [اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔] نازل ہوگیا۔ جس میں زوجہ اور بیٹیوں کا حصہ بھی مقرر فرمادیا گیا ہے اور تمام وارثوں کے نہایت وضاحت سے یقینی اور قطعی حصے بھی بیان فرمادیئے گئے، جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے اس حکم کی تعمیل میں سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے بھائی کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے بھائی کے مال میں سے دوثلث لڑکیوں کو دے دو اور آٹھواں حصہ ان کی والدہ کو اور جو کچھ باقی رہے وہ تمہارا ہے۔

اسلام کے اس پرحکمت اور سب سے آخری قاعدہ میراث کے مطابق جو سب سے پہلی میراث تقسیم ہوئی ہے وہ یہی حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی میراث تھی، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت اوس رضی اللہ عنہ کے مال میں سے بھی دوثلث تین بیٹیوں کو اور آٹھواں حصہ زوجہ کو اور باقی چچازاد بھائیوں کو دلوادیا اور اسی قاعدہ پر عمل درآمد شروع ہوا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام نے عورت کی عزت اور وقعت کا خاص خیال رکھا ہے، ورنہ اہل دنیا خصوصاً اہل عرب نے ان کو صرف ذریعہ نسل اور سامان نشاط

سمجھ رکھا تھا، زمانہ جاہلیت میں اول تو کسی کو کبھی عورتوں کو میراث دینے کا خیال ہی نہ آیا اور اگر اتفاق سے عرب کے ایک عاقل اور مصلح شخص عامر بن جشم کو خیال بھی آیا تو اس نے بالکل مردوں کی برابر کر کے حصہ عورت کے لئے مقرر کیا اور فرق مراتب کا خیال نہیں رکھا، جس پر چند روز ان کے پیروکاروں نے عمل کیا اور پھر یہ قاعدہ بالکل متروک اور نسیًا منسیًا ہوگیا، ایسی مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ عقول انسانی ہزار بلند پروازی کریں، لیکن اس احکم الحاکمین اور حکیم مطلق کی مصالح اور حکمتوں کی برابری نہیں کر سکتیں۔

اشکال

یہ ظاہر ہے کہ عورت چونکہ خود مال حاصل کرنے سے عاجز ہے، لہٰذا وہ زیادہ قابل رحم اور مستحق مال ہے، وہ تجارت وزراعت مردوں کے برابر نہیں کر سکتی، نیز شوہر کی خدمت اور بچوں کی پرورش میں مصروف رہتی ہے، علاوہ ازیں وہ خلقۃً بھی کمزور ہے، اور پھر حمل کی گرانی، پیدائش کی تکلیف، دودھ پلانے کی محنت اس کو بالکل ہی ناتواں بنا دیتی ہے، نیز بوجہ ناقص العقل ہونے کے وہ اکثر دھوکہ کھاتی ہے اور مال ضائع ہوجاتا ہے، ان امور کے لحاظ سے عورتوں کو مردوں سے زیادہ حصہ دیا جانا مناسب تھا، ورنہ کم از کم برابر تو ضرور دیا جاتا یہ کیسا انصاف ہے کہ اس کا حصہ نصف کر دیا گیا۔

جواب

عورتوں کو خرچ کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے، عام حالت یہ ہے کہ نہ اپنا ضروری خرچ ان کے ذمہ ہوتا ہے نہ اولاد کا، بلکہ شادی ہونے تک ماں باپ ان کی پرورش کرتے ہیں، نکاح کے بعد ان کا تمام خرچ شوہر کے ذمے واجب ہوجاتا ہے اور پھر شوہر سے علاوہ میراث کے مہر کی بھی مستحق ہیں اور ہر قسم کی زائد خرچوں سے آزاد ہیں، اس حالت میں تو نصف حصہ بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، بخلاف مرد کے کہ خود اپنے اور اولاد اور زوجہ کے تمام مصارف اس کے ذمہ ہوتے ہیں اولاد کی پرورش کے مصارف، ان کی تعلیم کے اخراجات سب وہی برداشت کرتا ہے، شادی، نکاح وغیرہ کے بڑے بڑے خرچوں کا بار وہی اٹھاتا ہے۔

شادی، غم، میزبانی، خیرات، چندہ، مکان، لباس وغیرہ جس قدر دنیا کے خرچ ہیں سب اسی کے اوپر ہیں، معاملات کی وجہ سے کبھی کبھی تاوان ونقصان بھی اسی کے سر پڑتا ہے۔

بخلاف عورت کے کہ کوئی بھی خرچ اس کے ذمہ نہیں، چنانچہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں ایسی حالت میں عورتوں کو مردوں سے نصف حصہ ملنے کو اگر کوئی شخص زیادہ سمجھ لے تو چنداں تعجب نہیں، نصف حصے کے خلاف انصاف سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ عورت کم عقل ہے اگر زیادہ مال ہوگا تو زیادہ ضائع کرے گی اور طرح طرح کے فساد کرے گی تو کثرت مال باعث وبال ہو جائے گا، اس لئے کم مال دلا کر فساد سے بھی بچالیا اور مستحق وحقدار قرار دے کر محرومی اور ناقدری سے بھی نجات بخشی۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اس آخری حکم نے میراث کے احکام کی میعاد کو بھی ختم کردیا، زمانہ جاہلیت کا طریقہ بھی ختم ہوا، اور ابتداء اسلام کا قصہ بھی ختم ہوا، وارثوں کے لئے وصیت ناجائز قرار دے دی گئی، چنانچہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند فرمایا: ''ان اللہ قد أعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک مستحق کو اس کا پورا پورا حق عطا فرمادیا ہے، پس اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔

یہ اور بات ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے، چونکہ خالق مختار نے اپنے اختیار سے بعض مخلوق کو بعض پر فوقیت دی ہے، اور اس فطری فضیلت اور فوقیت کو حاصل کرنے کی تمنا سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا" (النساء: ٣٢) اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ تعالیٰ نے ایک کو ایک پر، مردوں کا حصہ ہے اپنی کمائی سے، عورتوں کا حصہ ہے اپنی کمائی سے، اور مانگو اللہ سے اس کا فضل، بے شک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔

اور اب اسلامی شریعت میں اسباب وعلاقہ میراث صرف تین رہ گئے:

(١)……نسب۔ (٢)……نکاح۔ (٣)……ولائ۔ یعنی باہمی معاہدہ وعہد اور غلام آزاد کرنے والے کا حق جنہیں ''مولی الموالات'' اور ''مولی العتاقة'' کہا جاتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مفید الوارثین۔ ٣٠، تا ٣٦ نفحات التنقیح: ٣/٥١١)

﴿الفصل الاوّل﴾

قرضہ اور تقسیم میراث

{۲۹۱۰} وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَنَا اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَلَمْ يَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ تَرَكَ دَيْنًا اَوْ ضَيَاعًا فَلْيَاتِنِيْ فَاَنَا مَوْلَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَاِلَيْنَا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۲/۷۹۹، کتاب الفرائض، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک مالا فلاھلہ، حدیث نمبر: ۶۷۳۱،مسلم شریف: ۲/۳۵، کتاب الفرائض، باب اداء الدین قبل الوصیة، حدیث نمبر: ۱۶۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اہل ایمان کے نفوس سے زیادہ قریب (اور تعلق رکھنے والا) ہوں، جو شخص مر گیا ہو اور اس پر قرضہ ہو اور اس نے قرضہ کی ادائیگی کے مطابق مال نہیں چھوڑا تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا ہو تو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے، اور ایک روایت میں ہے جس شخص نے قرض چھوڑا یا ضائع ہونے والے چھوڑے تو اس (کے ولی یا وکیل) کو چاہئے کہ وہ میرے پاس آئے میں اس کا ولی ہوں۔ اور ایک روایت میں ہے جس شخص نے مال چھوڑا وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے اور جس نے عیال کو چھوڑا وہ ہمارے ذمہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ غایت محبت

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں ہر مسلمان کے اس کی ذات سے بھی زیادہ

قریب ہوں، یعنی آدمی کے مرنے کے بعد اس کے امور کی ایسی ذمہ داری لیتا ہوں اور اس کی اس طرح نصرت کرنے والا ہوں کہ اگر وہ مرنے والا زندہ ہوتا تو وہ خود بھی اپنا اتنا انتظام وانصرام نہ کرسکتا، جتنا میں اس کی طرف سے کرنیوالا ہوں، بڑی عجیب بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے ہر فرد امت سے کتنا قوی اور گہرا تعلق ہے کہ آدمی خود بھی اپنے امور کا خیال اتنا نہیں رکھ سکتا جتنا آنحضرت ﷺ فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی امت سے تعلق اور محبت کی احادیث تو بہت سی ہیں جیسا کہ کتاب الحج میں گذرا کہ آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبات میں بار بار فرمایا: "**خذوا عنی مناسککم لعلی لا اراکم بعد عامی هذا**" [مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو شاید اس سال کے بعد میں تم کو نہیں دیکھ سکوں گا۔] اور ایک حدیث شریف میں ہے: "وددت انی رأیت اخوانی" [میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں۔] کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھتا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کہ کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں، اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ تم تو میرے اصحاب ہو اور ہر وقت پاس رہنے والے ہو، میری مراد تو اخوان سے وہ امتی ہیں جو میرے بعد میں آئیں گے اور پیدا ہوں گے۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

ذوی الفروض مقدم ہوں گے

{۲۹۱۱} **وَعَنِ** ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحِقُوْا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۹۹۷/۲، کتاب الفرائض، باب میراث الولد من ابیه وامه، حدیث نمبر: ۶۷۳۲، مسلم شریف: ۳۴/۲، کتاب الفرائض، فصل الحقوق الفرائض باهلها، حدیث نمبر: ۱۶۱۵۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: فرائض ان کے حق داروں کو پہنچاؤ، پھر (فرائض دیئے جانے کے بعد) جو مال باقی رہے تو

وہ باقی ماندہ مال مرنے والے مردوں میں سے جو زیادہ قریب ہو اس کو دو۔

تشریح: ورثہ کی تین قسمیں ہیں:

(۱)......ذوی الفروض: یعنی وہ ورثاء جن کے حصص قرآن کریم میں مقرر کر دیئے گئے ہیں، جیسے زوجین اور ام ہیں۔

(۲)......عصبات: وہ ورثاء جن کے حصے متعین نہ ہوں، بلکہ جو مال ذوی الفروض سے بچ جائے وہ عصبات لے لیں اور اگر ذوی الفروض نہ ہوں تو تمام مال کے وہی علی وجہ العصوبۃ حقدار ہوں گے، جیسے ابناء اور اخوۃ ہیں۔

(۳)......ذوی الارحام: وہ ورثاء ہیں جن کی میت کے ساتھ قرابت ہو، لیکن نہ وہ ذوی الفروض سے ہوں اور نہ عصبات سے، جیسے عمات اور خالات ہیں۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ذوی الفروض کو ان کے "فرائض" حصے دے دو اس کے بعد بقیہ مال میت کے رشتہ داروں میں سب سے قریبی رشتہ دار مرد یعنی عصبہ کو دیا جائے۔ (تکملۃ فتح الملہم: ۲/۱۴)

اور یہی قاعدہ ہے کہ ذوی الفروض سے جو مال بچتا ہے وہ عصبات کو ملتا ہے۔

فمابقی فھو لأولی رجل ذکر: لفظ "اولی" بمعنی "اقرب" کے ہے اور یہ "ولی" بسکون اللام سے مشتق ہے، جس کے معنی "قرب" کے ہیں، صحیح مسلم کی روایت میں "فھو لأدنی" کے الفاظ بھی آئے ہیں، جو اس معنی میں صریح ہیں۔ یعنی "أقرب العصبات" (فتح الباری: ۱۲/۱۱)

لفظ "رجل" کے بعد "ذکر" بڑھایا، حالانکہ رجل مذکر ہی ہوتا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ اس قسم میں سبب میراث "ذکورۃ" یعنی مذکر ہونا ہے، نیز اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ لفظ "رجل" کو "انثی" مؤنث کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے نہ کہ "صغیر" نابالغ کے مقابلہ میں، لہٰذا ہر مذکر عصبہ میں سے وارث ہوگا خواہ وہ صغیر ہو یا کبیر۔

حدیث مذکور عصبات کے وارث بننے کے لئے اصل مستدل ہے، چنانچہ علماء اہل سنت کا حدیث مذکور کی بنیاد پر اس بات پر اجماع ہے کہ جو مال ذوی الفروض سے بچ جائے وہ مال اقرب العصبات کو مل جائے گا، یعنی ذوی الفروض کے بعد عصبات اپنی ترتیب کے مطابق وارث ہونگے۔

واضح رہے کہ ”ذکورۃ“ یعنی مذکر ہونا عصبہ بنفسہ کے لئے تو شرط ہے، لیکن عصبہ بالغیر جیسے ”بنت“ عصبہ بن جائے۔ ”ابن“ کی وجہ سے اور عصبہ مع الغیر جیسے ”اخت“ عصبہ بن جائے ”بنت“ کے ساتھ تو اس میں ”ذکورۃ“ شرط نہیں، بلکہ ان کو عصبہ بھی حقیقتاً نہیں مجازاً کہا جاتا ہے، حقیقتاً عصبہ ”عصبہ بنفسہ“ ہی ہیں، جن کے لئے ”ذکورۃ“ مذکر ہونا شرط ہے۔ (فتح الباری: ۱۲/ ۱۲، نفحات التنقیح: ۵۱۶/ ۳)

ملت کا اختلاف سبب حرمان ہے

{۲۹۱۲} **وَعَنْ** أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حواله: بخاری شریف: ۲/ ۱۰۰۱، کتاب الفرائض، باب لایرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم، حدیث نمبر: ۶۷۶۴، مسلم شریف: ۲/ ۳۳، کتاب الفرائض، فصل لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم، حدیث نمبر: ۱۶۱۴۔

ترجمه: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوگا اور نہ کافر مسلمان کا۔

تشریح: اس بات پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔ البتہ مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے یا نہیں؟

جمہور امت ائمہ اربعہ اور فقہاء امت کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں بن سکتا، جب کہ حضرت معاذ بن جبل، حضرت معاویہ، حضرت سعید بن المسیب اور مسروق رضی اللہ عنہم سے یہ مروی ہے کہ ان کے نزدیک مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے، اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اور اس کو نکاح پر قیاس کیا جاتا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح اہل کتاب کی عورت کے ساتھ صحیح ہے، جبکہ مسلمان عورت کے ساتھ ان کا نکاح صحیح نہیں۔

اس کے علاوہ ان حضرات کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس میں ارشاد ہے:

”الاسلام یعلو و لا یعلی علیہ“ کہ اسلام غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ان کا استدلال اس ارشاد گرامی سے ہے:

”الاسلام یزید و لا ینقص“ (المغنی:۶/۲۴۶،مرقاۃ:۶/۱۶۸)

[اسلام زیادہ ہوتا ہے اور کم نہیں ہوتا۔]

جمہور کا استدلال حدیث مذکور سے ہے جس میں تصریح ہے: ”لا یرث المسلم الکافر“ کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا اور یہ روایت مسئلہ میراث کے بارے میں نص ہے، جبکہ ان حضرات کی روایت مسئلہ میراث کے بارے میں نص نہیں، بلکہ وہ اس بات پر محمول ہے کہ دین اسلام دیگر ادیان سے افضل ہے۔

باقی میراث کو نکاح پر قیاس کرنا ایک تو اس لئے قبول نہیں کہ یہ قیاس حدیث مذکور نص صریح کے مخالف ہے، دوسرے یہ کہ یہ قیاس ایک اور قیاس سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ یہ کہ میراث کا تعلق ولایت سے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمان اور کافر کے درمیان ولایت نہیں، لہٰذا کوئی ایک دوسرے کا وارث نہیں بن سکتا۔ (فتح الباری:۱۲/۵۰)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کافر مر جائے اور اس کا کوئی کافر رشتہ دار نہیں، جس کو میراث مل جائے، البتہ کوئی مسلمان اس کا رشتہ دار ہے تو مذکورہ صورت میں اس کا ترکہ مسلمان کے بیت المال کو دیا جائے گا، جس میں امام اور حاکم کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد اور رائے سے جیسے مناسب سمجھے خرچ کرے، لیکن اس صورت میں حضرت معاذ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ یہ مال کافر کے مسلمان رشتہ دار کو دیا جائے تاکہ اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں کے دلوں کی تالیف ہو جائے، گویا کہ یہ معاملہ میراث اور توریث کے قبیل سے نہیں، بلکہ تالیف کے قبیل سے ہے، البتہ جب زمانہ گذر گیا تو لوگوں نے اس کو توریث ہی سمجھا اور مسلمان کو کافر کا وارث قرار دینے لگے، تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اسی غلط فہمی کی وجہ سے اس مسئلے کو رد کر دیا اور پہلا حکم کہ مسلمان اور کافر وارث نہیں بن سکتا، ایسا ہی مرتد کا وارث بھی نہیں بن سکتا، جاری فرمایا۔

جبکہ حضرات کوفیین، امام اوزاعی، امام اسحق رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم کے نزدیک مسلمان مرتد کا وارث بن سکتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک جو مال مرتد نے حالت ارتداد میں کمایا ہے وہ مال بیت المال کا ہے اور جو مال حالت اسلام میں کمایا تھا وہ اس کے مسلمان ورثہ کے لئے ہے تو گویا مسلمان وارث بن سکتا ہے لیکن تمام مال میں نہیں۔(مرقاۃ:۱۶۸/۶، طیبی:۱۹۷/۶)

آزاد شدہ غلام کی میراث

{۲۹۱۳} وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَوْلَی الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِہِمْ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف:۲/۱۰۰۰، کتاب الفرائض، باب مولی القوم من انفسھم وابن الاخت، حدیث نمبر:۶۷۶۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قوم کا آزاد کردہ غلام انہیں میں سے ہے۔

تشریح: مولیٰ سے مراد یہاں پر معتق یعنی آزاد کردہ غلام ہے، یہاں یہ حدیث لاکر یہ بتانا مقصود ہے کہ آزاد کردہ غلام کا اگر کوئی عصبہ یا نسب وارث نہ ہو تو آزاد کرنے والے کو عصوبۃ کی وجہ سے میراث ملے گی۔

بعض نے ''من انفسھم'' کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کسی قوم کے موالی یعنی آزاد کردہ غلام عام احکام میں اسی قبیلہ کے تابع ہوتے ہیں، لہٰذا ہاشمی کا مولیٰ زکوۃ نہیں لے سکتا۔(اشرف التوضیح:۴۲۵/۳)

ماموں کی میراث

{۲۹۱۴} وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِبْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْہُمْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ) وَذُکِرَ حَدِیْثُ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ

تَعَالٰی عَنْهَا اِنَّمَا الْوِلَاءُ فِیْ بَابِ قَبْلَ بَابِ السَّلَمِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ الْبَرَاءِ الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ فِیْ بُلُوْغِ الصَّغِيْرِ وَحَضَانَتِهٖ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔

حوالہ: بخاری شریف: ۲/۱۰۰۰، کتاب الفرائض، باب مولی القوم من انفسهم وابن الاخت، حدیث نمبر: ۶۷۶۱۔مسلم شریف: ۲/۳۳۸، کتاب الزکوة، باب اعطاء المؤلفة ومن یخاف علی ایمانه، حدیث نمبر: ۱۰۵۹۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قوم کی بہن کا بیٹا (یعنی بھانجا) انہیں میں سے ہے۔(یعنی وہ ذوی الارحام میں سے ہے جس کو وراثت پہنچتی ہے)۔

اور حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا "انما الولاء" "باب السلم" سے پہلے باب میں گذر چکی ہے اور حدیث براء رضی اللہ عنہ "الخالة بمنزلة الام" "باب بلوغ الصغیر وحضانته" میں عنقریب ذکر کریں گے۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ذوی الارحام کی تفصیل

تشریح: حدیث شریف میں ذوی الارحام کی میراث کا ذکر ہے،اور ذوی الارحام میت کے ان رشتہ داروں کو کہتے ہیں جو نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات،عصبات کی طرح ذوی الارحام کے بھی چار درجے ہیں۔

درجہ اول:......خود میت کی وہ اولاد جو ذوی الفروض اور عصبات میں داخل نہیں۔جیسے "اولاد البنات وان سفلوا" یعنی نواسے نواسیاں۔

درجہ دوم:......میت کے اصول جو ذوی الفروج اور عصبات نہیں جیسے جد فاسد "اب الام" یعنی نانا، اور جدہ فاسدہ "ام الام" یعنی نانی۔

درجۂ سوم:......میت کے ماں باپ کی اولاد جو ذوی الفروض اور عصبہ نہیں جیسے "اولاد الاخوات" بھانجے بھانجیاں۔"بنات الاخوة" بھتیجیاں اور "بنو الاخوة لام" اخیافی بھتیجے۔

درجۂ چہارم:…… دادا اور دادی اور نانی کی اولاد کی اولاد جیسے پھوپھی، خالہ، ماموں اسی طرح اخیافی چچاوغیرہ۔

اس مسئلہ پر حضرات ائمہ کا اجماع ہے کہ اگر ذوی الفروض اور عصبات موجود ہوں تو میراث ان ہی کو ملے گی، ذوی الارحام کو بالاتفاق حصہ نہیں ملے گا،لیکن ذوی الفروض اور عصبات کے عدم موجودگی میں ذوی الارحام میراث کے مستحق ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔

چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور سعید بن المسیب، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک ذوی الارحام کے لئے میراث نہیں، اگر ذوی الفروض اور عصبات نہ ہوں تو میت کا مال بیت المال میں رکھا جائے گا۔

اور استدلال حضرت حارث رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، جس میں ارشاد ہے: ”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن میراث العمۃ والخالۃ فسکت فنزل علیہ جبرئیل علیہ السلام فقال ”حدثنی جبرئیل ان لا میراث لھما“ (بذل المجہود:۱۷۵/۱۳)

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے میں دریافت کیا گیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جبرئیل امین علیہ السلام نے مجھے بتایا کہ پھوپھی اور خالہ کے لئے میراث نہیں۔

نیز تقسیم میراث کے سلسلے میں بھی قرآن کریم کی آیت میں ذوی الارحام کا ذکر نہیں۔

ان حضرات کے علاوہ جمہور امت حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضرات ائمہ حنفیہ، امام احمد، حسن بصری، ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم سب کے نزدیک ذوی الفروض اور عصبات کے عدم موجودگی میں ذوی الارحام وارث ہوں گے اور علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم توریث ذوی الارحام کے قائل ہیں۔(مرقاۃ:۲۳۶/۶)

علامہ موفق الدین ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ ہمارا استدلال ایک تو قرآن کریم کی آیت کریمہ سے ہے:

"وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللهِ" (الاحزاب:٦،مغنی:٦/٢٠٥)
[پیٹ کے رشتہ دار دوسرے مومنوں اور مہاجرین کے مقابلے میں ایک دوسرے پر (میراث کے معاملے میں) زیادہ حق رکھتے ہیں۔]

"فی کتاب اللہ" کے معنی ہیں "فی احکامہ و فرائضہ" کیونکہ "کتاب" کا لفظ عموماً فریضہ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

دوسرے حدیث شریف میں ارشاد ہے، جو اس باب کی فصل ثانی میں مذکور ہے: "الخال وارث من لا وارث لہ یعقل عنہ ویرثہ" (ابوداؤد: ٣/١٢٣) جس شخص کا "ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی وارث نہیں ہوتا تو "ذوی الارحام" میں سے اس کا ماموں اس کا وارث ہوتا ہے جو اس کی طرف سے خون بہا ادا کرتا ہے اور اس کی میراث پاتا ہے۔

اشکال: اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ تو ایک محاورہ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "الجوع زاد من لا زاد لہ والصبر حیلۃ لہ" لہٰذا یہاں بھی مطلب یہی ہوگا کہ جس کا ماموں کے علاوہ کوئی وارث نہ ہو تو اس کا کوئی وارث ہی نہیں ہے اور اس سے ماموں کا وارث ہونا نہیں بلکہ عدم وارث ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جواب: یہ ہے کہ یہ محاورہ یہاں نہیں چلتا، کیونکہ حدیث شریف میں تصریح ہے: "یرثہ" اور ایک روایت میں ارشاد ہے: "یرث مالہ"

نیز حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی سمجھا، چنانچہ جب حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ماموں کی میراث کے بارے میں سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے یہی جواب لکھ کر بھیج دیا اور ظاہر ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فہم مستقل دلیل ہے۔ (المغنی:٦/٢٠٦)

ذوی الارحام کی وراثت پر تیسری دلیل فصل ثانی میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہم کی روایت میں تصریح ہے: "التمسوا لہ وارثا او ذا رحم" (ابوداؤد: ٣/١٢٤)

یہاں وارث سے مراد ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی وارث ہے اور مطلب یہ ہے کہ ذوی الفروض اور عصبات میں سے اگر کوئی نہ ہو تو ذوی الارحام کو بھی میراث ملے گی۔ (مرقاۃ: ٦/١٧٣)

الفصل الثانی

اختلاف ملت کی وجہ سے میراث نہیں ہے

{۲۹۱۵} وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَتَوَارَثُ اَھْلُ مِلَّتَیْنِ شَتّٰی۔ (رواہ ابوداؤدوابن ماجۃ) وَرَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ عَنْ جَابِرٍ۔

حوالہ: ابوداؤدشریف: ۴۰۳/۲، کتاب الفرائض، باب هل یرث المسلم الکافر، حدیث نمبر: ۲۹۱۱، ابن ماجہ شریف: ۱۹۶، ابواب الفرائض، باب میراث اهل الاسلام من اهل الشرک، حدیث نمبر: ۲۷۳۱، ترمذی شریف: ۳۱/۲، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل، حدیث نمبر: ۲۱۰۸،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: دومتفرق اہل مذہب ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت جابر رضی اللہ عنہ یہ حدیث روایت کی ہے۔

تشریح: توارث کے لئے وارث اور مورث کے درمیان اتحادملت بالاتفاق شرط ہے، اس حدیث شریف میں یہی مسئلہ مذکور ہے، لیکن اس کے باوجود اس مسئلہ کی تفصیل میں اختلاف ہے، حنفیہ اور شافعیہ کا مسلک تو یہ ہے "الکفر ملۃ واحدۃ" خواہ وہ کتابی ہو یا مشرک یہودی ہو یا نصرانی ان دونوں کے نزدیک یہ سب ایک ہیں، لہٰذا ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، اصل تقابل اسلام اور کفر کے درمیان ہے، وہاں اختلاف ملت ہے، اور مالکیہ وحنابلہ کے نزدیک ادیان سماویہ جیسے یہودیت اور نصرانیت یہ آپس میں مختلف ہیں، لہٰذا ان میں ایک دوسرے کا وارث نہیں ہوگا، اور ادیان غیر سماویہ کے بارے میں امام مالک تو یہ فرماتے ہیں کہ انواعِ شرک سب ملت واحدہ ہیں، اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مختلف انواعِ شرک مختلف ملل ہیں، مثلاً بت پرست اور آتش پرست یہ الگ الگ ہیں، لہٰذا توارث نہیں

ہوگا، اور امام مالک کے نزدیک تو ارث ہوگا۔ (من ہامش الکوکب: ۴۰/ ۲، الدر المنضود: ۸٦/ ۵)

قاتل میراث سے محروم

{۲۹۱٦} **وَعَنۡ** اَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ اَلۡقَاتِلُ لَا یَرِثُ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ)

حوالہ: ترمذی شریف: ۳۱/ ۲، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل، حدیث نمبر: ۲۱۰۹،

ابن ماجہ شریف: ۱۹٦، ابواب الفرائض، باب میراث القاتل، حدیث نمبر: ۲۷۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قاتل وارث نہیں ہوگا۔

تشریح: لا یرث الخ: مقصد بیان یہ ہے کہ جس وارث نے اپنے مورث کو قتل کیا ہے وہ اس کی میراث میں سے محروم ہوگا یہ سبب ہے حرمانِ ارث کا۔

دادی کی میراث

{۲۹۱۷} **وَعَنۡ** بُرَیۡدَةَ رَضِیَ اللهُ عَنۡهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ لِلۡجَدَّةِ السُّدُسَ اِذَا لَمۡ تَکُنۡ دُوۡنَهَا اُمٌّ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/ ۴۰۱، کتاب الفرائض، باب فی الجدۃ، حدیث نمبر: ؟؟؟،

ترجمہ: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کے لئے چھٹا حصہ مقرر فرمایا، بشرطیکہ اس (سے مقدم حصہ دار) والدہ نہ ہو۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر میت کی ماں زندہ ہوگی تو اس کی وجہ سے میت کی جدہ محروم ہوجائے گی، ہاں اگر میت کی ماں زندہ نہ ہوگی تو اس کے ترکہ میں سے جدہ کو چھٹا حصہ ملے گا۔

زندہ پیدا ہوا تو وہ وارث ہوگا

{۲۹۱۸} **وَعَنۡ** جَابِرٍ رَضِیَ اللهُ عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللهِ صَلَّی اللهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَهَلَّ الصَّبِيُّ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَوُرِّثَ۔ (رواه ابن ماجة والدارمی)

حوالہ: ابن ماجہ شریف:۱۹۷، ابواب الفرائض، باب اذا استهل المولود ورث، حدیث نمبر:۲۷۵۰،
دارمی:۲/۴۸۵، کتاب الفرائض، باب:۴۷، باب میراث الصبی، حدیث نمبر:۳۱۲۶،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
کہ جب (بوقت ولادت) بچہ روئے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وہ وارث بنایا جائے گا۔

تشریح: استہلال کے اصل معنی تو چاند دیکھنے کے ہیں ”رویۃ ہلال“ اس کے بعد اس کا استعمال ہوا رفع الصوت میں یعنی چیخنا چلانا، اس مناسبت سے کہ پہلی رات میں چاند کو دیکھ کر لوگ شور کرتے ہیں کہ چاند ہوگیا، پھر اس کے بعد اس کا استعمال آثار حیات اور بچہ کے رونے میں ہونے لگا وہی یہاں حدیث شریف میں مراد ہے۔

اختلاف ائمہ

اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کے پیدا ہونے کے بعد اگر اس میں آثار حیات پائے گئے اور اس دوران میں اس کا کوئی عزیز قریب مرا تو وہ مولود اس کا وارث ہوگا اور اگر نہ پائے گئے تو نہیں ہوگا، حنفیہ شافعیہ کے یہاں تو اسی طرح ہے کہ صرف آثار حیات کا پایا جانا کافی ہے۔ (الدر المنضود:۵/۹۲)

حلیف کا حکم

{۲۹۱۹} **وَعَنْ** كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللهِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَحَلِيْفُ الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ۔ (رواه الدارمی)

حوالہ: دارمی:۲/۳۱۷، کتاب السیر، باب:۸۲، باب فی مولی القوم وابن اختهم منهم، حدیث نمبر:۲۵۲۸۔

ترجمہ: حضرت کثیر بن عبداللہ بروایت والد خود اپنے دادا (عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا: حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قوم کا آزاد کردہ غلام

انہیں میں سے ہے اور قوم کا حلیف انہیں میں سے ہے اور قوم کی بہن کا لڑکا انہیں میں سے ہے۔

تشریح: پہلی فصل میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جو روایت گذری ہے اس کی تشریح میں ''مولیٰ'' کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

''کسی قوم کا حلیف اسی قوم میں سے ہے'' کی وضاحت یہ ہے کہ پہلے اہل عرب میں یہ دستور تھا کہ دو شخص آپس میں قسم وحلف کے ذریعہ یہ باہمی عہد واقرار کر لیتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے رنج وراحت اور موت وحیات میں شریک رہیں گے، ایک کا خون دوسرے کا خون ہوگا۔ ایک کی صلح دوسرے کی صلح ہوگی، اور ایک کی جنگ دوسرے کی جنگ ہوگی، ہم میں سے کسی پر کوئی تاوان لازم ہوگا تو دوسرا ادا کریگا، اسی طرح ایک دوسرے کی میراث کے بارے میں بھی ایک دوسرا یہ اقرار کرتا تھا کہ میں تمہارا وارث ہوں گا اور تم میرے وارث ہوگے، چنانچہ میراث کے سلسلہ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا، مگر جب قرآن کریم میں وراثت کا ایک واضح ضابطہ نازل کیا گیا اور ورثاء اور ان کے حصے متعین ومقرر کر دیئے گئے تو یہ پرانا دستور بھی ختم ہوگیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی منسوخ ہوگیا۔

''اور کسی قوم کا بھانجا اسی قوم میں سے ہے'' اس کی وضاحت بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی روایت کی تشریح کی جا چکی ہے۔

حق میراث ماموں کیلئے

{۲۹۲۰} **وَعَنِ** الْمِقْدَامِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا اَوْ ضَيْعَةً فَإِلَيْنَا وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ وَاَنَا مَوْلٰى مَنْ لَا مَوْلٰى لَهٗ اَرِثُ مَالَهٗ وَاَفُكُّ عَانَهٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ يَرِثُ مَالَهٗ وَيَفُكُّ عَانَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاَنَا وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهٗ اَعْقِلُ عَنْهُ وَارِثُهٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ يَعْقِلُ عَنْهُ وَيَرِثُهٗ۔ (رواه ابوداؤد)

021 Babul Faraiz

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۴۰۲ / ۲، کتاب الفرائض، باب فی میراث ذوی الارحام، حدیث نمبر: ۲۹۰۰،

ترجمہ: حضرت مقدام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ہر مومن کے نفس سے زیادہ قریب ہوں، جس شخص نے قرضہ چھوڑا یا اولاد چھوڑی تو وہ ہمارے ذمہ ہے اور جس شخص نے مال چھوڑا وہ اس کے ورثاء کے لئے، اور میں اس کا ولی ہوں جس کا کوئی ولی نہ ہو کہ اس کے مال کا میں وارث (یعنی بیت المال کے لئے بمنزلہ وارث) ہوں اور میں اس کی قید کو چھڑآؤں گا۔ اور ماموں وارث ہوگا جس کا کوئی وارث (ذوی الفروض اور عصبات میں سے) نہ ہو اس کے مال کا۔ اور وہ اس کی ذات کو چھڑائے گا، اور ایک روایت میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں۔ اس کی طرف سے میں دیت ادا کروں گا اور میں اس کا وارث بنوں گا، اور جس کا کوئی وارث نہ ہو تو ماموں اس کا وارث ہے، وہ اس کی دیت (بھی) ادا کرے گا اور اس کا وارث بھی ہوگا۔

تشریح: انا اولیٰ بکل مؤمن من نفسه: تفصیل اسی باب کی سب سے پہلی حدیث شریف میں گذر چکی۔

آگے حدیث شریف میں "ضیعة" کا لفظ ہے، اس سے مراد عیال یعنی چھوٹے بچے اور عورتیں ہیں، کیونکہ اگر ان کی خبر نہ لی جائے تو وہ جلدی ضائع ہو جاتے ہیں، اسی لئے ان کو "ضیعة" کہا جاتا ہے۔

وانا مولی من لا مولی له: مولیٰ سے مراد وارث ہے۔

ارث ماله: ای لاجل بیت المال۔

وافک عانه: اس کی قید کو چھڑاتا ہوں۔ "عان" کے معنی قید، اسی لئے قیدی کو عانی کہتے ہیں۔ جیسا کہ جنائز کی ایک حدیث شریف میں "**اطعموا الجائع وعودالمریض وفکوا العانی، قال سفیان والعانی الاسیر**" [بھوکے کو کھانا کھلاؤ، بیمار کی عیادت کرو، قیدی کو چھڑاؤ۔ سفیان نے بیان کیا: کہ عانی کے معنی قیدی کے ہیں۔] اور یہاں قید سے مراد "**مایلزمه من الحقوق مثل الدین والدیة**" اس لئے کہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ آدمی ان میں مقید اور جکڑا رہتا ہے، اور ایک روایت میں جو آگے آرہی ہے اس میں "**عنی**" کا لفظ ہے۔ "**افک عنیه**"

کَلّ: کہتے ہیں ثقل اور بوجھ کو اور یہاں مراد اس سے عیال اور دین ہے۔ یعنی جو شخص نابالغ بچے چھوڑ کر مر جائے یا دین تو ان کو ذمہ داری مجھ پر ہے، اور جو مال چھوڑ کر مرے سو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے، اور جس شخص کے کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث میں ہوں، چنانچہ اس کی طرف سے میں ہی دیت ادا کروں گا اور اس کے مال کا وارث ہوں گا، یعنی اگر وہ کوئی مال چھوڑ کر مرے اور اس کے کوئی وارث نہ ہو تو میں اس کے مال کا وارث ہوں گا، یعنی بیت المال کے لئے، یہ وراثت آنحضرت ﷺ کی انتظام اور بیت المال کے اعتبار سے ہے، اور یہ جو حدیث شریف میں ہے ماموں وارث ہے اس شخص کا جس کا کوئی وارث نہ ہو دیت ادا کرے گا وہ ماموں اپنے بھانجے کی طرف سے اور اس کا وارث ہوگا، اس جملہ سے حنفیہ اور حنابلہ کی تائید ہو رہی ہے۔ ''خال'' (ماموں) ''خالہ عمہ'' یہ سب ذوی الارحام میں سے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ خال دیت ادا کرے گا بھانجہ کی طرف سے، یعنی اگر کسی شخص کا بھانجہ کسی پر جنایت کرے اور اس کے کوئی عصبہ نہ ہو تو اس کی طرف سے دیت اس کا ماموں ادا کرے گا، جس طرح سے عصبہ دیت ادا کرتے ہیں، میں کہتا ہوں: اور اسی طرح حدیث شریف میں آتا ہے ''ابن اخت القوم منهم'' لہٰذا ماموں بھانجے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، مگر وہ حضرات جو توریث ذوی الارحام کے قائل نہیں وہ اس حدیث کو وراثت پر محمول نہیں کرتے، بلکہ اس کو وہ حمایت اور اعانت پر محمول کرتے ہیں، یعنی اگر کسی شخص کا بھانجہ حق پر ہو تو اس کے ماموں کو چاہئے کہ اس کی اعانت کرے، یعنی اعانت اور نصرت ذوی الفروض اور عصبات کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ذوی الارحام کی بھی کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم

وراثت انبیاء کا مسئلہ

اس مسئلہ کے اندر سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام کا کوئی وارث نہیں ہوتا سوائے شیعہ کے فرقہ کے کہ وہ کہتا ہے کہ انبیاء کرام کے بھی وارث ہوں گے اور استدلال کرتے ہیں قرآن پاک کی آیت: ''وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ الخ''. مگر جن لوگوں کی عقلیں ان کے اعمال بد اور عقائد فاسدہ کی وجہ سے مسخ ہو جائیں ان کا کوئی علاج نہیں، ان مجاہیل کو یہ تو معلوم ہو نہ سکا کہ اوپر سے قرآن پاک کے اندر علم و نبوۃ حکمۃ و رسالت کا ذکر ہے اور اس کی میراث مراد ہے۔ اور انہوں نے یہ مذہب اختیار کر کے محض افضل البشر

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے باغ فدک میں سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حصہ نہیں دیا اور نعوذ باللہ منہ خلیفہ اوّل نے ان پر ظلم کیا، لیکن ہمارا استدلال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناه فهو صدقة" [ہم معاشر انبیاء کی وراثت جاری نہیں ہوتی، ہم جو چھوڑتے ہیں تو وہ صدقہ ہوتا ہے۔] سے ہے، اور اسی ارشاد گرامی کے تحت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دینے سے انکار فرمایا اور نیز حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سکوت فرمایا، یہ خود دلیل ہے اس بات کی کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قول صحیح ہے۔

اب دوسرا مسئلہ باقی ہے کہ انبیاء کرام بھی غیر کے وارث ہوتے ہیں یا نہیں؟ مالکیہ میں سے بعض کا قول ہے کہ وارث ہوتے ہیں، شافعیہ کا یہی قول ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے، بعض حنفیہ نے انکار کیا ہے۔

عورت کیلئے حق میراث

{۲۹۲۱} **وَعَنْ** وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَحُوْزُ الْمَرْاَۃُ ثَلَاثَ مَوَارِیْثَ عَتِیْقَهَا وَلَقِیْطَهَا وَوَلَدَهَا الَّذِیْ لَا عَنَتْ عَنْهُ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجة)

حواله: ترمذی شریف: ۲/۳۲، کتاب الفرائض، باب ماجاء مایرث النساء من الولاء، حدیث نمبر: ۲۱۱۵، ابوداؤد شریف: ۲/۴۰۳، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الملاعنة، حدیث نمبر: ۲۹۰۶، ابن ماجه شریف: ۱۹۷، ابواب الفرائض، باب تحرز المرأة ثلث مواریث، حدیث نمبر: ۲۷۴۲۔

ترجمه: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورت تین وراثت حاصل کرتی ہے (یعنی وارث بنتی) ہے: (۱) اپنے آزاد کردہ غلام کی اور (۲) لاوارث بچہ کی (جس کو بطور لقطہ لے کر پرورش کرے) اور (۳) اپنے اس بچہ کی جس پر اس نے لعان کیا ہے۔

تشریح: عورت کے لئے تین میراثوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(١)......عتیق یعنی آزاد کردہ غلام کی میراث۔اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کوئی غلام آزاد کرے اور وہ مرجائے کوئی عصبہ نہ ہو تو میراث کا یہ حصہ آزاد کرنے والی کو ملے گا۔

(٢)......لقیط کی میراث۔کوئی لاوارث بچہ پڑا ہوا تھا کسی عورت نے اٹھا کر اس کی پرورش کی، وہ مرگیا تو جمہور علماء کے نزدیک اس کی میراث بیت المال میں جمع کرائی جائے گی۔امام اسحاق کے نزدیک پرورش کرنے والی عورت اس کی وارث ہوگی، امام اسحاق اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جمہور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پرورش کرنے والی اگر مستحق ہو تو امام کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ بیت المال میں جمع ہونے کے بعد یہ مال اسی عورت کے دے دے، لیکن بطور میراث نہیں بلکہ بطور بیت المال کے مال کی مستحق ہونے کے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث غیر ثابت ہے۔

(٣)......ابن الملاعنۃ: جس بچے کے متعلق میاں بیوی نے لعان کیا ہے اس کا نسب صرف ماں کی طرف سے ہوتا ہے، اس لئے وہی اس کی وارث ہوگی، اس عورت کا خاوند اس کا وارث نہیں ہوگا۔(التعلیق،بذل:١١٠/٨،اشرف التوضیح:٤٢٦/٣،الدر المنضود:٤٨/٥)

حق میراث میں ولدِ زنا کا کیا حکم ہے؟

{٢٩٢٢} وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَيُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرَّةٍ اَوْ اَمَةٍ فَالْوَلَدُ وَلَدُ زِنًا لَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ۔ (رواه الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف:٣١/٢،کتاب الفرائض، باب ماجاء فی ابطال میراث ولد الزنا، حدیث نمبر:٢١١٣،

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد خود از جد خود روایت کرتے ہیں کہ بے شک حضرت رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی آزاد یا باندی سے زنا کیا تو وہ بچہ ولد الزنا ہے نہ تو وہ (باپ کا) وارث ہوگا اور نہ باپ اس کا وارث بنایا جائے گا۔

تشریح: اگر زنا کے ساتھ بچہ کی ولادت ہوئی ہے وہ ولد الزنا ہے (حرامی بچہ) اور اس کا حکم

یہ ہے کہ یہ بچہ زانی کی میراث کا حقدار نہ ہوگا اور اسی طرح اس بچہ کی میراث زانی کو نہ پہنچے گی اور جب یہ وارث نہ ہوں گے تو اس کے اقرباء بھی اس کے حقدار نہ ہوں گے، البتہ عورت (زانیہ) کے ساتھ وہ بچہ منسوب ہوتا ہے، اس لئے ان میں سے ہر ایک دوسرے کی میراث کے حق دار ہوں گے۔

آزادشدہ غلام کی میراث

{۲۹۲۳} **وَعَنْ** عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا اَنَّ مَوْلٰی لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَاتَ وَتَرَکَ شَیْئًا وَلَمْ یَدَعْ حَمِیْمًا وَلَا وَلَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اُعْطُوْا مِیْرَاثَہٗ رَجُلًا مِّنْ اَھْلِ قَرْیَتِہٖ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۴۰۲/۲، کتاب الفرائض، باب میراث ذوی الارحام، حدیث نمبر: ۲۹۰۲، ترمذی شریف: ۳۰/۲، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی الذی موت ولیس لہ وارث، حدیث نمبر: ۲۱۰۵،

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام (آزاد شدہ) کا انتقال ہوگیا اور کچھ مال چھوڑا اور نہ تو کوئی قریبی رشتہ دار چھوڑا اور نہ اولاد چھوڑی، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کی میراث اس کی بستی والوں میں سے ایک شخص کو دے دو۔

تشریح: آزاد شدہ غلام کی میراث کا مستحق عصبہ نسبی نہ ہونے کی صورت میں حق ولاء کی بنیاد پر اس غلام کا ''معتق'' آزاد کرنے والا ہوتا ہے۔

روایت مذکورہ میں اس غلام کا ذکر ہے جس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا اور آزاد کرنے والے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور انبیاء چونکہ کسی کے وارث نہیں ہوتے اور نہ کوئی شخص انبیاء کا وارث ہوتا ہے، اس لئے اس ترکہ کا حقدار بیت المال تھا اور بیت المال کا مصرف چونکہ فقراء مساکین ہوتے ہیں، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے مال کو اس کی بستی کے محتاج و مستحق شخص کو دے دینا مناسب سمجھا۔ (مرقاۃ: ۱۷۳/۶)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نہ خود وارث بنتے ہیں نہ کوئی اور ان کا وارث بن سکتا ہے۔

علامہ ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مال کا کوئی وارث

نہیں بن سکتا اور اس میں حکمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے ان حضرات کو لوگوں تک خداوندی پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا ہے اور اس بات کا اعلان کرایا: "لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا" (انعام:۹۰) ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں اور صراط مستقیم پر لانے کی کوشش اور سعی کرتے ہیں، یہ کسی عوض اور دنیوی منفعت کے لئے نہیں، اب اگر حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مال میں وراثت کا سلسلہ دوسرے لوگوں کی طرح جاری ہوتا، تو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ ان حضرات نے نبوت کو ذریعہ بنا کر اپنے وارثوں کے لئے مال جمع کیا ہے، اس واسطے اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال میں سلسلہ میراث ہی ختم کر دیا، تا کہ یہ گمان نہ ہو، کیونکہ جس منصب پر وہ فائز ہوتے ہیں وہ لوگوں کی محبت کا مرکز ہوتا ہے اور لوگ ان حضرات پر جان و مال ہر اعتبار سے قربان ہونے کے لئے تیار ہوتے ہیں، اگر ان کے مال میں وراثت کا سلسلہ جاری ہوتا تو دشمنوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ نبوت کا کاروبار اس لئے چلایا گیا ہے کہ ان کی بعد میں آنے والی نسلیں نبوت کے زمانہ میں جمع کردہ اموال سے اپنا بندوبست کریں اور عیش کریں۔

اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ حضرات انبیاء کرام بحیثیت نبوت و بلحاظ ہدایت تمام امت کے روحانی باپ ہوتے ہیں، اور سب کے ساتھ یکساں رویہ اور مساوی شفقت رکھتے ہیں، لہٰذا ان کے چھوڑے ہوئے مال کو صدقہ عام قرار دیا گیا جو بلا اعتبار حر و عبد اور بغیر فرق صالح و فاسق اور بدون لحاظ قریب و بعید عام مسلمانوں کے مصالح میں خرچ ہو اور سب کے کام آوے، کیونکہ ظاہر ہے کہ پوری امت میں تقسیم ہونا ممکن نہیں اور اگر خاص جماعت اقرباء کو میراث پہنچتی تو ان کے ساتھ علاقہ خاص کا اظہار ہوتا اور دیگر اُمتیوں کے لئے ایک طرح دل شکنی کا باعث ہوتا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا نورث ماتر کنا صدقة"

علیٰ ہذا القیاس اگر اقرباء کی میراث حضرات انبیاء علیہم السلام کو دلوائی جاتی تو وہی علاقہ خاص ثابت ہوتا جو شفقت عامہ کے بظاہر مخالف تھا۔

اور پھر حضرات انبیاء علیہم السلام کی دوربین نظروں پر غلت کا پردہ نہیں تھا، بلکہ ان کی توجہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اقدس پر ہوتی تھی اور ان کو اللہ تعالیٰ کے متصرف اور مالک حقیقی ہونے کا یقین کامل حاصل تھا، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے مالک ہونے کا تصور نہیں کرتے تھے۔ "الانبیاء

لا یشھدون لانفسھم ملکا مع اللہ‘‘ اور دنیا کے اسباب کو اپنے پاس مستعار سمجھتے تھے اور اپنے کو مالک نہیں بلکہ متولی سمجھتے تھے اور دنیا میں انسان کی مسافرانہ حالت کا نقشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا، اس لئے انہیں نہ تو دنیا کے ساز وسامان سے کوئی دلچسپی ہوتی تھی نہ زندگی میں یہ حسرت ہوتی تھی کہ ہمارے اقرباء کا ترکہ ہم کو دیا جائے اور نہ بوقت وفات اپنے سامان کے چھوٹنے کا کچھ قلق وافسوس ہوتا تھا، کیونکہ اولاً تو ان کے پاس دنیا کا سامان ہوتا ہی بہت مختصر تھا اور جو کچھ ہوتا تھا اس سے بھی اپنی شان کے ارتفاع اور متاع دنیا کی دنائت کی وجہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی، چنانچہ قانون الٰہی نے بھی ان کی شان کے پیش نظر یہ فیصلہ نافذ کیا کہ حضرات انبیاء اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو تھوڑا بہت مال چھوڑ جاتے ہیں وہ بھی کسی کی میراث نہیں اور نہ یہ حضرات اپنی زندگی میں اپنے اقرباء کی میراث کے حقدار ہوں گے۔

اشکال: قرآن شریف میں حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا: ’’رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَرِثُنِيْ‘‘ (التمھید لابن عبدالبر: ۸/۱۷۴) اے مرے رب مجھ کو ایسی اولاد عطا فرما جو میری وارث ہو۔

اسی طرح: ’’وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ‘‘ (النمل:۱۶) [اور سلیمان کو داؤد کی وراثت ملی۔] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وراثت حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی ثابت ہے۔

جواب: اکثر علماء کرام کا خیال یہ ہے کہ ان آیات میں وراثت سے مال کی وراثت مراد نہیں، بلکہ وراثت علم وحکمت مراد ہے، جیسا کہ مفسرین نے ’’وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا‘‘ (النمل:۱۵) [اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا۔] کے تحت تصریح کی ہے۔

یہ جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ ان آیات میں میراث کے مشہور ومعروف معنی مراد نہیں، بلکہ بعض جگہوں میں صرف جانشین کرنا مراد ہے، جیسا کہ ’’وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ‘‘ (الشعراء:۵۹) میں ہے [ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون کی قوم کا جانشین بنادیا۔]

بعض جگہ دینا مراد ہے، جیسے: ’’نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا‘‘ (مریم:۶۳) میں ہے: [ہم جنت اپنے پرہیزگار بندوں کو دیتے ہیں۔]

اور بعض جگہ لینا مراد ہے۔ جیسے: ’’وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ‘‘ (قصص:۵۸) میں ہے: [آخر ہم ہی

لینے والے ہیں۔]

لہٰذا یہاں بھی جانشینی کا ثبوت ہے اور وہ بطور میراث کے نہیں۔

اشکال: حضور اکرم ﷺ کے والد ماجد کی لونڈی ام ایمن رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کو میراث میں حاصل ہوئی تھیں، جنہوں نے والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کی پرورش کی ہے اور جن کا نکاح آنحضرت ﷺ نے اپنے متبنیٰ زید رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا، نیز آنحضرت ﷺ کو اپنی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ کا مال کثیر میراث میں ملا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دوسروں کے مال سے میراث مل سکتی ہے۔

جواب: ام ایمن چونکہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد کی لونڈی تھیں اور ہمیشہ خدمت میں رہیں، اس لئے یہ سمجھا گیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو میراث میں ملی تھیں ورنہ درحقیقت وہ والد ماجد کے انتقال کے بعد حضرت سید عالم ﷺ کے دادا صاحب اور والدہ صاحبہ کا حق اور حصہ ہوگئی تھیں، ان دونوں حضرات نے بوجہ شفقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رکھا اور گویا آنحضرت ﷺ کو دے دیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا، علاوہ ازیں یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب آنحضرت ﷺ کو ظاہری اعتبار سے باضابطہ نبوت ورسالت عطا نہیں ہوئی تھی، اس زمانہ میں اگر آنحضرت ﷺ کو میراث مل بھی جاتی تو کوئی تعجب نہ تھا، کیونکہ بہت سے احکام وخصوصیات کا اجراء نبوت کے بعد ہوتا ہے۔

اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے زندگی ہی میں اپنا مال واسباب آنحضرت ﷺ کے حوالہ کر دیا تھا کہ لوگ فقیری اور مفلسی کا طعنہ نہ دے سکیں، جیسا کہ سورۂ ضحیٰ کی آیت "وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰی" (ضحیٰ:۸) اور آپ کو تنگدست پایا پس غنی کر دیا۔ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد کچھ ان کا ترکہ رہا نہ آنحضرت ﷺ کو میراث میں پہنچا جو کچھ تھا وہ ہمیشہ سے آنحضرت ﷺ ہی کا تھا۔ (نفحات التنقیح: ۳/۵۲۲)

اگر کسی کا وارث معلوم نہ ہو

{۲۹۲۴} **وَعَنْ** بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ مَاتَ رَجُلٌ مِنَ

خُزَاعَةَ فَأُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِيْرَاثِهٖ فَقَالَ الْتَمِسُوْا لَهٗ وَارِثًا اَوْ ذَا رَحِمٍ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهٗ وَارِثًا وَلَا ذَا رَحِمٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعْطُوْهُ الْكُبْرَ مِنْ خُزَاعَةَ۔ (رواه ابوداؤد) وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ اُنْظُرُوْا اَكْبَرَ رَجُلٍ مِنْ خُزَاعَةَ۔

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۴۰۲، کتاب الفرائض، باب المیراث ذوی الارحام، حدیث نمبر: ۲۹۰۴،

ترجمہ: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ خزاعہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوگیا، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی میراث لائی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کے وارث کو تلاش کرو اور یا ذی رحم (وارث حقدار کو تلاش کرو) لوگوں نے اس کے کسی وارث کو نہیں پایا اور نہ کسی ذی رحم کو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قبیلہ خزاعہ میں جو بڑا شخص ہے اس کو دے دو۔ (ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قبیلہ خزاعہ میں جو شخص سب سے بڑا ہے اس کو تلاش کرو۔

تشریح: "کبر" بضم الکاف وسکون الباء "اکبر" کے معنی میں مستعمل ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں "اکبر رجل من خزاعة" کے الفاظ مذکور ہیں، جس کی تعبیر علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے "کبیرھم" سے کی ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "وھو اقربھم الی الجد الاعلی" کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو جد اعلیٰ کی طرف بنسبت دیگر حضرات کے زیادہ قریب ہو۔ (طیبی: ۶/۲۰۲)

حدیث شریف کی تفصیل گذر چکی ہے، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ یہ مال خزاعہ قبیلے کے بڑے آدمی کو دے دو یہ اس بنیاد پر ہے کہ اس آدمی کا کوئی وارث نہیں تھا، نہ ذوی الفروض میں اور نہ عصبات اور ذوی الارحام میں سے۔

اور ایسی صورت میں مال بیت المال کا ہوجاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ کے کسی بوڑھے کو قبیلے کے فرد ہونے اور بوڑھا ہونے کی وجہ سے بیت المال کا مصرف اور سب سے زیادہ مستحق سمجھ کر یہ فرمایا، گویا کہ یہ مال اس شخص کو توریث کے طور پر نہیں بلکہ مصرف بیت المال ہونے کی وجہ سے دیا گیا۔ (مرقاۃ: ۶/۱۷۳)

قرضہ کی ادائیگی مقدم ہے

{۲۹۲۵} وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اِنَّكُمْ تَقْرَؤُنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ وَاِنَّ اَعْيَانَ بَنِي الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي الْعَلَّاتِ الرَّجُلُ يَرِثُ اَخَاهُ لِاَبِيْهِ وَاُمِّهٖ دُوْنَ اَخِيْهِ لِاَبِيْهِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة) وَفِيْ رِوَايَةِ الدَّارِمِيِّ قَالَ: اَلْاِخْوَةُ مِنَ الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي الْعَلَّاتِ اِلٰى اٰخِرِهٖ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۲۹، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الاخوة من الاب والام، حدیث نمبر: ۲۰۹۴، ابن ماجه شریف: ۱۹۵، ابواب الوصایا، باب الدین قبل الوصیة، حدیث نمبر: ۲۷۱۵، دارمی: ۲/۵۰۷، کتاب الوصایا، باب: ۲۱، باب من قال الکفن من جمیع المال، حدیث نمبر: ۳۲۳۹،

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: یقیناً تم لوگ اس آیت کو "من بعد الخ" تلاوت کرتے ہو (جس میں وصیت کا تذکرہ مقدم ہے) حالانکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرض کی ادائیگی وصیت سے مقدم کرتے تھے اور آنحضرت+ نے ارشاد فرمایا: کہ حقیقی بھائی وارث ہوتے ہیں سوتیلے بھائی نہیں۔ اور آدمی وارث ہوتا ہے اپنے بھائی کا جو کہ اپنے والد اور اپنی والدہ سے ہو (یعنی حقیقی بھائی ہو) نہ کہ (صرف باپ شریک) سوتیلے بھائی۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور دارمی کی ایک روایت میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سگے بھائی (جو ماں شریک ہوں) وارث ہوتے ہیں نہ کہ سوتیلے (یعنی بھائی)۔ آخر حدیث تک۔

تشریح: حدیث شریف میں مذکورہ آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ اگر میت نے کوئی وصیت کی ہے تو اس کی پوری کرنے کے بعد اور اگر اس کے ذمہ کوئی قرض ہے تو اس کو ادا کرنے کے بعد اس کے ورثاء کو اس کی میراث تقسیم کی جائے گی، گویا آیت کریمہ میں بظاہر وصیت کی تعمیل کو قرض کی ادائیگی پر مقدم کیا گیا ہے، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصیت کی تعمیل سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیتے تھے، چنانچہ اسی بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے دریافت فرمایا: کہ تم یہ

آیت پڑھتے ہو کیا اس کی مراد بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ گویا اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن کریم کی اس آیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ میں کوئی تضاد نظر آتا ہے، یا یہ کہ آیت کریمہ میں چونکہ وصیت کو مقدم کیا گیا ہے، اس لئے وصیت کی تعمیل قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے بلکہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ آیت میں الفاظ کے اعتبار سے قرض کی ادائیگی کو اگرچہ بعد میں ذکر کیا گیا ہے، لیکن حقیقت اور حکم کے اعتبار سے یہی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم کے ذریعہ اس کو واضح کر دیا ہے، اب رہی یہ بات کہ پھر آیت کریمہ میں وصیت کا ذکر پہلے کیوں ہے؟ تو اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ میت کی وصیت کی تعمیل چونکہ گراں گذر سکتی ہے، اور اس میں کوتاہی ہو سکتی ہے، اس لئے وصیت کے ذکر کو مقدم کر کے یہ آگاہی دی گئی کہ میت کی وصیت کی تعمیل کو آسان اور غیر ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ایک اہم اور ضروری چیز سمجھ کر پورا کیا جائے۔

ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات الخ: اعیان بنی الام سے مراد حقیقی بھائی ہیں، انہی کو عینی بھائی بھی کہدیا جاتا ہے، جن کا باپ اور ماں ایک ہی ہوں، بنی العلات سے مراد وہ بھائی ہیں جو ایک ہی باپ سے ہوں، لیکن امہات مختلف ہوں، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی میت کے حقیقی بھائی بھی ہوں اور علاتی بھی تو حقیقی بھائیوں کو ترجیح ہوگی، علاتی بھائی وارث نہیں ہوں گے۔

آیت میراث کا واقعۂ نزول

{۲۹۲۶} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ بِابْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قُتِلَ اَبُوْهُمَا مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ شَهِيْدًا وَاِنَّ عَمَّهُمَا اَخَذَ مَالَهُمَا وَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا وَلَا تُنْكَحَانِ اِلَّا وَلَهُمَا مَالٌ قَالَ يَقْضِیْ اللّٰهُ فِیْ ذٰلِكَ فَنَزَلَتْ اٰيَةُ الْمِيْرَاثِ فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عَمِّهِمَا فَقَالَ: اَعْطِ لِابْنَتَیْ سَعْدٍ الثُّلُثَيْنِ وَاَعْطِ اُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَمَا بَقِیَ فَهُوَ لَكَ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

حوالہ: مسند احمد:۴/۲۰۵، کتاب الفرائض، الفصل الاول، ترمذی شریف:۲/۲۹، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث البنات، حدیث نمبر:۲۰۹۲، ابوداؤد شریف:۲/۴۰۰، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الصلب، حدیث نمبر:۲۸۹۱، ابن ماجہ شریف:۱۹۵، ابواب الفرائض، باب فرائض الصلب، حدیث نمبر:۲۷۲۰،

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت سعد بن ربیعہ کی زوجہ سعد بن ربیعہ کی دولڑکیوں کو ساتھ لے کر حاضر ہوئیں اور عرض کیا: کہ یارسول اللہ! یہ دونوں لڑکیاں سعد بن ربیع کی ہیں ان کے والد آپ کے ساتھ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تھے اور ان کے چچا نے ان کا تمام مال لے لیا ہے اور ان کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا اور ان کا نکاح بغیر مال کے نہ ہو سکے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں فیصلہ فرمائیں گے (لہٰذا تم انتظار کرو) چنانچہ آیت میراث نازل ہوئی، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لڑکیوں کے چچا کے پاس (قاصد) بھیجا، اور فرمایا: سعد کی دونوں لڑکیوں کو دو ثلث اور ان کی والدہ کو آٹھواں حصہ دو اور جو باقی رہا وہ تمہارا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) اور ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: مضمون حدیث یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے اپنی دو بیٹیوں کو پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ دونوں سعد بن الربیع کی بیٹیاں ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ احد میں تھے اور شہید ہو گئے تھے، ان دونوں کے چچا نے ان کا سارا مال اور میراث قبضہ میں لے لیا، اب کیا کیا جائے؟ بغیر مال کے ان کا نکاح کیسے کیا جائے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی بات سن کر فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کچھ فیصلہ فرمائیں گے، اس پر پھر آیت میراث "يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ" نازل ہوئی، اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو اور اس کے صاحب معاملہ کو بلوایا، اور ان کے آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لڑکیوں کے چچا سے فرمایا: کہ دو ثلث میراث کا ان دونوں کو دے اور ثمن ان کی والدہ کو، آگے جو بچے وہ تیرے لئے ہے۔

میراث کی ایک صورت

{۲۹۲۷} **وَعَنْ** هُزَيْلِ بْنِ شُرَحْبِيْلٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سُئِلَ اَبُوْمُوْسٰى عَنْ اِبْنَةٍ وَبِنْتِ ابْنٍ وَاُخْتٍ فَقَالَ: لِلْبِنْتِ النِّصْفُ وَلِلْاُخْتِ النِّصْفُ وَأْتِ ابْنَ مَسْعُوْدٍ فَسَيُتَابِعُنِى فَسُئِلَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَاُخْبِرَ بِقَوْلِ اَبِىْ مُوْسٰى فَقَالَ لَقَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ اَقْضِىْ فِيْهَا بِمَا قَضَى النَّبِىُّ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْبِنْتِ النِّصْفُ وَلِاِبْنَةِ الْاِبْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةً لِلثُّلُثَيْنِ وَمَا بَقِىَ فَلِلْاُخْتِ فَاَتَيْنَا اَبَا مُوْسٰى فَاَخْبَرْنَاهُ بِقَوْلِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ: لَا تَسْأَلُوْنِىْ مَادَامَ هٰذَا الْحَبْرُ فِيْكُمْ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ۹۹۷/۲، کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ ابن مع ابنۃ، حدیث نمبر: ۶۷۳۶۔

ترجمہ: حضرت ہزیل بن شرحبیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا: بیٹی، پوتی اور بہن کی میراث سے متعلق۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹی کے لئے نصف اور بہن کے لئے نصف میراث ہے، اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ تم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس (بھی) جاؤ وہ میری موافقت کریں گے، چنانچہ (سائل ان کے پاس آیا اور) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا اور ان کو ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول کی خبر بھی دی گئی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اگر میں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی اتباع کی) تو پھر میں گمراہ ہو جاؤں گا اور میں راہِ مستقیم پر نہ رہوں گا۔ میں تو اس سوال میں وہ فیصلہ دوں گا جو حضرت رسول اکرم ﷺ نے فیصلہ دیا تھا، بیٹی کے لئے نصف اور پوتی کے لئے چھٹا حصہ دو تہائی پورا کرتے ہوئے اور جو باقی رہا تو وہ بہن کے لئے، اس کے بعد پھر سوال کنندہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ہم نے ان کو حضرتِ عبداللہ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی خبر دی، حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگوں کے درمیان جب تک یہ ماہر عالم موجود ہے تو مجھ سے سوال نہ کیا کرو۔

تشریح: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے جو مسئلہ پوچھا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ ایک میت

ہے اس نے تین وارث چھوڑے ہیں: بیٹی، پوتی، بہن۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ فتویٰ دیا کہ نصف بیٹی کو اور نصف بہن کا اور پوتی محروم ہوگی۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے بیٹی اور بہن دونوں کو نصف نصف ذوی الفروض میں سے ہونے کی وجہ سے دیا ہے، بیٹی کو آیت "وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ" (سورۂ نساء:۱۱) [اور اگر صرف ایک عورت ہو تو اسے (ترکے کا) آدھا حصہ ملے گا۔] کی وجہ سے اور بہن کو آیت "اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ" (سورۂ نساء:۱۷۶) [اگر کوئی شخص اس حال میں مرجائے کہ اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں آدھے کی حقدار ہوگی۔] کی وجہ سے انہوں نے غالباً ولد کو مذکر کے ساتھ خاص سمجھا ہوگا۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اسی مستفتی کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تو آپ نے اس فیصلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیث کے خلاف قرار دیا (جو حضرت ابوموسیٰ تک نہیں پہنچی تھی) آپ نے یہ فیصلہ دیا کہ بیٹی کو نصف اور پوتی کو سدس ملے گا اخت عصبہ ہوگی اور بقیہ ایک ثلث اس کو ملے گا اس طرح سے:

		میت ۶
اخت	بنت الابن	بنت
۲	۱	۳

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے فتویٰ سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا: **"لاتسألونی ما دام هذه البحر فیکم"** [جب تک تم میں یہ علامہ موجود ہے مجھ سے سوال مت کیا کرو۔]

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اگر کسی میت کی اولاد میں سے بنات اور بنات الابن ہوں تو اگر بنات ثلثین سے کم لے رہی ہوں تو ثلثین میں سے باقی جو بچے گا وہ بنات الابن کا ہوگا تکملة للثلثین۔ یہ مسئلہ اتفاقی ہے، البتہ اختلاف اس بات میں ہوا ہے کہ بنات کو ثلثین کب ملے گا، اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر ایک ہی بیٹی ہو تو اس کو نصف ملے گا، لہٰذا سدس پوتی کو مل جائے گا اس پر بھی اتفاق ہے کہ دو سے زائد ہوں تو بیٹیوں کو ثلثین ملے گا لقولہ تعالیٰ: "فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ" (النساء: ۱۱) [اور اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو یا دو سے زیادہ تو مرنے

والے نے جو کچھ چھوڑا ہوا نہیں اس کا دوتہائی حصہ ملے گا اور اگر سرف ایک عورت ہو تو اسے (ترکے کا) آدھا حصہ ملے گا۔] دو کے بارہ میں اختلاف ہوا ہے، جمہور کے نزدیک اس صورت میں بھی ثلثین ملے گا ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ دو کی صورت میں ان کو نصف ملے گا۔(بدایۃ المجتہد:۲/۲۵۵)

اس حدیث شریف سے میراث کا ایک مشہور ضابطہ بھی ثابت ہوا "اجعلوا الاخوات مع البنات عصبة" یعنی اگر میت کی بنات ہوں اور ان کے ساتھ ان کی بہنیں ہوں تو بہنوں کے ساتھ عصبات والا معاملہ ہوگا، یہاں بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اخت کو عصبہ بنایا ہے، یہ اصول اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے بھی ثابت ہے۔

"وماروی اهل الفرائض عن النبی صلی اللہ علیه وسلم انه قال "اجعلوا الاخوات مع البنات عصبة" فلم اجده بهذا اللفظ الا انه ماخوذ من قول معاذ بن جبل الخ"

(اعلاء السنن:۱۸/۳۷۲، اشرف التوضیح:۳/۴۲۶)

[اہل فرائض نے جو نقل کیا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنادو، میں نے اس کو اس لفظ کے ساتھ نہیں پایا، البتہ یہ معاذ بن جبل صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ماخوذ ہے۔]

میراث جد (دادا کی میراث)

{۲۹۲۸} وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنَّ ابْنَ اِبْنِيْ مَاتَ فَمَالِيْ مِنْ مِّيْرَاثِهٖ قَالَ: لَكَ السُّدُسُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ قَالَ: لَكَ سُدُسٌ اٰخَرُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ قَالَ: اِنَّ السُّدُسَ الْاٰخِرَ طُعْمَةٌ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

حوالہ: مسند احمد:۴/۴۲۰، کتاب الفرائض، فرع فی الجد والجدۃ، الفصل الاول، ترمذی شریف:۲/۳۰، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الجد، حدیث نمبر:۲۰۹۹، ابوداؤد شریف:۲/۴۰۱، کتاب

الفرائض، باب میراث الجد، حدیث نمبر: ۲۸۹٦،

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا: کہ میرے پوتے کا انتقال ہوگیا ہے (اور اس کے دولڑکیاں ہیں) تو اس کی میراث میں میرے لئے کس قدر حصہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تیرے لئے چھٹا حصہ ہے اور پھر جب وہ واپس ہوئے تو اس کو بلایا اور فرمایا: تیرے لئے ایک اور دوسرا (بھی) چھٹا حصہ ہے اور پھر جب وہ واپس ہوا تو اس کو پھر بلایا اور فرمایا: آخر کا چھٹا حصہ (بوجہ عصبہ ہونے کے) تیرے لئے بطور رزق ہے (چونکہ ذوالفروض کی تعداد زائد نہیں) (احمد، ابوداؤد، ترمذی) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: یہ شخص جو سوال کرنے آیا تھا یہ میت کا دادا تھا، اسکے علاوہ میت کی دو بیٹیاں بھی تھیں، ان بیٹیوں کو دو ثلث ملنا تھا یہ تو واضح تھا اس شخص نے بھی اسکے متعلق سوال نہیں کیا، اس دادا کو ذوی الفروض میں سے ہونے کی حیثیت سے ایک سدس ملنا تھا، (میت کا والد زندہ نہیں تھا) باقی ایک سدس اس کو عصبہ ہونے کی وجہ سے ملنا تھا (کیونکہ میت کی نرینہ اولاد بھی نہیں تھی) گویا اس کا کل ایک ثلث ہوگیا لیکن اگر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی فرمادیتے کہ تمہیں ثلث ملے گا تو یہ سمجھتا کہ دادا کا فرض ہی اتنا ہے، اس لئے اولاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض والے سدس کا ذکر فرمایا اور فرمایا: کہ تمہیں سدس ملے گا جب جانے لگا تو بلا کر فرمایا: ایک اور سدس تمہارے لئے طعمہ ہے، یعنی عصبہ ہونے کی وجہ سے مل رہا ہے۔ (اشرف التوضیح: ۳/۴۲۷)

جدہ (دادی) کا حکم

{۲۹۲۹} **وَعَنْ** قَبِيْصَةَ بْنِ ذُوَيْبٍ قَالَ: جَاءَتِ الْجَدَّةُ إِلَى أَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ تَسْأَلُهُ مِيْرَاثَهَا فَقَالَ لَهَا: مَالَكِ فِيْ كِتَابِ اللهِ شَيْءٌ وَمَا لَكِ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ فَارْجِعِيْ حَتّٰى أَسْأَلَ النَّاسَ فَسَأَلَ فَقَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَاهَا السُّدُسَ فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ هَلْ مَعَكَ غَيْرُكَ؟

فَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَانْفَذَهُ لَهَا اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ ثُمَّ جَائَتِ الْجَدَّةُ الْأُخْرٰى إِلٰى عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ تَسْأَلُهُ مِيْرَاثَهَا فَقَالَ هُوَ ذٰلِكَ السُّدُسُ فَإِنِ اجْتَمَعْتُمَا فَهُوَ بَيْنَكُمَا وَاَيَّتُكُمَا خَلَتْ بِهٖ فَهُوَ لَهَا ۔

(رواہ مالك واحمد والترمذی وابوداؤد والدارمی وابن ماجة)

حوالہ: مؤطا امام مالک:۳۲۷، کتاب الفرائض، باب میراث الجدة، مسند احمد:۲۲۰، کتاب الفرائض، فرع فی الجدة، الفصل الاول، ترمذی شریف:۳۰/۲، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی مریاث الجدة، حدیث نمبر:۲۱۰۰، ابوداؤد شریف:۴۰۱/۲، کتاب الفرائض، باب فی الجدة، حدیث نمبر:۲۸۹۴، دارمی:۴۵۶/۲، کتاب الفرائض، باب قول ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فی الجدات، حدیث نمبر:۲۹۳۹، ابن ماجہ:۱۹۵، ابواب الفرائض، باب میراث الجدة، حدیث نمبر:۲۷۲۴،

ترجمہ: حضرت قبیصہ بن ذویب نے بیان کیا: کہ ایک دادی حضرت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئی جوکہ اپنی میراث سے متعلق معلوم کررہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کتاب اللہ میں (تو) تیرے حصہ کا تذکرہ نہیں اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں (یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معلوم کے مطابق) لہٰذا تم واپس جاؤ، یہاں تک کہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معلوم کرلوں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کہ میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے ساتھ (اس وقت) اور کوئی دوسرا شخص بھی تھا؟ تو حضرت محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح بیان کیا جس طرح کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دادی (یا اس سوال کرنے والی دادی) کے لئے چھٹا حصہ نافذ کردیا، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس دوسری دادی آئی جوکہ اپنی میراث کا مطالبہ کررہی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: وہی چھٹا حصہ ہے اور اگر تم دونوں جمع ہوجاؤ تو یہ چھٹا حصہ مشترک ہے اور اگر کوئی ایک اس چھٹے حصہ میں تنہا ہے تو وہ اسی کے لئے ہے (یعنی اگر کسی ایک میت کی دو دادیاں موجود ہوں تو ایک ہی چھٹا حصہ دونوں میں مشترک رہے گا)۔

تشریح: جدہ سے یہاں دادی اور نانی دونوں مراد ہیں کیونکہ دونوں ذوی الفروض میں سے ہیں اور دونوں کا سہم بھی ایک ہی ہے، یعنی سدس، اگر دونوں میں سے ایک ہوگی تو تنہا سدس وہ لے لیگی اور اگر دونوں ہیں تو سدس میں دونوں مشترک ہوجائیں گی، جیسا کہ حدیث الباب میں ہے۔

جاننا چاہئے کہ ذوی الفروض یعنی وہ ورثاء جن کے حصص متعین ہیں وہ دو طرح کے ہیں، اکثر تو وہ ہیں جن کے حصہ کی تصریح کتاب اللہ میں ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کا فرض اور حصہ کتاب اللہ سے ثابت نہیں بلکہ حدیث سے ہے، چنانچہ جدہ خواہ ام الاب ہو یا ام الام ہو، اسی قسم ثانی میں سے ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ کسی میت کی جدہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اپنی میراث طلب کرنے، تو انہوں نے فرمایا: "مالک فی کتاب اللہ شیئ؟" کہ کتاب اللہ میں تو تیرا حصہ مذکور نہیں اور کسی حدیث شریف سے تیرا حصہ ثابت ہے یا نہیں؟ یہ میرے علم میں نہیں، البتہ میں اس کے بارے میں لوگوں سے معلوم کروں گا، ان کے سوال کرنے پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میرے سامنے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جدہ کو سدس عطا کیا ہے، اور محمد بن مسلمہ نے بھی اس کی تائید فرمائی، ان دو صحابیوں کی روایت پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس حصہ کا نفاذ فرمادیا، پھر آگے روایت میں یہ ہے کہ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسی میت کی جدۂ اخریٰ آئی اور اپنی میراث طلب کی تو انہوں نے فرمایا: کہ جدہ کے لئے ایک ہی سدس ہے اگر وہ تنہا ہو تنہا لے لے، اور اگر دو ہوں (دادی اور نانی) تو وہ اس میں مشترک ہوں گی۔

جدہ کا اطلاق چونکہ دادی اور نانی دونوں پر ہوتا ہے اور دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہے، اس لئے یہ کہا جائے گا کہ اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آنے والی اس میت کی دادی تھی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آنے والی اس کی نانی ہوگی، اور ہوسکتا ہے اس کا عکس ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم (الدر المنضود: ۵/۷۷)

ایضاً

{۲۹۳۰} **وَعَنِ** ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ فِي الْجَدَّةِ مَعَ اِبْنِهَا اَنَّهَا اَوَّلُ جَدَّةٍ اَطْعَمَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُدُسًا مَعَ اِبْنِهَا وَابْنُهَا حَيٌّ. (رواہ الترمذی والدارمی) وَالتِّرْمِذِيُّ ضَعَّفَهٗ.

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۳۰، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الجدۃ مع ابنھا، حدیث نمبر: ۲۱۰۲،

دارمی: ۲/۴۵۵، کتاب الفرائض، باب فی الجدات، حدیث نمبر: ۲۹۳۲،

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: کہ دادی کی میراث کے سلسلہ میں بیٹے کے ساتھ جمع ہونے کی صورت میں وہ پہلی دادی تھی کہ جس کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھٹا حصہ بیٹے کے ساتھ دلایا کہ اس کا بیٹا زندہ تھا (اور اس کی والدہ زندہ نہ تھی)۔ (ترمذی، دارمی) اور امام ترمذی نے اس حدیث شریف کو ضعیف قرار دیا ہے۔

تشریح: ''ابن'' سے مراد میت کا باپ اور ''جدۃ'' سے مراد دادی ہے، صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص دادی اور باپ چھوڑ کر مرا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ترکہ میں سے دادی کو ''سدس'' چھٹا حصہ دلوایا، حالانکہ دادی کا بیٹا یعنی میت کا باپ موجود تھا، جبکہ دادی اپنے بیٹے یعنی میت کے باپ کی موجودگی میں پوتے ''میت'' کے ترکہ سے محروم رہتی ہے۔

اختلاف مذاہب

میت کا باپ جدہ کے لئے حاجب ہوتا ہے یا نہیں؟

اس میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک میت کا باپ جدہ کے لئے حاجب ہوتا ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے، حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک باپ جدہ کے لئے حاجب نہیں ہوتا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ زیر بحث حدیث شریف سے تمسک کرتے ہیں، اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث سنداً صحیح نہیں، صاحب مشکوۃ نے حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تضعیف نقل کی ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ جدہ ام الام تھی، اس کا بیٹا میت کا ماموں ہوگا، اب مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نانی کو سدس دیا اس کے بیٹے اور میت کے ماموں کے ہوتے ہوئے اس کے ہم بھی قائل ہیں۔ (اعلاء السنن: ۱۸/۳۸۲)

ایک جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مؤول ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کہ آنحضرت ﷺ نے دادی کو باپ کی موجودی میں تفضلاً تبرعاً یعنی از راہ احسان حصہ دلوایا تھا، بطریق میراث نہیں دلوایا تھا۔ فلا اشکال۔

اور بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ ممکن ہے باپ کافر ہو یا غلام ہو، اس لئے اس کو میراث نہیں دی، دادی کو دی۔

جمہور کی دلیل حضرت عثمان، حضرت علی، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے آثار ہیں جن کی تخریج دارمی نے کی ہے۔ (اعلاء السنن: ۱۸/۳۸۲، اشرف التوضیح: ۳/۴۲۸)

مسئلہ دیت اور میراث

{۲۹۳۱} وَعَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ سُفْيَانَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلَيْهِ اَنْ وَرِّثْ اِمْرَأَةَ اَشْيَمَ الضِّبَابِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۳۱، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث المرأۃ من دیۃ زوجھا، حدیث نمبر: ۲۱۱۰، ابوداؤد شریف: ۲/۴۰۶، کتاب الفرائض، باب فی المرأۃ ترث من دیۃ زوجھا، حدیث نمبر: ۲۹۲۷۔

ترجمہ: حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ان کو تحریر فرمایا: کہ اشیم ضبابی کی زوجہ کو اس کے شوہر کی دیت میں سے میراث دی جائے۔ (ترمذی، ابوداؤد) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے تھی کہ مقتول کی دیت عصبۃ المقتول کے لئے ہوگی۔ اور عورت اپنے خاوند کی دیت کی وارث نہ ہوگی، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ حضور اقدس ﷺ کی تحریر میرے پاس یہ آتی تھی: "ورث امرأۃ اشیم الضبابی من دیۃ زوجھا" یعنی اشیم ضبابی جب مقتول ہو گئے تھے تو حضور اقدس ﷺ نے حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان کی دیت میں سے ان کی بیوی کو بھی وارث بنانا، تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے اپنی سابق رائے سے رجوع فرمالیا۔

یہ حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ وہ ہیں جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے صدقات وصول کرنے پر عامل بنایا تھا، اس مسئلہ میں جو رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی کہا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے بھی وہی تھی، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا رجوع ثابت ہوگیا، جمہور کے مسلک کی طرف حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ کی روایت کی وجہ سے۔

دیت کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اور رجوع

جاننا چاہئے کہ دیت کا مسئلہ اور قاعدہ عند الجمہور یہ ہے کہ وہ واجب تو ہوتی ہے، عاقلہ یعنی عصبۃ القاتل پر اور ملتی ہے ورثۃ المقتول کو، اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے جمہور کے خلاف تھی وہ یہ کہ دیت واجب بھی عاقلہ پر ہوتی ہے اور ملتی بھی ہے عاقلہ ہی کو، تو چونکہ ان کا مسلک یہ تھا اسی کے پیش نظر وہ زوج کی دیت میں سے زوجہ کے حصہ کے قائل نہ تھے، کیونکہ زوجہ عاقلہ میں سے نہیں، لیکن جب ان کو حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ کی روایت پہنچی تو انہوں نے اپنی رائے سے رجوع فرمالیا، یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے کیوں تھی کہ دیت میں وراثت جاری نہیں ہوتی، اور وہ ورثاء کو نہیں ملتی بلکہ صرف عاقلہ کو ملنی چاہئے۔ اس کی وجہ جیسا کہ شراح نے لکھا ہے علی ظاہر القیاس یہ ہے کہ وراثت جاری ہوتی ہے اس مال میں جو ملک میت ہو عند الموت (جیسے عام مال ہوتے ہیں دیت کے علاوہ) اور دیت کا وجوب وثبوت چونکہ ہوتا ہے موت مقتول کے بعد اور میت میں مالک ہونے کی صلاحیت ہے نہیں اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ دیت میں وراثت بھی نہ ہونی چاہئے، بس صرف عاقلہ کو ملنی چاہئے تحمل دیت کی وجہ سے، یعنی چونکہ عاقلہ ہی قاتل کی طرف سے مقتول کی دیت کے متحمل ہوتے ہیں، اس تحمل کی وجہ سے ملنی بھی صرف عاقلہ کو چاہئے، لہٰذا نہ زوجہ کو ملنی چاہئے نہ اس کے علاوہ دوسرے ورثاء کو لیکن پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا علم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت زوج میں زوجہ کا حصہ لگانے کو فرمایا ہے تو اس پر انہوں نے اپنی رائے اور قیاس کو ترک کر کے رجوع فرمالیا۔

اگر کوئی شخص کسی کے ذریعہ مسلمان ہوا

{۲۹۳۲} **وَعَنْ** تَمِيْمِ الدَّارِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا السُّنَّةُ فِي الرَّجُلِ مِنْ اَهْلِ الشِّرْكِ يُسْلِمُ عَلٰى يَدَيْ رَجُلٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ؟ فَقَالَ: هُوَ اَوْلَى النَّاسِ بِمَحْيَاهُ وَمَمَاتِهِ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/ ۳۱، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی الرجل یسلم علی یدی الرجل، حدیث نمبر: ۲۱۱۲، ابن ماجہ شریف: ۱۹۷، ابواب الفرائض، باب الرجل یسلم علی یدی الرجل، حدیث نمبر: ۲۷۵۲، دارمی: ۲/ ۴۷۱، کتاب الفرائض، باب: ۳۴، باب فی یدی الرجل یوالی الرجل، حدیث نمبر: ۳۰۳۳،

ترجمہ: حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کہ جو مشرک کسی مسلمان شخص کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ شخص اس کی زندگی میں (بھی) اور اس کے مرنے کے بعد بھی تمام لوگوں میں زیادہ ولی ہونے کے لائق ہے۔

تشریح: ولاء کی تین قسمیں ہیں:

(۱)......ولاء عتاقہ۔ کسی غلام کو آزاد کرنے کی وجہ سے جو وراثت ملتی ہے یہ ولاء بالاتفاق معتبر ہے۔

(۲)......ولاء موالاۃ یا ولاء معاقدہ۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو شخص آپس میں معاہدہ کر لیتے ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مولیٰ ہیں ایک دوسرے کے تاوان وغیرہ برداشت کریں گے، اور جو پہلے مرگیا دوسرا اس کا وارث ہوگا، حنفیہ کے نزدیک اس ولاء کا میراث میں اعتبار ہے، لہٰذا اگر ان میں سے ایک شخص مرگیا اور اس کا کوئی وارث نہیں ہے نہ ذوی الفروض وعصبات میں سے اور نہ ہی ذوی الارحام میں سے تو یہ شخص اس کی میراث کا زیادہ مستحق ہوگا، شافعیہ ومالکیہ کے نزدیک اس ولاء کا اعتبار نہیں۔ حنفیہ کی دلیل آیت قرآنیہ ہے: "وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ" (النساء: ۳۳) [اور

جن لوگوں سے تم نے کوئی عہد باندھا ہو ان کو ان کا حصہ دو۔]

(۳)......ولاء اسلام۔ اگر کوئی شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہو تو بعض علماء کے نزدیک دونوں میں ولاء کا رشتہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر وہ نومسلم مرجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اسی کو اس کی میراث ملے گی۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اس ولاء کا اعتبار نہیں، ہاں البتہ صرف اسلام کا تعلق نہ ہو بلکہ باقاعدہ عقد بھی ہوگیا ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس کا اعتبار ہوگا۔

قائل وراثت زیر بحث حدیث شریف سے استدلال کرتے ہیں، اس میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "هو اولى الناس بمحياه ومماته" [وہ لوگوں میں اس کی موت اور اس کی زندگی کے زیادہ قریب ہے۔] جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس حدیث شریف کی سند میں محدثین نے کلام کیا ہے۔ ثانیاً اس حدیث شریف کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں ولاء ثابت ہوگئی بلکہ "هو اولى الناس الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی میں اس کو اس کے قریب ہونا چاہئے، اس کی نصرت کرنی چاہئے اور مرنے کے بعد بھی اس کے جنازہ وغیرہ میں شرکت کرنی چاہئے۔ "هو اولى الناس بالنصرة فى حال الحيوة وبالصلوة بعد الموت"

کیا آزاد غلام وارث ہوگا؟

{۲۹۳۳} وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا اَنَّ رَجُلًا مَاتَ وَلَمْ يَدَعْ وَارِثاً اِلَّا غُلَامًا كَانَ اَعْتَقَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ لَهُ اَحَدٌ؟ قَالُوْا لَا اِلَّا غُلَامٌ لَهُ كَانَ اَعْتَقَهُ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِيْرَاثَهُ لَهُ۔ (رواه ابوداؤد والترمذى وابن ماجة)

حواله: ابوداؤد شریف: ۴۰۳/۲، كتاب الفرائض، باب فى ميراث ذوى الارحام، حدیث نمبر: ۲۹۰۵، ترمذى شريف: ۳۰/۲، ابواب الفرائض، باب فى ميراث المولى الاسفل، حدیث نمبر: ۲۱۰۶، ابن ماجه: ۱۹۷، ابواب الفرائض، باب من لا وارث له، حديث نمبر: ۲۷۴۱،

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا اور اس

نے کوئی وارث نہیں چھوڑا، بجز ایک غلام کے جس کو اس نے آزاد کیا تھا۔ حضرت رسول اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا اس مرنے والے شخص کا کوئی وارث ہے؟ اصحاب رضی اللہ عنہم نے کہا: بجز اس کے ایک آزاد کردہ غلام کے اور کوئی نہیں تو حضرت رسول اکرم ﷺ نے اس کی میراث اس غلام کو دے دی۔

تشریح: یعنی ایک شخص کا انتقال ہوا اور کوئی وارث اس نے اپنا نہیں چھوڑا، البتہ اس نے اپنا آزاد کردہ غلام چھوڑا، آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع کی گئی تو آنحضرت ﷺ نے اس شخص کی میراث اسی آزاد کردہ غلام کو دلوادی۔

اگر کسی شخص کا آزاد کردہ غلام مرے اور اس کے کوئی وارث نہ ہو سوائے اس کے آقا اور سید کے تو اس کی میراث کا اس کا آقا مالک ہوتا ہے، جس کو ولاء کہتے ہیں، اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، "**لحدیث الولاء لمن اعتق**" [ولاء آزاد کرنے والے کے لئے ہے۔] اور یہاں اس حدیث شریف میں یہ صورت نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے یعنی آقا کی میراث اس کے آزاد کردہ غلام کو دی گئی، یہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مذہب نہیں ہے، سوائے شریح اور طاؤس کے، ان دونوں نے اسی حدیث شریف سے استدلال کیا اور جمہور جو اس کے قائل نہیں ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ولاء منحصر ہے معتق کے حق میں حدیث صحیح کی بناپر وہ حدیث الباب کی تاویل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا یہ میراث دلانا من حیث الاستحقاق نہ تھا بلکہ من حیث التصدق والمصرف تھا۔ (الدر المنضود: ۵/۸۳)

مسئلہ ولاء

{۲۹۳۴} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَرِثُ الْوَلَاءَ مَنْ يَرِثُ الْمَالَ۔ (رواه الترمذی) وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ إِسْنَادُهُ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ۔

حواله: ترمذی شریف: ۲/۳۲، ۱۹۷، ابواب الفرائض، باب من لا وارث له، حدیث نمبر: ۲۷۴۱، باب ماجاء من یرث الولاء، حدیث نمبر: ۲۱۱۴،

ترجمه: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والدخود از جدخود روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ

نے ارشاد فرمایا: جوشخص مال کا وارث ہوگا وہی ولاء کا بھی وارث ہوگا۔ (ترمذی) اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس حدیث شریف کی اسناد قوی نہیں۔

تشریح: آزاد شدہ غلام کے مال کو ''ولاء'' کہتے ہیں، لہٰذا حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص مثلاً زید کا باپ مرگیا، پھر اس کے بعد اس کے باپ کا آزاد کردہ غلام یا اس کے باپ کے آزاد کردہ غلام کا آزاد کردہ غلام مرا تو اب یہ شخص یعنی زید اس کے مال کا وارث ہوگا، کیونکہ جس طرح یہ اپنے باپ کی دیگر املاک کا وارث ہوا ہے اسی طرح اپنے باپ کے ولاء کا بھی وارث ہے۔ لیکن یہ حکم صرف عصبہ کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی جو عصبہ وارث (مثلاً بیٹا) بنفسہ عصبہ ہونے کی حیثیت سے میت کے مال کا وارث ہوتا ہے، وہی عصبہ ولاء کا وارث ہوگا، لہٰذا آزاد کرنے والے کی بیٹی اپنے باپ کے ولاء کی وارث نہیں ہوگی، کیونکہ اگرچہ وہ اپنے باپ کے مال کی وارث ہوتی ہے، مگر عصبہ نہیں ہوتی، بلکہ عصبہ بنفسہ تو صرف مرد ہوتے ہیں، عورتیں عصبہ بنفسہ نہیں ہوتی، ہاں عورت ایسے آزد شدہ غلام کے مال کی تو وارث ہوتی ہے، جسے اس نے خود آزاد کیا ہو یا اس کے آزاد کردہ غلام نے آزاد کیا ہو۔

الفصل الثالث

گذشتہ تقسیم شدہ میراث کا حکم

{۲۹۳۵} **وَعَنْ** عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا كَانَ مِنْ مِيْرَاثٍ قُسِّمَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ عَلٰى قِسْمَةِ الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا كَانَ مِنْ مِيْرَاثٍ اَدْرَكَهُ الْاِسْلَامُ فَهُوَ عَلٰى قِسْمَةِ الْاِسْلَامِ۔ (رواه ابن ماجة)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۹۷، ابواب الفرائض، باب قسمة المواريث، حدیث نمبر: ۲۷۴۹

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو مالِ میراث زمانہ جاہلیت میں تقسیم کر دی گئی، وہ میراث نہیں ہے (یعنی اب اس میں کسی کا حق ارث جاری نہ ہوگا) وہ تو جاہلیت کی تقسیم پر ہی برقرار رہے گی۔ اور جو مالِ میراث موجود ہے (تقسیم نہیں ہوئی) اسلام نے اس کو پالیا (یعنی ورثاء مسلمان ہو گئے) تو اب وہ اسلامی تقسیم کے مطابق ہوگی۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب تک آیاتِ میراث نازل نہ ہوئی تھیں اور احکام میراث بیان نہیں ہوئے تھے تو اس وقت تک عہد جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق ہی تقسیم ہو رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی وضاحت فرمائی کہ اس وقت جو تقسیم ہو چکی تھی وہ اس پر برقرار رہے گی، اور جب سے یہ احکام اسلام نازل ہوئے اس وقت ان کا نفاذ ہوگا، لہٰذا اگر کوئی ترکہ تقسیم شدہ نہ تھا، اس پر اسلام کا عہد شروع ہو چکا ہے تو اب یہ اسی اسلامی قانون کے مطابق تقسیم ہوگی۔

پھوپھی کے لئے حکم میراث

{۲۹۳۶} **وَعَنْ** مُحَمَّدِ بْنِ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ اَنَّهُ سَمِعَ اَبَاهُ كَثِيْرًا

یَّقُوْلُ: کَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ یَقُوْلُ عَجَبًا لِلْعَمَّۃِ تُوْرِثُ وَلَا تَرِثُ۔ (رَوَاہُ مَالِکٌ)

حوالہ: مؤطاامام مالک:۳۲۹، کتاب الفرائض، باب ماجاءفی میراث العصبۃ، حدیث نمبر:؟؟،

ترجمہ: حضرت محمد بن ابی بکر بن حزم سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ وہ اکثر فرماتے تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: پھوپھی کے لئے تعجب ہے کہ وہ (اپنے بھتیجے کو) وارث بناتی ہے اور (خود بھتیجے کی میراث میں) وارث نہیں ہوتی۔

تشریح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ تعجب محض عقل وقیاس کی بنیاد پر ہے، ورنہ اگر بجاآوری حکم کے نکتۂ نظر سے دیکھا جائے یا یہ بات پیش نظر ہو کہ اس کی حکمت ومصلحت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تو تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

حدیث شریف کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی پھوپھی مرجائے تو وہ اپنی پھوپھی کا وارث ہوسکتا ہے، اس کے برعکس اگر وہ شخص مرجائے تو اس کی پھوپھی اس کی وارث نہیں ہوسکتی، چنانچہ حدیث کا یہ مفہوم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ تعجب ان علماء کے مسلک کے مطابق ہے جن کے نزدیک ذوی الارحام میت کے وارث نہیں ہوتے، جبکہ پھوپھی ذوی الارحم میں سے ہونے کی وجہ سے ان علماء کے نزدیک اپنے بھتیجے کی وارث ہوسکتی ہے جو ذوی الارحام کو علم فرائض میں مذکور تفصیل کے مطابق میت کا وارث قرار دیتے ہیں۔

اور اسی سے وہ حضرات استدلال کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اس اثر کی سند میں بعض نے کلام کیا ہے، ثانیاً خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس سے قوی روایات سے توریث زوی الارحام ثابت ہے۔ ثالثاً اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عدم توریث کے قائل تھے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے، حضرت ابوبکر، حضرت علی، ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات کی رائے اس کے خلاف ہے، ایسی صورت میں مجتہد دلائل سے کسی بھی جانب کو ترجیح دے سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک توریث کے دلائل قوی ہیں۔ (اشرف التوضیح:۴۱۹/۳)

علم الفرائض کی تعلیم کی تاکید

{۲۹۳۷} وَعَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَزَادَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَالطَّلَاقَ وَالْحَجَّ قَالَا فَإِنَّهٗ مِنْ دِيْنِكُمْ ۔ (رواہ الدارمی)

حوالہ: دارمی: ۴۴۱/ ۲، کتاب الفرائض، باب: ۱، باب فی تعلیم الفرائض، حدیث نمبر: ۲۸۵۶۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: فرائض (کے احکام ومسائل) سیکھو۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے میزد (یہ بھی) فرمایا: طلاق اور حج کے احکام (بھی) سیکھو۔ حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما دونوں حضرات نے فرمایا: کیوں کہ وہ تمہارے دین (کے اہم ترین امور میں سے) ہے۔

تشریح: فانہ من دینکم: یہ علم الفرائض یا مذکورہ دوسرے اہم ترین مسائل، طلاق، حج، (خاص کر) اہم ترین احکام اور مسائل میں سے ہیں، اس لئے خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ ان کے احکام کو حاصل کیا جائے، بسا اوقات اس قسم کی تاکیدات حالات پر نظر رکھتے ہوئے بھی اسلافِ امت فرماتے تھے، بعض روایات میں ہے: "تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ فَإِنَّهَا نِصْفُ الْعِلْمِ" [فرائض کو سیکھ لو اور لوگوں کو سکھا دو اس لئے کہ یہ بالیقین نصف علم ہے۔] علم الفرائض کو جو نصف العلم کہا گیا اس کے بارے میں علماء متقدمین فرماتے ہیں کہ ہم بغیر تاویل حقیقت پر محمول کرتے ہیں، لیکن اس کے معنی وکیفیت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ لیکن متأخرین حضرات عوام کے ایمان کی حفاظت کی خاطر اس قسم متشابہات کی مناسب تاویلات کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض یہ فرماتے ہیں کہ عموم بلویٰ اور کثرت حاجت کی بنا پر اس کی اہمیت کے لئے نصف العلم فرمایا۔

وقیل اس علم کی تحصیل میں بہت زیادہ محنت ومشقت ہوتی ہے کہ اس میں بہت حساب کی ضرورت پڑتی ہے، بنابریں نصف العلم کہا گیا۔

وقیل کثرت ثواب وفضیلت کی بناء پر نصف العلم کہا گیا۔

وقیل یا اس اعتبار سے کہا گیا کہ سبب ملک دو قسم پر ہے، ایک اختیاری جیسے شراء وقبول ہدیہ

وغیرہ۔ دوسری قسم اضطراری جیسے ارث فرائض میں دوسری قسم سے بحث ہوتی ہے۔

بعض نے یہ توجیہ کی کہ انسان پر دو حالت طاری ہوتی ہیں حالت حیاۃ وممات، تمام علوم تو حالت حیوٰۃ میں ضروری ہیں اور فرائض کی طرف بعد الموت احتیاج ہوتی ہے، بنابریں نصف العلم کہا گیا۔

وقیل سب سے صحیح توجیہ یہ ہے کہ یہاں نصف سے آدھا مراد نہیں بلکہ اس سے مطلقاً جزء مراد ہے۔ یااحد القسمین مراد ہے، اگرچہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ (درس مشکوٰۃ:۲۹۰/۲)

تتمہ کتاب الفرائض

مسائل میراث کی تفصیل مستقل ایک فن ہے، جو اس فن کی کتب میں مسطور ومذکور ہے، لیکن اس فن کی جو بنیاد ہے یعنی قرآن کریم کی آیات المیراث جی چاہا کہ کم ازکم ان آیات میں مذکورہ ورثاء اور ان کے حصص ہم اپنی اس کتاب میں ذکر کردیں۔ تاکہ بنیادعلم میں اس کے بعد پڑھنے والوں کو مزید تفاصیل معلوم کرنے کا شوق پیدا ہو۔ اور اس طور پر حدیث شریف "تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ فَإِنَّهَا نِصْفُ الْعِلْمِ" پر عمل کی توفیق میسر ہوجائے۔ واللہ الموفق۔

وراثت کے سلسلہ میں زمانۂ قدیم ہی سے معاشرہ کے اندر پائی جانے والی زیادتیوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر اس مسئلہ کو بہت اہمیت اور خاص تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

چنانچہ سورۂ نساء کی آیت:۱۱، ۱۲/ اور ۱۷۶/ کے تحت اس مسئلہ کی بنیادی تفاصیل انتہائی وضاحت کے ساتھ موجود ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتب تفسیر وفقہ کی روشنی میں مختصر تشریحات کے ساتھ ان آیات میں مذکور حصص اور ان کے مستحقین کو یہاں ترتیب کے ساتھ ذکر کردیا جائے، مذکورہ بالا آیات میں سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ میت کے کل مال سے اولاً اس کے دین ادا کئے جائیں اور اس سے بچے ہوئے مال کے تہائی سے تنفیذ وصیت کی جائے۔

چنانچہ آیت:۱۱/ اور ۱۲/ دونوں ہی میں کچھ حصص اور ان کے مستحقین کے ذکر کے بعد ارشاد ہے: "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ" کہ یہ سب تقسیم میراث دین کی ادائیگی اور تنفیذ وصیت کے بعد ہو۔

پھر ان آیات میں حصے کل چھ بیان کئے گئے ہیں: نصف (کل مال کا آدھا) ربع (چوتھائی) ثمن (آٹھواں) ثلثان (دوتہائی) ثلث (ایک تہائی) سدس (چھٹا حصہ)

اور ان کے مستحقین سات طرح کے ہیں:

(۱)......اولاد (جس میں مذکر و مؤنث ساری فروع داخل ہیں، یعنی بیٹے، بیٹیاں، پوتے پوتیاں، اسی طرح نیچے تک، لیکن یہ واضح رہے کہ اوپر والی فرع کی موجودگی میں نیچے کی فروع محروم رہیں گی، جیسے بیٹے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیاں)

(۲)......باپ (اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں دادا، اسی طرح اوپر تک)

(۳)......ماں (اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں دادی اور نانی جو ایک درجہ میں ہیں، اسی طرح اوپر تک، لیکن ان میں جو اقرب الی المیت ہو وہ ابعد الی المیت کے لئے حاجب ہوگی۔

(۴)......شوہر۔

(۵)......بیوی۔

(۶)......حقیقی (ماں باپ دونوں شریک) بھائی بہن۔ وعلاتی (صرف باپ شریک) بھائی بہن۔

(۷)......اخیافی (ماں شریک) بہن بھائی۔

مذکورہ حصص اور ان کے مستحقین کی تفصیل حسب تصریح قرآنی اس طرح ہے۔

اولاد

ان کے وارث ہونے کی چار صورتیں ہیں:

(۱)......مذکر و مؤنث دونوں ہوں تو اس صورت کے لئے حکم ہے: "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْۤ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" کہ مذکر کو دو حصے مؤنث کو ایک حصہ ملے گا۔

(۲)......صرف ایک مؤنث ہو تو "وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَۃً فَلَهَا النِّصْفُ" کی بناء پر نصف ترکہ کی مستحق ہوگی۔

(۳)......اگر مؤنث اولاد دو یا اس سے زائد ہو تو "فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ" کی وجہ سے دوتہائی مال کی مستحق ہونگی۔ (واضح رہے کہ یہاں عبارۃ النص اگر چہ دو سے زائد کے

لئے ہے،لیکن اقتضاء النص اور احادیث سے دو کے لئے بھی یہی حصہ ثابت ہوتا ہے،تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

(۴)...... چوتھی صورت یہ ہے کہ وارث صرف مذکر اولاد ہو (ایک یا زائد) وہ عصبہ ہونے کی بنا پر ذوی الفروض سے بچے ہوئے کل مال کی مستحق ہوگی۔ (کتب تفسیر وسراجی)

باپ

اس کے وارث ہونے کی تین صورتیں ہیں:

(۱)...... اگر اس کے ساتھ میت کی کوئی اولاد مذکر بھی ہو (خواہ مؤنث ہو یا نہ ہو) تو اس صورت میں "وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ" (سورۂ نساء: ۱۱) [اور اگر مرنے والے کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا بشرطیکہ مرنے والے کے کوئی اولاد ہو۔] کی وجہ سے وہ کل مال کے چھٹے حصہ کا مستحق ہوگا۔

(۲)......اولاد مذکر نہ ہونیکی صورت میں جب کہ اولاد مؤنث ہو (ایک یا متعدد) باپ بطور فرض کے ایک سدس کا، اور بطور عصبہ کے بچے ہوئے کل مال کا مستحق ہوگا۔

(۳)...... اور میت کی کسی بھی قسم کی اولاد نہ ہو تو ذوی الفروض سے بچا ہوا کل مال باپ کو ملے گا،تعصیب کی بناء پر (ان دونوں صورتوں کا حکم کتب تفسیر اور کتب فقہ میں دیکھئے)

ماں

(۱)......میت کی اولاد (مذکر و مؤنث) میں سے کسی کے بھی ہوتے ہوئے سدس کی مستحق ہوگی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ" (سورۂ نساء:۱۱)

(۲)......میت کے بھائی بہنوں میں سے دو یا اس سے زائد کے ساتھ ہو تب بھی اسے سدس ملے گا۔ "فَاِنْ كَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ" (سورۂ نساء:۱۱) [ہاں اگر اس کے کوئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔]

(۳)......نہ میت کی کوئی اولاد ہو نہ بھائی بہنوں میں سے دو کا نصاب ہو تو "فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ" (سورۃ نساء:۱۱) [اور اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں تہائی حصے کی حقدار ہے۔] کے حکم کے مطابق ثلث دیا جائے گا (پھر اس ثلث میں کچھ اختلاف ہے کہ کس صورت میں کل مال کا تہائی دیا جائے گا، اور کب ثلث مابقیہ کی مستحق ہوگی؟)

شوہر

(۱)......اگر بیوی کسی بھی طرح کی اولاد چھوڑ کر مری ہے، خواہ اسی شوہر سے یا کسی اور شوہر سے تو "فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ" (سورۃ نساء:۱۲) [اور اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو اس کی وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو انہوں نے کی ہو اور ان کے قرض کی ادائیگی کے بعد تمہیں ان کے ترکہ کا چوتھائی حصہ ملے گا۔] کی بناء پر شوہر چوتھائی مال کا مستحق ہوگا۔

(۲)......اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں شوہر کو نصف ملے گا، لقولہ تعالیٰ: "وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ" (سورۃ نساء:۱۲) [اور تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر جائیں اس کا آدھا حصہ تمہارا ہے، بشرطیکہ ان کی کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔]

بیوی

(۱)......اگر بیوی کے ساتھ مرنے والے شوہر کی کوئی اولاد بھی ہو تو "فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ" (سورۃ نساء:۱۲) [اگر اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو تم نے کی ہو اور تمہارے قرض کی ادائیگی کے بعد ان کو تمہارے ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔] کے مطابق بیوی کو کل مال کا آٹھواں حصہ ملے گا۔

(۲)......اور اگر اولاد نہ ہو تو اس کے حصہ میں چوتھائی آئے گا۔ "وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ" (سورۃ نساء:۱۲) [اور تم جو کچھ چھوڑ کر جاؤ اس کا ایک چوتھائی ان (بیویوں) کا

021 Babul Faraiz

ہے، بشرطیکہ تمہاری کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔]

تنبیہ: اگر میت کی کوئی اولاد نہ ہو (اور اس کے حقیقی وعلاتی واخیافی بھائی بہنوں میں سے کوئی ہو) تو ایسی میت کو ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ ''اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ'' سے یہی مراد ہے۔

حقیقی وعلاتی بھائی بہن

(۱)......اگر میت (کلالہ) مذکر ہو اور اس کی حقیقی وعلاتی صرف ایک بہن ہو تو اسے کل مال کا آدھا ملے گا۔ ''وَلَهٗ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ'' (نساء) [اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے آدھے کی حق دار ہوگی۔]

(۲)......اور اگر دو یا اس سے زائد بہنیں ہوں تو دو تہائی مال کی مستحق ہو کر اس میں برابر کی شریک ہوں گی۔ ''فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ'' (نساء)

ہدایت: واضح رہے کہ یہاں عبارۃ النص اگرچہ دو ہی کیلئے ہے لیکن اقتضاء النص کی روشنی میں قیاساً علی الاولاد الاناث اور بطریق اولویت دو سے زائد کیلئے بھی یہی حکم ہے۔

(۳)......اگر میت مؤنث ہے اور ورثاء میں صرف بھائی ہیں (خواہ ایک ہوں یا زیادہ) وہ بطور عصبہ کے کل مال کے مستحق ہوں گے۔ ''وَهُوَ يَرِثُهَا وَلَدٌ''

(۴)......اور اگر بھائی بہن دونوں ہیں تو سب عصبہ بنیں گے، اور بھائی ۲/۲ ر بہنیں ایک ایک حصہ کی مستحق ہوں گی۔ ارشاد ہے: ''وَاِنْ كَانُوْا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ'' (نساء) [اور اگر (مرنے والے کے) بھائی بھی ہوں اور بہنیں بھی تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔]

تنبیہ: علاتی وحقیقی بھائی بہنوں کا حکم تقسیم میراث میں ایک ہی ہے، لیکن حقیقی بھائی علاتی بہنوں کے لئے حاجب ہے اسی طرح حقیقی بہن بھی جب کہ وہ میت کی اولاد اناث کی وجہ سے عصبہ ہوتا اور حقیقی بہن کی موجودگی میں علاتی بہنوں کو سدس ملے گا تکملۃ للثلثین۔

اخیافی بھائی بہن

(۱)......ماشریک بھائی بہنوں میں سے اگر کوئی تنہا ہوتو اس کو سدس ملے گا۔ "وَلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ" (نساء)[اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک چھٹے حصے کا حقدار ہے۔]

(۲)......اور اگر ایک سے زائد ہو خواہ صرف بھائی یا صرف بہنیں یا مخلوط ہوں تو ان کے لئے ثلث مال ہوگا، جس میں وہ برابر کے شریک ہوں گے۔ "فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِی الثُّلُثِ" (نساء)[اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔]

تنبیہ: (۱)...... یہاں آیت کریمہ میں "وَلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ" سے اخیافی بھائی بہن مراد ہیں، جیسا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی قرأۃ میں "من ام" کی زیادتی وارد بھی ہوئی ہے۔ اور اس کی یہی تفسیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی بھی ہے۔ (ابن کثیر)

(۲)......اخیافی بھائی بہن حصص میں برابر کے شریک رہتے ہیں "فَهُمْ شُرَكَآءُ فِی الثُّلُثِ" کے اطلاق کی وجہ سے۔ لہٰذا "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" کا کلیہ ان پر جاری نہ ہوگا۔ (دیکھو کتب تفسیر اور سراجی وغیرہ)

(۳)......حقیقی وعلاتی بھائی بہن اسی طرح میت کے اصول مذکر اور فروع مطلق یہ سب کے سب اخیافی بھائی بہنوں کے لئے حاجب ہیں۔

خاتمہ

میراث کے ان حصص اور ان کے مستحقین کا یہ ایک اجمالی بیان ہے، جو قرآن کریم کے عبارۃ النص کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب شریعت کے اصول چار ہیں (جن سے ثابت شدہ احکام کے مجموعہ کا نام فقہ ہے) تو کسی بھی مسئلہ کی مکمل وضاحت ان چاروں اصول کی مراجعت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا مسئلہ میراث میں بھی مزید تفصیل وتوضیح کے لئے اس فن کی مستقل کتابوں (مثلاً سراجی وغیرہ) کی طرف مراجعت ناگذیر ہے۔ (الدر المنضود: ۵/۹۷)

022 Babul Wasaya

باب الوصایا

رقم الحدیث: ۲۹۳۸ر تا ۲۹۴۵ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب الوصایا

(وصیتوں کا بیان)

وصایا جمع ہے وصیۃ کی، جیسے عطایا عطیۃ کی اور ھدایا ھدیۃ کی جمع ہے۔

"وصیۃ" کا لفظ اسم ہے مصدر کے معنی میں، یعنی "ایصاء" وصیت کرنا "وصی یصی وصیا"، بمعنی "اتصل" اور "وصل" یعنی پہنچنے کے معنی میں ہے اور وصیت کو بھی اسی لئے وصیت کہتے ہیں کہ جو کچھ حالت حیات میں اس کے پاس تھا، وہ حالت موت کے بعد موصی لہ تک پہنچایا جاتا ہے۔

اور اصطلاح شریعت میں وصیت کی تعریف ہے: "عھدٌ خاصٌّ مَضَافٌ اِلٰی مَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَقَدْ یَصْحَبَہ التبرُّعُ"۔ یعنی وصیت ایک خاص معاملہ ہے، جس کی نسبت موت کے بعد کی طرف ہوتی ہے اور یہ کبھی تبرعاً بھی ہوتی ہے۔ (فتح الباری: ۵/۳۵۵)

اس تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ وصیت کا نفاذ وصیت کرنے والے کے مرنے کے بعد ہی ہوگا، زندگی میں نفاذ نہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص نے وصیت کی میرے مرنے کے بعد فلاں کام کیا جائے۔

اور وصیت کی چند اقسام ہیں: لازم اور واجب وفرض، نیز احسان وتبرع خواہ اپنے حق میں اور یا دوسروں کے حق میں جس کی شریعت نے بندہ کو اجازت دی ہے۔

وصیت کی مشروعیت قرآن وسنت سے ثابت ہے، اور ہمیشہ وہ معمول بہ رہی ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں وصایا کا تذکرہ ہے: "قال اللہ تعالیٰ: وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ" (سورۂ بقرہ)

[اور اسی بات کی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور یعقوب نے بھی۔]

الف:......اگرکسی شخص پرنماز، روزہ فرض اور حج فرض ہے اور وہ ادانہ کرسکے تو عندالموت لازم وفرض ہے ان کی ادائیگی کی وصیت کرنا۔

ب:...... نیزاگرامانت ہے یا قرض وغیرہ کوئی حق لازم ہے اس کی بھی وصیت کرنالازم ہے۔

ج:...... یہ خواہش ہے کہ وہ کسی کو تبرعاً اپنی ملک میں سے کچھ دے تو ایک تہائی تک اس کی اجازت ہے۔

د:......اس کی خواہش ہے کہ وہ بعدالموت اس کے حق میں کوئی کام صدقۂ جاریہ کی صورت میں ہو، اس کی بھی شرعاً اجازت ہے کہ تہائی ملک تک کرسکتا ہے وغیرہ ذالک۔

ہ:......اور وصیت بمعنی حکم، نصیحت بھی مستعمل ہے اور یہ وصیت زندگی میں ہوسکتی ہے اور عندالموت بھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وصیت کرنا اپنی اولاد کو اسی مفہوم پر ہے کہ وہ اسلام اور حق پر قائم رہیں۔

و:......ابتداءِ اسلام میں جب تک آیاتِ میراث کا نزول نہ ہوا تھا، مالدار پر واجب فرض تھا کہ وہ بعد الموت کے لئے وصیت کرلے کہ کس کو کتنا مال دیا جائے اور کس قدر دیا جائے؟ اور آیاتِ میراث کے نزول کے بعد یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے۔

ذ:......اسی وجہ سے شریعت نے جس کا حق میراث بیان کیا ہوا ہے ان میں سے کسی کے حق میں وصیت کرنا جائز نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ان اللہ قد اعطیٰ کل ذی حق حقہ فلا وصیت لوارث" (ابوداؤد شریف:۲/۳۹۶)[بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دیدیا، پس وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔]

تفصیل فقہ میں موجود ہے۔ (ماخوذ از تعلیق وغیرہ)

﴿الفصل الاول﴾

وصیت تحریر کرنا

{۲۹۳۸} **وَعَنِ** ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَہٗ شَیْئٌ یُوْصٰی فِیْہِ یَبِیْتُ لَیْلَتَیْنِ اِلَّا وَوَصِیَّتُہٗ مَکْتُوْبَۃٌ عِنْدَہٗ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۸۲/۱، کتاب الوصایا، پہلی روایت، مسلم شریف: ۳۸/۲، کتاب الوصیۃ، کی پہلی روایت، حدیث نمبر: ۱۶۲۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان شخص کے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے جس کے ذمہ کوئی ایسی چیز ہو جس میں اس کو وصیت کرنی ہو کہ وہ دوراتیں گذارے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی (ہونی چاہئے)۔

وصیت لکھنے کا حکم

تشریح: اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں بھی وصیت کا سلسلہ تھا، البتہ اس کے لئے کوئی شرط نہیں تھی، آدمی کو پورا اختیار ہوتا تھا کہ جس قدر وصیت کرے اور جس کے لئے بھی کرے کرسکتا ہے۔

اسلام نے رسم جاہلی کو باطل قرار دے کر یہ بتلایا کہ ''ثلث مال'' سے زائد میں وصیت نہیں کی جاسکتی اور ان افراد کی بھی نشاندہی کردی جن کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔

وصیت کے جواز پر تمام علماء کا اتفاق ہے اور یہ قرآن وسنت اور اجماع تینوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصٰی بِہَآ اَوْ دَیْنٍ'' [(اور یہ ساری تقسیم) اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد ہوگی، جو مرنے والے نے کی ہو یا اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہو تو اس

کی ادائیگی کے بعد۔]

نیز سنت میں سے احادیث باب کے علاوہ دیگر احادیث بھی جواز وصیت پر دال ہیں اور اس بات پر تمام علماء کا اجماع بھی ہوا ہے کہ وصیت جائز ہے۔

البتہ وجوب کے بارے میں اختلاف ہے، چنانچہ اہل ظاہر اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ وصیت کرنا واجب ہے۔ان رشتہ داروں کے حق میں جو کہ وارث نہیں بنتے اور ان کا استدلال قرآن کریم کی آیت "كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ" (سورۂ بقرہ) [تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آ جائے وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے، یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے۔]

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث شریف سے بھی وہ استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیت میراث سے وصیت منسوخ ہوگئی لیکن صرف والدین اور ان اقرباء کے حق میں جو وارث ہیں اور جو حضرات وارث نہیں ان کے حق میں وصیت منسوخ نہیں۔

جبکہ جمہور کے نزدیک اس صورت میں وصیت واجب ہے کہ جب آدمی پر کسی کا قرض ہو یا کوئی چیز بطور ودیعت کسی نے اس کے پاس رکھی ہو یا کوئی اور حق واجب کسی کا اس کے ذمے ہو جس کا ادا کرنا لازم تھا۔

جمہور کا استدلال اس سے ہے کہ اگر وصیت مطلقاً واجب ہوتی تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ظاہری طور پر وصیتیں منقول ہوتیں، یا کم از کم وصیت نہ کرنے پر کوئی نکیر ہوتی، اس لئے کہ واجب کے ترک پر نکیر ہے، حالانکہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وصیتیں بھی منقول نہیں، اور نہ اس کے ترک پر کسی قسم کی نکیر منقول ہے، عقلی اعتبار سے بھی وصیت ایک عطیہ اور تطوع ہے، جو کہ زندگی میں واجب نہیں تو پھر موت کے بعد کیونکر واجب ہوگی۔

باقی رہی آیت وصیت تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک آیت وصیت اس آیت سے منسوخ ہے: "لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ" (سورۂ نساء) [مردوں کے لئے بھی

اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔]

اور حضرت ابن عمر، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم اور حضرت امام مالک، امام شافعی، اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گئی ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت باب بھی اسی صورت پر محمول ہے، جبکہ آدمی کے پاس کوئی ودیعت کی چیز ہو یا اس پر کسی کا قرضہ یا کوئی اور حق ہو تو ظاہر ہے کہ اس حق واجب کی ادائیگی کی خاطر وصیت کو واجب قرار دیا جائے گا، نہ کہ عام حالات میں۔

اس کے علاوہ حدیث مذکور میں لفظ ''حق'' کو واجب پر حمل کرنا بھی بلا دلیل ہے، اس لئے کہ حق لغت میں ''الشی الثابت'' کو کہا جاتا ہے، اور اصطلاح شرع میں حق کے معنی ہیں: ''ماثبت به الحکم'' یعنی جس سے کوئی حکم ثابت ہو اور ظاہر ہے کہ حکم ثابت عام ہے، کبھی واجب ہوتا ہے کبھی مندوب، لہٰذا لفظ ''حق'' کا اطلاق صرف واجب پر نہیں ہوتا، بلکہ واجب مندوب اور کبھی کبھی مباح پر بھی ہوتا ہے، البتہ اگر لفظ ''علیٰ'' اس کے صلہ میں آجائے تو پھر وجوب کے معنی ہونگے، جبکہ حدیث مذکور میں ''علیٰ'' کا لفظ نہیں، اسی وجہ سے اس میں وجوب کے علاوہ دیگر احتمالات بھی ہیں اور جب احتمالات متعدد ہیں تو اس سے استدلال صحیح نہیں، بلکہ بعض طرق میں الفاظ حدیث یوں وارد ہیں: ''له شیء یرید ان یوصی فیه'' جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق واجب مراد نہیں بلکہ حق مندوب ہے، کیونکہ وصیت کو وصیت کرنے والے کے ارادے پر معلق کیا گیا ہے، اگر حق واجب ہوتا تو وصیت کرنے والے کے ارادے پر اس کو معلق نہ کیا جاتا۔ (اعلاء السنن: ۲۹۲/ ۱۸)

ایک تہائی تک وصیت کرسکتا ہے

{۲۹۳۹} **وَعَنْ** سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ مَرِضْتُ عَامَ الْفَتْحِ مَرَضًا اَشْفَيْتُ عَلَى الْمَوْتِ فَاَتَانِیْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُنِیْ فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ لِیْ مَالًا كَثِيْرًا وَلَيْسَ يَرِثُنِیْ اِلَّا اِبْنَتِیْ اَفَاُوْصِیْ بِمَالِیْ كُلِّهٖ؟ قَالَ: لَا قُلْتُ: فَثُلُثَیْ مَالِیْ؟ قَالَ:

لَا قُلْتُ: فَالشَّطْرَ؟ قَالَ: لَا قُلْتُ: فَالثُّلُثُ؟ قَالَ الثُّلُثُ كَثِيْرٌ اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَاِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِيْ بِهَا وَجْهَ اللهِ اِلَّا اُجِرْتَ بِهَا حَتَّى اللُّقْمَةَ تَرْفَعُهَا اِلٰى فِيْ اِمْرَاَتِكَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ۱/۷۹۹، باب میراث البنات، حدیث نمبر: ۶۷۴۶، مسلم شریف: ۲/۳۹، کتاب الوصایا، حدیث نمبر: ۱۶۲۸،

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں فتح مکہ والے سال میں بیمار ہوگیا ایسا سخت بیمار کہ موت کے قریب ہوگیا (یعنی مرض الموت) میرے پاس حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے، میں نے کہا: یارسول اللہ! بے شک میرے پاس بہت زائد مال ہے اور میری ایک بیٹی کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں ہے، کیا میں اپنے تمام مال کی وصیت کردوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں، میں نے کہا: تو پھر اپنے مال کی دوتہائی (کی وصیت کردوں؟) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، میں نے کہا: نصف کی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ میں نے کہا: ایک تہائی کی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک تہائی (کی وصیت کردو) اور ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے، بے شک تمہارے اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑنا بہتر ہے، اس سے کہ تم ان کو مفلس اور نادار چھوڑو کہ (پھر) وہ لوگوں سے سوال کرتے ہوں۔ اور بے شک تم جو بھی خرچ کرتے ہو جس سے تمہاری غرض اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا ہو تو تم اس پر اجر دیئے جاؤ گے یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تم نے اپنی زوجہ کے منہ کی طرف اٹھایا ہے۔ (تاکہ تم اس کو کھلاؤ)۔

تشریح: مرضت عام الفتح الخ: صحیح بخاری کے اندر آٹھ جگہ پر یہ حدیث آئی ہے، ایسے ہی مسلم کے اندر اسی قسم کی حدیث آئی ہے، ان تمام کے اندر بجائے عام الفتح کے "عامۃ حجۃ الوداع" واقع ہوا ہے، حافظ نے دونوں حدیثوں کے اندر جمع کیا کہ تعدد واقعہ پر محمول ہے، بعض نے کہا: کہ یہ حدیث وہم ہے، زہری کے شاگردوں میں سفیان بن عیینہ اس کے ساتھ منفرد ہیں، آگے آپ نے فرمایا کہ: "ولیس یرثنی الا ابنتی الخ" اس لڑکی کا نام ام الحکم ہے، بعض نے عائشہ بتلایا لیکن یہ وہم ہے کیونکہ

انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں پایا۔

قال الثلث و الثلث کثیر الخ: امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر اجماع نقل کیا ہے کہ بغیر اجازت ورثہ کے ثلث مال سے زیادہ وصیت کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر وارث نہ ہوں تو ثلث سے زیادہ میں وصیت جائز ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ، امام احمد، اسحق بن راہویہ، شریک بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک جائز ہے، امام شافعی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک ثلث سے زیادہ کے اندر وصیت جائز نہیں ہے۔

اس حدیث شریف میں اس بات کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے کہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کے حق میں ہمیشہ خیر خواہی کا جذبہ رکھا جائے اور وارثوں کے تئیں شفقت ومحبت ہی کے طریقے کو اختیار کیا جائے، علاوہ ازیں اس حدیث شریف سے اور بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ اپنا مال غیروں کو دینے سے افضل یہ ہے کہ اسے اپنے قرابتداروں پر خرچ کیا جائے، دوم یہ کہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی کی طلب پیش نظر ہو، اور سوم یہ کہ اگر کسی مباح کام میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی نیت کر لی جائے تو وہ مباح کام بھی طاعت اور عبادت بن جاتا ہے۔ چنانچہ بیوی اگر چہ جسمانی ودنیوی لذت وراحت کا ذریعہ ہے اور خوشی ومسرت کے وقت اس کے منہ میں لقمہ دینا محض ایک خوش طبعی ہے، جس کا طاعت وعبادت اور امور آخرت سے کوئی تعلق نہیں، مگر اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: کہ اگر بیوی کے منہ میں لقمہ دینے میں اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی کی نیت ہو تو اس میں ثواب ملتا ہے، لہٰذا اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں تو بطریق اولیٰ ثواب ملے گا۔ (مظاہر حق: ۲/۲۴۳)

ایضاً

{۲۹۴۰} وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ عَادَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مَرِیْضٌ فَقَالَ اَوْصَیْتَ؟ قُلْتُ: نَعَمْ! قَالَ بِکَمْ؟ قُلْتُ بِمَالِیْ کُلِّہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ: فَمَا تَرَکْتَ لِوَلَدِکَ؟ قُلْتُ: ھُمْ اَغْنِیَاءُ بِخَیْرٍ فَقَالَ: اَوْصِ بِالْعُشْرِ فَمَا زِلْتُ اُنَاقِصُہٗ حَتّٰی قَالَ اَوْصِیْ بِالثُّلُثِ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ۔ (رواہ الترمذی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۳۲، کتاب الوصیۃ بالثلث، حدیث نمبر: ۲۱۱۶،

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری عیادت فرمائی اور میں (اس وقت) بیمار تھا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تم نے وصیت کی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کتنی مقدار کی وصیت کی؟ میں نے کہا: اپنے تمام مال کو اللہ کے راستے میں (دے رہا ہوں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: اپنی اولاد کے لئے تم نے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے کہا: وہ (تو) مالدار ہیں، مال رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دسویں حصہ کی وصیت کردو۔ تو میں اس کو برابر کم خیال کرتا رہا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک تہائی کی وصیت کردو اور ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔

تشریح: یہ حدیث شریف اور ما قبل کی حدیث ایک ہی واقعہ سے متعلق ہے، دونوں حدیث میں قدرے فرق ہے، دراصل یہ احادیث کے کلمات کا فرق روایت بالمعنی کی وجہ سے ہوا کرتا ہے، نیز ایک وجہ فرق کی یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ بعض راوی اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں، اور بعض تفصیل کے

ساتھ (اور یہ بھی روایت بالمعنی ہی کی ایک صورت ہے) اس روایت میں یہ تذکرہ بھی ہے کہ اولاً آنحضرت ﷺ نے فقط عشر (دسویں حصہ) کی وصیت کا مشورہ دیا تھا تاکہ وارث کو زیادہ سے زیادہ ترکہ پہنچے اور اس میں اشارہ ہے کہ وصیت زائد مال کی نہ ہو، بالآخر آنحضرت ﷺ نے ایک ثلث کی اجازت دیتے ہوئے بھی ارشاد فرمایا: "والثلث کثیر" کہ ایک تہائی بھی زیادہ ہے۔

وصیت سے متعلق بعض ضروری مسائل

حدیث الباب سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کے لئے زائد سے زائد ایک ثلث کی وصیت غیر وارث کے لئے جائز ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے: "باب الوصیة بالثلث" اس پر حافظ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ثلث سے زائد وصیت ممنوع ہے، (پھر میت دو حال سے خالی نہیں، اس کے ورثاء ہوں گے یا نہیں، شق ثانی میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ ایسے شخص کے لئے ثلث سے زائد وصیت جائز نہیں) اور اگر شق ہے اوّل یعنی میت کے ورثاء ہیں تو اس وقت بھی ثلث سے زائد کی وصیت کو جمہور علماء ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن حنفیہ اور اسحاق اور احمد فی روایۃ نے اس کو جائز رکھا ہے۔ یعنی بشرطیکہ ورثہ کی طرف سے اس کی اجازت ہو، چنانچہ ہدایہ میں ہے: "ثم تصح للاجنبی فی الثلث من غیر اجازة الورثة ولا تجوز بما زاد علی الثلث الا ان تجیزها الورثة بعد موته وهم کبار لان الامتناع لحقهم وهم اسقطوه ولا معتبر باجازتهم فی حال حیاته"

نیز جاننا چاہئے کہ وصیۃ للوارث کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے، ظاہریہ کے نزدیک تو یہ حکم مطلقاً ہے۔ "لحدیث لا وصیة لوارث" (اخرجه ابو داؤد والترمذی وغیرهما) اور عند الجمہور وصیۃ لبعض الورثۃ کا جواز موقوف ہے، بقیہ ورثاء کی اجازت پر اگر بقیہ ورثہ موت موصی کے بعد اس کی اجازت دیدیں تو پھر وہ وصیت معتبر اور جائز ہے، لروایة الدار قطنی "لا وصیة لوارث الا ان یشاء الورثة، قال الحافظ ورجاله ثقات الا انه معلول" (تراجم بخاری) وفی العینی قال المنذری انما یبطل الوصیة للوارث فی قول اکثر اهل العلم من اجل حقوق سائر الورثة فاذا اجازوها جازت کما اذا اجازوا الزیادة علی الثلث وذهب بعضهم الی انها لا تجوز وان اجازوها لان المنع لحق

الشرع وھذا قول اھل الظاھر۔ (عمدۃ القاری: ۱۱/۲۷۱)

وفی الھدایۃ: ولا تجوز بما زاد علی الثلث الا ان یجیزھا الورثۃ لان الامتناع لحقھم فتجوز باجازتھم ولو اجاز بعض ورد بعض تجوز علی المجیز بقدر حصۃ لولایتہ علیہ (ملخصاً ملتقطاً) نیز جاننا چاہئے کہ اگر کوئی شخص مرض الوفات میں اپنے کسی وارث کو کوئی چیز فی الحال ہبہ کرے تو وہ حکم میں وصیت کے ہے "وفی الھدایۃ والھبۃ من المریض (مرض الموت) للوارث فی ھذا نظیر الوصیۃ لانھا وصیۃ حکماً" نیز حدیث شریف میں ہے "والثلث کثیر" اسی لئے علماء فرماتے ہیں وصیت اگر ثلث سے کم ہو تو یہ بہتر ہے۔ ففی الھدایۃ وتجب ان یوصی الانسان بدون الثلث سواء کانت الورثۃ اغنیاء او فقراء، لان فی التنقیص صلۃ القریب بترک ما لہ علیھم بخلاف استکمال الثلث لانہ استیفاء تمام حقہ فلا صلۃ ولا منۃ، پھر یہ کہ مادون الثلث کی بھی وصیت کرنا اولیٰ ہے یا اس کا ترک اولیٰ ہے، اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ اگر ورثاء فقراء ہیں اس صورت میں ترک وصیت اولیٰ ہے اور اگر وہ اغنیاء ہیں تو وصیت کرنا اولیٰ ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ موصی کو اختیار ہے جونسی چاہے شق اختیار کرے، اس لئے کہ ہر ایک شق میں من وجہ فضیلت ہے۔ مختصراً من الھدایۃ (ہامش الدر المنضود: ۵/۶۱)

وارث کے لئے وصیت نہیں

{۲۹۴۱} **وَعَنْ** اَبِیْ اُمَامَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِہٖ عَامَ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ) وَزَادَ التِّرْمِذِیُّ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاھِرِ الْحَجَرُ وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ وَیُرْوٰی عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ الْوَرَثَۃُ مُنْقَطِعَۃٌ ھٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِیْحِ وَفِیْ رِوَایَۃِ الدَّارِقُطْنِیِّ قَالَ لَا تَجُوْزُ وَصِیَّۃٌ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ یَشَاءَ الْوَرَثَۃُ۔

حوالہ: ابوداؤد شریف:۲/۳۹۶، باب فی الوصیة للوارث، حدیث نمبر:۲۸۷۰، ابن ماجه شریف:۱/۱۹۴، باب لا وصیة لوارث، حدیث نمبر:۲۷۱۳، ترمذی شریف:۲/۳۲، باب لا وصیة لوارث، حدیث نمبر:۲۱۲۰، دارقطنی:۲/۲۷، حدیث نمبر:۴۲۵۳۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں فرمارہے تھے: بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دلایا (اور متعین فرمادیا) ہے، لہٰذا کسی وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ (ابوداؤد،ابن ماجہ) اورامام ترمذیؒ نے اپنی روایت میں یہ زیادہ روایت کیا ہے بچہ صاحب فراش کے لئے اور زانی کے لئے پتھر ہیں اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اور بروایت حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی وارث کے لئے وصیت نہیں البتہ اگر ورثاء منظور کرلیں۔ (یہ حدیث منقطع ہے اور یہ الفاظِ حدیث مصابیح کے ہیں اور دارقطنی کی ایک روایت میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں البتہ اگر ورثاء منظور کرلیں۔)

تشریح: ''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کا حق دیدیا ہے الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے لئے حصے متعین ومقرر فرمادیئے ہیں، خواہ وہ ذوی الفروض ہوں یا عصبہ ہوں، لہٰذا اب کسی وراث کے حق میں وصیت کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر کوئی میت اپنے کسی وارث کے حق میں یہ وصیت کربھی جائے کہ اسے دوسرے وارثوں سے اتنا زیادہ حصہ دیا جائے تو شرعی طور پر اس کا کچھ اعتبار نہیں، ہاں اگر تمام ورثاء عاقل و بالغ ہوں اور وہ برضاء ورغبت کسی وارث کو میت کی وصیت کے مطابق اس کے حصے سے زیادہ دے دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا، آیت میراث نازل ہونے سے پہلے اپنے اقرباء کے حق میں وصیت کرنا واجب تھا، مگر جب آیت میراث نازل ہوئی اور تمام ورثاء کے حصے متعین ومقرر ہو گئے تو وصیت کا واجب ہونا منسوخ ہوگیا۔

''فراش'' ویسے تو عورت کو کہتے ہیں، لیکن یہاں ''الولد للفراش'' میں فراش سے مراد ''صاحب فراش'' (یعنی عورت کا مالک) ہے، حدیث پاک کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا کرے اور اس کے نتیجہ میں بچہ پیدا ہو تو اس بچہ کا نسب زنا کرنے والے سے قائم نہیں ہوتا بلکہ وہ

صاحب فراش کی طرف منسوب ہوتا ہے خواہ وہ صاحب فراش زنا کرانے والی عورت کا خاوند ہو یا (لونڈی ہونے کی صورت میں) اس کا آقا ہو، اور یا وہ شخص وہ جس نے شبہ میں مبتلا ہو کر اس عورت سے صحبت کرلی تھی۔

''اور زنا کرنے والے کے لئے پتھر ہے'' جو جملہ زنا کرنے والے کی محرومی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جیسا کہ ہماری عام بول چال میں کسی ایسے شخص کے بارے میں کہ جسے کچھ نہیں ملتا، کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسے خاک پتھر ملے گا، لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب چونکہ زنا کرنے والے سے قائم نہیں ہوتا اس لئے اس کو ولد الزنا کی میراث میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یا پھر یہ کہ یہاں ''بچہ'' کا نسب چونکہ زنا کرنے والے سے قائم نہیں ہوتا اس لئے اس کو ولد الزنا کی میراث میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یا پھر یہ کہ یہاں ''پتھر'' سے مراد سنگسار کرنا ہے کہ اس زنا کرنے والے کو (اگر وہ شادی شدہ تھا) سنگسار کیا جائے گا۔

''ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ اس بدکاری میں مبتلا ہونے والوں کا حساب وکتاب اللہ پر ہے کہ وہ ہر ایک کو ان کے کرتوت کے مطابق بدلہ دے گا، ویسے یہ جملہ ایک دوسرے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے تو یہاں ہم زنا کرنے والوں کو سزا دیتے ہیں، بایں طور کہ ان پر حد جاری کرتے ہیں، اب رہا وہاں یعنی آخرت کا معاملہ تو یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشاء پر موقوف ہے چاہے تو مواخذہ کرے اور چاہے اپنے بے پایاں رحم وکرم کے صدقہ میں انہیں بخش دے۔

مذکورہ بالا عبارت کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو شخص زنا کرے یا کسی اور گناہ میں مبتلا ہو اور اس پر کوئی حد قائم نہ ہو یعنی دنیا میں اسے کوئی سزا نہ دی جائے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

وارث کیلئے وصیت کا حکم

اگر ورثاء کسی وارث کے لئے میت کو وصیت کی اجازت دیں تو آیا جائز ہے یا نہیں؟

عبدالرحمن بن الکیسان الحم کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ جمہور کے نزدیک جائز ہے، پھر یہ مسئلہ کہ اس اجازت کے بعد ورثاء اپنی اجازت سے رجوع کر سکتے ہیں، یا نہیں؟ جمہور کے نزدیک رجوع کا حق ہے، ربیعۃ الرائے، حسن، اوزاعی، زہری کے نزدیک رجوع کا حق نہیں ہے، امام مالک تفصیل فرماتے ہیں کہ اگر ورثاء نے اجازت صحت کی حالت میں دی ہے تو رجوع کا حق ہے اور اگر مرض کے اندر اجازت دی ہے تو رجوع کا حق نہیں ہے۔

ورثاء کو بذریعہ وصیت نقصان پہنچانا درست نہیں

{۲۹۴۲} **وَعَنْ** اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ الْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللهِ سِتِّیْنَ سَنَةً ثُمَّ یَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ ثُمَّ قَرَأَ اَبُوْهُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُوْصٰی بِهَا اَوْ دَیْنٍ غَیْرَ مُضَارٍّ اِلٰی قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجة)

حواله: مسند احمد: ۲/۲۴۸، حدیث نمبر: ۷۷۲۸، ترمذی شریف: ۲/۳۲، باب الوصیة بالثلث، حدیث نمبر: ۲۱۱۷، ابوداؤد شریف: ۲/۳۹۶، باب کراهة الاضرار فی الوصیة، حدیث نمبر: ۲۸۶۷، ابن ماجه شریف: ۱۹۴، باب الحیف فی الوصیة، حدیث نمبر: ۲۷۰۴۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک مرد اور عورت اللہ تعالیٰ کی اطاعت (وعبادت) ساٹھ سال تک کرتے ہیں، پھر ان کو موت آئے وہ دونوں وصیت میں نقصان پہنچاتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں کے حق میں دوزخ کی آگ لازم ہو جاتی ہے، اس کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آیت تلاوت فرمائی: "من بعد وصیة یوصی بها الخ"

تشریح: یہ حدیث حقوق العباد کی اہمیت ظاہر کرتی ہے کہ جو لوگ اپنی ساری زندگی عبادت

الٰہی میں گذار دیتے ہیں مگر حقوق العباد کو نقصان پہنچانے سے اجتناب نہیں کرتے وہ اپنی تمام عبادتوں کے باوجود خدا کی ناراضگی کا مورد بن جاتے ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ جو لوگ خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ساٹھ سال تک عبادت کرتے ہیں، مگر اپنی زندگی کے آخری لمحات میں یہ وبال اپنے سر لے لیتے ہیں کہ وہ اپنے مال میں تہائی سے زیادہ وصیت کسی غیر شخص کے حق میں کر جاتے ہیں یا اپنا سارا مال کسی ایک وارث کو ہبہ کر دیتے ہیں تاکہ دوسرے وارثوں کو کچھ نہ ملے اور اس طرح وہ اپنے وارثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ اتنے طویل عرصہ کی اپنی عبادتوں کے باوجود اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بنا لیتے ہیں، کیونکہ اپنے وارثوں کو نقصان پہنچانا حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے غیر مناسب و ناجائز ہی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی اور اس کی مقررہ ہدایات سے تجاوز بھی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا ارشاد بیان کرنے کے بعد بطور تائید مذکورہ بالا آیت کریمہ پڑھی۔ کیونکہ اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مورث کو چاہیئے کہ وہ اپنے مال کے تہائی حصہ سے زائد کے بارے میں وصیت کرکے اپنے وارثوں کو نقصان نہ پہنچائے۔

﴿الفصل الثالث﴾

وصیت اور تقویٰ

{۲۹۴۳} **وَعَنْ** جَابِرٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ عَلٰی وَصِیَّۃٍ مَاتَ عَلٰی سَبِیْلٍ وَسُنَّۃٍ وَمَاتَ عَلٰی تُقًی وَشَہَادَۃٍ وَمَاتَ مَغْفُوْرًا لَہٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۹۳، باب الحث علی الوصیۃ، حدیث نمبر: ۲۷۰۱۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے وصیت پر وفات پائی تو اس نے راہِ مستقیم اور سنت (کے مطابق) وفات پائی اور اس نے تقویٰ اور شہادت پر وفات پائی اور اس نے وفات پائی اس حال میں کہ اس کی مغفرت کر دی گئی۔

تشریح: علی سبیل: یعنی علی وجہ السنۃ مزید ارشاد فرمایا: "علی تقی" یعنی حقوقِ واجبہ کی رعایت کرتے ہوئے وصیت کی گئی جو علامت ہے کہ وہ تقویٰ پر قائم ہے اور اس کے ذریعہ مقام شہادت پر فائز ہوا، اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت فرمائی "ومات مغفوراً" یہ آخرت کے اعتبار سے مقاماتِ عالیہ کا آخری درجہ ہے کہ مغفرت کا مقام حاصل ہوا ہے۔ "لان الغفران غایۃ الطلب ونہایۃ المقصد" (تعلیق: ۳/۳۹۹)

ایصالِ ثواب کا حکم

{۲۹۴۴} **وَعَنْ** عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ اَوْصٰی اَنْ یُعْتَقَ عَنْہُ مِائَۃُ رَقَبَۃٍ فَاَعْتَقَ اِبْنُہٗ ھِشَامٌ خَمْسِیْنَ رَقَبَۃً فَاَرَادَ

اِبْنُهٗ عَمْرٌو اَنْ یُّعْتِقَ عَنْهُ الْخَمْسِیْنَ الْبَاقِیَةَ فَقَالَ: حَتّٰی اَسْأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ اَبِیْ اَوْصٰی اَنْ یُّعْتَقَ عَنْهُ مِائَةُ رَقَبَةٍ وَاِنَّ هِشَامًا اَعْتَقَ عَنْهُ خَمْسِیْنَ وَبَقِیَتْ عَلَیْهِ خَمْسُوْنَ رَقَبَةً اَفَاُعْتِقُ عَنْهُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ لَوْ کَانَ مُسْلِمًا فَاَعْتَقْتُمْ عَنْهُ اَوْ تَصَدَّقْتُمْ عَنْهُ اَوْ حَجَجْتُمْ عَنْهُ بَلَغَهٗ ذٰلِكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤدشریف: ۳۹۹/۲، باب الوصیة الحربی، حدیث نمبر: ۲۸۸۳۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب بروایت والد خود از جد خود روایت کرتے ہیں کہ بے شک حضرت عاص بن وائل رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی طرف سے ایک سو غلام آزاد کئے جائیں، چنانچہ ان کے ایک لڑکے ہشام نے پچاس غلام آزاد کردیئے ہیں اور ان کے دوسرے لڑکے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقی پچاس غلام آزاد کردینے کا ارادہ کیا ہے، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (آزاد نہیں کروں گا) تاوقتیکہ میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرلوں، چنانچہ وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! بے شک میرے والد نے وصیت کی ہے کہ ان کی طرف ایک سو غلام آزاد کردیئے جائیں، حضرت ہشام رضی اللہ عنہ نے تو پچاس غلام ان کی طرف سے آزاد کردئے ہیں اور پچاس باقی ہیں، کیا میں ان کی طرف سے آزاد کردوں؟ (اور ان کو ثواب پہنچے گا؟) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر وہ مسلمان تھے تو تم ان کی طرف سے آزاد کردو یا ان کی طرف سے تم صدقہ کرو یا تم ان کی طرف سے حج کرو تو ان اعمال کا اجر وثواب ان کو پہنچے گا۔

تشریح: اگر کوئی کافر کوئی وصیت کرکے مرے اور حال یہ کہ اس کا وارث مسلمان ہوجائے تو کیا اس صورت میں اس وارث مسلم پر یہ واجب ہے کہ اس کافر باپ کی وصیت کو پورا کرے۔

حدیث پاک میں بتادیا گیا کہ اس پر اس وصیت کو پورا کرنا لازم نہیں، اس لئے کہ کافر کو مرنے کے بعد کسی نیک عمل کا ثواب نہیں پہنچتا۔

کافر کو اعمال خیر کا ثواب اکثرین علماء کے نزدیک دنیا کے اندر پہنچتا ہے آخرت کے اندر نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

ورثاء کا حق نہ دیئے جانے پر وعید

{۲۹۴۵} وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَطَعَ مِیْرَاثَ وَارِثِہٖ قَطَعَ اللہُ مِیْرَاثَہٗ مِنَ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (رواہ ابن ماجۃ) وَرَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

حوالہ: ابن ماجہ شریف: ۱۹۴، الحیف فی الوصیۃ، حدیث نمبر: ۲۷۰۳، بیہقی فی شعب الایمان: ۲/۲۲۴، باب فی صلۃ الارحام، حدیث نمبر: ۷۹۶۵۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے وارث کی میراث کا حصہ ادا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت جنت سے اس کا حصہ قطع کریگا۔ (ابن ماجہ) اور امام بیہقی نے بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ شعب الایمان میں نقل کی ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی وارث کے حق میراث کو قطع کرنا، وارث کو محروم کرنا، کوئی صورت اور تدبیر ایسی کرنا جس سے کوئی وارث محروم ہو جائے تو یہ شدید ترین ظلم اور عدوان ہے، اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ حق کو قطع کرنا، قانونِ الٰہی کو قطع کرنے کے مترادف ہے، اس لئے اس پر یہ شدید وعید فرمائی ہے کہ جنت کی میراث سے یہ محروم رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اہل ایمان کی وراثت جنت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: "وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا" (سورۃ الاعراف) [لوگو! یہ ہے جنت، تم جو عمل کرتے رہے ہو، ان کی بنا پر تمہیں اس کا وارث بنادیا گیا ہے۔] جنت کو میراث انجام کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ بہر حال اس حدیث پاک میں اس پر یہ شدید وعید ہے۔

(۱)......محروم کرنا اور حق کو ضائع کرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً بصورتِ ناجائز وصیت کر دینا اور کوئی خلافِ شرع وصیت نامہ تحریر کر دینا جو سبب ہو کسی کے حق ضائع ہونے کا۔

(۲)......کسی اولاد کو ''عاق'' کر دینا اور اس کا اعلان کر دینا۔ (بہر حال اس ''عاق'' سے وارث محروم نہ ہوگا۔

(۳)......خلافِ واقعہ کسی کے لئے قرض وغیرہ کا اقرار کرنا۔

(۴)......خلافِ شرع کوئی وقف یا ہبہ وغیرہ کر دینا۔

(۵)......کسی وارث کا حق نہ دینا، اگر چہ بصراحت اس کا تذکرہ اس روایت میں نہیں ہے، لیکن یہ بھی ظلم ہے اور حق العباد پر قبضہ کرنا ہے جو حرام ہے۔

عرض ضروری

آج کل یہ صورتِ حال غالب ہوگئی ہے کہ معاشرہ میں حق میراث کی ادائیگی میں بہت زیادہ غفلت اور بے فکری ہے اور اکثر و بیشتر میراث کا اہتمام جس قدر ضروری اور لازم و فرض ہے اس میں بہت زیادہ کوتاہی ہے اور جس کا قبضہ ہے وہ اس پر قابض رہتا ہے اور خاص کر لڑکیوں اور بہنوں کا حق تو تقریباً نہ دیئے جانے کے ہی برابر ہے، دورِ جاہلیت کی یہ رسم اہل اسلام میں بھی بہت حد تک پائی جاتی ہے، نیز صحرائی اور کاشت کی املاک میں غیر شرعی قانون کا سہارا لے کر غیر اسلامی طریقہ کو ہی عملاً اختیار کیئے ہوئے ہیں، شاید اور باید ہی اس میں حق شرعی پر عمل کرتے ہوں گے، یہ صورت بھی محروم کرنے کے ہم معنی ہے، اللہ تعالیٰ امت اسلام کو قرآن وسنت کے اصولوں پر فائز رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور صراطِ مستقیم پر استقامت عطا فرمائے۔

تم الجزء الخامس عشر بحمد الله تعالیٰ واحسانه وتوفيقه وبمنه وكرمه

ويليه الجزء السادس عشر اوّله كتاب النكاح ان شاء الله تعالیٰ

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم

بحرمة حبيبك سيد المرسلين

صلى الله تعالیٰ عليه وعلى اٰله واصحابه اجمعين الى يوم الدين

محمد فاروق غفر له